حیات، خدمات اور شعری کائنات
عرفان صدیقی
مرتّبین:
عزیز نبیل۔ آصف اعظمی
زیرِ اہتمام: مجلسِ فخرِ بحرین برائے فروغِ اردو، مملکت بحرین
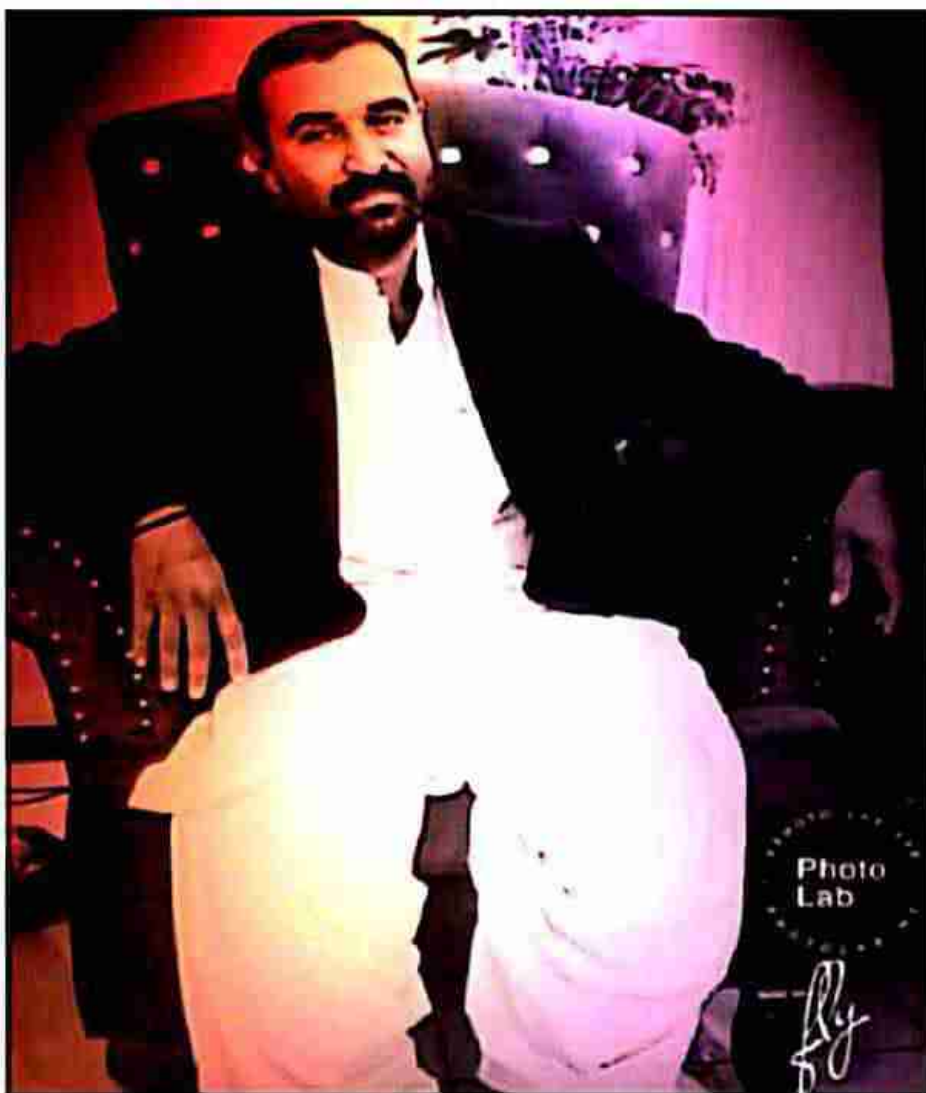
عرفان صدیقی

حیات، خدمات اور شعری کائنات

مرتّبین

عزیز نبیل۔ آصف اعظمی

زیر اہتمام

مجلس فخر بحرین برائے فروغِ اردو، بحرین

عرفان صدیقی: حیات، خدمات اور شعری کائنات

- مرتبین : عزیز نبیلؔ۔ آصف اعظمی
- سنِ اشاعت : 2015
- تعداد : 500
- قیمت : چارسو روپے
- طباعتی تعاون : سید راشد حامدی
- کمپوزنگ : واعظ الرحمٰن صدیقی، راشد شکیب
- طابع و ناشر : گلوبل میڈیا پبلی کیشنز، نئی دہلی

کتاب ملنے کے پتے

- مجلس فخرِ بحرین برائے فروغِ اردو، بحرین، پوسٹ باکس نمبر 21503
منامہ، بحرین۔ ٹیلی فون: 17624212-973+
ای میل: bahrainurdu@gmail.com
- عزیز نبیلؔ، دوحہ، قطر ۔ ٹیلی فون: 55296335-974+
ای میل: aziznabeel@yahoo.com
- آصف اعظمی، نئی دہلی ۔ ٹیلی فون: 26331071-11-91+
ای میل: asifazmi@hotmail.com

انتساب

مملکتِ بحرین میں اردو تہذیب کی اعلیٰ قدروں کے نقیب
اور اردو شاعری کے عاشقِ صادق

شکیل احمد صبرحدی صاحب

کے نام

جانے کتنے سورجوں کا فیض حاصل ہے اسے
اس مکمّل روشنی سے جو ملا روشن ہوا

عزیز نبیلؔ

مری شاعری مری عاشقی ہے سمندروں کی شناوری
وہی ہمکنار اسے چاہنا، وہی بیکراں اسے دیکھنا
عرفان صدیقی

فہرست

آئینۂ عرفان: کوائف، شجرہ، تصاویر

ابتدائیہ

عرفان صدیقی اردو زبان کے شاعر ہیں جو منفرد و ممتاز، عظیم و معروف جیسے تمام لاحقوں سے بالاتر جنھیں آج کل ہر کس و ناکس کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ عرفانِ ذات سے لے کر عرفانِ کائنات تک فکر و عمل اور تجربات و مشاہدات کی جو دنیا عرفان صدیقی کے ہاں اپنی پوری صوتی، صوری، معنوی اور جمالیاتی نیرنگیوں کے ساتھ آباد ہے، وہ ان کی شاعری کو نئی وسعتوں اور پنہائیوں سے ہمکنار کراتی ہے۔ پھر وہ جداگانہ الفاظ اور ترکیبیں ہوں کہ نت نئے استعارے اور تلمیحات، روایات کی مٹی میں رچا بسا کلاسیکی خمیر ہو کہ جدیدیت کے نئے آسمانوں کی فکری اڑان، ان کی شاعری میں وہ تمام اوصاف و لوازمات موجود ہیں جو انہیں بلا مبالغہ صف اول کے شعراء میں جگہ دلانے کے لئے کافی ہے۔

سائنس اور آرٹ دونوں کی معراج صنعت ہے، لیکن دونوں کے فارمولے الگ الگ ہیں۔ عرفان صدیقی کے نزدیک بھی شاعری تخلیق سے زیادہ صناعی ہے۔ الہامی سے زیادہ اختراعی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی شاعری کا نظم خود تشکیل دیتے ہیں۔ کینوس بھی ان کا ہوتا ہے اور رنگ بھی۔ یہ نظم فکر کی جولان گاہوں پر چلتے ہوئے صوتی اور معنوی لحاظ سے موزوں ترین الفاظ کی صناعی سے عبارت ہے۔ ان کی شاعری فارم اور اسپیس کے درمیان تناسب اور توازن کی شاعری ہے، جس میں مصوری جیسی پیکر تراشی، موسیقی جیسا آہنگ اور داستان گوئی یا تھیٹر جیسا ڈرامائی انداز بھی ہے۔ عرفان صدیقی کہتے ہیں "میں اس لیے سوچتا ہوں کہ شاید میں جو کچھ بات کہنا چاہتا ہوں وہ اپنے تمام تلازمات اور

تمام رموز کے ساتھ اس وقت تک ادا نہیں ہوگی جب تک اس لفظ کے جتنے امکان بھی اجاگر کر سکتا ہوں اجاگر کر لوں تو بہت اتھاہ قسم کی چیز ہے، لیکن جتنے بھی اس کے امکانات کو تلاش کر سکوں اور ان کو برت سکوں، اپنے مفہوم کو پہونچانے میں اس حد تک میں جاؤں اور اس کے لئے خاصی محنت ریاض اور کوشش کرنی پڑتی ہے۔ میں بالکل ان لوگوں میں نہیں ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ شاعری کوئی صاحب الہامی چیز ہے۔ ہوتی ہوگی، الہام خیال کی شکل میں ہوتا ہوگا۔ کوئی چیز آ جاتی ہوگی لیکن شاعری خالص شعوری exercise ہے اور اگر آپ لفظ کے برتنے کے لئے شعور کی اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ نہیں لگتے تو وہ کام نہیں بنتا ہے اور شاعری میں تو بالکل نہیں بنتا ہے صاحب''۔

عرفان صدیقی اوریجنل شاعر ہیں۔ وہ انسپریشن اور اثر تو لیتے ہیں، مگر کسی دھارے یا تحریک کا حصہ نہیں بنتے۔ عرفان صدیقی کے لفظوں میں ''میں خدا کی قسم بہت خوش ہوں اگر میں کسی دھارے میں آپ کو نظر نہیں آ رہا ہوں اس لئے کہ میں اصل میں کسی دھارے کا شاعر نہیں ہوں۔ میں تو، میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اب تک میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں میرؔ کو غالبؔ سے کہاں ممیز کروں''۔ انہی پر کیا موقوف، کلاسیکیت، ترقی پسندی، جدیدیت وغیرہ کے بھی سبھی دھارے عرفانیات میں آ کر مدغم ہو جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہوا آخر وہ ہم سے ہم سخن آہستہ آہستہ
چلی صحرا میں بھی ٹھنڈی ہوا آہستہ آہستہ

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچیے آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

ہمیں سچ مچ کوئی آزار ہے ایسا نہیں لگتا
کہ ہم دفتر بھی جاتے ہیں غزل خوانی بھی کرتے ہیں

مگر اس کا کیا کیا جائے کہ عرفان صدیقی کی شاعری کی عظمت کو پہچاننے میں زمانے

لگ گئے اور جب پہچانا گیا تو بھی اس کی اس طرح تعین قدر نہیں ہوئی جو اس کو سزاوار تھا۔ خیر، یہ تو ایک یونیورسل المیہ ہے اور یہ شکوہ غالبؔ سے لے کر عرفان تک سبھی کرتے آئے ہیں۔

ع ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا'' (غالب)

ع ''لو گو مری گلکاریٔ وحشت کا صلہ کیا'' (مجروح)

ع ''فائدہ عرض ہنر میں تھا، ہنر میں کیا تھا'' (عرفان صدیقی)

مزید ظلم یہ ہوا کہ کربلا کے استعارات و تلمیحات کی بنا پر عرفان صدیقی کو محض ایک منقبت خواں اور مرثیہ نگار کی حیثیت اور مقام تک محدود کرنے کی کوشش کی گئی، جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ نوحہ و مرثیہ، منقبت و سلام ان کی شاعری کا جزوی حصہ ہے، کُل نہیں۔ ایک ایسے دور میں جب کہ آرٹ برائے آرٹ اور فن برائے فن کی وکالت پر زور طریقے سے کی جارہی ہے، عرفان صدیقی کی شاعری کو محدود حوالوں کے بجائے تکنیک فن اور اظہار کے پیمانوں پر سمجھا جانا ضروری ہے۔ یوں بھی وہ اپنی نوع کے منفرد اور حیران کردینے والے لب ولہجہ کے شاعر تھے۔

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک
مسند خاک پہ بیٹھا ہوں برابر اپنے

اس کتاب میں عرفان صدیقی کے ذاتی اوصاف و خصائل، علمی و ادبی خدمات اور بطور خاص شاعری کے حوالے سے ان کے دوستوں، عزیزوں، نقادوں اور دیگر اہل قلم حضرات کی وقیع تحریریں جمع کی گئی ہیں، جن سے نہ صرف عرفان صدیقی کی شخصیت کو قریب سے جاننے میں مدد ملے گی، بلکہ ان کے شعر و ادب کے گوناگوں گوشوں کی تفہیم کی راہ آسان ہوگی۔ اس کے علاوہ قارئین عرفان صدیقی کی چنندہ شاعری اور نثر کے نمونوں سے براہ راست استفادہ کرسکتے ہیں، جس کے لئے عرفانیات کے نام سے علاحدہ گوشہ قائم کیا گیا ہے۔ مرتبین اسے

اپنا ادبی فریضہ جانتے ہیں کہ کتاب میں شامل ان تمام قلمکاروں کا شکریہ ادا کیا جائے جنہوں نے خصوصی طور پر اس کتاب کے لئے اپنے مضامین قلم بند کیے۔ اس کتاب کی ترتیب میں جن دیگر احباب اور عرفان صدیقی کے اہل خانہ کا تعاون شامل حال رہا، ان میں ان کی اہلیہ محترمہ، صاحبزادے خالد عرفان اور ان کے قریبی عزیز اور معروف شاعر و فکشن نگار سید محمد اشرف، سعود عثمانی (لاہور)، قمر صدیقی (ممبئی)، سید راشد حامدی (دہلی)، ڈاکٹر عمیر منظر (لکھنو)، ڈاکٹر محمد شارق (علی گڑھ)، احمد اشفاق (قطر)، شاہنواز فیاض) (دہلی) شامل ہیں۔ علاوہ بریں، نیا دور کے عرفان صدیقی نمبر، سوغات و شب خون کے مختلف شمارے اور ایوانِ اردو کے گوشۂ عرفان سے بھی خوشہ چینی کی گئی ہے۔

اس کتاب کی سب سے دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ اس میں عرفان صدیقی کے معاصرین سے زیادہ تعداد ان قلمکاروں کی ہے جن کی قلمی عمر دس بارہ برس سے زیادہ کی نہیں ہے یعنی ان کا تعلق عرفان صدیقی کے بعد کے زمانہ سے ہے۔ اس بات کا مثبت پہلو یہ ہے کہ یہاں دو نسلوں کی نمائندگی ہے، ایسی دو نسلیں جن کی سوچ اور طریقۂ کار کا ابعاد زمانہ کی سرعت پذیری میں نمایاں ہے۔ منفی پہلو یہ ہے کہ عرفان صدیقی کے معاصرین ان پر قلم اٹھانے کے معاملہ میں کوتاہ رہے ہیں۔

عرفان صدیقی بے نیاز قسم کے انسان تھے۔ انفارمیشن سروسز کی طویل ملازمت اور رابطۂ عامہ کو سمجھنے اور اس پر کتاب لکھنے والے عرفان اپنے پی آر کو لے کر کافی کمزور واقع ہوئے تھے۔ اس کا اعتراف انہوں نے نیر مسعود سے اپنی ایک گفتگو میں کچھ یوں کیا ہے: ” کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے تعارف میں بہت بڑا ہاتھ شاید اس کی شاعری کے volume کا بھی ہوتا ہے پھر میں چونکہ خود اس فیلڈ کا ہوں مجھے معلوم ہے کہ .P.R کے تقاضے کیا ہوتے ہیں مگر یہ کہ کچھ طبیعت ادھر نہیں آتی “۔ تاہم سوال صرف عرفان، ایک ذات

کی تعریف وتحسین کا نہیں ، بلکہ عرفان شاعر کی شناسی کا ہے اور یہ شکوہ بجا ہے کہ شاعری میں عرفان صدیقی کی حیثیت مسلم ہو جانے کے بعد بھی تفہیم عرفان اور ترسیل عرفان کی کوششیں جس پیمانے پر ہونی چاہیے تھیں، نہیں ہو سکیں۔

شاعری خلاقی ہے کہ صناعی ۔ یہ بحث تفصیل چاہتی ہے، مگر ہے ان دونوں کے درمیان کی کوئی چیز جو یہ تقاضا کرتی ہے کہ اسے برتا جائے، فہم وادراک سے لے کر فکر وعمل کے تمام راستوں سے گزارا جائے اور اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جو اس کا حق ہے۔ اگر کوئی فن پارہ محض اس وجہ سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اس کے مخاطبین کو معلوم ہی نہیں ہو سکا یا ان کے ہاں ذوق کی کمی تھی، تو شاعر وادیب اس کے لئے ہرگز قصوروار نہیں ہے، تخلیق تو بالکل ہی نہیں۔ مجلسِ فخر بحرین اور اس کے بانی شکیل احمد صبر حدی کی جانب سے گزشتہ تین برسوں سے جاری یہ کاوش، جس کے تحت شہریار اور فراق گورکھپوری پر اسی قسم کی دستاویزی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہے، اگر اپنے ذوق سلیم کا اعادہ نہیں تو حق بقدر رسید کا استعارہ ضرور ہے۔ عرفان صدیقی کی شخصیت اور شاعری پر مرتب یہ کتاب بھی اسی مشن کا ایک حصہ ہے، امید ہے پسند کی جائے گی۔

یادِ عرفان

یادیں، ملاقاتیں، خاکے

رختِ سفر اٹھا گیا کون سرائے خواب سے

رات پھر اس نواح میں گریۂ جاں بہت ہوا

میں اک کرن تھا شب تار سے نکل آیا

شمیم حنفی (دہلی) ....

۱۳/اپریل کی اس شام کو عرفان صاحب سے رخصت ہوتے وقت دل میں یہ ڈر سمایا ہوا تھا کہ یہ ملاقات کہیں ان سے آخری ملاقات نہ ہو۔ میرے ساتھ نیّر مسعود تھے اور انیس اشفاق۔ پرانے شہر کی ایک گلی میں عرفان صاحب نے اب ایک نیا گھر آباد کرلیا تھا۔"قندیل"۔

ادبستان (پروفیسر نیر مسعود کے مکان کا نام) سے ہم سہ پہر کے وقت نکلے تھے۔ عرفان صاحب کے گھر پہنچتے پہنچتے دھوپ ڈھلنے لگی تھی۔ قندیل پر سناٹا طاری تھا۔ غیرارادی طور پر ہم سب بہت دھیمی آواز، تقریباً سرگوشی کے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ عرفان صاحب کے بیٹے نے ہمیں اندر بلایا اور عرفان صاحب کے کمرے کی طرف رہنمائی کی۔ ایک بے قرار شعلہ جس کی حرارت کا اندازہ دور سے دیکھنے والے بھی کر لیتے تھے بستر پر تقریباً بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ ابھی ایک سال سے بھی کچھ پہلے، لکھنؤ کے پچھلے سفر میں عرفان صاحب سے دو لمبی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ نیر صاحب کے گھر پر، اس کے بعد بارود خانے میں ایک عزیزہ کے یہاں۔ عرفان صاحب کے علاوہ وہاں عثمان غنی صاحب، مسعود الحق صاحب، پروفیسر انیس اشفاق اور ڈاکٹر نسیم انصاری (جواب دوست کے مصنف اور علی گڑھ کے معروف سرجن) بھی تھے۔ رات دیر گئے تک ہم عرفان صاحب سے شعر سنتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں میں، لہجے میں، انداز میں، وہی اضطرار آمیز ذہانت اور زندہ دلی تھی جو عرفان صاحب کی

پہچان کہی جا سکتی تھی۔ وہ تیز سوچتے تھے، تیز چلتے تھے اور تیز بولتے تھے۔

تو کیا انھوں نے اپنے حصے کا سفر قبل از وقت ہی تمام کر لیا اور انھیں واقعی یہاں سے جانے کی جلدی تھی؟ بیماری کی پہچان، دوا دارو سے لے کر ان کے سفر کے آخری پڑاؤ تک ایک عجیب پر اسرار جلد بازی اور کم فرصتی کا گمان ہوتا تھا۔ طرز احساس اور شعور پر وارد ہونے والی کیفیتوں اور تجربوں سے ان کی روحانی افسردگی کا اظہار تو ہوتا تھا، لیکن اس افسردگی کے ادراک واظہار میں بھی ایک طرح کی تخلیقی بے چینی اور ایک مستقل اور پائدار وجودی سرگرمی کا رنگ حاوی تھا۔ ''شب خون'' میں اور ''شعر و حکمت'' میں ادھر ایک ساتھ عرفان صاحب کی کئی کئی غزلیں شائع ہوئیں۔ گجرات فسادات کے پس منظر میں ان کی معرکہ آرا غزل:

'حق فتح یاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا'

سے ان کی روحانی آشوب اور فکر کی الم آمیزی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ تو عرفان صاحب اپنے شخصی ملال اور اضراب کو بھی ایک گہرے، اجتماعی رمز اور شاعرانہ تفکر میں منتقل کر دینے کی غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ اسی لیے ہندوستان اور پاکستان کے تمام ممتاز نئے غزل گویوں کی بھیڑ میں بھی ان کی غزل الگ سے پہچانی جاتی تھی۔ معاصر غزل گویوں میں ظفر اقبال اور احمد مشتاق کے ساتھ عرفان صاحب اپنی سب سے زیادہ واضح شناخت رکھنے والے شاعر تھے۔

ذہنی تساہل اور تخلیقی پژمردگی کی وہ کیفیت، جس میں ہمارے نئے شاعروں کی اکثریت مبتلا دکھائی دیتی ہے، عرفان صاحب کے یہاں قطعاً ناپید تھی اور ان کے کلام میں اس کیفیت کا ظہور ان کے پہلے مجموعے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ محمود ایاز مرحوم (مدیر سوغات) ہندوستان کے نئے غزل گویوں میں انھیں پائیدار حسیت اور "Staying Power" رکھنے والا سب سے نمایاں شاعر کہتے تھے۔ اپنے انتقال سے پانچ چھ برس پہلے ان دنوں جب محمود ایاز

کرناٹک اردو اکادمی کے صدر تھے، ایک سمینار کی تقریب میں انھوں نے لکھنؤ سے نیر مسعود صاحب کے ساتھ عرفان صاحب کو بھی مدعو کیا تھا۔ احمد آباد سے وارث علوی آئے تھے۔ اس موقع پر ہمارا تقریباً ہفتے بھر کا دن رات کا ساتھ رہا۔ عرفان صاحب جتنے اچھے شعر کہتے تھے، اتنی ہی اچھی باتیں بھی کرتے تھے۔ سمینار کے اختتام پر ہم نے (نیر مسعود اور عرفان صاحب کے ساتھ) سری رنگا پٹنم اور میسور کا سفر بھی کیا۔ ٹیپو سلطان کے آثار کی زیارت کے دوران عرفان صاحب قدرے جذباتی اور دل گرفتہ نظر آئے۔ ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اپنے اجتماعی ماضی اور تاریخ کو بھی وہ اپنی جیتی جاگتی صورت حال کی طرح ایک زندہ واردات کے طور پر دیکھتے ہیں۔ عرفان صاحب کی غزلوں میں اپنے مخصوص تہذیبی حوالوں کا جو وفور ملتا ہے اپنی تاریخی وراثت کا جو گرم اور توانا احساس، مشترکہ علائم اور شعری پیکروں کی جو بہتات دکھائی دیتی ہے، اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقی بصیرت اور لسانی وفنی شعور کو اس کے تمام رشتوں اور رابطوں کے ساتھ اپنایا اور زندہ رکھا ہے۔ عرفان صاحب ایک بہت بیدار اور طاقت ور تہذیبی یادداشت رکھنے والے شاعر کے طور پر نمودار ہوئے اور اپنا یہ تشخص انھوں نے نئی حسیت کے مختلف عناصر اور جہات کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ قائم اور محفوظ بھی رکھا۔ تلمیحات، اساطیری علائم اور اظہار کے قدیمی اسالیب کو انھوں نے ایک نئی تخلیقی ضرورت کے تحت، ایک نو دریافت وسیلے کی حیثیت بھی دی۔ وہ جوایلیٹ نے ایک انتہائی معنی خیز اشارہ کیا تھا کہ نئی اور سچی تخلیقی صلاحیت سے مالا مال شاعر اپنے مستقبل پر ہی نہیں، اپنے ماضی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، تو اس رمز کی شہادت اردو کی نئی غزل کے نمائندوں میں ہمیں سب سے زیادہ ظفر اقبال اور عرفان صدیقی کے کلام سے ملتی ہے۔ عرفان صاحب کی غزل صرف نئے عہد کی نئی غزل کا ایک منفرد نقش و نشان ہی نہیں، تخلیقی بصیرت کے ایک لازوال سلسلے کا حصہ بھی ہے جس کا ایک دریچہ آنے والے زمانوں کی طرف بھی کھلتا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی غزل کا ایک نیا تصور قائم کیا۔ عرفان صاحب کی

غزل کو جو بے مثال قبولیت اور شہرت ملی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو شاعری کی دوسری صنفوں کے برعکس، غزل کی صنف انسانی صورت حال اور زمان و مکاں کے تمام تر تغیرات کی پرچھائیاں سمیٹنے کے بعد بھی اپنے ورثے سے کبھی دست بردار نہ ہوگی۔ نئی غزل کا ایک قدم اپنی روایت کے سمٹتے پھیلتے دائرے میں بھی نہایت مضبوطی سے جما رہے گا۔ عرفان صاحب کی غزل میں حال اور مستقبل کے ادراک کے علاوہ اپنے ماضی کا احساس ایک دائمی قدر کے طور پر موجود ہے۔ چنانچہ ان کا قائم کردہ اسلوب اور ان کا مخصوص رنگ و آہنگ ہماری ادبی تاریخ کے آئندہ موسموں میں بھی اپنی بہار کے ساتھ زندہ اور روشن رہے گا۔ ''شعر و حکمت'' کے حالیہ شمارے میں عرفان صاحب کی چھ غزلیں شامل ہیں۔ میرے لیے یہ ان کے آخری اشعار ہیں:

اسی دنیا میں کہیں کوئے نگاراں بھی تو ہے
ایک گھر بھی تو ہے، اک حلقۂ یاراں بھی تو ہے

آہی جاتی ہے ادھر موج ہوائے نمناک
اس مسافت میں کوئی خطۂ باراں بھی تو ہے

لو صبح ہوئی، موجِ بلا خیز ادھر آئے
اور آکے چراغ شب افسانہ اٹھالے

جو رنج میں اس جی پہ اٹھایا ہوں انھیں چھوڑ
تو صرف مرا نعرۂ مستانہ اٹھالے

ہم لفظ سے مضمون اٹھا لاتے ہیں جیسے
مٹی سے کوئی گوہر یک دانہ اٹھالے

دو جگہ رہتے ہیں ہم ایک تو یہ شہر ملال
ایک وہ شہر جو خوابوں میں بسایا ہوا ہے

رات اور اتنی مسلسل، کسی دیوانے نے
صبح روکی ہوئی ہے، چاند چرایا ہوا ہے

بھول جاؤ گے کہ رہتے تھے یہاں دوسرے لوگ
کل پھر آباد کریں گے یہ مکاں دوسرے لوگ

جل بجھیں گے کہ ہم اس رات کا ایندھن ہی تو ہیں
خیر، دیکھیں گے نئی روشنیاں دوسرے لوگ

گرفت ثابت و سیار سے نکل آیا
میں اک کرن تھا شب تار سے نکل آیا

یہاں وہ حشر بپا تھا کہ میں بھی آخر کار
اگرچہ نقش تھا، دیوار سے نکل آیا

تو یہ سبز سنہرا تخلیقی زندگی سے ٹمٹماتا ہوا نقش جو جمعہ کے دن ۱۰ راپریل ۲۰۰۴ کو وجود کی دیوار سے نکل کر عدم کے دھندلکوں کی جانب جاتا ہوا دکھائی دیا، رخصت ہونے کے بعد بھی حاضر اور موجود نظر آتا ہے۔ کچھ لوگ جانے کے بعد بھی اپنی جگہ خالی نہیں چھوڑتے۔ عرفان صاحب کے ساتھ بے شک ایک اکیلی روح کا سفر ختم ہوا لیکن اس روح کا بھی ایک سایہ ہے جو اردو شاعری کے احاطے میں ہمیشہ رواں دواں دکھائی دے گا اور آنے والوں کو بھی اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہے گا۔

☆☆☆

عرفان صدیقی

ملک زادہ منظور احمد (لکھنؤ) ....

کب تلک حلقۂ زنجیر میں کرتا رہوں رقص
کھیل اگر دیکھ لیا ہے تو اجازت مجھے دیں

اور پھر ۱۵/اپریل ۲۰۰۴ء کی شام کے نو بجے حلقۂ زنجیر کا یہ رقص بھی تمام ہوگیا۔ کھیل دیکھ لیا گیا اور ''ہوائے دشت عاریہ'' کو ''سات سموات'' کی جانب اذن سفر مل گیا۔ اس رقص زندگی کی جو مین بہت دنوں سے دیکھتا چلا آرہا تھا، آخری لمحات میں بھی دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بجے میں میڈیکل یونی ورسٹی کے اس وارڈ سے نکلا جہاں یہ ''دریا'' سمندر سے ملنے والا تھا۔ سانسوں کی رفتار تیز اور نبض کی رفتار مدھم پڑ چکی تھی۔ میرے ساتھ میرا بیٹا پرویز ملک زادہ بھی تھا۔ ہم زینے سے اتر رہے تھے، ایک پرانے دوست انجم ملیح آبادی ان کے پاس جاتے ہوئے ملے۔ انہوں نے پوچھا کیا حال ہے، میں نے کہا زیادہ سے زیادہ ''شب درمیاں'' تک کی کہانی ہے۔ نیچے ڈاکٹر عثمان کوثر مل گئے، بولے کیا آپ عرفان صدیقی کو دیکھنے آئے ہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہنسنے لگے صبح مشکل سے ہوسکے گی۔ میں سیدھا صحافت کے دفتر پہنچا۔ امان عباس مل گئے۔ صورت حال پر گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ موبائل کی گھنٹی بجی اور ایک روتی اور سسکتی ہوئی آواز نے یہ خبر دی کہ کہانی ختم ہوگئی۔ اور پھر اس کے بعد وہی ہوا جو عموماً ہوتا ہے۔ ہم امان عباس کے ساتھ میڈیکل یونیورسٹی پہنچے۔ انکے حسدِ خاکی کو ان کے اعزوان کے گھر

لائے اور دوسرے دن نماز جمعہ کے بعد ان کی تدفین ڈالی گنج کے قبرستان میں عمل میں آئی۔
پسماندگان میں ایک بیوہ ایک بیٹا اور چار بیٹیوں کے علاوہ انہوں نے کینوس، شب درمیاں، سات سموات، ہوائے دشت ماریہ، عشق نامہ کے علاوہ کالی داس کا ترجمہ، مالوی کا اگنی منتر اور متفرق نثری تحریریں چھوڑیں۔

عمر میں وہ مجھ سے کم وبیش آٹھ برس چھوٹے تھے مگر تہذیبی رویوں میں رکھ رکھاؤ تھا اور خود کو اتنا لیے دیے رہتے تھے کہ بھی 'تم' کہنے کی ہمت مجھ میں نہ ہوئی۔ ایک دوسرے کے گھر پر آنا جانا تو کم ہوا مگر گھر کے باہر خوب خوب ملے۔ لکھنؤ کی جن سڑکوں پر مجاز، ناشاد ناکارد پھرا کرتے تھے ہم نے اکثر رت جگے کیے ہیں۔ طے شدہ پروگرام کے تحت میں روزنامہ صحافت کے دفتر پہنچا، وہ اداریہ لکھنے سے فارغ ہوئے امان عباس نے چائے منگائی، اپنی سگریٹ کے پیسے عرفان نے خود دیے، ظہر خاں آ گئے، تھوڑی دیر تک گپ شپ ہوئی، رات گیارہ بجے طے ہو گیا کہ کھانا ہوٹل میں کھایا جائے گا۔ سب کے سب نکل پڑے، کبھی ٹائمس آف انڈیا کے دفتر کے قریب، شاکاہاری اور کبھی ریس کلب کے پاس غیر شاکاہاری ہوٹلوں میں گئے۔ کھانا تو محض ایک بہانہ تھا، مقصد صرف سیر و تفریح اور انجمن آرائی میں تھوڑا سا وقت گذارنا ہوتا تھا۔ اخبار کے مالک امان عباس تو خیر عمر میں تو بہت چھوٹے تھے، ظہیر خاں وکیل جو ہم عمر ہی رہے ہونگے، کبھی یہ ہمت نہیں کر سکے کہ ان کے دائرہ احترام میں تھوڑی سی بے تکلفی برت لیں۔ دونوں کسی حد تک ان سے ڈرے اور سہمے ہی رہتے۔ عرفان کچھ کھلے تو مجھ سے کھلے۔ مگر وہ بھی اس وقت جب دونوں میں تھوڑی بہت تکرار ہوئی، مجھے اس رکشہ پر آگے جانا ہے۔ ان کا اصرار کہ وہ میرے منزل مقصود تک کا کرایہ ادا کریں گے۔ میرا انکار کہ مجھے آگے جانا ہے، میں کرایہ ادا کروں گا۔ کبھی وہ جیتے کبھی میں ہارا، کبھی میں جیتا اور کبھی وہ ہارے۔ اور یہ سلسلہ اکثر جاری رہا۔

ایک دن میرے ایک دوست سرِ راہ مل گئے۔ شام کا وقت تھا انہوں نے خبر دی کہ دریا

کے کنارے ایک نیا ریسٹورینٹ کھلا ہے، اچھے اچھے لوگ آتے ہیں۔ فضا بے حد خوشگوار رہتی ہے چلو وہیں چل کر کافی پیتے ہیں۔ میں ان کی کار پر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے ہمارا گذر بارہ دری کے جانب سے ہوا۔ میں نے ان سے کہا چلو صحافت کے دفتر میں دیکھ لیتے ہیں۔ اگر عرفان صدیقی ہوں تو ان کو بھی ساتھ لے لیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ ہم دونوں صحافت کے دفتر گئے، عرفان مل بھی گئے، ان کو بھی ساتھ لیا گیا، مگر اب وہ دریا کے کنارے والی فردوس تلاش شدہ کے بجائے حضرت گنج کے کافی ہاؤس میں لے گئے، اور وہیں ہماری ضیافت کی۔ عرفان سگریٹ لینے کے لیے باہر نکلے تو میں نے ان سے پوچھا 'تم نے تو دریا والے رستورنٹ میں چلنے کا ذکر کیا تھا، آخر وہاں کے بجائے یہاں کیوں آ گئے؟'' بولے'' یار! وہاں لڑکیاں وڑکیاں آتی ہیں، عرفان بھائی کے ساتھ اتنے Exposure کی ہمت نہیں ہوئی''۔

عرفان صدیقی اپنے تمام ملنے جلنے والوں کے ساتھ ایک ایسا 'باوقار احترام آمیز فاصلہ رکھتے تھے کہ کوئی ان کی ذاتیات میں دخل دینے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ میری ان کی کسی حد تک بے تکلفی اس زمانے میں ہوئی جب انکا دفتر اشوک مارگ پر منتقل ہوا۔ میں اس زمانے میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کا چیئر مین تھا اور دفتر کے بالکل سامنے اندرا بھون میں بیٹھا کرتا تھا۔ ہم ملنے کے لیے ایک دوسرے کے دفتر آتے جاتے رہتے تھے۔ دفتر میں چائے کا انتظام نہایت ہی نا معقول تھا۔ اس لیے ہم نے طے کیا کہ ہفتہ میں دو دن ہم ٹھیک ڈیڑھ بجے قریب کے ہی ''رنز'' ہوٹل میں ملا کریں گے۔ ہماری ان کی ملاقاتیں جو عرصے تک جاری رہیں، ہمارے درمیان قدرے بے تکلفی کا سبب بن گئیں۔ قدرے کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا اس لیے کہ انہوں نے اپنے بے تکلف ترین دوستوں کو بھی ایک خاص منزل تک ہی بے تکلف ہونے کی اجازت دی انہوں نے جو حد فاصل قائم کر رکھی تھی اس کے اندر داخل ہونے کی کسی میں بھی ہمت نہیں ہوئی اور چونکہ میں انکے مزاج کو سمجھتا تھا اس لیے میں

نے بھی بے تکلفی تو رکھی مگر اس حد تک جہاں تک وہ خود بے تکلف ہوئے اور شائد یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں اکثر اپنے اپنے جذب وشوق کو آسودہ کرنے کے لیے فرصت وفراغت کے کچھ لمحات نکال لیا کرتے۔عرفان صدیقی اپنے تعلقات میں حفظ مراتب کا بے حد خیال رکھتے تھے وہ اپنے خوردوں کو خورد اور بزرگوں کو بزرگ کا درجہ دیتے تھے۔

مجھے بھی اچھی طرح بدایوں کی ایک ادبی تقریب یاد ہے جس میں ہم دونوں ساتھ ساتھ ایک ہی کمرے میں ٹھہرے۔بغل کے کمرے میں بدایوں کے رہنے والے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لکچرر معروف شاعر اسعد بدایونی اپنی محفل تاؤ نوش کو آباد کیے ہوئے ہنگامہ پرور تھے۔میں نے ان سے کہا چلئے دیکھ آتے ہیں کیا ہنگامہ ہو رہا ہے۔مگر عرفان میرے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔''وہ میرا خورد اور ہم وطن ہے۔اگر میں وہاں گیا اور اس کو اس حالت میں دیکھا تو اسے شرمندگی ہوگی۔'' اور انہوں نے نہ صرف اسعد کے کمرے میں جانے سے احتراز کیا بلکہ مجھے بھی وہاں جانے سے روکا۔وہ ''لا ابالی پن'' جو عام طور پر اردو شعراء تصور کے ساتھ ابھرتا ہے اس کا کوئی تعلق عرفان صدیقی سے دور دور تک بھی نہیں تھا۔

عرفان صدیقی نے شعر ادب کی خدمت، ہمیشہ ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر کی۔انہیں اپنی صلاحیتوں پر اعتماد اور اپنے تخلیقی عمل پر بھروسہ تھا۔۔۔۔۔۔۔دینے والے اردو اداروں میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور کس طرح جوڑ توڑ، ساز باز اور چاپلوسی سے کام لیا جا رہا ہے۔اس سے وہ خاطر خواہ واقف تھے۔اپنے تہذیبی رویوں نے کبھی اس بات کی اجازت ہی نہیں دی کہ وہ حرفِ طلب یا حرفِ شکایت زبان پر لاتے۔انہوں نے ایک گزل میں کہا تھا۔

ہاں اہل زر کے پاس خزانے تو ہیں مگر

مولا کا یہ فقیر ضرورت کہاں سے لائے

ان کی اس افتادِ مزاج میں عشق رسولؐ اور محبت اہل بیت کا بڑا دخل تھا۔جس میں ان

کا قالب ڈھالا گیا تھا۔ یہ وہ خاندانی ترکہ تھا جوان کو اپنے اسلاف سے ملا تھا۔اور جو اردو شاعری کی روایات سے ہم آہنگ ہوکر ان کی بیشتر غزلوں میں ایک موج تہ نشیں بن گیا تھا۔ یہ محض شاعری کا ایک بہانہ نہ تھا بلکہ اسی عقیدے کی پختہ بنیادوں پر کھڑے ہوکر انہوں نے اپنی شخصیت اور اپنی شاعری دونوں کا نگار خانہ سجایا تھا۔انہوں نے کالیداس کی ''رتو سنگھار' کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے اور ''عشق نامہ'' بھی تخلیق کیا ہے وہ حسن کی اداؤں کی رمز شناس ، جمال دوست کے وصاف اور کاروبار شوق کے شارغ اور ترجمان بھی رہے ہیں۔مگر ان کا استعاراتی نظام جوجگہ جگہ ان کے کلام میں چمک جاتا ہے وہ وہی ہے جو اہل بیت اور کربلا کے حوالے سے ان کو ملا ہے۔

جب وہ سنجے گاندھی میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سے صحت یاب ہوکر نکلے تو ایک دن میں ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ان کے سبھی احباب کو معلوم تھا کہ یہ عارضی وقفہ ہے اس لیے کہ کینسر کے ریشوں کی موجودگی کی خبر سبھی کو مل چکی تھی ،مگر ان سے چھپائی گئی تھی۔ دورانِ علامت انہوں نے جو منقبت کے اشعار کہے تھے وہ مجھے سنائے۔ بھابھی بھی موجود تھیں۔ان کو سارا علم انکی علالت کے بارے میں تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دورانِ گفتگو انہوں نے بھابھی سے کہا تھا'' تم میرے لیے دعا کرو،اس لیے کہ تم امام زین العابدین کے خاندان کی ہو، تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی۔'' عرفان کچھ دنوں تک تو ٹھیک رہے، صحافت کے دفتر اور تقریبات میں آتے جاتے رہے۔نفیس غازی پوری کے بیٹے کی دعوت ولیمہ میں خاصے شاداں وفرحاں تھے۔شہر یار بھی آگئے تھے، مجھ سے بڑی دیر تک حسب معمول روشن اور چمکدار باتیں کرتے رہے۔مگر کچھ دنوں کے بعد اسی اتھاہ اور گہری بیہوشی میں میں نے ان کو میڈیکل یونیورسٹی میں دیکھا، جس میں کچھ ماہ پہلے سنجے گاندھی میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں دیکھ چکا تھا۔ اس بار وہ ہوش میں نہیں آئے اور ان کا ایک شعر سچ ثابت ہوا ۔

سار ی آوازوں کا انجام ہے چپ ہو جاتا
نعرۂ ہو ہے تو کیا، شور سلاسل ہے تو کیا

چراغ شب افسانہ بجھ چکا ہے۔ پیمانہ لبریز ہو کر چھلک چکا ہے۔اب ہمارے درمیان کوئی عرفان صدیقی نہیں ہے۔ شعرادب کی دنیا میں چاروں طرف دیکھتا ہوں، قرب و جوار میں کوئی ایسا نہیں نظر نہیں آرہا ہے جو اس کا بار اٹھانا تو درکنار اس کے کشکول فقیرانہ کا ہی بار اُٹھالے۔

(2004)

☆☆☆

عرفان صدیقی

شخصیت، سوانح اور شعری مزاج

.... سید محمد اشرف (دہلی/کولکتہ)

جب عرفان صاحب کی شادی ہوئی، میں پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا، کہانیوں کی کتابیں اور بچوں کے رسالے پڑھتا تھا لیکن شاعری سے کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ چوتھی کی رسم کے بعد جب وہ اپنی دلہن کو لینے آئے تو ہمارے گھران کی دعوت ہوئی اور گھر کی خواتین کے اصرار پر انہوں نے اپنی غزلیں سنائیں۔ اسی محفل میں یہ غزل بھی پڑھی اور ترنم سے پڑھی۔ یہ کسی مجموعے میں نہیں ہے ع

پھر بھی پاؤں میں وہی زنجیر رم ہے دوستو

جس دن وہ دولہا بن کر آئے تھے اور نکاح ہوا تھا، میں نے انہیں غور سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن جب وہ ترنم سے غزل پڑھ رہے تھے تب میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ اپنے گھر میں کسی غیر مرد کو ترنم سے غزل پڑھتے دیکھنا میرے لیے حیرانی کا مرحلہ تھا۔ میری والدہ مرحومہ دلگیر مارہروی کی غزلیں اکثر ان کی نواسیوں سے اصرار کر کے سنتی تھیں اور میرے کانوں کو ان نواسیوں کی آواز کی عادت تھی۔ لیکن ایک مرد گھر میں چاندنی پر بیٹھ کر ترنم میں غزل پڑھے وہ عجیب سا لگا۔ کسی نے اس دن بتایا کہ یہ صاحب شاعر بھی ہیں اور خود اپنی غزلیں پڑھ رہے ہیں۔ میرے بچپن کے ذہن کے لیے یہ بھی ایک حیران کن بات تھی کہ ایک انسان دولہا ہو کر

شاعری بھی کر سکتا ہے۔

شادی کے بعد ان کا مارہرہ آنا جانا اکثر ہوتا تھا۔ ان کی پوسٹنگ دلی میں ہوتی تھی یا لکھنؤ میں۔ میرے دادا سید آلِ عبا (حضرت آوارہ) عرفان صاحب سے دیر تک گفتگو کرتے رہتے تھے۔ میرے والد محترم اکثر عرفان صاحب سے فارسی شاعری یا امام احمد رضا قدس سرہٗ کی نعتیہ شاعری پر گفتگو کرتے تھے۔ اس بات سے میں بہت متاثر ہوتا تھا کہ کوئی شخص ایسا بھی ہے جو میرے دادا اور والد دونوں سے اردو اور فارسی کے شاعروں کے متعلق بات بھی کر سکتا ہے اور ان کے اشعار بھی سنا سکتا ہے۔ سات آٹھ سال کے بچے کا خیال تھا کہ شاعری پر صرف اس کے بزرگ ہی گفتگو کر سکتے ہیں دوسرا کوئی نہیں۔

مارہرہ میں وہ اپنی سسرال کے گھر میں لیٹے بیٹھے ابن صفی کی 'جاسوسی دنیا' کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ میں اب کچھ بڑا ہو گیا تھا اور ابن صفی کی کتابوں کا شوق ہم دونوں میں مشترک تھا۔ لیکن ابھی وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ وہ مجھے اپنے اشعار سنائیں۔ ممکن ہے اس زمانے میں وہ کثرت سے اشعار نہ کہتے ہوں۔ مارہرہ میں ان کی ایک مصروفیت اور بھی تھی، یعنی شکار، وہ میرے دادا اور چچا کے ساتھ شکار کو جاتے اور کم چوڑی نہر (بمبے) میں تیر تیر کے نہاتے بھی تھے۔

میں ۱۹۷۴ء میں علی گڑھ کا طالب علم تھا اور اسی سال جولائی میں میرے بڑے ابا سید العلماء سید شاہ آلِ مصطفیٰ میاں کا وصال ہوا۔ یہ میرے خاندان کیلئے بہت بڑا سانحہ تھا۔ عرفان صاحب ان کے حقیقی ہم زلف تھے اور ان کی اہلیہ کی پرورش میرے بڑے ابا کے گھر میں ہی ہوئی تھی۔ وہ پہلا موقعہ تھا جب سوگواروں کے رخصت ہونے کے بعد خانقاہ کی چوک میں، عشا کے بعد، میرا ہاتھ پکڑ کر، ٹہل ٹہل کر انہوں نے وہ اشعار سنائے جو بہت پر درد تھے۔ اس دن پہلی مرتبہ میں ان کی شاعری سے بہت متاثر ہوا۔ اس سے پہلے مجھے متاثر ہونے کا کوئی

خاص موقعہ بھی نہیں ملا تھا کہ رسائل میں ان کا کلام شاید نہ کے برابر چھپتا ہو۔ وہ خطوں میں اپنی غزلیں لکھ کر بھیجتے تھے اور میں علی گڑھ کے دوستوں آشفتہ چنگیزی، مہتاب حیدر نقوی، فرحت احساس، اسعد بدایونی اور منظور ہاشمی کو سنایا کرتا۔ وہ علی گڑھ نہیں آتے تھے لیکن ان کا کلام علی گڑھ کے طالب علم شاعروں میں بہت مقبول ہو چکا تھا۔

جب ۱۹۷۸ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''کینوس'' شائع ہوا تو دھوم مچ گئی۔ ڈاکٹر ابن فرید، فرحت احساس، اور منظور ہاشمی نے ان پر مضامین لکھے جو ''خیر و خبر'' اور ''الفاظ'' میں شائع ہوئے۔ میں یونیورسٹی لٹریری کلب کا سکریٹری تھا، عرفان صاحب کے مجموعۂ کلام پر ایک بہت بڑے جلسے کا اہتمام کیا جو ایک دوست کی اچانک موت کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا۔

میں جب اپنے ننہال سیتاپور جاتا تو کسی نہ کسی بہانے سے لکھنؤ بھی پہنچ جاتا۔ شروع شروع میں وہ مولوی گنج میں ایک بیکری کے پاس رہتے تھے۔ پھر جلد ہی انہوں نے اپنی رہائش لاٹ کلن کے قریب گولہ گنج میں کرلی۔ ان کا آفس ''بسنت'' سنیما کی اوپری منزل میں تھا اور اس آفس کی باہری گیلری بہت چوڑی تھی جہاں سے حضرت گنج کی رونق صاف نظر آتی تھی۔ وہ ان رونقوں سے بے نیاز اپنے دفتری کام میں لگے رہتے۔ دفتری کام میں ان کی لیاقت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ جب کام پورا ہو جاتا تو اس چوڑی گیلری میں ٹہل ٹہل کر مشق سخن کرتے اور کاغذ کی چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر مہین تحریر میں قلمبند کرتے جاتے۔

۱۹۸۱ء میں میرا انتخاب سول سروس میں ہو گیا اور ۱۹۸۲ء میں On The Job Training کے لئے میری تعیناتی لکھنؤ میں کی گئی۔ عرفان صاحب کا اصرار تھا کہ جب تک باقاعدہ رہائش نہ ملے میں ان کے ساتھ ہی رہوں، میرا دل بھی یہی چاہتا تھا، میں ان کے ساتھ کئی ہفتے رہا، پھر مجھے موتی محل ہاسٹل میں جگہ مل گئی لیکن اکثر شامیں ان کے ساتھ ہی

گزرتیں، میرا دفتر اشوک روڈ پر تھا۔ میں وہاں سے P.I.B آجاتا اور پھر ہم دونوں یہاں سے گولہ گنج کے مکان پر جاتے۔ واپسی میں وہ عابد سہیل اور والی آسی صاحبان سے علیک سلیک کرتے ہوئے جاتے۔ کبھی کبھی صحافت کے دفتر پر رک کر کوئی تحریر لکھتے اور پھر ہم دونوں وہیں قریب کی ایک دوکان پر جا کر بالائی خریدتے۔ بالائی انہیں بہت پسند تھی مجھے یاد ہے ایک بار انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کی والدہ بچپن اور لڑکپن میں ان کی کھانسی کا علاج بالائی سے کرتی تھیں۔ بالائی لے کر جب ہم گھر میں داخل ہوتے تو بی (اہلیہ عرفان صدیقی) کھانے پر ہمارا انتظار کر رہی ہوتی تھیں۔ گولہ گنج میں ان کا مکان رقبے میں کم لیکن مکانیت کے اعتبار سے خوب کافی تھا۔ سب سے اوپر کی منزل پر باورچی خانہ تھا اور اس کے آگے ٹیرس، رات کے کھانے کے بعد وہ اس ٹیرس پر اس کام کو مکمل کرتے جو دن میں دفتر کی چوڑی گیلری میں شروع کیا تھا۔ کبھی کبھی سرشاری کے عالم میں سرگوشی کے انداز میں وہ اپنے تازہ اشعار گنگناتے بھی تھے۔ میں اسی رات یا دوسرے دن ان کی وہ غزل سن لیتا۔ کسی کسی دن وہ دو تین غزلیں تسلسل کے ساتھ کہہ لیتے۔

وہ بے تحاشہ سگریٹ پیتے تھے۔ خود اقبال کرتے تھے کہ میں روزانہ دو پیکٹ سگریٹ پیتا ہوں۔ ان کی اہلیہ ان کی غیر موجودگی میں مجھے مطلع کرتیں کہ تمہارے پھوپھا جان نے آدھی تعداد بتائی ہے۔ وِلس فلٹر نیوی کٹ ان کا پسندیدہ برانڈ تھا۔

عرفان صدیقی اپنی اہلیہ کی بے حد دلداری کرتے تھے اور بچوں کو بے پناہ چاہتے تھے۔ وہ اس انداز سے بچوں کو چاہتے تھے کہ اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ کس بچے کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ بڑی بیٹی مینا کا نام انہوں نے حضرت شاہ مینا کی مناسبت سے رکھا تھا۔ سب بچوں میں مینا ہی ان کی جناب میں سب سے زیادہ شوخ تھی اور باقاعدہ ان کے اشعار پر داد دیتی تھی۔ ان کی اہلیہ کو اپنے مائیکے سے ہی کافی ستھرا ادبی ذوق ملا تھا۔ عرفان صاحب سے شادی

ہونے کے بعد اس ذوق کو اور جلا ملی۔ انہیں اپنے شوہر کے لاتعداد اشعار یاد ہیں۔ عرفان صاحب کے دادا خوش گو شاعر تھے اور شاعری میں ان کے استاد عرفان صاحب کی اہلیہ کے بزرگ حضرت احسن مارہروی تھے۔ عموماً گھر میں ذاتی گفتگو کے دوران اپنی والدہ کو کسی نہ کسی حوالے سے ضرور یاد کرتے تھے۔ جب وہ حیات تھیں تب بھی اسی عادت پر عمل تھا۔ ماں سے گہرے تعلق کا ثبوت ان کی شاعری سے بھی ملتا ہے۔

عرفان صدیقی بدایوں شریف کے اس خاندان کے فرد تھے جس میں ہر پیڑھی میں یقینی طور پر کوئی نہ کوئی فرد شاعر ہوتا تھا۔ عرفان صاحب کے والد بھی شاعر تھے اور بڑے بھائی نیاز بدایونی بھی شاعر تھے جو تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ دونوں بہت خوش گو شاعر تھے۔

تصوف کے سلسلے کے اعتبار سے مارہرہ اور بدایوں میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ اہل بدایوں اس رشتے کو ہمیشہ سر آنکھوں پر رکھتے آئے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی سوانح ''خواب باقی ہیں'' میں پہلے ہی پیراگراف میں تحریر کیا کہ ان کا نام مارہرہ مطہرہ کے مشہور و معروف بزرگ حضرت سید آل احمد اچھے میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مناسبت سے آل احمد رکھا گیا۔ عرفان صاحب کے اجداد کا مارہرہ کے سادات سے یہ رشتۂ عقیدت کئی صدیوں پر محیط ہے اور اس رشتے پر اصحاب قلم نے رسالے اور کتابیں لکھی ہیں۔ عرفان صاحب کے اجداد نے مارہرہ کے بزرگوں کے بارے میں بہت لکھا اور یہ غالباً پہلی بار ہوا ہے کہ ہمارے خاندان کا کوئی فرد ان کے خاندان کے کسی فرد کے بارے میں لکھ رہا ہے۔ عرفان صاحب میں کوٹ کوٹ کر بدایونیت بھری ہوئی تھی۔ وضع داری، تمکنت، خوف خدا، الفت اولیاء اللہ اور علم اور اہل علم سے لگاؤ، کربلا کے استعارے پر مشتمل اشعار کی بنیاد بدایوں کی مٹی میں تلاش کی جانی چاہیے۔ اس موضوع پر کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن ع

رات تھوڑی ہے اور سوانگ بہت

عرفان صاحب صبیح چہرے اور اوسط قد و قامت کے مالک تھے۔ پتلے پتلے ہونٹ، سگریٹ کے عادی ہونے کے باوجود صاف ستھرے برابر کے دانت، ارسٹوکریٹک سانچے کی ناک اور کف دست اور کلائیاں گھنے رونگٹوں سے پر۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے قدرے سرعت کے ساتھ چلتے تھے۔ انگلیوں یا ہونٹوں میں اکثر سگریٹ دبی رہتی تھی۔ گفتگو کرتے وقت ان کے چہرے پر اضطراب کی سی کیفیت ہوتی تھی۔ وہ بہت سلیس اور شستہ گفتگو کرتے تھے۔ اگر کوئی ان کی گفتگو ٹیپ کر کے معرض تحریر میں لے آتا تو بغیر اڈیٹنگ کے کتاب میں چھاپی جا سکتی تھی۔ عموماً وہ صرف ناگزیر الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔ یہ خوبی میں نے بہت کم انسانوں میں دیکھی ہے۔ گھر پر لکھنوی کرتا اور پتلی مہری کا پاجامہ زیب تن رہتا۔ گھر کے باہر قمیص پتلون اور آخری پندرہ بیس برس سفاری سوٹ پہنتے تھے۔ کوٹ پہنتے تو ٹائی بھی لگاتے۔ میں نے زندگی بھر انہیں ایک ہی کٹ کے جوتے پہنے دیکھا جنہیں ہم لافرشو کہتے ہیں اور جن میں تسمے نہیں ہوتے ہیں۔ وہ اونچی ایڑی کا جوتا نہیں پہنتے تھے۔ داب و آداب کے بہت قائل تھے۔ بڑوں کو واجب احترام دیتے تھے اور چھوٹوں کو خوردہ گیری کا موقعہ نہیں دیتے تھے۔ بے تکلف دوستوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ پروفیسر نیر مسعود سے گہرا تعلق خاطر ہونے کے باوجود دونوں کے درمیان ایک احترام آمیز پروٹوکول شامل رہتا تھا۔ اپنے چھوٹوں کو خوب وقت دیتے تھے۔ شعیب نظام، ندیم جائسی، شافع قدوائی ان میں سے چند نام ہیں۔ لیکن کچھ ہی برسوں میں خورد اپنی اپنی ذمے داریوں کی وجہ سے الگ الگ شہروں میں منتقل ہو گئے۔ ان کے بعد لکھنؤ میں ان کے خوردوں کی گدی کس نے سنبھالی، مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ البتہ ڈاکٹر ارشاد علی اور رحیم آباد ہاؤس کے طارق فیاض سے ان کا تعلق آخر عمر تک ایک سا رہا۔

عرفان صدیقی بے حد حساس طبیعت کے انسان تھے۔ گفتگو معاملات یا مراسلت میں اگر کسی سے تھوڑی سی بھی نامناسب بات سرزد ہو جائے تو وہ گہرا اثر لیتے تھے۔ کبھی گہری

خاموشی اور کبھی فصیح و بلیغ جملوں کے ذریعے اس بات کے ردعمل کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک بے نیاز اور خوش مزاج انسان تھے اور ان کی گفتگو سے محفل گرم رہتی تھی۔

میرا بارہا کا مشاہدہ ہے کہ وہ بڑوں بڑوں سے داب نہیں کھاتے تھے۔ علمی اور ادبی دنیا تو خیر۔ وہ سرکاری محکمے کے افسر اعلیٰ سے بھی اس طرح پیش آتے تھے کہ وہ خود کو نعوذ باللہ خدا نہ سمجھنے لگے۔ ان کے دفتر میں اگلا کمرہ ان کے افسر کا تھا۔ دن میں ایک دو بار اس کے پاس بھی جانا پڑتا تھا۔ اگر ملاقات لمبی ہوتی دیکھتے تو اجازت لے کر اس کے سامنے سگریٹ سلگا لیتے تھے۔ ان دنوں سرکاری دفاتر میں سگریٹ نوشی ممنوع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے عرفان صاحب کی گفتگو تو ایک طرف لہجے تک کو کبھی خوشامد آلود نہیں پایا۔

وہ اخبار بہت انہماک کے ساتھ پڑھتے تھے اور اس فن سے بخوبی واقف تھے کہ اخبار میں کیا پڑھنا چاہئے۔ غالباً ملازمت کی ضروریات نے انہیں یہ ہنر سکھا دیا تھا۔ وہ دن بھر میں پانچ چھے اخبار پڑھ لیتے تھے۔ انگریزی میں ان کی لیاقت زبردست تھی۔ انگریزی میں وہ بہت خوبصورت جملے لکھتے تھے اور کچھ اس انداز سے تحریر کرتے تھے کہ کوئی لفظ کم یا زائد نہیں محسوس ہوتا تھا۔ بعینہٖ یہی معاملہ اردو میں تھا۔ وہ بے تکان اسی خوبی کے ساتھ صفحات پر صفحات لکھتے چلے جاتے تھے۔ وہ بہت خوش خط تھے۔ انگریزی ہو یا اردو، ان کے الفاظ موتی کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کی گفتگو کا بھی یہی انداز تھا۔

مشاعروں میں ان کی شرکت کم ہوتی تھی، نشستوں میں زیادہ۔ اشعار پیش کرنے میں ڈرامائی پوز ہوتے تھے نہ تمہید۔ شعر کے پہلے مصرعے کو ہرگز دو مرتبہ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی تو ایک ہی مرتبہ پر اکتفا کر لیتے تھے۔ عموماً متفرق اشعار اور تازہ غزلیں سناتے تھے لیکن دو سے زیادہ نہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں یوم جمہوریہ کی شعری نشست سے جامعہ کے پروگراموں کا آغاز ہوتا تھا۔ وہ بھی مدعو تھے۔ ہم بھی موجود تھے۔ وہ دو

غزلیں پڑھ چکے تھے۔ میں نے ایک اور غزل کی فرمائش کی۔ تو مسکرا کر سامعین سے (جوان کو بہت دیر سننا چاہتے تھے) کہا۔ عزیزی اشرف نے غزل کی فرمائش کی ہے وہ میں ٹال نہیں سکتا۔ لیکن صرف قسم کھانے بھر کوان کی فرمائش پوری کروں گا۔ بس اس غزل کا ایک شعر پڑھا اور اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گئے۔

غالباً انتقال سے دو برس پہلے کی بات ہے کہ علی گڑھ میں یوم جمہوریہ یا یوم آزادی کے مشاعرے میں مہمان خصوصی کے طور پر مدعو ہوئے۔ مشاعرے کے بعد ڈنر ہوا اور دیر تک باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ علی گڑھ کے ادیبوں شاعروں نے فرمائش کی ہم لوگ چائے پینے کبھی کبھی اسٹیشن بھی جاتے ہیں اور وہاں ایک قدیم دوکان ہے وہاں پوری ترکاری بھی کھاتے ہیں۔ غرض یہ کہ کار، رکشہ اور سائیکل پر یہ قافلہ اسٹیشن کے پاس پوری والے کی دوکان پر پہنچا اور ہم لوگوں نے ڈنر کھانے کے بعد بھی سیر ہو کر پوری ترکاری کھائی اور چائے کے کئی دور چلے۔ اس دن عرفان صدیقی طلباء کی طرح ہشاش بشاش اور شوخ تھے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی تھی لیکن لگتا تھا جیسے وہ اسی جامعہ کے دور زریں کے طالب علم رہے ہوں۔

☆

عرفان صدیقی کی شاعری میں سوانحی اِشارے کثرت سے ملتے ہیں۔ تفصیل سے پہلے کچھ تمہید ضروری ہے۔

عرفان صدیقی کی شاعری پر لکھنے والے مجھ سے بہتر بیشتر اصحاب قلم ہیں اور تھے ان میں سے کچھ گذارش کر کے میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں مضمون لکھوائے تھے جیسے فرحت احساس، ابن فرید، منظور ہاشمی، خدا معلوم نمبر کے لئے وہ مضامین فراہم ہو سکے کہ نہیں، وہ سبھی قیمتی مضمون تھے کسی بھی ریا اور مصلحت سے پاک۔

میں لڑکپن سے عرفان صدیقی کا سامع اور پھر قاری رہا ہوں۔ میں ان کے بیسیوں

خطوط کا مکتوب الیہ ہوں اور وہ میرے ذوق وشوق کے مدنظر اپنے ہر خط میں تین چار غزلیں لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے۔

کینوس ان کا پہلا مجموعۂ کلام جب شائع ہوا ان دنوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لٹریری کلب کا سکریٹری تھا، بمشکل تمام ان کو راضی کیا تھا کہ آپ کے مجموعہ کی رونمائی کی ایک تقریب منعقد کی جارہی ہے آپ بھی تشریف لائیں ان کا آنا بھی طے ہوگیا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل ہوگئی تھیں۔ کنیڈی ہال کے ایک وسیع کمرے میں جلسہ کا اہتمام تھا یا شاید آرٹ فیکلٹی لاؤنج میں۔ ان کی غزلیں یونیورسٹی کی گلوکار طالبات نے ترنم سے پڑھنے کے لئے تیار کرلی تھی مضامین بھی لکھ لئے گئے تھے کہ چند ناگزیر اسباب کی بنا پر وہ جلسہ نہیں ہوسکا۔

۲۰۰۴ء میں لگ بھگ چھبیس سال بعد میں ایک بار پھر علی گڑھ میں تھا۔ عرفان صاحب کو غالب ایوارڈ ملا۔ دل چاہا کہ اس سلسلہ میں تہنیت کا ایک جلسہ علی گڑھ میں اور وہ بھی کنیڈی ہال کے اسٹیج پر منعقد کیا جائے، شعبۂ اردو کے نوجوان اساتذہ کے تعاون اور احمد مجتبیٰ صدیقی کی کوششوں سے ایک بار پھر جلسہ کی تیاری کی گئی اس بار عرفان صدیقی نے بہت اعتماد کے ساتھ شریک جلسہ ہونے کا وعدہ کیا لیکن جلسہ کے دن ان کے بیٹے فیضی کا فون آیا۔ ''بھائی جان! ڈاکٹروں نے سخت تاکید کی ہے کہ وہ بستر سے نہ اٹھیں۔'' ہم لوگ دل مسوس کر رہ گئے لیکن جلسہ کیا جو خوب دھوم دھام سے ہوا۔

جب کبھی وہ سسرال آتے اور شروع شروع میں اکثر آتے تھے تو مارہرہ شریف کی خانقاہ میں چوک کے اندر سڑک پر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ٹہلتے جاتے تھے اور شعر سناتے جاتے تھے۔ میں اس وقت ۱۳-۱۴ ربرس کا تھا وہ میرے پھوپھا تھے۔ اپنی اہلیہ یعنی میری پھوپھی سے اکثر کہتے اشو (میرے گھر کا نام) میرا دوست ہے جب میں سول سروس کے تحریری امتحان میں کامیاب ہوگیا تو انہوں نے انٹرویو کی تیاری کے لئے باریک تحریر میں لکھے ہوئے سولہ صفحات کا

خطبہ مجھے لکھا جو عالمی حالات اور ملکی معاملات کا اجمالی احاطہ خوب کرتا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے بہت فائدہ ہوا۔ وہ بہت عمدہ نثر لکھنے پر قادر تھے۔ ان کی ذاتی گفتگو میں بھی صرف ناگزیر الفاظ ہوتے تھے حشو وزائد نہیں کے برابر ہوتے تھے۔ ان کی زبان سے میں نے کسی کے لئے دشنام کا لفظ نہیں سنا۔ وہ ایک مکمل شریف انسان تھے۔ وضعداری اور شرافت کو اپنی آخری جائداد سمجھتے تھے۔ ان کی موجودگی میں ہلکی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

اسی شرافت کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے بارے میں بہت کم گفتگو کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے مختلف ادوار کا ذکر بھی بس کبھی کبھی اشارتاً کر دیا کرتے تھے غالباً صرف ایک جگہ ان کے قلم سے میں نے ان کی سوانح کا بے حد مختصر احوال پڑھا ہے۔

عجیب معاملہ ہے کہ گفتگو اور نثر میں انہوں نے جو چھپایا لاشعوری طور پر اپنی شاعری میں بیان کر دیا۔ بظاہر ایسا نہیں لگتا کہ غزل کا کوئی مخصوص مصرع یا شعر ان کی سوانح سے متعلق ہے لیکن بعد میں بوجوہ ان کے بہت سے معاملات سے واقف ہوں۔ میں نے ایک پھوہڑ سی کوشش کی ہے کہ ان کے کلیات ''دریا'' کی مدد سے ان کی زندگی کا ایک خاکہ مرتب کروں جس میں کچھ وہ معاملات بھی آ گئے ہیں جن کا اظہار وہ نثر میں نہیں کر سکتے تھے۔ بال بچوں دار انسان تھے محض شاعر ہی نہیں تھے۔ ممکن ہے قارئین عرفان صدیقی کو اس طرح بھی دیکھنا پسند کریں۔

ان کے مزاج میں وضع داری اور شرافت بے حد تھی وہ کبھی اوچھا پن کرنا تو دور کی بات اوچھی بات کہنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ حد تو یہ کہ کوئی ان کے سامنے ان کا شعر بآواز بلند پڑھتا تو وہ خفیف ہو جاتے تھے۔ مزاج کی اس خاکساری وانکساری نے انہیں تصوف کی روایت کے بہت قریب کر دیا تھا، کبھی کبھی یہ تصوف قلندرانہ رنگ بھی اختیار کر لیتا تھا، اس ضمن میں انہوں نے جتنی اصطلاحات استعمال کی ہیں معاصر شاعری ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔

مٹی، بوریا، خریطہ، دست، بیعت، در، دروازہ، کشکول، قلندر، بساط، ابدال۔

اس موضوع پر طویل گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے ان کا عشق کچھ مختلف انداز کا تھا۔ ان کے دوسرے طور طریقے بھی کچھ الگ تھے۔ ؎

کچھ تو ہو جو تجھے ممتاز کرے اوروں سے

جان لینے کا ہنر ہو کہ مسیحائی ہو

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی غزل میں عرصۂ دراز کے بعد محبوب کی جنس کا تعین نظر آتا ہے۔ بانو شہر کا ذکر آتا ہے۔ سر برہنہ بیبیوں کا ذکر آتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو اردو شاعری کے عام محبوب سے مختلف دکھاتے ہیں۔ ان کے عشق کی تگ و تاز کا میدان بھی اردو غزل کی عشقیہ شاعری کے مقابل میں جغرافیائی طور پر مختلف ہے۔ اشعار سے بیسوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن اس وقت ہم ان کی شاعری میں ان کے سوانحی اشارات پر گفتگو کریں گے۔

بدایوں فرد فرید پیا نظام الدین اولیا کا بدایوں، صوبے دار شمس الدین التمش کا بدایوں، مؤرخ عبد القادر بدایونی کا بدایوں، سلطان العارفین اور شاہ ولایت جیسے تاجداران ولایت کا بدایوں، شاہ فضل رسول اور حضرت تاج الفحول جیسے بادشاہان علم و معرفت کا بدایوں، فانی، شکیل، آل احمد سرور، سردار جعفری، جیلانی بانو اور اسعد بدایونی جیسے اصحاب قلم کا بدایوں اور عرفان صدیقی کا بدایوں، امیر خسرو اس محترم شہر کی خاک کو اپنے پیر و مرشد کی نسبت سے سرمۂ چشم کے استعارے میں بیان کرتے ہیں۔ ع

بجائے سرمہ در دیدہ کشم خاک بداؤں را

مصحفی اپنے محبوب کی گلی کو شہدائے کرام کی کثرت کے سبب بدایوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔

شمالی ہند کی ریاست اتر پردیش کے خطہ روہیل کھنڈ میں گنگا کے مشرق میں یہ وہ محترم بستی ہے جو پچھلے ایک ہزار سال سے اصحاب علم و معرفت سے خراج عقیدت وصول کر رہی

ہے۔ مغرب کی طرف بڑھیں تو سوروں نام کا تیرتھ استھان ہے جہاں تلسی داس نے رام چرتر مانس لکھی اور تھوڑا آگے بڑھے تو ضلع ایٹہ میں پٹیالی نام کا قصبہ ہے جو خسرو کی جائے پیدائش سے مشرف ہے۔ (اب یہ بستی نومولود ضلع کاشی رام نگر میں ہے)۔

جب انسان پرندوں کی طرح آزاد تھے اور سرحدوں پر رکنا نہیں جانتے تھے تو اسی خطہ کی طرف بلخ، کرمان، یمن، بخارا، سنجر، فرشور یعنی عرب، ایران اور سنٹرل ایشیا کے متعدد علاقوں سے قافلے کے قافلے یہاں پہنچے اور اپنے ساتھ زبان، تہذیب وتمدن اور عقیدوں کے خزانے بھی لائے۔

دیکھنا جامع شمسی میں ستوں ہیں کتنے
ایک ہی ذوق ہے اسپین سے دو آبے تک

صرف دو مصرعوں میں قدیم بدایوں کا مرقع اس طرح کھینچا گیا۔

معرکے رزم گہیں، کشف کرامات سلوک
مدرسے، خانقاہیں، جذب، مقامات، سماع

عرفان صدیقی ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ چھ سات برس کے بچے کے ذہن کے پردے پر اس وقت اس قسم کی تصویروں کے خطوط ایک دوسرے کو کاٹ رہے ہوں گے۔

آسمانوں میں جو دن رات یہ اڑتے ہیں جہاز/ اتحادی ہیں کہ نازی ہیں کہ فسطائی ہیں/ آل یعقوب یہ رات بہت بھاری ہے/ (ہٹلر کے گیس چمبر اور یہودیوں کی نسل کشی) پھر اتحادی فوجوں کے ممالک کا وعدہ۔ ع

ہم تمہاری یہ امانت تمہیں لوٹا دیں گے

اہل فلسطین پر خود ان کے ملک کی زمین تنگ کر دی گئی۔ ع

اور مظلوم ستم پیشہ بھی ہو جاتے ہیں

اور اسی زمانے میں وہ معرکہ بھی ہوا جسے تقسیم ہند کہتے ہیں۔ عرفان صدیقی کے والد مولوی سلمان احمد ہلالی کے اجداد کو حاکمان وقت نے اوقاف کی تولیت کا اعزاز دیا تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک وکیل، ذوق وشوق کے اعتبار سے شاعر اور فطرتاً گوشہ نشین تھے۔ ان کی والدہ رابعہ خاتون تعلیم یافتہ خاتون تھیں جو شعر کہنے پر قادر تھیں، عرفان صاحب کے دو بھائی اور تھے بڑے بھائی نیاز بدایونی مرحوم اور چھوٹے بھائی اشفاق احمد صدیقی جو بریلی میں بود و باش رکھتے ہیں۔ چھوٹے بھائی تو تقسیم ہند کے وقت بہت کم عمر رہے ہوں گے۔ بمشکل دو سال کے۔ گھر کے بقیہ افراد یعنی والد، والدہ، بڑے بھائی اور عرفان صدیقی کے درمیان اس وقت کس طرح کے مکالمے ہوتے ہوں گے اس کی ایک خفیف سی جھلک ''سفر کی زنجیر'' نام کی نظم میں نظر آتی ہے جو ان کے پہلے مجموعہ کلام کینوس میں شائع ہوئی تھی۔ شریف متوسط طبقے کے وکیل مولوی سلمان احمد ہلالی کے مکان کا صحن کچا تھا۔ اندر دالان در دالان تھے۔ کچے صحن میں ایک طرف کیاری بنا کر پھول اگائے گئے تھے اور بیلیں لگائی گئیں تھیں۔ بڑا بیٹا نیاز احمد مملکت خداداد کی نادیدہ بستیوں کے خواب دیکھ رہا تھا۔ والدین اپنے جگر کے ٹکڑے کو ایک اجنبی ملک کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے کہ خدشہ تھا کہ بڑا بیٹا جس دشت میں شوق کے گھوڑے دوڑا رہا ہے، اس کا راستہ تصویر کی آنکھ کی نگاہ سے بھی زیادہ تنگ ہے (غالب) لیکن اس عمر کا شوق تو ایک بے مہار اونٹ کی طرح ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی تھا کہ انہیں وطن عزیز میں مستقبل کے لئے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بڑے بھائی کی ہجرت نے عرفان صدیقی کے کچے ذہن میں نئے تلازے داخل کئے وہ ان کی شاعری کی اساس بن گئے۔ تقسیم کا ہنگامہ، قتل و غارت گری، ہجر و یاس، رات، انتظار، فرقت، گلی، راستے، دریا، وقت نیم شب، گھر کے اندر لٹ جانا اور گھر کے باہر بچ جانا، ماں کے دل کی حالت، باپ کی پر تحمل خاموشی، ان تمام معاملات پر عرفان صدیقی نے بے شمار شعر کہے ہیں لیکن اس وقت وہ اشعار موضوع بحث نہیں ہیں اس وقت ہمیں ان مکالمات سے

سروکار ہے جوان چار افراد کے درمیان جاری تھے۔

مولوی سلمان احمد ہلالی (والد): ے

آگے پڑھنے کے لئے بانڈ الگ کرنے ہیں

علم صدیوں سے وراثت ہے تمہارے گھر کی

یعنی اے میرے فرزند کبیر تم اپنی تعلیم کے اخراجات کی فکر نہ کرو خاتمۂ زمیں داری پر جو بانڈ حکومت نے دئے تھے ان میں سے حسب ضرورت کچھ بانڈ تمہاری تعلیم کے لئے الگ رکھ دوں گا۔

نیاز احمد صدیقی: ع

میں سمجھتا ہوں کہ روشن ہے وہاں مستقبل

عرفان صدیقی: ع

کیا کبھی حال میں ہم لوگ نہیں جی سکتے

عرفان صدیقی کو اپنے بچپن میں زمانہ حال بہت اچھا لگتا ہوگا۔ کیونکہ جھلستی ہوئی دوپہر میں وہ گھر سے نکل جاتے تھے اور نزدیک ہی میں حضرت ابراہیم شہید کے مزار کے احاطہ میں پیڑی کے درخت سے گرنے والی پیڑیاں بین بین کر ہم عمروں کے ساتھ کھاتے تھے۔ وہیں قریب میں ایک طاق بھی تھا جسے مقامی لوگ جنات کا طاق کہتے تھے اور اس میں چراغ روشن کرتے تھے۔ ان کے لئے سنسان رات میں جنات کے طاق میں چراغ روشن دیکھنا ایک مبہوت کن منظر ہوتا ہوگا۔ مغرب کے بعد جب وہ گھر کے باہر گلیوں میں نکلتے ہوں گے تو والدہ ان سے کہتی تھیں۔

تم کبھی شب میں ادھر سے نہ گزرنا کہ وہاں

صف بہ صف تند فرس سبز علم اڑتے ہیں

بچپن میں اس طرح کا خوف جس میں کسی مافوق الفطرت شئے کا ذکر ہو بچوں کو ڈراتا

بھی ہے اور ایک سہرن بھرا آنند بھی دیتا ہے کہ ہم ان مافوق الفطرت ہستیوں کے اتنے قریب زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے بچپن کا وہ ''حال'' جس میں وہ جینے کی تمنا کرتے ہیں کئی اور باتوں سے بھی عبارت تھا۔ اماں کہتی تھیں۔

درگہ شاہ ولایت میں جو اک زینہ ہے
تم وہاں جا کے پکارو کسی گم گشتہ کو
سالہا سال کے کھوئے ہوئے لوٹ آتے ہیں
شرط یہ ہے کہ صداؤں کا جواب آ جائے

ان حکایتوں کو سننے کے علاوہ ان کا بچپن بہ نفس نفیس بدایوں سے گزرنے والی گنگا کی معاون ندی، سوتھ، کے کنارے زرد کھجوروں کی قطاروں سے آگے ریتی میں تعزیے دفن کئے جانے کے موقعہ پر بھی شریک ہوتا تھا (اور یہیں سے عرفان صدیقی کی آگے آنے والی زندگی میں شعر کہنے کے لئے کربلا کا استعارہ حاصل ہوا ہوگا)۔

مذکورہ بالا تمام باتوں کے باوصف انہیں اپنے بچپن کا 'حال' اچھا لگتا تھا اس لئے چپکے سے بول پڑتے تھے۔

کیا کبھی حال میں ہم لوگ نہیں جی سکتے

نیاز احمد بدایونی (موضوع بدلنے کی خاطر):

پھول کا تازہ شمارہ نہیں آیا اب تک
تاج صاحب کی کہانی تو بہت اچھی تھی

وہ یہ پیغام بھی دے رہے ہیں کہ دیکھ لو۔ لڑائی دنگوں کی وجہ سے پھول جیسا دلکش رسالہ بھی اس دفعہ نہیں آسکا۔ اب یہاں رہیں گے تو تاج صاحب کی اچھی اچھی کہانیاں بھی نہیں پڑھ سکیں گے۔ عرفان صدیقی بڑے بھائی کی منطقی باتیں سن کر اور تقریباً پسپا ہو کر اب

ایک اور طریقے سے انہیں ہندوستان میں رہنے کے لئے راغب کر رہے ہیں اور اپنے والد سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ ''اس دفعہ چھٹی میں زمین داری والے قصبے بناور میں جا کر تازہ ہولے (بھنے ہوئے کچے چنے) کھائیں گے کہ وہ بے حد مزیدار ہوتے ہیں۔

اب کے ہم چھٹی میں جائیں گے بناور ابا
تازہ ہولوں کا مزہ اور ہی کچھ ہوتا ہے

والد کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ وطن عزیز نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کے پیر خانے مارہرہ شریف سے ایک ہدایت کا اعلان ہوا کہ اپنے وطن ہندوستان میں رہنا ہے کہ یہاں ہمارے صدیوں پرانے آثار موجود ہیں۔ وکیل صاحب یہ سب سوچ ہی رہے ہیں کہ انہیں خیال آتا ہے کہ پچھلی بساط تہہ کر دی گئی ہے۔ کل ضلع کلکٹر کی وداعی دعوت ہے۔ ع

بار نبلیٹ کو کل دے گی وداعی دعوت

عرفان صدیقی: ؎

کیا مشن کے نئے فادر بھی چلے جائیں گے
وہ تو بیچارے کسی کو بھی نہیں مارتے ہیں

نیاز احمد صدیقی پھر اپنے موضوع کی طرف لانے کی کوشش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ آج کل اخباروں میں کیسی روح فرسا باتیں لکھی جا رہی ہیں۔ ع

گھوش نے آج کے اخبار میں کیا لکھا ہے

والد صاحب اس بات سے صرف نظر کرتے ہیں لیکن اخبار ہی کی ایک خبر بتاتے ہیں: ؎

جشن آزادی جمہور منانے کے لئے
کل سے اسکول میں تعطیل رہے گی بچو!

اور پھر اچانک ہی انہیں خیال آتا ہے (ڈور جب بیچ سے کٹ جائے تو کیا ہوتا

ہے) تبھی ایک اور ننھا سا کردار ان مکالمات میں داخل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایسے خاندانوں میں ہوتا ہے کہ جہاں سب لوگ گفتگو کر رہے ہوں وہیں کوئی عم زاد، ماموں زاد یا پھوپھی زاد بچی بھی موجود ہوتی ہے۔ وہ فرفر اپنے گھر کا احوال بیان کرنے لگتی ہے۔ اس کے والد پہلے ہی نقل مکانی کر چکے ہیں۔ ؎

آج ہی پاپا کا لاہور سے خط آیا ہے
ہم یہی بیل وہاں لان میں لگوائیں گے
ہم بھی کل شام گاڑی سے چلے جائیں گے

نیاز احمد صدیقی اب موضوع کو یکسر بدل دیتے ہیں اور چھوٹے بھائی عرفان صدیقی کو دالان کے اندر کمرے میں لے جا کر کہتے ہیں۔ ع

آج کالج کے ڈرامے میں بہت لطف آیا

(لیکن) ؎

تم مرے کمرے میں کیوں چھوتے ہو کاغذ میرے
بزم اقبال کے جلسے کی یہ تیاری ہے

چھوٹا بھائی ان باتوں کو سنتا تو ضرور ہے لیکن اس وقت اس کی فکر ایک اور جانب نگراں ہے کہ بھائی صاحب کے کاغذات کے درمیان ایک من موہنی سی شکل کی لڑکی کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ لڑکی کون ہے؟ ع

جانے تصویر وہ کس کی ہے مگر پیاری ہے

بڑے بھائی مصمم ارادہ کر چکے تھے اس لئے وہ سرحد پار جانے سے پہلے اپنے دوستوں کے ساتھ خوب وقت گزارتے ہیں۔ ع

رات کو دیر تلک حلقۂ یاراں میں خروش

جب واپس آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ممتا کی ماری نے اب تک ان کے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا وہ الٹا ماں ہی کو موردالزام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ؎

آپ نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا افسوس
آپ اس طرح تو کمزور بنادیں گی مجھے

ماں کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں دیکھ کر وہ ایک بہانہ کرتے ہیں۔ ماں کی تسلی کے لئے کہتے ہیں: ع

میں نئے ملک کی سرحد سے پلٹ آؤں گا

ماں جو خود ایک تعلیم یافتہ خاتون ہے اس تسلی سے نہ خوش ہوتی ہے نہ اس کا جواب دیتی ہے۔ وہ جو جواب دیتی ہے وہ تمام سوالوں کا تمام جوابوں کا منہ بند کر دیتا ہے۔ وہ ہار مان جاتی ہیں۔ ع

رک کہ میں آیۂ کرسی تو ذرا دم کردوں

بڑے بھائی ہجرت کر جاتے ہیں۔ اب عرفان صدیقی ہندوستان میں والدین کی سب سے بڑی اولاد ہیں۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ بدایوں کی تعلیم مکمل کر کے بریلی کالج میں داخلہ لیتے ہیں۔ وہاں کسی مکان کی دوسری منزل پر کچھ ساتھیوں کے ساتھ ہاسٹل بنا کر رہتے ہیں اور وہ تمام صعوبتیں سہتے ہیں جو متوسط خاندان کے ان تمام افراد کی اولاد کو برداشت کرنا پڑیں جن کی زمین داری کے معاش کا حکومت ہندوستان نے خاتمہ زمین داری ایکٹ کے ایک ہی وار میں خاتمہ کر دیا تھا۔ وہ سخت محنت کرتے ہیں۔ شعر لکھنے کا سلسلہ اور کتب بینی کا مشغلہ بھی جاری رہتا ہے۔ مہینے کے اخراجات کے لئے کچھ زیادہ پیسوں کے لئے وہ جاسوسی طرز کے ناول بھی لکھتے ہیں جو اس زمانے کے ریلوے اسٹال پر بآسانی دستیاب تھے۔ پھر دہلی جیسے شہر میں کسی ہندی رسالے کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ ادھر ماں باپ

بوڑھے ہوتے جارہے ہیں۔ اسی دوران P.I.B میں ایک اچھی حیثیت کا کام مل جاتا ہے۔ یہیں انہوں نے UPSC کا امتحان دیا اور اس کے افسر کے طور پر انتخاب ہوا تب ایک دن گہری ہوتی رات میں اپنے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے وہ غزل لکھی جس کا ہر شعر لاجواب ہی نہیں ان کے جذبات واحساسات کا آئینہ دار بھی ہے۔

تم ہمیں دشت میں ایک دن چھوڑ کر چل دیے تھے تمہیں کیا خبر یا اخی
کتنے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر نکلنے میں یہ بال و پر یا اخی

سرحد پار کے حالات دن رات پڑھنے والا چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی سے کہتا ہے۔

نہر اس شہر کی بھی بہت مہربان ہے مگر اپنا رہوار مت روکنا
ہجرتوں کے مقدر میں باقی نہیں اب کوئی قریۂ معتبر یا اخی
یہ بھی اچھا ہوا تم اس آشوب سے اپنے سر سبز بازو بچا لے گئے
یوں بھی کوئے زیاں میں لگانا ہی تھا ہم کو اپنے لہو کا شجر یا اخی

عرفان صدیقی نے بھی لڑکپن میں کسی کی حنائی انگلی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ والدہ واقف حال تھیں لیکن کسی سماجی مجبوری کی وجہ سے معاملہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ غزل کے اشعار اپنی ایمائیت اور رمزیت کے وصف کے سبب معاملات کو بہت واضح نہیں کرتے۔ ایک دھندلکا سا قائم رہتا ہے لیکن ان کے چند اشعار سے اتنا اندازہ تو یقیناً ہوتا ہے کہ ان کے معاملات میں وصل کے لمحات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک مسلسل ہجر ہے۔

بیس اکیس برس پہلے ہمیں کب تک ملتے رہنا ہے
دیکھو اب کی بار ملو تو دل کی بات بتا جانا
شوق دونوں کو ہے ملنے کا مگر رستے میں
ایک پندار کی دیوارِ گراں حائل ہے

غالباً یہ پندار (یقیناً دونوں طرف سے) بہت استقلال کے ساتھ دونوں کے ساتھ لگا رہا۔ ے

اب اس قدر بھی سکوں مت دکھا بچھڑتے ہوئے
وہ پھر تجھے نہ کبھی مل سکے عجب کیا ہے

یا پھر ۔ وقت پھر جانے کہاں اس سے ملادے تجھ کو
اس قدر ترک ملاقات کا پندار نہ رکھ

اور یہ بھی ۔ ے

خبر نہیں ہے مرے گھر نہ آنے والے کو
کہ اس کے قد سے تو اونچے ہیں بام و در میرے

ہلکی تفتیش پر علم ہوا کہ دونوں نے اپنی جدائی کی تاریخ طے کر لی تھی اور رفاقت کے آخری لمحوں میں دونوں کو احساس تھا کہ دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ اس ضمن میں پہلا شعر تو غزل کا عام شعر ہے لیکن دوسرے میں سوانحی رنگ بہت گہرا ہے۔ ے

یہ رفاقت بہت مختصر ہے مری ہم سفر لا مرے ہاتھ میں ہاتھ دے
تو ہوائے سر رہ گذر کی طرح میں کسی نکہت رائگاں کی طرح

سنو اتنی افسردہ کیوں ہو اگر آج ہم کو چھڑاتی بھی ہے چپ رہو
یہی ریل گاڑی بہت دن کے بچھڑے ہوؤں کو ملاتی بھی ہے چپ رہو

۱۹۶۳ء میں عرفان صاحب کی شادی نجیب الطرفین سادات گھرانے میں ہوئی۔ اپنا پہلا مجموعہ انہوں نے اپنی اہلیہ کے نام منسوب کیا ہے۔ اشعار کے تیور بھی بتا رہے ہیں کہ اب عشق کا کاروبار گھر کی چہاردیواری تک محدود کر دیا ہے۔ ے

جسم کا شیشہ کاجل کرتی کالی رات خرابی کی
آنکھوں کی محراب میں روشن چہرہ اک سیدانی کا

عرفان صدیقی دوران ملازمت لکھنؤ اور دہلی میں رہے۔ دونوں شہروں سے ان کی محبت فطری ہے جس کا اظہار بار بار ان کے اشعار میں ہوا ہے خصوصاً غزلیہ اشعار میں، انہوں نے ان دونوں شہروں کو اپنی شعری سائکی کا حصہ بنالیا تھا۔ دہلی میں ان کی عمر کا وہ حصہ گزرا جب آتش جوان تھا۔ دن کے ہنگامے دوستوں کے ساتھ دیر دیر تک رہنا شعر کہنا اور شعر سننا ان کا مشغلہ تھا۔ بچے بھی تب تک بڑے نہیں ہوئے تھے۔ ذمہ داریاں کم تھیں اس لئے دہلی کی یاد ذرا دوسرے قسم کی ہے۔

جانے کیوں کوئی سندیسہ نہیں لاتی پچھوا
کیا ہمیں بھول گئے اہل کرم دلی کے
چاہے جس شہر میں رہ آئیں مگر رہتے ہیں
زندگی دلی کی، دل دلی کا، ہم دلی کے

ٹرانفسر ہو کر لکھنؤ آئے تو پھر زندگی کا زیادہ تر حصہ لکھنؤ ہی میں گزرا۔ جناب والی آسی کا کتب خانہ، عابد سہیل صاحب کی نشست گاہ اور پھر پروفیسر نیر مسعود کا ساتھ۔ عرفان صاحب پروفیسر نیر مسعود کی شرافت، علمیت، اور تخلیقیت کے بہت معترف تھے۔ مجھ سے اکثر ذکر بھی کرتے تھے۔ کبھی نیر مسعود ان کے گولہ گنج کے مکان پہ آجاتے اور عرفان صاحب کے ڈرائنگ روم میں گھنٹوں گفتگو ہوتی۔ اکثر عرفان صاحب دین دیال روز پر واقع ادبستان چلے جاتے اور دونوں کو گفتگو میں وقت کا احساس ہی نہ ہوتا۔ نیر مسعود صاحب سے ان کی گہری ہم آہنگی تھی۔ شہروں، قصبوں اور بستیوں سے محبت صرف سڑکوں اور در و دیوار کی زائیدہ نہیں ہوتی بلکہ اس محبت کی تہہ میں شامل ہوتا ہے اس شہر کے عزیزوں، دوستوں اور چاہنے والوں اور چہیتوں کا تصور۔ کچھ دن کے لئے اچانک دلی تبادلہ ہو گیا تو لکھا۔

ابھی کھلا بھی نہ تھا رخت شوق دلی میں

کہ پھر ہمیں کشش لکھنؤ بلانے لگی

ایک جگہ یوں بھی لکھا۔ ؎

ہر جگہ فتنۂ محشر کی علامت ہے وہی
لکھنؤ میں بھی بتوں کا قدو قامت ہے وہی

(یہ شعر غالباً لکھنؤ میں پہلی بار تبادلہ ہو کر آنے کے بعد کہا ہوگا)۔

آخر آخر میں تو لکھنؤ سے وہ تعلق ہو گیا کہ خود کو اس شام اودھ والے شہر کا ایک ناقابل تقسیم حصہ سمجھنے لگے۔ ؎

چار طرف رمیدہ خو، پائے ہوا، صدائے ہو
میرے بغیر لکھنؤ دشت غزال کے بغیر

یہ ان کے بعد کے مجموعے ''سات سماوات'' کا شعر ہے۔اس کے بعد شہر دلی ان پر حاوی نہیں ہوا۔

زندگی کے آخری ایام تک وہ بدایوں سے عشق کرتے رہے شہروں میں یہ ان کا پہلا عشق تھا اور اس عشق کی یاد بھی ان کے دل سے نہیں گئی۔ ملازمت پیشہ انسان کو مختلف شہروں میں رہنا پڑتا ہے۔والد کے انتقال کے بعد گھر کی حالت بھی خستہ ہونے لگی تھی جب کبھی بدایوں جاتے اور اپنے گھر میں داخل ہوتے تو خدا معلوم کیا کیا یاد آتا ہوگا۔ کچا صحن، دالان، کمرے، کیاری میں پھول اور بیلیں، ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، بھائی کی ہجرت، اور طاق میں شام کے افسردہ چراغوں کا دھواں۔اور ؎

تم کبھی شب میں ادھر سے نہ گزرنا کہ وہاں
صف بصف تند فرس سبز علم اڑتے ہیں

اور ماں کے بڑے بیٹے کو رخصت کرتے ہوئے کہنا۔ ع

رک کہ میں آیۂ کرسی تو ذرا دم کردوں

گھر کے در و دیوار کو ہاتھ لگا لگا کر اپنا یہ شعر پڑھتے ہوں گے۔ ؎

ایک آسیب ہے ٹوٹے ہوئے گھر کا وارث

کس کو آواز لگاتا ہے کھنڈر کا وارث

بدایوں سے جب لکھنؤ واپس پہنچے ہوں گے اور بدایوں اور والدین جب یاد آتے ہوں گے تو ؎

بہت بے اماں پھر رہے ہیں مسافر

کہاں ہیں خطوں میں دعا لکھنے والے

اپنا وطن عملی طور پر تقریباً چھوٹ جاتا ہے۔ بدیوں میں ان کے چاہنے والے کم نہیں تھے۔ انتقال سے چند برس پہلے ادب دوست حضرات نے بدایوں بلا کر ان کا تہنیتی جلسہ بہت اعلیٰ پیمانے پر کیا۔ بدایوں سے ان کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ بچپن کی یادوں کے علاوہ زیادہ تر یادیں وہ تھیں جن سے ان کا دل دکھتا تھا۔ ان کے ضعیف ماں باپ بھی بدایوں میں زندگی جیتے تھے۔

غم دوراں اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ جلد جلد والدین کے پاس جاسکیں۔ بس ایک ہوک سی اٹھتی رہتی تھی۔ لکھنؤ یا دلی میں بیٹھ کر انہوں نے یہ شعر کہا ہوگا ؎

بند ہیں اس شہر نا پرساں کے دروازے تمام

اب مرے گھر اے مری ماں کی دعا لے چل مجھے

اور یہ بھی ؎

کتنے بے مہر ہیں اس شہر کے قاتل عرفان

پھر اسی کوچۂ دلبر کی طرف لوٹ چلو

والدہ کے وصال کے وقت وہ ان کے پاس موجود نہیں تھے۔اس کسک نے یہ شعر کہلوایا ہوگا۔

ایک لڑکا شہر کی رونق میں سب کچھ بھول جائے
ایک بڑھیا روز چوکھٹ پر دیا روشن کرے

ماں کے انتقال پر بدایوں پہنچے تو ان کے گھر نے ان سے کچھ کہا۔

مرا سونا گھر مرے سینے سے لگ کر روتا ہے
مرے بھائی تمہیں اس بار بہت تاخیر ہوئی

پھر آخر کار دل کڑا کر کے یہ طے کرلیا کہ اب بدایوں میں واپسی ممکن نہیں ہے۔لیکن اس وعدے کے ساتھ۔

بدایوں تیری مٹی سے بچھڑ کر جی رہا ہوں میں
نہیں اے جان من بار دگر ایسا نہیں ہوگا

نظم کی شاعری فکر کا واضح اظہار کرتی ہے۔پڑھنے والے کے ذہن میں تصویری بنا دیتی ہے۔مضمون کا تسلسلِ بیان کبھی کبھی کہانی جیسا وحدت کا تاثر دیتا ہے۔اس کے برخلاف غزل اپنی ریزہ خیالی کے لئے مشہور، محبوب اور معتوب رہی ہے۔غزل میں اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔رمز و ایما غزل کا حصہ ہیں۔غزل میں سوانح کا بیان عموماً نہیں کیا جاتا لیکن عرفان صدیقی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔انہیں جو کچھ کہنا تھا وہ زیادہ تر غزل کی صنف ہی میں کہا۔

عرفان صدیقی کی زندگی کا ایک بہت تابناک پہلو اپنی اولاد سے غایت درجے کی محبت تھی۔ان کی اولاد میں ایک بیٹا فیضی اور چار بیٹیاں، مینا، نغمہ، رومانہ اور لبنیٰ ہیں۔خدا تعالیٰ انہیں زندہ تندرست خوش وخرم رکھے۔آمین۔وہ بیماری کے زمانے میں اپنے بیٹے فیضی سے بہت مانوس ہوگئے تھے۔اس سعادت آثار نے اپنے محبوب باپ کی خدمت بھی خوب کی

تھی لیکن بیماری سے پہلے کے زمانے میں وہ اپنی بیٹیوں کو بے حد چاہتے تھے اور ان پر فخر کرنے کے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتے تھے۔ علی گڑھ میں میری پہلی پوسٹنگ کے زمانے میں ان کی بیٹی رومانہ نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ہوسٹل ملنے میں کچھ وقت تھا تو میں اور میری اہلیہ اسے اپنے گھر لے آئے چند روز اس کا قیام ہمارے گھر پر رہا۔ اس زمانے میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی اولاد خصوصاً بیٹیوں کو کتنا چاہتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کے نام ان کی نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

مرے آنگن چڑیاں چار
کہ جن کے سبز سنہرے پروں میں چمکے
بابل کی توقیر
میں وہ زندہ تقدیر
کہ میرے نام
سچے آقا کا سلام
میرے پیچھے زندہ چڑیوں کی دشمن کالی صدیاں
میرے آنگن نور کی ندیاں
میرے آنگن کی چڑیاں چار
کہ جن سے دل کا پتھر موم
میری آنکھوں میں مہتاب
میرے شانوں کے شجر شاداب
مری دیواروں پر برکت والی روشنیوں کا نزول
مرے ہاتھوں اجلے پھول

میرے پورب پچھم، اتر دکھن

صبحوں کی چہکار

سہانے گاؤں کریں آثار

میرے آنگن چڑیاں چار

(نئی صبحوں کی بشارت)

ان کی غزل کا عمیق نگاہ سے مطالعہ کرنے والے صاحبان نقد ونظر اس بات سے واقف ہوں گے کہ ان کی غزل میں مستقبل سے مایوسی کا اظہار بہت کم ہے۔ پورے کلیات میں صرف ایک شعر ایسا ہے جو مستقبل کو مشکوک بتاتا ہے۔

اتنی امید نہ آتے ہوئے برسوں سے لگاؤ

حال بھی تو کسی ماضی ہی کا مستقبل ہے

اس کے برخلاف کم ازکم دس اشعار ایسے ہیں جن میں اچھے مستقبل کی تصویر ہے۔ وہ اپنی اولاد کے مقدر اور دنیا کے مستقبل کو مترادف سمجھتے تھے۔

ایسی بے رنگ بھی شاید نہ ہو کل کی دنیا

پھول سے بچوں کے چہروں سے پتہ لگتا ہے

یا

پھول چہروں پہ سویروں کا سماں جیسا ہے

سارا منظر مرے خوابوں کے جہاں جیسا ہے

عرفان صدیقی بنیادی طور پر گوشہ نشین تھے۔ دفتر اور گھر کے درمیان بہت مختصر وقفے کے لئے دوستوں سے روبرو ہوتے تھے۔ شہر سے باہر جاتے تو جلد از جلد متعلقہ کام کو نپٹانے کی کوشش کرتے تاکہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اپنے گھر پہنچ کر اپنے بچوں کو دیکھ سکیں۔

پھول چہروں سے بھی پیارے تو نہیں جنگل
شام ہوجائے تو بستی ہی کا رستہ اچھا

ان کی شاعری میں نظم ہو کہ غزل بچوں کی ایک مخصوص اہمیت ہے۔ ان کی غزل میں بچوں کے افعال کو بچوں کے حوالے سے نہیں، باپ یا شاعر کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ وہ اپنی زندگی اپنی روشنی اور آنے والی دنیا کے اجالوں کو بچوں کے حوالے سے خوش آئند بتاتے ہیں۔

اک نہ اک دیپ سے روشن رہی کالی دنیا
میں بجھا تو مرے بچوں نے اجالی دنیا

چراغ آخر شب ہیں سو اپنے بچوں کو
ہم آنے والے سحر انتساب کرتے ہیں

کل کی دنیا کی بنا ڈال رہا ہے کوئی
ننھے ہاتھوں میں ہے مٹی کا گھروندا روشن

(خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کا بیٹا سول انجینئر بنا جواب ماشاءاللہ بستیاں بسا رہا ہے۔)

مجھے یہ زندگی نقصان کا سودا نہیں لگتی
میں آنے والی دنیا کو بھی تخمینے میں رکھتا ہوں

بچوں سے متعلق ان کی غزلیہ شاعری کے اشعار پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ تسلسل حیات کے قائل ہیں اور زندگی کو جاوداں، پیہم رواں ہردم جواں سمجھنے پر مائل ہیں۔

میں نے شروع کے صفحات میں عرض کیا تھا کہ وہ ہلکی باتوں اور چھچھوری حرکات کو ناپسند کرتے تھے حتیٰ کہ کوئی ان کا شعر بھی بلند آواز میں پڑھ دیتا تو وہ خفیف ہوجاتے تھے۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جس وقت وہ اپنے باطن سے ہم کلامی کرتے اور داخلی طور پر

اپنے شعروں کو سنتے یا محسوس کرتے اس وقت وہ تنہا راہ کے مسافر ہو جاتے تھے۔ وہ اپنے شعر کی خوبی سے خوب واقف تھے اور ان کا نئی غزل میں کیا مقام ہے، وہ اچھی طرح محسوس کرتے تھے۔

غزل تو خیر ہر اہل سخن کا جادو ہے
مگر یہ نوک پلک میرے فن کا جادو ہے

وہ اپنے شعر کی پائداری پر بھی اصرار کرتے ہیں ۔

میں یہ کیوں سوچوں کہ اک موج مٹا دے گی اسے
ریگ ساحل پہ کوئی نقش کف پا لکھوں

عرفان صدیقی کو اپنی شعری دنیا کی انفرادیت کا شدید احساس تھا لیکن عام گفتگو میں وہ اس احساس کو کبھی اعلان نہیں بناتے تھے۔ البتہ اشعار کے پردے میں اپنی شاعری سے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنے میں انہیں کوئی باک نہیں تھا۔

شمع تنہا کی طرح صبح کے تارے جیسے
شہر میں ایک ہی دو ہوں گے ہمارے جیسے

یا

کچھ تو ہو جو تجھے ممتاز کرے اوروں سے
جان لینے کا ہنر ہو کہ مسیحائی ہو
نقش پا ڈھونڈنے والوں پہ ہنسی آتی ہے
ہم نے ایسی تو کوئی راہ نکالی بھی نہیں
میں اپنے نقد سخن کی زکات بانٹتا ہوں
مرے ہی سکے مرے ہم سخن اچھالتے ہیں

وہ مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے۔ اکثر چھوٹی چھوٹی نشستوں میں اپنا کلام سناتے تھے۔ وہ شاعری کے ''ادب وآداب'' سامعین کی نفسیات سے واقفیت اور ناظم مشاعرہ سے تعلقات کی اہمیت سے انجان نہیں تھے لیکن غالب کے بقول معاملہ یہ تھا۔ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

وہ اپنے شعری کارناموں کی بے ہودہ تبلیغ بھی نہیں کرتے تھے جو مشاعروں کی دعوت ملنے میں بے حد معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس موضوع پر بھی ایک طنزیہ شعر کہا تھا۔ ؎

تم بتاتے تو سمجھتی تمہیں دنیا عرفان
فائدہ عرض ہنر میں ہے ہنر میں کیا تھا

زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے ایک گہرا دکھ جھیلا۔ صدی کی ابتدا میں گجرات میں جو کچھ ہوا اس نے ان کے دل پر گہرا اثر چھوڑا ان کی طبیعت بے حد حساس تھی اور وہ بہت زودرنج تھے، عالمی منظرنامے یا ملکی سطح پر کوئی ظلم دیکھتے تو بے تاب ہو جاتے۔ اس سے پہلے بھی ایک نظم ایسے ہی ایک موقعے پر کہی تھی۔

کا وہ تو نے سنا
ماؤں کی دودھیاں لوریاں
دھول میں اٹ گئیں
اور گہواروں کی ریشمی ڈوریاں
کٹ گئیں
نیند کی اجلی پریوں کے پر
ٹوٹ کر گر گئے

اور ننھے بدن

مٹھیوں میں دبائے ہوئے اپنی مٹی کی چڑیاں

دماوند کی کالی چٹان پر

ریزہ ریزہ ہوئے۔

گجرات کے سانحے کا وقت وہ تھا جب ان کی بیماری کی تشخیص ہو چکی تھی۔ گجرات کے حالات سنتے اور دکھ اور ہزیمت سے پیدا شدہ جھنجھلاہٹ میں ایسے منفرد شعر نکالتے۔

حق فتح یاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا
تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا
جو کچھ ہوا وہ کیسے ہوا جانتا ہوں میں
جو کچھ نہیں ہوا وہ بتا کیوں نہیں ہوا

ایسے ہی کی ہزیمت کے احساس کے تحت ۱۹۹۰ء کی دہائی میں یہ بڑا شعر کہا تھا۔

اے خدا کتنے کو ہے تجھ سے زمیں کا رابطہ
دیکھ میں دست دعا ہوں اور قلم ہونے کو ہوں

پھر ایک روز وہ دن آیا جس کے بارے میں سردار جعفری نے ''میرا سفر'' نام کی نظم کے ابتدائی مصرعوں میں کہا تھا۔

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیئے بجھ جائیں گے
ہونٹوں کے کمل مرجھائیں گے
اور برگ زباں سے
نطق وصدا کی

ہر تتلی اڑ جائے گی

اپریل ۱۹۹۴ء کے اس روز موعود کے لئے وہ اپنے کلیات ''دریا'' کے آخر میں یہ شعر درج کر چکے تھے۔

بجھ رہی ہیں میری شمعیں سو رہے ہیں میرے لوگ
ہو رہی ہے صبح قصہ مختصر کرتا ہوں میں

☆

عرفان صدیقی کا شعری شعور کیا صرف ہمارے عہد کا استعارہ ہے؟ نہیں۔ وہ کسی اور زمانے کی داستان بھی سناتے ہیں۔ تو کیا وہ ہماری تہذیب و ثقافت کے ماضی کے کسی دور دراز علاقے سے اپنا رشتہ استوار کیے ہوئے تھے۔ یہ بھی نہیں، دراصل وہ عہد کے کلیشے سے کبھی نہیں بہل سکے۔ وہ ایک غیر منقسم زمانے کا بیان اس طرح کرتے تھے کہ ان کی غزلوں میں کرۂ ارض بھی سرحدوں سے عاری نظر آتا ہے۔

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچئے آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

کیا واقعی ہمارا عہد ہر معنی میں پچھلے عہد سے مختلف ہے۔ کیا وقت کے مختلف ادوار کے درمیان کوئی حقیقی حد فاصل ہوتی ہے جس پر سب متفق ہوں۔ تو کیا زمانے کو تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کیا شعری ذہن صرف ایک ہی عصر کی تصویر کشی کرنے پر مجبور ہے۔ کیا اگلے وقتوں پر ہمارا اب کوئی حق نہیں۔ کیا گردش گیتی کے مسلسل زناٹے میں جولا تعداد تصویریں، تصورات، صدائیں اور صدیاں ایک دوسرے کو کاٹتی، ضرب دیتی، روشنی کی رفتار سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ سفر کر رہی ہیں، ان کی اس کائنات میں ہمہ وقت موجودگی سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے۔ ان سوالوں کا جواب لامحالہ نفی میں ہے۔ اور اسی نفی کبیر کے نتیجے میں جو مقدمہ وجود میں

آتا ہے، عرفان صدیقی اپنے عہد میں اس مقدمے کے سب سے بڑے مدعی ہیں۔ انہیں اس کا احساس بھی ہے۔

شمع تنہا کی طرح، صبح کے تارے جیسے
شہر میں ایک ہی دو ہوں گے ہمارے جیسے

اور یہ شہر لکھنؤ، دلی، بدایوں یا مارہرہ نہیں ہے، یہ انسانوں اور ان کے اعمال کے بوجھ سے چٹختا ہوا پورا کرۂ ارض ہے۔

اے خدا کٹنے کو ہے تجھ سے زمیں کا رابطہ
دیکھ میں دست دعا ہوں اور قلم ہونے کو ہوں

ان کی معنی خیز تراکیب، کچھ کچھ فارسی آمیز لہجہ، دنیا بھر کی ثقافتوں کے نمائندہ کردار، وہ آہوئے تاتار ہو یا بانوئے ناقہ سوار، نیزے پر پھول کی طرح کھلا ہوا سر ہو یا سر برہنہ بیبیاں، کنار دریا کے معرکے ہوں یا آنکھوں کی محراب میں روشن ایک سیدانی کا چہرہ ہو۔ سب کے سب اشارہ کرتے ہیں کہ اس شاعر نے زمین کو اپنا مستقر تو بنایا ہے لیکن یہ زمین بہت وسیع ہے اور اس کی وسعت اور ہمہ گیری پر کسی حالت میں سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ ان کی ارضیت ایک سمٹی سکڑی ذاتی قسم کی ارضیت نہیں ہے، اس کا کینوس ایسا وسیع ہے کہ اس میں سات سماوات سمائے ہوئے لگتے ہیں۔

دنیا کا وسیع تصور ''کینوس'' سے لے کر ''ہوائے دشت ماریہ'' تک لشکارے مارتا ہے۔ اپنی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا عرفان واعلان انہیں صرف اپنی ثقافت کے دائرے میں بند نہیں رکھتا۔ وہ بانوئے ناقہ نشین کے ساتھ اس بنجارن کا ذکر بھی کرتے ہیں جو۔

رکنا ہو یا چلنا ہو کوئی فکر نہیں بنجارے کو
بنجارن نئے چھپر چھائے، کوچ میں پوت سہارا دے

دنیا میں جہاں بھی ظلم ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ سب کے نوحہ خواں ہی نہیں ہیں للکارنے کا بھی جذبہ رکھتے ہیں۔ برطانیہ جب نو آبادیات سے مجبوراُ دست بردار ہوتا ہے تو وہ ٹھٹھے نہیں لگاتے، معروضی انداز میں ذکر کرتے ہیں۔

جن کی اقلیم پہ سورج نہیں ہوتا تھا غروب
کھولتے پھرتے ہیں خیموں کی طنابیں ہر سمت

ستم ایجاد یہودیوں کا وہ زمانہ بھی انہیں یاد رہتا تھا جب وہ ظلموں کے بوجھ سے پسے ہوئے تھے۔ ع

اور مظلوم ستم پیشہ بھی ہو جاتے ہیں

جب اپنی ہی سرحدوں کے اندر بے پناہ ظلم دیکھتے ہیں اور اس کا مداوا نظر نہیں آتا تو ایک مجبور انسان کی طرح لیکن شکوے کے تیوروں کی سان پر رکھا ہوا ایسا دھار دار شعر کہتے ہیں۔

حق فتح یاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا
تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا

زندگی میں ایک وقت وہ آتا ہے جب وہ خود کو عشق کے سپرد کر دیتے ہیں۔

سخت ہے مرحلۂ رزق بھی ہم جانتے ہیں
پر اسے معرکۂ عشق سے کم جانتے ہیں
ہم بڑے اہل خرد بنتے تھے یہ کیا ہو گیا
عقل کا ہر مشورہ دیوانہ پن لگنے لگا

تیرے تن کے بہت رنگ ہیں جان من، ...... والی غزل محبت کے دونوں ساز و سامان یعنی من اور تن کے بارے میں ایسی منفرد غزل ہے جس کا جواب ہمارے عہد کے ایک ہی دو غزل گویوں کے پاس ہوگا۔ عام غزل گویوں کے برعکس وہ اپنے محبوب کی جنس کا اعلان

واشگاف انداز میں کرتے ہیں۔

میں نے اتنا اسے چاہا ہے کہ وہ جان مراد
خود کو زنجیر محبت سے رہا چاہتی ہے

ان کی غزلوں میں دو جذبے بہت شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ایک تو یہ کہ صرف لمحۂ موجود کی نوحہ خوانی بہت ہوگئی، آنے والے وقت کے حسن و خوبی کو بھی خوابوں کا حصہ بناؤ۔

دو جگہ رہتے ہیں ہم ایک تو یہ شہر ملال
دوسرا وہ کہ جو خوابوں میں بسایا ہوا ہے
اتنی بے رنگ بھی شاید نہ ہو کل کی دنیا
پھول سے بچوں کے چہروں سے پتہ لگتا ہے

اور دوسرا رنگ تصوف کی حقیقی روح کا ہے جو انہیں اپنے اجداد سے ورثے میں ملی جو جگہ جگہ ان کو تنبیہ دیتی ہے کہ مستقبل کے خواب اور آنے والی دنیائے حسن آمنا صدقنا، اس سے بے رغبتی تو کفران نعمت ہوگا لیکن دنیا کی آسائش سے تھوڑی سی بے نیازی بھی چاہئے۔

یوں اہل زر کے پاس خزانے تو خوب ہیں
مولا کا یہ فقیر ضرورت کہاں سے لائے
پھر بار فقیروں کا اٹھانا مرے داتا
پہلے تو یہ کشکول فقیرانہ اٹھالے
مدت سے فقیروں کا یہ رشتہ ہے فلک سے
جس سمت وہ ہوتا ہے اُدھر ہم نہیں ہوتے

عرفان صدیقی کی شاعری کی خصوصیات چند صفحات میں بیان کرنا محال ہے۔

''ہوائے دشت ماریہ'' جو کربلا کے اشعار سے سرتاپا مزین ہے، کا ذکر اس مختصر سے نوٹ کو طویل کردے گا۔ رات تھوڑی ہے اور سوانگ بہت۔

بیسویں صدی کے اختتام پر عرفان صدیقی نے صدیوں پہ پھیلی ہوئی اردو غزل کی تابناک روایت کو ایک ایسا پھول جیسا منفرد چہرہ دیا جو بہت سے رنگوں اور خوشبوؤں اور زاویوں کا مجموعہ ہے اور جسے دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ غزل جسے تنگ نائے غزل کہا گیا ہے، کس طرح ایک عبقری شاعر عرفان صدیقی کی بدولت، قصبوں، شہروں، ملکوں، براعظموں اور ظالموں اور مظلوموں اور محبت کرنے والوں اور نفرت کرنے والوں اور حاکموں اور محکوموں اور محبوبوں کے احوال کو کتنی طاقت، نفاست اور اکملیت کے ساتھ بیان کرنے کا اعجاز رکھتی ہے۔

غزل تو خیر ہر اہل سخن کا جادو ہے
مگر یہ نوک پلک میرے فن کا جادو ہے

(2015)

میرا یار جانی عرفان صدیقی

عظیم اختر (دہلی) ....

عام طور پر سرکاری دفتروں اور محکموں میں ہر تیسرا، چوتھا بڑا افسر یر کن شرمایا گپتا ہی نظر آتا ہے لیکن 1964ء کے اوائل میں جب وزارت اطلاعات و نشریات کے محکمہ پریس انفارمیشن بیورو میں ہمارا اسسٹنٹ جرنلسٹ کے عہدے پر تقرر ہوا اور ہم پہلے دن دفتر پہنچے تو یہاں صورت حال یکسر مختلف نظر آئی۔ اس زمانے میں پریس انفارمیشن بیورو کا صدر دفتر آکاش وانی بھون کی پہلی منزل پر واقع تھی اور ہر کمرہ کسی نہ کسی صدیقی سے آباد تھا۔ اکیلے اردو یونٹ میں چھ صدیقی موجود تھے۔ آنجہانی جگناتھ آزاد اردو یونٹ کے افسر اعلیٰ اور آج کی دہلی کے بزرگ صحافی جناب جی ڈی چندن ان کے نائب تھے۔ ہماری پوسٹنگ ایک ایسے یونٹ میں ہوئی تھی جس کے سربراہ جناب علی جواد زیدی تھے۔ پہلا دن رسمی کاروائیاں پوری کرنے میں گزر گیا۔ اگلے دن اردو سے دلچسپی اور صدیقیوں سے ملنے کا شوق ہمیں کھینچ کر اردو یونٹ میں لے گیا۔ ہم یونیورسٹی چھوڑ کر آئے تھے اور نگاہوں میں ہم عمر چہرے بسے ہوئے تھے لیکن یہاں ساتھیوں کے نام پر ادھیڑ عمر کے چہرے دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ ہمارے شوق اور دلچسپی پر اوس پڑ چکی تھی۔ تاثرات سے خالی چہروں نے ہمیں دیکھا، تعارف ہوا اور سپاٹ ہاتھ ملے۔ تعارف کرانے والے نے مسکراتے ہوئے کہا ایک صاحب اور ہیں ایم آئی صدیقی وہ آج کل لگان وصول کرنے بدایوں گئے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر ہم نے حیرت سے کہا ”پریس انفارمیشن

بیوروکولگان سے کیا تعلق‘‘؟اس پر کمرے میں کئی قہقہے گونجے۔متعارف کرانے والے ہماری حیرت دور کرتے ہوئے استہزایہ لہجے میں کہا’سات آٹھ ماہ پہلے ان کی شادی ہوئی ہے اس لیے وہ،لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ پورا کرتے اور کمرہ میں قہقہے گونجتے ہم نے مسکراتے ہوئے کہا اچھا تو یہ بات ہے لیکن معاف کیجئے کیا آپ کی لگان کوئی اور وصول کرتا ہے؟ ان صاحب نے ہمیں کینہ توز نگاہوں سے دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولے’’میاں بتا تو دیتا لیکن ابھی آپ بچے ہیں۔ یہ سن کر ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا کوئی بات نہیں اب تو ساتھ ہی رہیں گے بڑے ہوجائیں گے تو بتا دیجئے......‘‘۔ ہمارا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ کمرہ پھر قہقہوں سے گونج اٹھا۔قہقہوں کے درمیان سنائی دیا کوئی کہہ رہا تھا ’’صدیقی، یہ ہے نہلے پر دہلا۔ اب مزہ آئے گا۔ یہ سن کر ہم نے ان صاحب کو کھجلانے کے لیے خالص لکھنوی انداز میں سلام کیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔شاید تیسرا یا چوتھا دن تھا اور گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کا عمل تھا ہم اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے پاکستان سے آئے ہوئے اخبارات پڑھ رہے تھے۔ اچانک دروازہ کھلا اور آنکھوں پر نظر کا رنگین چشمہ لگائے سفاری سوٹ میں ملبوس چھوٹے قد و قامت کے ایک صاحب ہمارے کمرے میں داخل ہوئے۔ان کے بائیں ہاتھ میں سگریٹ تھی وہ باہیں پھیلاتے ہوئے ہماری طرف بڑھے اور بولے عظیم مجھ سے ملو میں ہوں ایم آئی صدیقی‘‘ یہ تھے ہمارے اس زمانے کے ایم آئی صدیقی اور ڈیڑھ دو دہائیوں کے بعد اردو دنیا میں ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر کے روپ میں ابھرنے والے عرفان صدیقی سے ہماری پہلی ملاقات۔اس کی گرم جوشی قابل دید تھی۔ ہم جلدی سے کرسی چھوڑ کر اٹھے، وہ آگے بڑھا اور ہم سے بغل گیر ہوگیا۔بغل گیر ہوتے ہوئے جی چاہا کہ اس سے پوچھیں میاں لگان وصول کر آئے۔لیکن اس سے پہلے کہ ہماری زبان پھسلتی اس نے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دباتے ہوئے کہا مجھے ابھی ساری تفصیل معلوم ہوئی ہے۔مزہ آ گیا تم سے ملنے اور تمہیں

دیکھنے کیلئے دوڑا چلا آرہا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا یار کیا تم علی گڑھ کی پروڈکٹ ہو؟ ہم نے فوراً جواب دیا نہیں۔ عرفان صاحب ہم دہلی کالج کی پروڈکٹ ہیں اور پرانی دہلی کی گلیوں کے پروردہ ہیں اور وہاں کے شابوؤں سے خاصی اچھی یاد اللہ ہے۔'' اس پر عرفان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہمارا ہاتھ دباتا ہوا بولا پارٹنر میں تم سے یقیناً بڑا ہوں لیکن اتنا بڑا بھی نہیں کہ ہمارے درمیان بے تکلفی پیدا نہ ہو سکے۔ اس لیے یہ صاحب واحب کا چکر چھوڑو۔ اس پہلی ملاقات کے بعد بھی یہی چند ہی دنوں میں ہم دونوں کے درمیان بے تکلفانہ مراسم پیدا ہو گئے اور ناموں کے ساتھ صاحب کا لاحقہ غائب ہو گیا۔ اس زمانے میں پریس انفارمیشن بیورو کے اردو یونٹ میں اردو والوں کے باہمی بغض وعناد، کدورتوں اور ریشہ دوانیوں کی روایتیں خوب پھل پھول رہی تھی جس نے یونٹ کے ماحول کو گھونٹ کر رکھ دیا تھا، گرچہ آنجہانی جگنناتھ آزاد افسر اعلیٰ تھے لیکن ان کی غیر معمولی شعری وادبی مصروفیات کی وجہ سے اردو یونٹ ان کے نائب کے گرد ہی گھومتا تھا۔ آزاد صاحب کے نائب صحافی کم محتسب زیادہ تھے۔ دفتری ڈسپلن اور ضابطوں کی پابندی ان کے یہاں کارکردگی اور Effeciency کا دوسرا نام تھا۔ معمولی سی خلاف ورزی پر جواب طلب کرنے اور میمو (Memo) جاری کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ہمارے عرفان میاں اپنے مزاج کے لاابالی پن کی وجہ سے دفتر دیر سے آنے اور ہر ہفتہ، اتوار، پیر بدایوں میں گذارنے کے لئے چھٹی کی درخواست منظور کرائے بغیر خاموشی سے نکل جانے کے عادی، چنانچہ عرفان کی واپسی پر ایک عدد (Memo) اس کا منتظر رہتا تھا۔ عرفان کو بولنے چالنے میں تو نہیں ہاں اچھی اور عمدہ انگریزی لکھنے میں دسترس حاصل تھی۔ اس وقت اردو یونٹ میں عرفان صدیقی سے بہتر انگریزی لکھنے اور انگریزی سے اردو با محاورہ ترجمہ کرنے والا کوئی اور نہیں تھا۔ چنانچہ ہر میمو کا سلیس اور عمدہ انگریزی میں مدلل جواب دیا جاتا۔ جو بڑی خاموشی سے داخل کر دیا جاتا۔ عرفان کے ان محتسب افسر نے

میموز کے جواب پر کبھی کوئی مزید کاروائی نہیں کی لیکن اس کی سالانہ رپورٹ خراب کرنے سے نہیں چوکتے۔ یہ تین سال چلا اور آنجہانی جگناتھ آزاد کے تبادلے کے ساتھ ہی رکا۔ آزاد صاحب کے بعد سردار شمشیر سنگھ نرولہ اردو کے انفارمیشن آفیسر بن کر آئے۔ نرولہ صاحب غیر منقسم پنجاب کے ممتاز اردو افسانہ نگاروں میں سے تھے۔ انگریزی اور اردو اخبارات میں کام کرنے کا کافی وسیع تجربہ تھا۔ دفتری کاموں میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ عرفان صدیقی کی صلاحیتوں کو پریس انفارمیشن بیورو میں صحیح معنوں میں پہلی بار نرولہ صاحب ہی نے پہچانا۔ انہوں نے عرفان کے ساتھ ہونے والی دفتری ناانصافیوں کا تدارک کیا، لیکن یکے بعد دیگرے تین معمولی اور خراب اے سی آرز نے سینیارٹی لسٹ میں عرفان کو پیچھے دھکیل دیا تھا ورنہ ریٹائرمنٹ سے چند ماہ قبل ملنے والا عہدہ عرفان کو کم از کم چار پانچ سال پہلے مل جانا چاہیے تھا۔

عرفان صدیقی بنیادی طور پر ایک خاموش طبع، کم گو مگر متلون مزاج انسان تھا۔ لوگوں سے ملنے جلنے میں بھی وہ بہت احتیاط برتتا تھا۔ متلون مزاج ہونے کی وجہ سے اس کے یہاں ٹھہراؤ نہیں تھا لیکن اس متلون مزاجی کے باوجود اس نے ایک منصوبہ بند طریقے سے شاعری کی۔ عام طور پر شعرائے کرام شعر کہنے، غزل مکمل کرنے کے بعد اپنے قریبی دوستوں کو سنانے کے لیے بیتاب رہتے ہیں اور شعر سنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ نو واردان ادب پر شعر سنانے اور داد پانے کا جنون کچھ زیادہ ہی سوار رہتا ہے۔ دہلی کے قیام کے دوران عرفان صدیقی کی شاعری یقیناً ابتدائی دور سے گزر رہی تھی۔ یہاں کا ادبی ماحول ہر لحاظ سے سازگار تھا لیکن حیرت کا مقام ہے کہ آٹھ نو سال کے اس خاصے طویل عرصہ میں عرفان نے اپنی شعر گوئی کو سختی سے مخفی رکھا اور دوستوں کو بھی اپنی شاعری کی بھنک نہیں لگنے دی۔ اس کا یہ رویہ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آسکا۔ دہلی کے قیام کے دوران عرفان صدیقی کو ہمارے ساتھ کناٹ پلیس اور پرانی دہلی کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں گھومنے پھرنے کے علاوہ مشاعرے

سننے کا شوق تھا اور یہ شوق اس حد تک تھا کہ ایک بار ہم لوگوں کو جشن جمہوریت کے مشاعرے کے پاس نہیں مل سکے۔ پاس کے بغیر ہم مشاعرے میں جانا نہیں چاہتے تھے لیکن عرفان کی ضد اور شوق کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ چنانچہ لال قلعہ پہنچے، بغیر پاس کے مشاعرہ گاہ میں پہنچے کی کوشش کی لیکن غیر معمولی حفاظتی بندوبست کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکے۔ اس زمانے میں عام لوگوں کے لیے مشاعرے کے ٹکٹ فروخت ہوا کرتے تھے۔ سب طرح سے مایوس ہو کر ہم دونوں نے نچلے درجے کے دو ٹکٹ خریدے اور جب مشاعرہ گاہ کی اس گیلری میں پہنچے تو وہاں ڈنڈا بردار پولیس والوں کی کثرت نظر آئی۔

شعر و ادب کی محفل میں ڈنڈا بردار پولیس والوں کو دیکھ کر ہمیں دہلی والوں کے چہیتے شاعر استاذ رسا دہلوی کا ایک مشاعرہ یاد آ گیا، جس میں بندوبست کے نام پر اسی طرح پولیس والوں کو سامعین کے درمیان بٹھایا گیا، جب مشاعرہ شروع ہوا اور سامعین نے کسی اچھے شعر پر داد دینی شروع کی تو مشاعروں کی روایت سے ناواقف پولیس والے داد کو شور سمجھ کر حرکت میں آ گئے اور بہت سے سامعین کی گدیاں پکڑ لیں۔ استاذ رسا مرحوم اپنے مشاعروں کی نظامت خود ہی کیا کرتے تھے جب انھوں نے پولیس والوں کو سامعین کی گدیاں پکڑتے ہوئے دیکھا تو مائیک پر پولیس سے مخاطب ہوئے۔ بھائیو یہ شور نہیں مچا رہے ہیں داد دے رہے ہیں۔ اس پر پولیس عملے کے انچارج نے استاذ سے پوچھا تو استاد پھر شور کیا ہوتا ہے؟ اس سوال پر مشاعرے میں قہقہوں کا طوفان آ گیا اور سامعین کی گدیاں پولیس والوں کی شکنجوں سے چھٹیں۔ استاد کے مشاعرے کے وہ منظر یاد آتے ہی ہم جملے بازی اور ہوٹنگ کرنے کے شوق کو بھول کر رات کے دو تین بجے تک لٹھوں اور ڈنڈوں کے زیر سایہ مشاعرہ سنتے رہے۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے ایک انجانی اور خفت کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ لیکن عرفان میں اپنے گرد و پیش سے بے نیاز مشاعرہ سننے میں لگے تھے۔ اور خوب داد دے رہے تھے۔

اس زمانے میں ہم نے عرفان کے اس شوق کی بدولت دہلی میں بہت سے مشاعرے یونہی پچھلی صفوں میں بیٹھ کر سنے اور گھنٹوں خون جلایا۔ بڑے بوڑھوں نے کہا کہ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی، اور اسی لال قلعہ کے اسی مشاعرے میں جہاں عرفان صدیقی اور عظیم اختر ایک ایک روپے کا ٹکٹ لے کر پہنچے تھے۔ چند برسوں کے بعد عرفان صدیقی کو شاعر کی حیثیت سے بہ صد احترام مدعو کیا گیا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب جشن جمہوریت کی ثقافتی پروگراموں اور تقریبات کے انعقاد کی تمام تر ذمہ داری دہلی ایڈمنسٹریشن کو سونپ دی گئی تھی۔ ہم اس وقت دہلی ایڈمنسٹریشن میں اسٹیٹ پریس آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ اردو جاننے والے آفیسر ہونے کے ناطے ہمیں مشاعرہ جشن جمہوریت کمیٹی کا جوائنٹ کنویز بنادیا گیا۔ ہم چار پانچ سال تک مشاعرہ کمیٹی کے جوائنٹ کنویز رہے۔ اس قسم کی سرکاری کمیٹی میں عام طور پر دانش گاہوں کے پروفیسر نقاد حضرات ہی ممبر کے طور پر سجے ہوئے نظر آتے ہیں، اب تو خیر اس مشاعرے کی تمام ذمہ داریاں دہلی اردو اکیڈمی کے سپرد ہیں جس میں سیاسی سفارشوں کی بدولت پروفیسر نقاد حضرات کی بہتات ہے لیکن ہمارے زمانے کی مشاعرہ کمیٹی میں بھی دہلی کی تینوں دانشگاہوں کے کئی پروفیسر حضرات ممبر کے طور پر سجے ہوئے تھے۔ مشاعرے میں مدعو کئے جانے والے شعرائے کرام کے انتخاب کے سلسلے میں ہم نے مشاعرہ کمیٹی کے معزز ممبران کے ماہرانہ جوڑ توڑ ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو بہت قریب سے دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو زبان و ادب کا ریموٹ کنٹرول بنے ہوئے یہ زعمائے ادب اپنی زبان اور ادب کی تئیں قطعاً مخلص نہیں ہیں۔ اس قسم کی کمیٹیوں کا ممبر بننے کے بعد اپنے موالی قلمکاروں کو فائدہ پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اردو دنیا میں اور بھی ناانصافیوں اور بددیانتوں کا ایسا بازار گرم ہے جس کی آنچ اور بڑھتی جارہی ہے۔ ہمیں یاد ہے مشاعرہ کمیٹی میں جب عرفان صدیقی کا نام

پیش کیا گیا تو تین چار معزز ممبر مخالفت کے باوجود مخالفت نہ کر سکے اور عرفان کو مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔ جب مشاعرہ شروع ہوا اور پنڈال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہی تو ہم نے عرفان کے کان میں کہا ''میاں ذرا وہ دن یاد کرو جب ہم دونوں نے ایک ایک روپے کا ٹکٹ لے کر سب سے پیچھے بیٹھ کر یہ مشاعرہ سنا تھا'' عرفان نے ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''ہاں وہ دن مجھے بھی یاد ہے، خدا کا کتنا بڑا کرم ہے کہ آج ہم دونوں مشاعرے کا حصہ بنے ہوئے اسٹیج پر موجود ہیں''۔ یہ کہہ کر عرفان نے اپنے مخصوص انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

عرفان صدیقی نے بہ حیثیت شاعر اس مشاعرے میں شرکت کی اور ہماری خواہش پوری ہوگئی۔ لیکن وہ باقی ایم اے کی طرح مشاعروں کا شاعر نہیں تھا اور اس کی شاعری شعر فہمی اور سخن شناسی سے محروم آج کے مشاعروں کے ان سامعین کی سمجھ سے بالاتر تھی جو متشاعرات کے ترنم پر سر دھنتے ہیں اور پٹے بازوں کی طرح ہوا میں ہاتھ لہرانے اور پنڈال کی محبت کو دیکھ کر خمار آلود آواز میں متفرق اشعار سنانے والے شاعروں کو پسند کرتے ہیں۔ عرفان صدیقی ترنم کی دولت اور تحت میں بازیگری کا کلام دکھانے سے محروم تھا، اس کی خوبصورت شاعری اور سپاٹ تحت دہلی کے سامعین کو متاثر نہ کر سکی، اس کے بعد جشن جمہوریت کے کسی اور مشاعرے میں ہمارے علمائے ادب نے کبھی عرفان کو مدعو نہیں کیا۔ لیکن وہ ایک ایسا جینوئن، اور ریجنل اور ذہین شاعر تھا جس کے حوالے کے بغیر آج کی اردو شاعری پر گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ عرفان فضول خرچ بہت تھا۔ جیب میں پیسے ہوتے تو کناٹ پلیس کے مہنگے ہوٹلوں میں کافی پی جاتی اور ٹیکسی میں سفر ہوتا اور شاہانہ انداز سے وقت گذرتا لیکن جب پیسے ختم ہو جاتے تو ادھار کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور یہ سلسلہ مہینے کے آخر تک جاری رہتا تھا۔ شاہ خرچی اس کی عادت تھی لیکن عرفان کے کردار میں کوئی جھول نہیں تھا۔ اس زمانے میں پی آئی بی کا اردو یونٹ بھرا پڑا تھا۔ دس بارہ رفقائے کار کے باوجود اس کی دوستی کسی سے نہیں تھی۔ سب سے الگ تھلگ رہتا اور شام کو

دفتری اوقات کے بعد ہمارے ساتھ کناٹ پلیس کی سڑکوں پر مٹر گشتی کرتا۔ اگر سلام مچھلی شہری اور لکھنؤ کے ممتاز شاعر جناب عمر انصاری کے صاحبزادے اقبال عمر جوان دنوں دہلی میں برسرِ روزگار تھے ہمارے دفتر آجاتے تو پھر ہم چاروں کناٹ پلیس کے کسی خوبصورت ریسٹورینٹ میں کافی پیتے، سگریٹیں پھونکتے اور دنیا جہاں کی باتیں کرتے۔ سلام مچھلی شہری ابا جی مرحوم حضرت مولانا علیم اختر کے ہم عصر اور دوست تھے، اسی تعلق کی وجہ سے وہ ہم سے بڑی شفقت سے پیش آتے۔ دفتر قریب ہونے کی وجہ سے اکثر وہ فون کر کے ہمیں بلا لیتے یا ٹہلتے ہوئے خود ہی ہماری طرف آجاتے۔ عرفان صدیقی کی سلام مچھلی شہری سے ملاقاتیں یہیں سے شروع ہوئیں۔ عمروں میں تفاوت کے باوجود سلام ہم دونوں سے بے تکلف ہو گئے تھے لیکن انہیں بے تکلفی میں بھی مراتب کا خیال رہتا تھا۔ عرفان سلام کی معصومیت کا مداح تھا اور ہماری طرح سلام بھائی کہا کرتا تھا۔ ہم لوگوں نے سلام بھائی کے ساتھ کناٹ پلیس کے بارونق ریسٹورنٹوں میں ان گنت شامیں گزاری ہیں، جہاں ہم لوگ آپس میں پیسے ملا کر کافی پیتے تھے۔ سلام بھائی کو فنگر چپس کھانے کا بہت شوق تھا۔ ہم سب جانتے تھے لیکن عرفان سلام بھائی کی پسند کا خاص خیال رکھتا اور ان کے لیے فنگر چپس کا ایک پلیٹ کا آرڈر ضرور دیا جاتا۔ گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ سلام بھائی اپنی شعری فتوحات کے قصے سناتے اور ہم تینوں بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سنتے رہتے۔ جب محفل ختم ہوتی تو سلام بڑی خاموشی سے پانچ روپے کا نوٹ بڑھا دیتے اور سلام بھائی کے شوق کی قیمت ہم تینوں کو چکانی پڑتی۔ ان محفلوں میں اکثر شاعری بھی ہوتی اقبال شعر سناتا۔ سلام بھائی کی نظمیں، غزلیں سنی جاتیں لیکن بے تکلفی کے اس ماحول میں بھی عرفان صدیقی کا شاعر گونگے کا گڑ کھائے بیٹھا رہتا۔

خاموش طبعی اور کم گوئی کی وجہ سے عرفان اپنے ہم عمر لوگوں سے ملنے جلنے، گھلنے ملنے یا دوست بنانے کا اہل نہیں تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ لکھنؤ کی فضاؤں میں وہاں کے ادبی ماحول میں

عرفان کی مزاج میں کچھ تبدیلی آئی تھی یا نہیں، دہلی کے قیام کے دوران عرفان Reticent تھا۔ کناٹ پلیس کے انڈین کافی ہاؤس میں جہاں ہر شام اردو اور پنجابی کے شاعروں اور ادیبوں کی محفل جمتی تھی۔ ادبی موضوعات پر خوب بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے۔ ان محفلوں میں کے کے کھلر، دیوبند ستھیارتھی، یعقوب عامر، اندر سروپ ناداںؔ، تارا سنگھ کامل، سنسار سنگھ غریب، فیاض رفعت، اقبال عمر وغیرہ تقریباً روزانہ کے آنے والوں میں سے تھے لیکن باقی ایم اے، محسن زیدی، راج نرائن رازؔ وغیرہ بھی اکثر آ نکلتے۔ باقی ایم اے محسن زیدی اور راج نرائن راز کے آنے سے بحث و مباحثے کی نوعیت بدل جاتی، عرفان صدیقی خاموش بیٹھا ہوا سگریٹیں پھونکتا رہتا، پھر زیر لب مسکراتا رہتا تھا، عرفان کو دیوبند ستھیارتھی سے الرجی تھی۔ لیکن ستھیارتھی عرفان کی خاموش طبیعت اور کم گوئی سے متاثر تھے۔ دیویندر ستیارتھی کو دیکھتے ہی عرفان کرسی پر پہلو بدلنے لگتا اور اگر اتفاق سے ستیارتھی کو عرفان کے پہلو میں نشست مل جاتی تو عرفان کی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا اور پیروں کے ہلنے میں تیزی آ جاتی۔ ستیارتھی بیٹھتے ہی عرفان کے قریب منہ لے جا کر مہذب انداز میں مزاج پرسی کرتے، تو اس وقت عرفان کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی عرفان پہلو بدل کر منہ اوپر کر لیتا اور ہوں ہاں کر کے ستھیارتھی کو ٹالنے کی کوشش کرتا۔ دیویندر ستیارتھی نے رابندر ناتھ ٹیگور جیسی وضع قطع اختیار کر لی تھی اور کافی ہاؤس میں گرودیو کے نام سے مشہور تھے۔ ٹیگور تو یقیناً نہاتے دھوتے ہوں گے لیکن ستیارتھی نہانا تو کجا منہ ہاتھ دھونے کے تکلف سے بھی بے نیاز تھے جس کی وجہ سے اس کے سر اور داڑھی کے لمبے اور بے ہنگم بالوں سے ایک عجب سی بو آتی تھی۔ عرفان اس معاملے میں نفاست پسند واقع ہوا تھا اس کو سینٹ اور عطر لگانے کا شوق تو نہیں تھا ہاں صبح کو دفتر کے لیے تیار ہوتے وقت جسم پر ٹیلکم پاؤڈر چھڑکنے کی عادت تھی۔ ایسا شخص قریب بیٹھے ہوئے شخص کے جسم کی بو بھلا کیسے گوارا کر سکتا۔ اس لیے وہ ستیارتھی کی داڑھی سر کے بالوں سے چھن کر آنے والی بو سے پیچھا چھڑانے کے لیے اکثر کافی چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔

ہم عرفان سے تفریح لینے کے لیے کہتے عرفان صاحب تشریف رکھیں، گرو دیو امرتا پریتم سے اپنی پہلی ملاقات کا قصہ سنائیں گے۔ لیکن عرفان سنی ان سنی کر کے کھڑا ہو جاتا اور ہمیں بھی مجبوراً عرفان کا ساتھ دینا پڑتا۔ امرتا پریتم ساحر لدھیانوی پر دل و زبان سے فدا تھی۔ لاہور میں ستیارتھی ساحر لدھیانوی کا دم چھلہ بنے ہوئے تھے اور اس قربت کی وجہ سے امرتا پریتم سے خاموش عشق کرنے لگے تھے۔ کافی ہاؤس میں اکثر آ کر ستیارتھی امرتا پریتم سے اپنے یکطرفہ اور خاموش عشق کی کہانی سناتے اور ہم لوگ بھرپور تفریح لیتے تھے۔ عرفان کو دوسروں کے عشق کی داستان سننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ کافی ہاؤس سے باہر نکل کر عرفان اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہتا، ''جانی اگر یہ شخص اپنی بیوی سے بھی تھوڑا بہت عشق کر لیتا تو اس کی زندگی سدھر جاتی''۔ عشق صحیح معنوں میں شریک حیات ہی سے کرنا چاہیے۔ وہ عشق زندگی سے پیار کرنے کا شعور بخشتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کی کالج لائف اور دہلی کے قیام میں تمام تر آزادیوں کے باوجود اس قسم کی آلودگی سے پاک تھی۔ اس نے شادی کے بعد اپنی شریک حیات سے ٹوٹ کر عشق کیا اور اسے چاہنے والوں کی طرح پایا۔ ہم عرفان کے اس عشق کے شاید واحد گواہ ہیں جس نے عرفان کے اس عشق کی شدت کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے۔ عرفان دہلی میں اپنے آٹھ نو سالہ قیام کے دوران گرچہ اس شہر کی ان گلیوں اور کوچوں میں نہیں رہا، جن میں رہنے کے بعد دہلی ذہن میں سرایت کر جاتی ہے اور پھر سوادِ رومتہ الکبریٰ میں بھی دہلی یاد آتی ہے لیکن عرفان نے ہمارے ساتھ پرانی دہلی کے بازاروں، گلیوں کوچوں اور کناٹ پلیس کی شاہراروں پر اتنی مٹرگشتی کی کہ لکھنؤ میں اسے رہ رہ کر دہلی یاد آتی تھی۔

عرفان صدیقی

.... خورشید رضوی (لاہور)

عرفان صدیقی کا نام میں نے پہلی بار اپنے دوست ڈاکٹر توصیف تبسم سے سنا۔ یہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کا کوئی سال تھا جب میں ادارۂ تحقیقات اسلامی سے وابستہ اور اسلام آباد کے سیکٹر جی۔۹۱ میں مقیم تھا۔ توصیف صاحب قریب ہی جی۔۹۳ میں رہتے تھے اور میری ان سے تقریباً ہر روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ عرفان صاحب سے یہ اولین تعارف ان کی شاعری کے حوالے سے تھا۔ توصیف صاحب نے ان کے اشعار سنائے تو ان کے کمال ہنر کا نقش فی الفور دل پر ثبت ہو گیا۔ مثلاً:

اے مرے طائرِ جاں، کس کی طرف دیکھتا ہے
ناوکِ کور کماں کس کی طرف دیکھتا ہے
بانوئے ناقہ نشیں، دیکھ کے چہرہ تیرا
بندۂ خاک نشاں کس کی طرف دیکھتا ہے
ہم سب آئینہ در آئینہ در آئینہ ہیں
کیا خبر کون، کہاں، کس کی طرف دیکھتا ہے

اسی زمانے میں شہزاد احمد صاحب بھی اسلام آباد آئے اور توصیف صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ وہیں ان کی موجودگی میں پھر عرفان صدیقی کا ذکر چھڑا اور وہ بھی ان کے زبردست

مدّاح نکلے۔ اب ہم سب متفق تھے کہ ہندوستان میں اس وقت سب سے اچھی غزل عرفان صاحب کہتے ہیں۔ بعدازاں آپس میں گاہے گاہے عرفان صاحب کے اشعار کا تبادلہ جاری رہا:

ریت پر تھک کے گرا ہوں تو ہوا پوچھتی ہے
آپ اس دشت میں کیوں آئے تھے وحشت کے بغیر

کوزہ گر پھر اسی مٹی میں ملاتا ہے مجھے
دیکھیے اب کے وہ کیا چیز بناتا ہے مجھے

دولتِ سر ہوں کہ ہر جیتنے والا لشکر
طشت میں رکھتا ہے نیزے پہ سجاتا ہے مجھے

میں تو اس دشت میں خود آیا تھا کرنے کو شکار
کون یہ زین سے باندھے لیے جاتا ہے مجھے

عرفان صاحب کے ہاں ہندوستانی مسلمانوں کا جو درد پایا جاتا تھا اور ہند اسلامی تہذیب کا جو رچا ہوا شعور ملتا تھا وہ ہمیں بہت متاثر کرتا تھا:

تم ہمیں ایک دن دشت میں چھوڑ کر چل دیے تھے تمہیں کیا خبر یا اخی
کتنے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر نکلنے میں یہ بال و پر یا اخی

ہم اپنے ذہن کی آب و ہوا میں زندہ ہیں
عجب درخت ہیں، دشتِ بلا میں زندہ ہیں

ہوائے کوفۂ نا مہرباں کو کیا معلوم
کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں

خدا کا شکر ابھی میرے خواب ہیں آزاد
مرے سفر مری زنجیرِ پا میں زندہ ہیں

ایک تعویذ کو موجوں کے حوالے کر کے
دور تک مجھ کو نظر آتا تھا دریا روشن
جاگتی راتوں میں لہراتے ہوئے حمد کے گیت
طاقِ مسجد میں کسی دل کی تمنا روشن
کانپتے ہاتھوں میں دلدار دعاؤں کے چراغ
اور اشکوں کے ستاروں سے مصلیٰ روشن

یہ سب کچھ اس خوشبو کی طرح تھا جو پھول سے پہلے آپ تک پہنچتی ہے اور خود پھول کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا کرتی ہے۔ یہ اشتیاق شاید طلبِ صادق پر مبنی تھا کہ آخر عرفان صاحب سے ملاقات کی صورت پیدا ہو ہی گئی۔

یہ وسطِ ستمبر ۱۹۹۸ء کی بات ہے۔ مجلسِ فروغِ اردو ادب، دوحہ قطر کی طرف سے پاکستان میں جناب انتظار حسین کو اور ہندوستان میں جیلانی بانو صاحبہ کو ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا تھا جس کے لئے دوحہ میں ایک شاندار تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ ہم لوگ اسی سلسلے میں دوحہ پہنچے تھے۔ اس تقریب کے فوراً بعد سلیم جعفری مرحوم کی روایت کو زندہ رکھنے کے لئے ان کی بیگم شاہدہ سلیم صاحبہ نے دبئی میں جشن علی سردار جعفری کے عنوان سے مشاعرے کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں ہمارے لئے خصوصی کشش کا باعث یہ بات تھی کہ جناب عرفان صدیقی بھی اس میں شمولیت کے لئے لکھنؤ سے تشریف لا رہے تھے۔

۲۰ر دسمبر ۱۹۹۸ء کو ہم دبئی پہنچے اور پام بیچ ہوٹل میں قیام پذیر ہوئے۔ ۲۲ر تاریخ کو ناشتے سے قبل ہی عرفان صاحب پہنچ گئے۔ ملاقات ہوئی تو ایسا محسوس ہوا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ ارادہ تھا کہ آج کچھ خریداری کے لئے بازار جائیں گے لیکن عرفان صاحب سے گفتگو میں ایسی محویت ہو گئی کہ کچھ اور یاد ہی نہ رہا۔ اسی روز پاکستان سے جناب فیصل عجمی اور

ریاض احمد ریاض صاحب بھی اپنے طور پر دبئی کے دورے پر آئے اور رمادہ ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ وہ مجھے، عرفان صاحب کو اور شہزاد صاحب کو وہاں لے گئے۔ چائے پینے کے بعد مغرب کے وقت وہ اپنی گاڑی میں ہم تینوں کو لے کر ابوظہی روانہ ہو گئے جہاں اسی رات ہوٹل ہالیڈے ان میں محفل مشاعرہ کا اہتمام تھا۔ راستے بھر ہماری ایک مختصر سی بزمِ شعر بجی رہی اور جس کا لطف مشاعرے سے کہیں زیادہ تھا۔

مشاعرہ رات تین بجے ختم ہوا۔ کھانا اس کے بعد تھا۔ پھر واپس دبئی میں اپنے ٹھکانے پر جانے کے لئے ہم گاڑی میں بیٹھے تو مجھے اور اجمل سراج کو عقبی نشستوں پر عرفان صاحب کے ساتھ جگہ ملی جو بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ ہوٹل پام بیچ پہنچتے پہنچتے صبح کے چھ بج گئے۔ راستے میں ہم تینوں میں خوب خوب علمی وادبی مکالمہ رہا جس کی سرشاری آج تک یاد ہے۔ اس گفتگو سے ہم سب پر یہ منکشف ہوا کہ ہم تینوں ذہنی طور پر ایک فطری ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

اگلے روز میں دبئی کے دیرہ بازار سے گھر کے لئے کچھ خریداری کرنا چاہتا تھا مگر میں اس کام میں صفر ہوں۔ عرفان صاحب کے فرزند، فیضی اس زمانے میں دبئی میں مقیم تھے۔ انہوں نے فیضی کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ میری رہنمائی کے لئے میرے ساتھ جائیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد فیضی مجھے لے کر نکلے اور ان کی خوبو سے عرفان صاحب کی خوشبو آتی رہی اور انہوں نے میری بہت مدد کی۔

آئندہ روز بھی ریاض احمد ریاض صاحب کی معیت میں عرفان صاحب سے بہت باتیں ہوتی رہیں۔ ۲۵ ستمبر کی رات کو دبئی میں جشن علی سردار جعفری کے سلسلے کا مشاعرہ ہماری آخری مصروفیت تھی۔ اس دن بھی صبح کو عرفان صاحب کی معیت میں کچھ وقت گزرا اور پھر ہم اپنا سامان باندھنے اور دیگر مصروفیات میں گم ہو گئے۔

اس روز مشاعرہ رات بھر جاری رہا جس میں عرفان صاحب بھی شریک تھے۔

یوٹیوب پران کی ایک مختصر ویڈیو کلپ جس میں وہ اپنا کلام سنا رہے ہیں اسی مشاعرے کی ہے۔ مشاعرے کے اختتام پر بیگم شاہدہ سلیم صاحبہ کے ہاں کھانا ہوا اور صبح کی اذان ہم نے ان کے فلیٹ کے نیچے سڑک پر سنی۔

اسی روز ہم سب ہوٹل سے چیک آؤٹ ہو کر دبئی کے ہوائی اڈے پر چیک ان ہو گئے۔ کراچی تک عرفان صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ صبح سوا پانچ بجے کراچی اترے۔ یہاں سے مجھے لاہور کی اور انہیں دہلی کی پرواز پکڑنی تھی۔ اپنے اپنے راستوں پر جاتے ہوئے میری اور ان کی الوداعی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں انہیں آخری بار دیکھ رہا ہوں۔

عرفان صاحب اس کے بعد بھی ایک بار پاکستان آئے مگر لاہور آنا نہیں ہو سکا۔ دبئی اور ابوظہی کے جن مشاعروں کا ذکر میں نے کیا ان میں اس سال لکھنؤ سے رئیس انصاری صاحب بھی شامل تھے۔ ان سے بعد میں بھی قطر اور دبئی کے بعض مشاعروں میں ملاقات ہوئی۔ عرفان صاحب کا ذکر ہوا تو انہوں نے بتایا کہ وہ بھی اس خاکسار کو بہت محبت سے یاد کیا کرتے تھے۔

ابھی دل میں تجدید ملاقات کی آرزو اور امید کا ایک طویل سلسلہ باقی تھا کہ عرفان صاحب کی علالت کی خبر آئی۔ پھر یہ پتا چلا کہ برین ٹیومر کے باعث ان کو عمل جراحی سے گزرنا پڑا مگر صورت حال قابو میں نہ آسکی اور آخر وہ سناؤنی آ ہی گئی جس کا دھڑ کا لگا ہوا تھا۔ اِنا لِللہِ وانا الیہ راجعون۔

عرفان صاحب کی وفات پر مجھے جس قدر ذاتی صدمے کا احساس ہوا کم کم ہی ہوا ہوگا۔ انہوں نے ایک غزل میں کہا تھا:

تیر چلتے رہیں گے، ہاتھ بدلتے رہیں گے
ہم گریں گے تو اٹھا لیں گے نشاں دوسرے لوگ

مگر حقیقت یہ ہے کہ عرفان صدیقی کے ہاتھ سے چھوٹے ہوئے علم کو سنبھالنا اتنا آسان نہیں۔

اسی احساس کے تحت، اسی زمین میں بے ساختہ چند اشعار سرزد ہوئے اور انہی پر میں اس مختصر سی یادداشت کا اختتام کرتا ہوں۔

بیادِ عرفان صدیقی

تیرے معیار کو پہنچیں گے کہاں دوسرے لوگ
تجھ سا رکھتے ہیں کہاں دردِ نہاں دوسرے لوگ

گو اُنہی میں تھا مگر ان سے جدا تھا یکسر
تو جو گوہر تھا تو تھے آبِ رواں دوسرے لوگ

کس کو ہمت ہے کہ ہو تیری طرح سینہ سپر
کیا اُٹھائیں گے ترے بعد نشاں دوسرے لوگ

ہاتھ پر کس کے کرے کوئی سخن میں بیعت
اب رہیں دست بدست دگراں دوسرے لوگ

ڈھونڈتی ہیں تجھے آنکھیں مگر اب دنیا میں
نظر آتے ہیں کراں تا بہ کراں دوسرے لوگ

تجھ سے ملنے کی اک امید تھی وہ بھی نہ رہی
میری قسمت میں ہیں اب صرف یہاں دوسرے لوگ

تو جو تھا شعلہ بجاں دوسرے لوگوں کے لئے
سو ترے غم میں ہیں اب نوحہ کناں دوسرے لوگ

(2015)

☆☆☆

عرفان صدیقی

عابد سہیل (لکھنؤ) ....

عرفان صدیقی سے جان پہچان برسوں سے تھی۔ ادبی جلسوں اور نشستوں میں ملاقاتیں ہوتیں لیکن اس سب کی حیثیت بس دور کے جلوے کی رہتی پھر گہرے اور ذاتی تعلقات ہو گئے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ان کا آغاز ایک عملی مسئلے پر اختلاف سے ہوا۔

ہوا یہ کہ اخلاقیات کے کسی پہلو پر آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ نے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا۔ شرکاء میں عرفان صدیقی اور میرے علاوہ ایک اور صاحب جن کا نام نہیں یاد آ رہا ہے، بھی تھے لیکن وہ کسی سبب تشریف نہ لا سکے چنانچہ اظہار خیال کے لیے ہم دونوں کو خاصا وقت ملا۔ سنسکرت سے عرفان صدیقی صاحب کی واقفیت اور ہندوستانی فلسفہ سے میری دلچسپی کے سبب ہم دونوں نے مغربی مفکرین کے افکار سے زیادہ ہندوستان کے فلسفیانہ افکار اور دانشوروں کے خیالات سے سروکار رکھا۔ موضوع ایسا تھا کہ اس میں مذہبی افکار اور دانشوروں کے خیالات سے سروکار رکھا۔ موضوع ایسا تھا کہ اس میں مذہبی افکار کا زیر بحث آنا لازمی تھا۔ ہندوستانی فلاسفہ اور خاص طور سے گیتا کے حوالے سے بات چیت کے دوران میں لفظ ''دھرم'' استعمال کرتا رہا اور عرفان صدیقی اس کے متبادل کے طور پر ''مذہب''۔ یہ گفتگو معنی خیز رہی اور انتہائی خوشگوار ماحول میں انجام پائی۔

اسٹوڈیو سے باہر نکلتے ہی عرفان صاحب نے کہا کہ بھائی گفتگو تو بہت اچھی رہی

لیکن اردو پروگرام میں آپ ''دھرم دھرم'' کیوں کہتے رہے۔ آپ نے دھرم کے لیے لفظ مذہب ایک بار بھی نہیں استعمال کیا۔ میں نے کہا دھرم اور مذہب ہم معنیٰ الفاظ نہیں ہیں تو میرے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔

''تو پھر دھرم کے معنی کیا ہیں؟''

اس وقت چونکہ آل انڈیا ریڈیو کے پروڈیوسر بھی ہمارے ساتھ تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ مذاکرہ کے سلسلے میں اس اختلاف رائے پر بات چیت میں وہ بھی شامل ہوں اس لیے میں نے کہا کہ فی الحال تو چیک لے لیجیے۔ اس موضوع پر ہم لوگ بعد میں گفتگو کرلیں گے۔

''بعد میں کب؟'' انھوں نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

''اسٹوڈیو کے باہر کسی تیسرے شخص کی عدم موجودگی میں۔ ویسے ممکن ہے سنسکرت سے آپ بخوبی واقف ہوں لیکن ہندوستانی فلسفہ سے آپ بالکل ناواقف ہیں'' میں نے بھی کسی قدر سخت لہجہ میں کہا جس کا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے اپنے لہجہ کی تلخی پر افسوس تھا۔ اور شاید انھیں بھی اپنے ان گھڑ انداز پر۔

جاڑوں کے دن تھے، ہم دونوں نے ریڈیو اسٹیشن سے نکل کر پاس کے ایک سڑک چھاپ ہوٹل میں چائے پی۔ مزے کی باتیں کیں اور ''دھرم اور مذہب'' نے نہ صرف یہ کہ برسوں کی شناسائی کی راہ میں رکاوٹیں نہیں کھڑی کیں بلکہ دھیرے دھیرے اسے گہرے ذاتی تعلقات میں تبدیل کردیا۔

بعد میں عرفان صاحب سے نیر مسعود اور شمس الرحمٰن فاروقی کے گھروں پر اور چھوٹے موٹے ادبی جلسوں اور نصرت پبلشرز میں سیکڑوں، جی ہاں سیکڑوں، ملاقاتیں ہوئیں لیکن ہم دونوں کو ریڈیو اسٹیشن کے واقعے کا شاید کبھی خیال بھی نہیں آیا۔

ان کی شاعری کا مداح میں پہلے بھی تھا لیکن اب کبھی کبھی انھیں کے اشعار انھیں سناتا

اور وہ داد کچھ اس طرح دیتے گویا یہ اشعار میرے ہوں۔ اس سلسلے میں دو تین شعر یاد آرہے ہیں۔

عبارتیں جو ستاروں پہ ہم کو لکھنا تھیں
تری جبین ستارہ نما پہ لکھیں گے

جانتے ہو کہ کوئی موج مٹادے گی اسے
پھر بھی کیا کیا سر ریگ گزراں لکھتے ہو

فرض سے عہدہ برآ کوئی نہ ہونے پایا
سر تسلیم بھی چپ تیغ جفا بھی خاموش

ایسے خوبصورت اور گہری بصیرت کے اشعار انھیں کچھ اس طرح سناتا تو وہ ان کی داد بھی خوب خوب دیتے۔ مراسم اور قربت کا اندازہ لگانے کے لیے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ ''سات سماوات'' کی دستیابی کے لیے انھوں نے جن تین اداروں کا نام دیا تھا ان میں نصرت پبلشرز بھی شامل تھا اور مجھے اس کا علم کتاب دیکھنے کے بعد ہی ہوا تھا۔

۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۷ء تک میں روزنامہ پائنیر سے متعلق رہا۔ اسی دوران سہیل وحید کی کتاب ''صحافتی زبان'' کی رسم اجراء انھوں نے پریس انفارمیشن بیورو میں کی تو اس تقریب کی صدارت مجھ سے کرائی۔ کسی باہر کے شخص کی صدارت کی اہمیت یوں ہے کہ وہ اس وقت پی۔آئی۔بی لکھنؤ کے سربراہ تھے۔

روزنامہ ''صحافت'' کی باقاعدہ اشاعت کا آغاز ۱۹۹۵ء کے آخر یا ۱۹۹۶ء کے ابتدائی مہینوں میں ہوا۔ اس سے قبل عرفان صدیقی اور اخبار کے مالک امان عباس کے بڑے بھائی طاہر عباس جو خود بھی ہندی کے ایک نامور صحافی ہیں میرے پاس تشریف لائے اور انھوں نے مجھ سے اس روزنامے کی ادارت قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن پائنیر سے اپنے تعلق کی بنا پر کسی دوسرے اخبار میں بطور مدیر اپنا نام دینا مجھے کچھ ایسا مناسب نہ معلوم ہوا۔ تاہم ان

دونوں اور خاص طور سے عرفان صاحب کے اصرار پر اداریہ لکھنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے علاوہ بطور ''مشیر خصوصی'' اپنے نام کی اشاعت کی اجازت بھی میں نے دے دی۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔

وقت اس قدر خاموشی لیکن تیز رفتاری سے قدم بڑھاتا ہے اور پلٹ کے بھی نہیں دیکھتا کہ اس کی تیز گامی کا ذرا بھی احساس ہو سکے۔ یکا یک احساس ہوا کہ عرفان صاحب کی سبکدوشی کا دن جیسے اڑا چلا آ رہا ہے۔ فطری طور سے ان کی خواہش تھی کہ ملازمت کی مدت میں توسیع کی کوئی صورت نکل آئے۔ ایک دن امان عباس نے ان کی اس خواہش کا ذکر کیا تو میں نے انھیں بتایا کہ مرکزی حکومت ملازمت میں توسیع کی پالیسی برسوں پہلے ترک کر چکی ہے اس لیے یہ تو شاید ممکن نہ ہو البتہ معاہدے کے تحت ملازمت کی صورت ضرور نکل سکتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ترسیل کی ناکامی کا المیہ جانے کہاں پیش آیا، میرے اور امان عباس کے درمیان یا امان عباس اور عرفان صدیقی کے درمیان کہ عرفان صاحب کو یہ خیال ہوا کہ میں ان کی ملازمت کی توسیع کے امکان سے خوش نہیں ہوں اور ہمارے انتہائی دوستانہ تعلقات میں دراڑ پڑ گئی۔ بہر حال ہوا وہی جو ہونا تھا۔ ملازمت کی توسیع تو ہوئی لیکن معاہدے کے تحت دہلی میں کام کی پیش کش کی گئی۔ معاہدے کی اس ملازمت میں مشاہرہ پہلے سے کم تھا چنانچہ انھوں نے بجا طور پر معذرت کر لی۔

عرفان صدیقی خوش پوش تھے ہمیشہ صاف ستھرے اور سلیقے سے سلے ہوئے کپڑوں میں نظر آتے۔ ان کے کپڑوں میں شکن در شکن تو دور کی بات میں نے ذرا سی بھی شکن کبھی نہیں دیکھی۔ وہ کم گو اور ذرا سے زود رنج ہونے کے باوجود پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے ہر کام میں وہ شاعری ہو یا دفتر کا کام رکھ رکھاؤ نمایاں تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کا انھیں یوں تو کوئی افسوس نہ تھا لیکن دس بجے دن سے قبل دفتر کے لیے

روانہ ہوجانے اور شام میں واپسی کی برسوں کی عادت یکایک ترک ہوجانے سے ان کو زندگی میں ایک طرح کے خلا کا احساس ضرور ہوتا۔ ''صحافت'' کے دفتر میں اب ان کا وقت زیادہ گزرتا۔ کام تو وہاں کچھ نہ تھا بس سگریٹ پیا کرتے۔ ان کے سگریٹ سے سگریٹ جلانے کا خیال آیا تو ایک پرانا واقعہ یاد آ گیا اور یہ بھی کہ تیس پینتیس برس قبل تک سگار اور پائپ بمشکل میرے ہاتھوں سے چھوٹتے تھے۔

میں عرفان صدیقی کو مسلسل سگریٹ نوشی پر ٹوکتا تو وہ میرے کھچڑی بالوں کا اتنا خیال کرتے کہ میری موجودگی میں ایک سگریٹ سے دوسری نہ جلاتے۔ ایک دن سہکارتا بھون میں کوئی ادبی جلسہ تھا اس کا اختتام قریب آیا تو ہم لوگ بھیڑ بھاڑ میں پھنس جانے کے خوف سے باہر آ کر باتیں کرنے لگے پھر میں سائیکل اسٹینڈ سے اسکوٹر حاصل کرنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ شروع میں آنے والی گاڑیوں سے گھرا ہے اور اسے حاصل کرنے میں کچھ وقت لگے گا چنانچہ دوستوں کے پاس لوٹ آیا۔ میں وہاں پہنچا تو عرفان صدیقی سگریٹ سے سگریٹ جلا رہے تھے جو مجھے دیکھتے ہی ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ ہم دونوں ہی مسکرا دیے۔ نیر مسعود بھی وہاں موجود تھے وہ بھی ہنس دیے۔ یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب روزنامہ صحافت کی اشاعت کا سلسلہ شروع بھی نہیں ہوا تھا۔

پریس انفارمیشن بیورو سے ترک تعلق کے بعد ایک دن ان کو اخبار کے دفتر میں مسلسل سگریٹ نوشی کرتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ وہ پہلے کی طرح مصروف ہوتے اور اخبار کے کاموں کا بوجھ ان پر ہوتا تو ممکن ہے ان کی طلب میں کمی آجاتی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ایک فیصلہ کرلیا اور تین چار دن بعد دوسری مصروفیات کا بہانا بنا کر روزنامہ صحافت سے مستعفی ہوگیا۔ امان عباس اور خود انھوں نے استعفے پر اصرار نہ کرنے کے لیے مجھ پر خاصا زور ڈالا لیکن میں کسی طرح تیار نہ ہوا اور وہ اخبار کے باقاعدہ ایڈیٹر ہوگئے۔ میرے اس فیصلے میں یہ خیال

بھی شامل تھا کہ ان سے خالی وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے۔

اسی دوران ایک دن وہ شہر یار کے ساتھ نصرت پبلشرز میں مسکراتے اور یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے ''اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں''۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد یہ ''سخت مقام'' ان کا حوالہ بن گیا دراصل معاملہ یہ تھا کہ وہ کسی سے زیادہ دنوں ناراض نہیں رہ سکتے تھے۔

ایک دن کسی نے بتایا کہ عرفان صاحب کی سگریٹ نوشی بہت بڑھ گئی ہے پھر چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ بیمار ہیں اور پی۔جی۔آئی میں داخل کردیے گئے ہیں۔ میں اگلے ہی دن مزاج پرسی کے لیے گیا تو اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھے تھے اور غالباً سیب کھا رہے تھے۔ صورت سے کچھ ایسے بیمار نہ لگے تو میں نے انھیں کا یہ شعر پڑھ دیا۔

ہوشیاری دلِ نادان بہت کرتا ہے
رنج کم سہتا ہے اعلان بہت کرتا ہے

خوش ہوئے اور باتیں شروع کردیں۔ سب سے پہلے نیر مسعود کے بارے میں پوچھا پھر چند دوسرے لوگوں کے بارے میں۔ میں نے چہرے پر تکان کے آثار اترتے ہوئے دیکھے تو پھر آنے کا وعدہ کر کے اجازت چاہی۔ یہ وہی دن تھا جب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے محکمہ کے ایک بڑے ڈاکٹر کو ان کی علالت کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ خوش تھے کہ دوستوں کو ان کی اتنی فکر ہے۔

کچھ دنوں بعد ان کو پی۔جی۔آئی سے چھٹی دے دی گئی لیکن اس وارننگ کے ساتھ کہ اب سگریٹ ان کے لیے زہر ہوگئی ہے۔ چند دنوں کے بعد میں مزاج پرسی کے لیے ان کے یہاں گیا تو وہ صحافت جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ کہنے لگے گھر میں لیٹے لیٹے اوب جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے قیصر باغ ہو آتا ہوں۔ سڑک پر انھوں نے پان کی دکان سے سگریٹ

کی آدھی ڈبیا خریدی۔ ایک اسی وقت جلائی اور مجھے دیکھ کر کچھ اس طرح مسکرائے جیسے کہہ رہے ہوں ''زندگی میں سب کچھ چلتا ہے'' ان کی یہ مسکراہٹ بجھی بجھی سی تھی۔ پھر ایک دن شاہنواز قریشی نے بتایا کہ دفتر سگریٹ پینے ہی آتے ہیں کہ گھر میں یہ ممکن نہیں۔

مشکل سے آٹھ دس دن بعد ان کی بجھی بجھی سی مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی اور اردو غزل وسیع امکانات سے محروم۔

اندیشۂ جاں خیمے کی دیوار تلک ہے
کچھ بھی نہیں ہوگا اگر اک بار نکل آئے

(2010)

☆☆☆

عرفان صدیقی

تیرے بغیر لکھنؤ دشتِ غزال کے بغیر

..................شعیب نظام (کانپور)

شاید یہ ۱۹۷۹ء یا ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ عرفان بھائی سے پہلی بار ایک سمینار میں ملاقات ہوئی تھی۔ میرے دوست انتظام بھائی نے تعارف کرنے سے پہلے دھیرے سے بتایا تھا کہ یہ بہت اہم اور بڑے شاعر ہیں مگر پہلی نظر میں وہ مجھے بڑے اور اہم کیا سرے سے شاعر ہی نہیں معلوم ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ میں تازہ تازہ بارہ بنکی سے لکھنؤ وارد ہوا تھا اور خمار بارہ بنکوی اور شمسی مینائی کو تو چھوڑیئے میں نے نگار اور عزیز بارہ بنکوی کو بھی کبھی شیروانی کے بغیر نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے بڑے شاعر کا تصور شیروانی کے بغیر میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ کیونکہ عرفان بھائی ٹائی اور نفیس سوٹ میں ملبوس تھے۔

ان دنوں میں اردو میں ایم اے کر رہا تھا اور بارہ بنکی سے لکھنؤ روز آتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی انتظام بھائی کا ساتھ ہو جاتا تھا۔ ان کے والی صاحب اور عابد سہیل صاحب سے تقریباً دوستانہ مراسم تھے۔ امین آباد میں چندر سائل اور کبھی کبھار کچھ کتابیں خریدی جاتیں اور والی آسی صاحب کے یہاں کچھ شاعروں اور ادیبوں سے ملاقاتیں بھی ہو جاتیں جن میں شام کو اکثر عرفان بھائی بھی آجاتے۔ والی صاحب کے یہاں شعر و ادب اور شخصیات پر بے تکلف گفتگو چلتی ہی رہتی تھی۔ وہ اس زمانے میں پروین شاکر، ظفر اقبال، ناصر کاظمی اور شکیب جلالی

کے اچھے اچھے شعر خوب سناتے تھے۔ بعد میں انھوں نے ان شعرا کے مجموعے شائع بھی کیے۔ شعر و ادب پر گفتگو کے بیچ بیچ میں مقامی اور بیرونی شخصیتوں پر کھل کر تبصرے روا بلکہ رواں رہتے جو تھوڑی دیر میں ذاتیات کی سرحدوں میں بھی داخل ہو جاتے۔ موضوعِ گفتگو زیادہ تر مشاعروں کے شاعر ہوتے تھے مگر کبھی کبھی اس دائرے میں ادیب اور دانشور حضرات بھی آجاتے تھے۔ گفتگو کی سطح کچھ بھی رہتی ہو مگر مزہ بہت آتا تھا۔ انھیں دنوں منور رانا نئے نئے والی آسی کے شاگرد ہوئے تھے۔ برابر آنے والوں میں رئیس انصاری، انور ندیم، حفیظ نعمانی، مسعود الحسن عثمانی، انجم ملیح آبادی اور حسن واصف عثمانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زیادہ تر مشاعروں کے معروف شعراء بھی کسی مشاعرے میں جاتے ہوئے یا لوٹتے ہوئے والی صاحب کے یہاں بیٹھے ہوئے مل جاتے تھے۔ اسی دور میں انور ندیم صاحب نے مشاعروں پر مبنی اپنے تاثرات مضامین کی شکل میں قلم بند کرنے شروع کر دئے تھے۔ جملوں کی کاٹ اور ان کی دھاردار نثر بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ بعد میں یہ مضامین ''جلتے توے کی مسکراہٹ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع بھی ہوئے۔

عرفان بھائی دفتر سے واپسی پر زیادہ تر والی صاحب کی دکان پر رک جاتے تھے۔ میں نے دھیرے دھیرے ایک خاص تبدیلی سی محسوس کی، بظاہر گفتگو پہلے کی طرح جاری رہتی مگر عرفان بھائی کے آنے پر کچھ لوگ محتاط سے ہو جاتے تھے۔ بہت فرمائش کرنے پر عرفان بھائی شعر سنا دیتے تھے۔ اب انتظام بھائی کے ساتھ کبھی کبھی میں ان کے دفتر بھی جانے لگا تھا یہاں وہ بہت محبت سے ملتے تھے اور فرمائش پر اپنے شعر بھی آسانی سے سنا دیتے تھے اب میں امین آباد سے بہت نزدیک گوئن روڈ واقع اپنے ماموں کے مکان میں رہنے لگا تھا جہاں سے عرفان بھائی کا گھر اور والی صاحب کی دکان کا فاصلہ بہت تھوڑا سا تھا۔

میں ایم اے فائنل میں تھا۔ اسی سال اردو کے نووارد طلباء میں شافع قدوائی،

رفعت عزمی، ندیم اشرف اور محسن خان بھی آ گئے جلد ہی ہم سب کی دوستی ہوگئی۔ اب ہم اکثر عرفان بھائی کے گھر آنے لگے۔ تھوڑے دنوں بعد شافع قدوائی نے قومی آواز جوائن کرلیا اور مجھے بھی عرفان بھائی نے اپنے دفتر میں لگالیا۔ دفتر کے بعد میں زیادہ تر عرفان بھائی کے ساتھ ہی امین آباد تک آتا تھا۔ دھیرے دھیرے عرفان بھائی دفتر سے سیدھے گھر آنے لگے اب والی صاحب کے یہاں رکنے کا سلسلہ خاصا کم ہوگیا تھا۔

گھر پر چائے وائے پینے کے بعد میں بھی عموماً ان کی طرف نکل آتا تھا وہ اکثر امین آباد کا ایک چکر لگانے کی فرمائش کرتے۔ راستے میں وہ کبھی کبھی میر کا شعر سناتے اور پھر اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے رہتے۔ انھیں چکروں کے طفیل غالب کی غزل اور محسن کاکوروی کی نعت گوئی پر عرفان بھائی کی گفتگو آج بھی میرے حافظہ میں کم و بیش محفوظ ہے۔ واپسی پر وہ زیادہ تر عزائم کے دفتر کی طرف مڑ جاتے۔ جمیل مہدی صاحب سے ان کی کچھ عجیب سی دوستی تھی۔ عرفان بھائی کمرے میں داخل ہوتے جمیل صاحب سر اٹھا کر دیکھتے ذرا سا مسکراتے پھر اپنا کام کرنے لگتے۔ عرفان بھائی ٹیلی پرنٹر سے کاغذ پھاڑتے اور محمد مسعود سے باتیں کرتے ہوئے ایک خبر ترجمہ کرتے اور کاغذ وہیں رکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ جمیل صاحب سر اٹھا کر انھیں جاتے ہوئے دیکھتے اور پھر لکھنے میں مشغول ہوجاتے۔ ملاقات کا یہ عجیب سا سلسلہ برابر جاری رہتا۔ میں حیران کہ یہ کون سا رشتہ ہے۔ کاہے کی دوستی ہے۔ ایک دن صبر جواب دے گیا اور میں نے پوچھ ہی لیا بھائی، جمیل صاحب آپ کے دوست ہیں مگر آپ لوگوں میں گفتگو تو ہوتی ہی نہیں ہے۔ عرفان بھائی مسکرا کر بولے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اور میں پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد انڈیا قلفی ہاؤس کی بالائی منزل پر پابندی کے ساتھ بیٹھک ہونے لگی۔ یہاں ایک میز تقریباً مخصوص ہوگئی تھی۔ اس نشست میں عرفان بھائی کے ساتھ عمر انصاری،

انجم ملیح آبادی، عرفان لکھنوی، شمس فرخ آبادی، افسر بسوانی صاحبان اور یاد دہلوی صاحبہ تقریباً روز ہی بیٹھنے لگے۔ شعر و شاعری کے علاوہ ادھر ادھر کی گفتگو رہتی جس میں ادب، تاریخ، ملکی اور ادبی سیاست اور ماضی کی یادیں سب کچھ شامل رہتا۔ میں یہاں تقریباً سامع کے فرائض انجام دیتا رہتا۔ اب امین آباد جانے کا راستہ الٹا ہو گیا تھا۔ یعنی عرفان بھائی اور میں والی صاحب کی دکان پر دو چار منٹ رکتے ہوئے عزائم کے دفتر جاتے، چند منٹ جمیل صاحب کو دیکھنے کے بعد نشست گاہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔ یہ نشست ساڑھے آٹھ کے آس پاس برخاست ہوتی۔ میں امین آباد ہی میں رک جاتا اور عرفان بھائی شمس صاحب کے ساتھ گھر چلے جاتے۔ اس کے بعد شافع قومی آواز سے آجاتے اور دس پانچ منٹ کے فرق سے ندیم اشرف اور محسن بھی اور ہم لوگ دیر رات تک کسی بے نام ہوٹل میں نامور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں الجھے رہتے۔ مگر ان دنوں ہم لوگ پڑھتے بہت تھے۔

اسی دوران سید محمد اشرف سول سروسز میں منتخب ہو کر ٹریننگ کے سلسلہ میں لکھنؤ آگئے تھے۔ وہ عرفان بھائی کے عزیز ہوتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی ان کا افسانہ 'ڈار سے بچھڑے' گفتگو میں شائع ہو کر لکھنؤ آچکا تھا اور عرفان بھائی کی نشاندہی پر ہم لوگ پڑھ چکے تھے۔ ویسے بھی اس افسانے کا ادبی حلقوں میں خاصا چرچا تھا۔ اشرف صاحب کی شکل میں ہم لوگوں کے ہاتھ ایک ابھرتا ہوا کیا پوری طرح سے ابھرا ہوا افسانہ نگار لگ گیا تھا۔ ان کے ساتھ متعدد نشستیں برپا کی گئیں۔ ان کے افسانوں پر جو داد وصول ہوئی تھی اس میں ہم لوگ بھی اپنے حصے کی خوشیاں تلاش لیتے تھے۔ اشرف صاحب، عرفان بھائی کی شاعری کے پرستار کیا تقریباً عاشق تھے اور انھیں عرفان بھائی کا بہت سا کلام حفظ تھا۔ ان کے افسانے ''منظر'' میں ایک کردار عرفان بھائی کا بھی ہے جسے بہت خلوص سے پیش کیا گیا ہے۔

اکثر شام کو اور خصوصاً اتوار کو عرفان بھائی کے گھر پر محفل سی رہتی تھی۔ جس میں

اشرف صاحب، شافع، ندیم اشرف اور کبھی کبھی محسن خاں بھی شریک رہتے تھے۔ ان محفلوں میں عرفان بھائی کا رویہ سرپرستوں والا ہوتا تھا۔ وہ گفتگو میں شریک بھی رہتے تھے اور نہیں بھی۔ ہاں ہم لوگوں سے فرمائش کر کے شعر بھی سنتے تھے اس زمانے میں شافع بھی شعر کہتے تھے۔ دوسروں کے عیب و ہنر گنوانے کا کام تب تک اس عزیز نے شروع نہیں کیا تھا۔ ہاں ندیم اشرف نے شعر گوئی کے ساتھ چھوٹی موٹی حرکتیں بھی شروع کر دی تھیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کر لیتا ہوں۔

عرفان بھائی اپنے گھر کے نیچے والے کمرے میں غزل سنا رہے تھے ابھی وہ مطلع ہی پر تھے۔

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچئے آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

ندیم کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے 'جی پرندہ اچھا' ۔عرفان بھائی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ بولے میں پہیلیاں نہیں بجھا رہا ہوں۔ کمرے میں ایک سناٹا۔ مگر چند لمحوں کے بعد وہ خود ہنس دیے اور اس دن ہم لوگ بقول شاعر بس ڈوبتے ڈوبتے بچ گئے۔

عرفان بھائی ہی کی سفارش پر ہم لوگوں نے پہلا ٹی، وی پروگرام پیش کیا تھا۔

ہم لوگوں کے علاوہ عرفان بھائی کے گھر پر آنے والوں میں آس زیدی، تصور حسین زیدی، شہنشاہ مرزا، وقار ناصری، محمد مسعود اور انجم ملیح آبادی خاص طور پر شامل تھے۔ انجم صاحب سے ان کے گھریلو مراسم تھے۔ جب کبھی شہریار صاحب آجاتے تھے تو عرفان بھائی کے گھر پر بڑی رونق رہتی تھی اور وہ بھی خوب شعر سناتے تھے۔

عرفان بھائی تحت میں شعر بہت عمدہ پڑھتے تھے۔ ان کے پڑھنے کا انداز بہت پرتاثیر اور دلکش ہوتا تھا اور شعر کی پوری معنویت روشن ہوجاتی تھی۔ اب تک بہت سی غزلوں

کے ساتھ ان کے پڑھنے کا مخصوص انداز کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ تخلیقی عمل ایک پراسرار تجربہ ہے وہ ایک نشست میں کئی کئی شعر آسانی سے کہہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی ایک رات میں پوری غزل مکمل ہو جاتی تھی۔ ان کی پہلی سامع زیادہ تر بی یعنی ان کی اہلیہ ہوتی تھیں جو خود بھی بہت صاحب ذوق خاتون ہیں۔ وہ شعروں میں ردوبدل بہت کم کرتے تھے۔ میں نے انھیں مصرع نوٹ کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے پورا شعر ہی ان پر نازل ہوتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ رہی ہوگی کہ جب تک ایک خاص کیفیت ان پر طاری نہیں ہو جاتی تھی وہ شعر نہیں کہتے تھے۔

دفتر میں جب زیب غوری اور ابوالحسنات صاحب یا شہریار صاحب آجاتے تھے تو کچھ گھنٹوں کے لئے ان کا کمرہ ڈرائنگ روم میں تبدیل ہو جاتا تھا میں بھی خاموشی سے آ کے بیٹھ جاتا۔ شعر و شاعری اور ادب پر خوب خوب باتیں ہوتیں۔ ابوالحسنات صاحب بولتے کم تھے مگر عرفان بھائی کو چاہتے بہت تھے۔ ویسے بھی زیب کی خوش گفتاری کے سامنے کسی اور کو بولنے کا موقع مشکل ہی سے ملتا تھا۔ زیب غوری زندگی سے بھرپور بہت نفیس اور وضعدار انسان تھے وہ جب بھی لکھنو آتے نیر بھائی اور عرفان بھائی سے ضرور ملتے تھے۔

نیر مسعود صاحب کے گھر پر ہم لوگ چھوٹی چھوٹی محفوظ نشستیں منعقد کیا کرتے تھے جن میں نیر بھائی کی ہدایت کے مطابق شرکا کی تعداد آٹھ۔ نو سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ان میں میرے اور عرفان بھائی کے علاوہ شہنشاہ مرزا، وقار ناصری، انیس اشفاق، شافع قدوائی اور کبھی کبھی تصور حسین زیدی، عثمان غنی، محسن خاں اور انیس انصاری صاحب بھی شریک ہوتے تھے۔ شروع شروع میں عرفان بھائی گفتگو میں شریک بھی ہوتے تھے۔ شعر بھی سناتے تھے مگر کھل کر بے تکلفی سے گفتگو نہیں کرتے تھے۔ یہ عام طور پر ان کا مزاج بھی تھا مگر دھیرے دھیرے نیر صاحب ان کے بہت اچھے اور بے تکلف دوست بن گئے۔ نیر بھائی بھی کبھی کبھی عرفان بھائی کے گھر آجاتے

تھے۔ دونوں ادب کے علاوہ ملبوسات، فلم، ڈرامے، تاریخ پتہ نہیں کن کن موضوعات پر ڈھیروں گفتگو کرتے رہتے۔ اس دوستی کے پیچھے مزاج اور اقدار کی ہم آہنگی اور ادب سے گہری وابستگی بنیادی وجہ رہی ہوگی۔ اسی دوران شمس الرحمٰن فاروقی صاحب بھی پی ایم جی ہوکر لکھنؤ آ گئے۔ اب دو کے بجائے تین دوست لکھنؤ میں یکجا ہو گئے تھے۔ یہ دور ادبی اور ذہنی آسودگی کے لحاظ سے عرفان بھائی کی زندگی کا سب سے بہترین دور کہا جاسکتا ہے۔ شب خون اور سوغات کے صفحات پر ان کی غزلیں اور نثری تحریریں اسی دور کی یادگار ہیں۔ ریڈیو پر تفہیم شعر کے سلسلہ کی ان تینوں حضرات کی گفتگو معرکہ کی چیز تھی۔ شعر کی تفہیم کے موضوع پر اس سطح کی علمی گفتگو بڑے بڑے سمیناروں میں بھی شاید ہی کبھی سننے کو ملتی ہو۔ بعد میں اس گفتگو کا بڑا حصہ تحریری شکل میں بھی شب خون میں شائع ہوا اور ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔

وہ اپنی شاعری کی طرح عام گفتگو میں بھی لفظوں کو بہت سلیقے اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اپنے چند مخصوص دوستوں کے علاوہ وہ احباب سے بھی زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے پن کے احساس کے ساتھ ایک خاص طرح کا حجاب بھی درمیان میں پڑا رہنے دیتے تھے۔ اس لئے دور سے دیکھنے والوں کو تھوڑا خشک مزاج سے نظر آتے تھے مگر درحقیقت وہ بہت نرم مزاج، شفیق اور وضعدار انسان تھے۔ ہاں جذبات کے بے محابا اظہار سے انھیں وحشت ہوتی تھی۔ مگر ان کا چہرہ آئینہ تمثال تھا اس میں ہر طرح کے جذبات فوراً اپنا عکس دکھا دیتے تھے ناگواری اور خوشی ان سے چھپائے نہیں چھپتی تھی۔

عرفان بھائی کے اندر Self Respect کا جذبہ بہت شدید تھا مگر وہ سخت غصہ کے عالم میں بھی اپنا آپا نہیں کھوتے تھے۔ ایک سمینار میں نارنگ صاحب کی تقریر کے دوران انھوں نے شاید نیر صاحب سے مخاطب ہوکر کوئی بات کہی۔ نارنگ صاحب کے احتجاج پر عرفان بھائی نے جواب دیا۔ معاف کیجئے گا میں سمینار سمجھ کر آ گیا تھا مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ آپ کا کلاس روم

ہے اور اٹھ کر چلے آئے۔

دوسرا واقعہ علی گڑھ کے ایک مشاعرہ کا ہے جس میں شہریار صاحب نے عرفان بھائی کو اور شاید ان کا ساتھ دینے کے لئے مجھے بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ ہم لوگ علی گڑھ پہونچے تو ہمارے رکنے کا انتظام گیسٹ ہاؤس کے ایک کشادہ سے کمرے میں کیا گیا۔ شام کو ہم لوگ شمشاد مارکیٹ کی طرف گھومنے نکل گئے مگر واپسی پر حیران رہ گئے کیونکہ ہمارا سامان کمرے میں موجود نہیں تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ جعفری صاحب اور نارنگ صاحب سمیت کچھ اور مہمان آئے ہیں اور شہریار صاحب نے کمرہ تبدیل کرا دیا ہے۔ یہ بات عرفان بھائی کو اتنی ناگوار گذری کہ انھوں نے مشاعرہ میں شرکت کے بجائے واپسی کا فیصلہ کرلیا اور اسٹیشن روانہ بھی ہوگئے مگر تب تک شہریار صاحب کو پتہ چل گیا تھا وہ بھاگے ہوئے آئے اور بڑی مشکلوں سے عرفان بھائی کو روکنے میں کامیاب ہوسکے۔ عرفان بھائی کو دراصل شکایت یہ تھی کہ کمرہ تبدیل کرنے سے پہلے انھیں بتایا کیوں نہیں گیا۔ مشاعرہ کے بعد بھی وہ اپنے کو پوری طرح نارمل نہیں کرسکے اور دیر تک جاگتے اور سگریٹ پیتے رہے۔ اس رات انھوں نے ایک عجیب سی بات کہی، بولے ''کبھی کبھی شہریار سے ڈر لگنے لگتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شخص انتہائی شریف ہے یا انتہائی منافق'' میرا خیال ہے کہ عرفان بھائی کی پہلی رائے ہی درست ہوگی۔

عرفان بھائی لکھنو سے بہت پیار کرتے تھے ان کا شعر ہے

چار طرف رمیدہ خو پائے ہوا صدائے ہو

میرے بغیر لکھنؤ دشتِ غزال کے بغیر

اور یہ واقعہ ہے کہ جب ان کا ٹرانسفر دوردرشن دہلی میں بحیثیت انگریزی نیوز ایڈیٹر کے ہوگیا تو وہ بہت افسردہ ہوگئے تھے جبکہ اس پوسٹ پر رہتے ہوئے مرکزی وزراء اور اعلیٰ افسران سے مراسم کے امکانات خاصے روشن تھے کیونکہ تب تک ڈش چلن میں نہیں آیا تھا اور دوردرشن کی

خبریں پورے ہندوستان میں بہت اہمیت رکھتی تھیں۔مگر عرفان بھائی کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔طمع کا ایک ذرہ بھی اس مٹی میں شامل نہیں تھا۔

ان کے جانے کے کچھ دنوں بعد میرا ایک انٹرویو کے سلسلہ میں دہلی جانا ہوا۔ظاہر ہے کہ میں سیدھا عرفان بھائی کے گھر گیا۔انھیں آر کے پورم میں ایک کشادہ سا سرکاری مکان مل گیا تھا مگر مجھے بہت حیرانی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ کئی کمرے بند ہیں اور ایک کمرے میں عرفان بھائی بستر لگائے تقریباً مسافرت کی سی زندگی بسر کررہے ہیں۔انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ بیوی بچوں سے کہہ کر آئے ہوں کہ بھائی تم لوگ بیٹھو میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔انھوں نے دہلی جاتے ہی لکھنؤ واپسی کی کوششیں شروع کردی تھیں۔اسی زمانے کا ان کا شعر ہے۔

ابھی کھلا بھی نہ تھا رختِ شوق دلّی میں
کہ پھر ہمیں کششِ لکھنؤ بلانے لگی

اور واقعی تھوڑے ہی دنوں میں وہ واپس لکھنؤ آگئے اور پھر وہی ہم وہی امین آباد۔

کچھ برسوں بعد ایک بار پھر ان کا تبادلہ کانپور ہوگیا۔میں ملازمت کے سلسلہ میں پہلے ہی کانپور آگیا تھا۔خوشی ہوئی کہ اب خوب ملاقاتیں رہیں گی مگر صرف تین ملاقاتیں ہی ہوسکیں کیونکہ جب میں کالج سے فرصت پاکر ان کے دفتر پہونچتا تو پتہ چلتا کہ وہ لکھنؤ روانہ ہوچکے ہیں۔تھوڑے دنوں بعد وہ پھر لکھنؤ پہونچ گئے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تو وہ کچھ اس طرح خوش نظر آئے جیسے کوئی دشوار اور لمبے سفر سے گھر واپس آکر خوش ہوتا ہے۔

دفتر میں ان کا رویہ کچھ اس طرح کا تھا کہ لوگ ان کے سامنے مؤدب اور محتاط سے رہتے تھے۔ہرچند وہ کسی کے ساتھ سختی سے پیش نہیں آتے تھے مگر وہ اپنے اسٹاف کے ساتھ صرف اتنی ہی گفتگو کرتے تھے جتنی ضروری ہوتی اس لئے اپنے پن کے احساس کے ساتھ ایک خاص طرح کی دوری بھی قائم رہتی تھی۔

عرفان بھائی دفتر سے گھر تقریباً روز ہی فون کرکے بی سے (اپنی اہلیہ) باتیں ضرور کرتے تھے۔فون پر ان کی آواز سرگوشی سے بلند شاید ہی کبھی ہوئی ہو یہاں تک کہ میز کے دوسری طرف بیٹھنے کے باوجود مجھے کچھ ادھورے لفظ یا بے ربط جملوں کے علاوہ پوری گفتگو کبھی نہیں سنائی دی۔وہ ویسے بھی فون پر بلند آواز میں گفتگو کرنا تو دور سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دن دفتر ہی کے ایک صاحب فون پر باآواز بلند کسی سے ہم کلام تھے۔عرفان بھائی ادھر سے گزرتے ہوئے رک گئے جب گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا تو بولے'' آپ ذرا سی اور کوشش کر لیتے تو فون کے بغیر بھی گفتگو ہو سکتی تھی''۔وہ عام طور پر نمبر ڈائل کرنے کے لئے انگلی کے بجائے قلم کا استعمال کرتے تھے۔

عرفان بھائی دوستوں کے جملوں اور لطیفوں پر بھی مسکرا دیتے تھے۔دل کھول کر ہنستے میں نے انھیں بہت کم موقعوں پر دیکھا اس وقت مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ہم لوگ ایک اتوار نیر صاحب کے یہاں گئے ہوئے تھے۔گفتگو کے دوران حسب دستور چائے آگئی عرفان بھائی نے چائے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ صاحب چائے تو عمدہ ہے ہی کراکری بہت نفیس ہے۔نیر صاحب مسکرا دئے۔دیر تک زہر کے اقسام اور درندوں کی فطرت جیسے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ظاہر ہے کہ میں سامع کے فرائض انجام دے کر عرفان بھائی کے ساتھ واپس آگیا۔تقریباً ہفتہ بھر بعد نیر صاحب نے عرفان بھائی کے یہاں آنے کا ارادہ ظاہر کیا اور مجھ سے کہا پوچھ لیجئے گا کوئی مصروفیت تو نہیں ہے۔عرفان بھائی بہت خوش ہوئے کہنے لگے بتا دیجئے گا درویش دن بھر انتظار کرے گا۔صبح نیر صاحب طے شدہ وقت پر آگئے۔ان کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا خیر دیر تک گفتگو جاری رہی، جاتے وقت نیر صاحب نے تھیلے سے اخبار میں لپٹی ہوئی ایک بھاری سی چیز نکال کر میز پر رکھ دی اور بولے یہ میں آپ کے لئے لیتا آیا تھا۔عرفان بھائی نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا، کیا چیز ہے۔نیر صاحب بولے آپ نے

اس دن کراکری کی تعریف کی تھی۔ اتفاق سے اسی کا دوسرا سیٹ مل گیا تو آپ کے لئے لیتا آیا۔
عرفان بھائی کچھ کہنا چاہتے تھے پھر چپ ہو گئے۔ نیر صاحب کے جاتے ہی تصور حسین زیدی صاحب آ گئے۔ ان کی نظر پیکٹ پر پڑی۔ عرفان بھائی نے مختصراً اس کی آمد کی روداد بیان کر دی اور بولے نیر صاحب اتنے شریف آدمی ہیں کہ اب ان کی کسی چیز کی تعریف کرنے سے پہلے سوچنا پڑے گا۔ زیدی صاحب برجستہ بولے۔ بھائی نیر صاحب کی شرافت اپنی جگہ مگر ٹی سیٹ سے یہ نتیجہ نکالنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کہ آپ ان کی جس چیز کی تعریف کر دیں گے وہ اسے تحفتاً آپ کو پیش ہی کر دیں گے۔ عرفان بھائی دل کھول کر دیر تک ہنستے رہے پھر بولے نہیں بھائی وہ واقعی بہت شریف آدمی ہیں۔

ہم لوگوں نے عرفان بھائی کے دہلی تبادلے کے موقع پر ''ایک شام عرفان صدیقی کے نام'' عنوان سے ایک پروگرام کا انعقاد بھی کیا تھا جس میں انھوں نے ایک شرط بھی رکھ دی تھی کہ میں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔ بس شریک ہو جاؤں گا۔ پروگرام بھی ٹھیک ٹھاک ہوا۔ بعد میں انھوں نے ہم سب کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ مگر اب احساس ہوتا ہے کہ وہ پروگرام ان کے شایان شان نہیں ہو سکا تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ تقریباً پچیس سال ادھر لکھنو میں ادب اور قدروں کی صحت بہت اچھی تھی ہم جیسے نو واردان ادب کی دعوت پر بھی تمام نامور ادباء اور شعراء کے پروگراموں میں برابر شریک ہوتے تھے اور بھرپور حوصلہ افزائی کرتے تھے مگر اب پتہ نہیں فاصلے حائل ہو گئے ہیں یا لوگ سچ مچ بہت مصروف ہو گئے ہیں۔ بہر حال اپنا لکھنؤ دھیرے دھیرے گذشتہ لکھنؤ یا گم شدہ لکھنؤ بنتا جا رہا ہے۔ خیر کم وبیش یہی صورت حال دوسرے شہروں کی بھی ہے۔

لکھنو سے ۸۶ء میں کانپور آنے کے بعد عرفان بھائی سے میرا رابطہ برابر قائم رہا۔ ان کی بیماری کے دنوں میں بھی ان سے دو تین ملاقاتیں رہیں۔ اسی دوران وہ کانپور کی ایک مخصوص ادبی نشست میں بھی شہریار صاحب کے ساتھ شریک ہوئے تھے مگر میں کسی مجبوری کی

وجہ سے اس پروگرام میں نہیں جاسکا تھا جس کا مجھے اب تک افسوس ہے۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد میں شاہد اختر اور ظفر غازی کے ساتھ عرفان بھائی کے گھر گیا۔ ملاقات پر وہ بہت خوش اور زندگی سے بھرپور نظر آئے اور بتایا کہ آپریشن کامیاب رہا۔ اب اوڈین سنیما ہال کے پاس کسی اچھے ہومیو پیتھ کا علاج چل رہا ہے جس سے وہ پوری طرح مطمئن ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے بھی خاصا اطمینان ہوا۔

دوسری مرتبہ شافع قدوائی اور ڈاکٹر عارف ایوبی کے ساتھ ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوا اور دیر تک کانپور کے احباب اور علی گڑھ کا ذکر رہا۔ وہ شاید خود بھی اپنی بیماری کو بھول گئے تھے ہم لوگوں کو بھی اس کا ذکر ضروری نہیں معلوم ہوا مگر تیسری بار شاہد اختر اور ظفر کے ساتھ میں نیر صاحب کی مزاج پرسی کے لئے لکھنؤ گیا تو انھوں نے بتایا کہ عرفان صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم لوگ عرفان بھائی کے گھر گئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اور جمیلہ بھابھی بھی عیادت کے لئے ان کے گھر آئے ہوئے تھے مگر وہ دوا کے اثر سے نیند اور غفلت کی ملی جلی کیفیت میں تھے، ملاقات نہیں ہوسکی بی بہت گھبرائی ہوئی تھیں ہم لوگ انھیں کھوکھلی سی تسلی دے کر مایوس واپس آ گئے۔ کچھ دنوں بعد ایک دوپہر ضیا فاروقی نے لکھنؤ سے فون پر اطلاع دی کہ عرفان بھائی کا انتقال ہوگیا ہے وہ وہیں ہیں اور مٹی اٹھنے والی ہے اور اتنا وقت نہیں ہے کہ میں کانپور سے آ کر ان کے آخری سفر میں شریک ہوسکوں۔ اس وقت میرا ہی ایک شعر میری کیفیت کی ترجمانی کررہا تھا۔

بس اک خبر سنی تھی کہ محسوس یوں ہوا
کچھ تھا جو میرے سینے کے اندر نہیں رہا

انھیں شروع سے ہی لکھنو کی سرزمین بہت پرکشش لگتی تھی اور آخر آخر وہ اسی زمین کے پیوند ہوگئے۔
شاعری میں وہ کسی گروپ کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں جدید شعراء

کی سکہ بند لفظیات دور دور تک نظر نہیں آئیں۔ یہاں نہ صحرا ہے نہ سایہ ہے نہ بے چہرگی ہے۔ نہ ان کے یہاں ترقی پسندوں والی انسان دوستی۔ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ظالم اور مظلوم کا رشتہ ہے جسے انھوں نے پوری تخلیقی توانائی اور فنکاری کے ساتھ برتا ہے۔ شاید یہی موضوع انھیں کربلا کے استعاروں کی طرف لے گیا۔ وہ ماضی کی طرف لالچ بھری نظروں سے مڑ مڑ کر دیکھنے کے قائل نہیں تھے بلکہ ماضی کی شعری اور تہذیبی روایات ان کی شاعری کی پشت پر ہمیشہ موجود رہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے بغیر بڑی شاعری ممکن ہی نہیں ہے مگر اردو والوں کی بھی تو اپنی روایت رہی ہے کہ وہ ہمیشہ دیر سے جاگتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب سورج سر پر آ گیا ہے۔ اب اردو والوں کو جاگنا ہی ہوگا۔

علم کے ساتھ ان کا معاملہ بہت ذاتی اور داخلی نوعیت کا تھا۔ انگریزی کے ساتھ فارسی اور سنسکرت ادبیات سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ کالی داس کی دو تخلیقات رت سنگھارم اور مالویکا اگنی متر کا انھوں نے بہت عمدہ منظوم ترجمہ پیش کیا۔ رابطہ عامہ پر انگریزی کی ایک مشہور کتاب کا اردو ترجمہ کیا...... وہ تقسیم کے پس منظر میں ایک ناول بھی لکھنے کا ارادہ کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہجرت کے موضوع پر تو خاصا لکھا گیا ہے مگر وہ جو یہاں رہ گئے اور راتوں رات جن کی دنیا بدل گئی اور پشتوں کے روابط اور مشترکہ تہذیب ایک ہی پل میں بے معنی ہوگئی۔ ان کا المیہ بھی ہجرت کرنے والوں سے کم نہیں ہے۔ یہ ایک بڑے ناول کا موضوع ہوسکتا ہے مگر اپنی مصروفیات یا شاعری سے گہرے سروکار کی وجہ سے وہ یہ ناول لکھ نہیں سکے ورنہ شاید اردو کو ایک اور اہم ناول مل جاتا۔

مجھے حیرت نہیں ہوتی جب میں سوچتا ہوں کہ عرفان بھائی کے انتقال سے پہلے فاروقی صاحب کے ایک تبصرے اور ابن فرید صاحب کے ایک تجزیہ کے علاوہ ان کی شاعری پر کوئی قابل ذکر تحریر کیوں نہیں لکھی گئی یا کربلا کے استعاروں کو پوری تخلیقی قوت کے ساتھ برتنے

کے باوجود اس موضوع پر لکھی گئی پروفیسر نارنگ کی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں ان کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ ان کو ان بڑے اعزازات اور انعامات سے کیوں نہیں نوازا گیا جن کے وہ بجا طور پر حقدار تھے۔

اصل میں ہمارے عہد میں جسے زمانہ سازی نہیں آتی یا جو خود کو اس پر آمادہ نہیں کر پاتا اسے کم سے کم اتنی تو قیمت ادا ہی کرنی پڑتی ہے۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ نفع وضرر کا پیمانہ اصل میں ہے کیا؟ میرے خیال میں جس کام سے انسان کا ضمیر مطمئن ہو اور سچی خوشی ملتی ہو وہی تو اس کا اصل منافع ہے اور جس کام سے ضمیر پر بوجھ محسوس ہو اور انسان کو دکھ پہونچے وہی اس کا خسارہ۔ اس نقطہ نظر سے عرفان بھائی نے عمر بھر منافع کا کاروبار کیا اور ہمیشہ خوش اور مطمئن رہے۔

انھوں نے تو بہت پہلے ہی اعلان کر دیا تھا۔

رکھنا یا فہرست میں تم مرا نام نہ رکھنا
مجھ کو اس انجمن سے کوئی کام نہ رکھنا

(2010)

اٹھو یہ منظرِ شب تاب دیکھنے کے لیے

اقبال اشہر (دہلی).................

محترم عرفان صدیقی سے میری پہلی ملاقات مئی ۲۰۰۲ء میں علامہ علیم اختر مظفر نگری کے فرزند اور عرفان صاحب کے جگری دوست ممتاز نثر نگار جناب عظیم اختر کے گھر پر ہوئی تھی۔ دلّی کے نئے ادبی منظر نامے کے منفرد شاعر جناب منیر ہمدم مجھے وہاں لے گئے تھے۔ عظیم صاحب نے ہمارا غائبانہ تعارف عرفان صاحب سے کرادیا تھا، وہ بڑی گرمجوشی اور محبت سے پیش آئے ویسے بھی عرفان صاحب سے ملنے کے اشتیاق نے اندر باہر کے موسم کو خوشگوار بنادیا تھا۔ کچھ دیر تک عرفان صاحب تیس سال پہلے کی دلّی اور موجودہ دلّی کے گلی کوچوں کا تقابلی جائزہ پیش کرتے رہے، پھر عظیم اختر صاحب نے کچھ حسین یادوں کی چلمنیں سرکادیں، موسم کچھ اور سہانا ہوگیا تھا، ہوا کچھ اور معطر ہو چلی تھی...... ہم دونوں نے موقع مناسب جان کر عرفان صاحب سے کچھ سنانے کی درخواست کی تو فرمایا ''عظیم نے آپ دونوں کی بہت تعریف کی ہے پہلے آپ اپنا کلام سنایئے تا کہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ میں کس ذہنی سطح کے لوگوں کے درمیان ہوں''۔ بہر حال تعمیل حکم کے طور پر پہلے میں نے دو غزلیں سنائیں پھر منیر ہمدم نے اپنا کلام پیش کیا تو عرفان صاحب نے مزید کچھ سننے کی خواہش ظاہر کی لہٰذا دو۔ دو غزلیں اور سنائی گئیں۔۔۔ عرفان صاحب بہت مسرور ہوئے بہت حوصلہ افزا کلمات سے نوازا۔۔۔ پھر ہم دونوں جگر تھام کے بیٹھ گئے کہ ہمارا پسندیدہ شاعر آمادۂ سخن ہوا چاہتا تھا۔۔۔ عرفان صدیقی کے

سحر انگیز لہجے نے سماعت کی رہگذر پر پہلا قدم رکھا۔

دل کا جو حال ہوا دشمن جانی کا نہ ہو
آخرِ شب کبھی آغاز کہانی کا نہ ہو

پھر نہ جانے ہم لوگ کتنی دیر تک انہیں سنتے اور سر دھنتے رہے وہ رات اور وہ ملاقات ابھی تک وقت کی دہلیز پر ٹھہری ہوئی ہے اور عرفان صدیقی کو انہیں کے الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کر رہی ہے۔

دیارِ دل میں کبھی صبح کا گجر نہ بجا
بس ایک درد کی شب ساری عمر ڈھلتی رہی

اگست ۲۰۰۲ء میں دلّی اردو اکادمی کے 'مشاعرۂ جشنِ آزادی'' کے موقع پر میری عرفان صدیقی سے دوسری اور آخری ملاقات ہوئی وہ مشاعرہ فکّی آڈی ٹوریم میں منعقد ہوا تھا۔ عرفان صاحب پچھلی ملاقات کی طرح اس بار بھی بڑے تپاک سے ملے، مجھے دیکھتے ہی گلے لگالیا اور مشاعروں کی زبوں حالی پر تبصرہ کررہے مشہور فکشن نگار مشرف عالم ذوقی سے کہا ''میاں اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں نوجوان شاعروں کی ایک صف آرہی ہے جو شاعری اور مشاعروں کو نئی جہت بخشے گی''۔۔۔لوگ کہتے ہیں اپریل ۲۰۰۴ء میں عرفان صاحب اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔۔۔مگر میری آنکھیں آج بھی اسی منظر میں قید ہیں۔۔۔میں آج بھی فکّی آڈی ٹوریم میں دونسلوں کو بغل گیر ہوتے دیکھ رہا ہوں۔۔۔شفقت کی گھنی چھاؤں اور مانوسیت کی دل نواز خوشبو نے آج بھی مجھے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔۔۔آج بھی میرے دل کا ایک مخصوص گوشہ عرفان صدیقی کے لئے مخصوص ہے۔۔۔یہاں کسی اور شاعر کو آنے جانے کی اجازت نہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد غزل کے بدلتے روپ سروپ اور تروتازہ ہوتے شعری منظر نامے

کو منور اور معطر کرنے میں عرفان صدیقی چراغ انجمن اور گل تر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مشاعروں سے ان کا تعلق واجبی سا تھا۔ ان کا کلام نقوش، فنون اور شب خون جیسے مؤقر جرائد کے توسط سے اردو دنیا تک پہنچتا تھا، وہ انتہائی بالغ نظر، مستقل مزاج اور رموز آشنا لوگوں کے شاعر تھے۔ اردو دنیا کے اس ممتاز طبقے سے عرفان صدیقی کی غزل اکثر مخاطب ہوا کرتی تھی۔

یوں سخن میں نکل آتے ہیں بہت سے پہلو
ویسے میں نے جو کہا ہے وہ کہا تم سے ہے
حرف کو عکس میں تبدیل کیا ہے تم نے
آئینے میں نے بنائے ہیں جلا تم سے ہے

حالانکہ عرفان صدیقی کی شاعری ایک خاص قسم کی ذہنی سطح کے لوگوں کی روحانی تسکین کا سرچشمہ تھی پھر بھی یہ کہنا نامناسب ہوگا کہ ان کی شہرت کا دائرہ محدود تھا میں نے ہندوپاک اور تمام خلیجی ممالک کے علاوہ امریکہ اور کناڈا میں بھی ان کے بے شمار چاہنے والے دیکھے ہیں اور ان سے عرفان صاحب کی شاعری کے بارے میں بہت سی باتیں بھی کی ہیں، لوگ انہیں جنون کی حد تک چاہتے ہیں۔ عموماً اردو زبان کے شعرا زندگی بھر کی جمع پونجی لگا کر اپنے مجموعے شائع کراتے ہیں پھر تحفتاً یا جبراً اپنے احباب اور اعزا کو بانٹتے ہیں ستم تو یہ کہ مفت ہاتھ آئے ان شعری مجموعوں کو بھی کوئی پڑھنا حتیٰ کہ رکھنا گوارا نہیں کرتا۔ اس افسوسناک بلکہ المناک صورتِ حال کے برعکس عرفان صدیقی کا شمار ان خوش نصیب شعرا میں ہوتا ہے جن کے شعری مجموعوں کو لوگ سینے سے لگا کر رکھتے ہیں بلکہ لوٹانے کی گارنٹی کے بغیر کسی کو پڑھنے کے لئے بھی نہیں دیتے۔

میں مارچ ۲۰۱۲ء میں جناب پروفیسر وسیم بریلوی، جناب ڈاکٹر راحت اندوری اور برادرِ عزیز منظر بھوپالی کے ساتھ ''شہر قائد'' کے مشاعروں میں شرکت کرنے کے لئے (پاکستان) گیا تھا۔ ان دنوں ہندوستان میں مشاعروں کا سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ وسیم صاحب

اور راحت بھائی دو مشاعروں کے لئے Committed تھے۔ میں اور منظر بھوپالی تیرہ دن کراچی میں رہے، ہمیں روز کسی نہ کسی مشاعرے یا نشست میں جانا پڑتا تھا۔ ان تیرہ دنوں کے قیام کے دوران شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب مجھے عرفان صدیقی کا کوئی چاہنے والا نہ ملا ہو، ہندوستان لوٹنے سے دو دن قبل ''شہر قائد'' کے روح رواں محترم اظہر عباس ہاشمی اور محترم افضال صدیقی نے ہمارے اعزاز میں ایک شعری نشست آراستہ کی تھی۔ نشست کے بعد میں نے ان سے پوچھا کیا آپ کے پاس عرفان صدیقی کی کلیات ''دریا'' ہے۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا، میں نے کہا مجھے ایک مدت سے اسکی تلاش ہے انہوں نے جواب دیا ''میں اپنی لائبریری کی تمام کتابیں آپ کو دے سکتا ہوں مگر ''دریا'' نہیں دے سکتا۔

تقریباً دس سال پہلے ممتاز افسانہ نگار اور دلّی دوردرشن پر اردو پروگراموں کے پروڈیوسر جناب انجم عثمانی سے عرفان بھائی کے بارے میں بات ہو رہی تھی، انہوں نے کہا ''حالانکہ میں بنیادی طور پر نثر کا آدمی ہوں لیکن شاعری کے رموز اور شاعروں کے مراتب سمجھتا ہوں، اگر آپ مرے گھر تشریف لائیں اور میری کتابوں کی الماری کو غور سے دیکھیں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہر مصنف یا شاعر کی کتاب کو حفظِ مراتب کے اعتبار سے رکھا گیا ہے، مثال کے طور پر عرفان صدیقی کا مجموعہ آپ کو غالبؔ کے مجموعے کے قریب رکھا ملے گا'' ۔۔۔ ایسے ہیں عرفان صدیقی کے چاہنے والے ۔۔۔ یوں سر چڑھ کر بولتا ہے عرفان صدیقی کی شاعری کا جادو ۔۔۔

اس کا نام ہی انتم سر ہے میری صدا کی سرگم کا
اس کے آگے سناٹا ہے کوئی اگر مجبور کرے

عرفان صدیقی کی شعری کائنات: نظریہ اور ڈکشن

کچھ اشعار شاعر کے نظریۂ شاعری کی کلید بن جاتے ہیں، مجھے اس وقت عرفان صدیقی کا ایک

شعر یاد آرہا ہے جوانکے عمیق عشقیہ احساس اور وسیع شعری کینوس کا ترجمان بن گیا ہے۔

مری عاشقی مری شاعری ہے سمندروں کی شناوری
وہی ہم کنار اُسے چاہنا وہی بے کنار اسے دیکھنا

عرفان صدیقی نے کم عمر میں اپنے دادا اکرام احمد شاؔد اور اپنے والد سلمان احمد ہلاؔل سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔۔۔ان کے ذہن و دل پر فارسی کی بلاغت اور فصاحت کے نقوش مرتب ہو گئے تھے۔۔۔شاید اسی لئے ان کا شعری ڈکشن فارسی آمیز تھا۔۔۔عربی زبان کی شد بد نے اس ڈکشن اور بھی تہ دار بنا دیا تھا۔ایک مکالمے کے دوران انہوں نے جناب نیر مسعود سے کہا تھا۔

''لفظ بہت پر اسرار بہت طاقتور اور بہت مقدس چیز ہے۔۔۔تو لفظ کے اسرار لفظ کی تقدیس اور لفظ کی گہرائیوں اور امکانات کی تلاش۔۔۔یہ تو ہر فنکار کا بنیادی فریضہ ہونا چاہئے ۔۔۔میں ہمیشہ لفظ کے استعمال پر ہفتوں سوچتا ہوں۔۔۔بلا مبالغہ ہفتوں۔۔۔میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ اپنے تمام تر تلازمات اور رموز کے ساتھ اس وقت تک ادا نہیں ہو گی جب تک کہ میں لفظ کے تمام تر امکانات اجاگر نہ کرلوں''

عرفان صدیقی شاعری میں کمالِ خوش بیانی کے قائل تھے ان کی غزل کو رسماً نہیں بلکہ حقیقتاً مرصع غزل کہنے کا جی چاہتا ہے۔۔۔الفاظ کو ان کے وسیع ترین معنی میں استعمال کرنے والے شاعر کے اس دعوے کو مبالغے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

شمعِ تنہا کی طرح صبح کے تارے جیسے
شہر میں ایک ہی دو ہوں گے ہمارے جیسے

غزل تو خیر ہر اہل سخن کا جادو ہے
مگر یہ نوک پلک میرے فن کا جادو ہے

ایک میں ہوں کہ اس آشوبِ نوا میں چپ ہوں
ورنہ دنیا مرے زخموں کی زباں بولتی ہے

کہاں سے آتے ہیں یہ گھر اجالتے ہوئے لفظ
چھپا ہے کیا مری مٹی میں ماہ پارہ کوئی

عرفان صدیقی کی عشقیہ شاعری۔ روحانیت سے لذتیت تک

۱۹۶۰ء کے بعد کی غزلیہ شاعری میں عشقیہ جذبات واحساسات کا وہ بہاؤ نظر نہیں آتا جس نے فیض اور جگر کو سرشار کیا تھا ہاں کبھی کبھی آفتابِ عشق کسی روزن کے توسل سے ناصر کاظمی، شکیب جلالی، احمد مشتاق، وسیم بریلوی اور بشیر بدر جیسے سنتوں کی کٹیا کو تھوڑا بہت منور ضرور کر دیتا ہے مگر روشنی تغزل کی حدوں تک نہیں پہنچتی خود عرفان صدیقی کے یہاں بھی 'کینوس' شب درمیاں اور ''سات سماوات' تک یہ نور سمٹا سمٹا سا نظر آتا ہے۔

وقت پھر جانے کہاں اس سے ملادے تجھ کو
اس قدر ترکِ ملاقات کا پندار نہ رکھ

وہ کہہ گیا ہے پھر آئیں گے ہم، اداس نہ ہو
تو ہم خوشی سے بھی چھوٹے ملال سے بھی گئے

رائگاں ہو گئے لمحے ترے پاس آنے کے
دکھ ابھی تازہ ہیں اوروں سے بچھڑ جانے کے

احوال ترا شام بدن میں بھی وہی ہے
باطن کی چمک سانولے پن میں بھی وہی ہے

آگے بڑھنے سے پہلے عرفان صدیقی کے پہلے مجموعہ کلام ''کینوس'' کے تین

شعروں کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ اس لئے کہ میں ان شعروں کو ''عشق نامہ'' کی عشقیہ شاعری کا ماخذ مانتا ہوں۔

ہائے وہ جسم کہ اک جی کی جلن ہے وہ بھی
اور سچ پوچھو تو سرمایۂ فن ہے وہ بھی
اس کی آنکھوں میں بھی رقصاں ہے وہی گرغوشوق
غالباً محرمِ اسرارِ بدن ہے وہ بھی
اس کے حلقے میں تگ وتاز کی وسعت ہے بہت
آہوئے شہر مری بانہوں کی زنجیر میں آ

مذکورہ اشعار ان حضرات کی خصوصی توجہ کے طالب ہیں جو ''عشق نامہ'' کی شاعری کو ''میر کے رنگ میں رنگنا'' یا استعارۂ کربلا سے فرار کا وسیلہ قرار دیتے ہیں، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ''عشق نامہ'' کے گھر اجالتے ہوئے لفظ مانگے کا اجالا نہیں بلکہ مٹی میں چھپے ہوئے ماہ پارے کی دین تھے۔ ''عشق نامہ'' میں یوں تو بہت سے رنگ ہیں اور سبھی رنگ ہوش رُبا ہیں۔ مگر ''ربطِ نوا'' چاہنے والی ''جانِ سخن'' کی بازیافت اور ''تجدیدِ عشق'' کا رنگ دل پر امٹ نقش چھوڑ جاتا ہے۔

شہاب چہرہ کوئی گم شدہ ستارہ کوئی
ہوا طلوع افق پر مرے دوبارہ کوئی
گماں نہ کر کہ ہوا ختم کارِ دل زدگاں
عجب نہیں کہ ہو اس راکھ میں شرارہ کوئی
آخرِ شب ہوئی آغاز کہانی اپنی
ہم نے پایا بھی تو اک عمر گنوا کر اسکو

ہم تو حیراں ہوئے جاتے تھے کہ اس نے آکر

شہر آباد کیا نہر صبا جاری کی

ہماری شاعری میں محبوب کے سراپے کا ذکر کوئی نئی بات نہیں میرؔ نے کہا تھا سراپا پہ جس جا نظر کیجئے۔ وہیں عمر ساری بسر کیجئے۔۔۔ ہاں شاعری بالخصوص غزل میں Eroticism کے اظہار کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں یوں بھی یہ راستہ خطروں سے خالی نہیں زبان و بیان کی ذرا سی لغزش ہوئی نہیں کہ شاعر رکالت کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ تلوار کی اس دھار پر غزل کی تہذیبی شائستگی کے ساتھ عرفان صدیقی جیسا قادالکلام شاعر ہی چل سکتا تھا۔

عجب گداز پرندے بدن میں اڑتے ہوئے

اسے گلے سے لگائے زمانہ ہوتا ہوا

جو رنگ خواب میں دیکھے نہیں وہ سامنے تھے

کھلا ہوا تھا نظر پر نگار خانہ ترا

وہ میرے ہاتھوں میں آئے ہوئے زمین وزماں

وہ میری خاک پہ بکھرا ہوا خزانہ ترا

میں ایک موج میں غرقاب ہو چکا تھا مگر

چھلک رہا تھا ابھی ساغرِ شبانہ ترا

میں بجھتا جاتا تھا لیکن کنارِ جوئے وصال

دھمک رہا تھا ابھی گوہرِ یگانہ ترا

میں تیری منزل جاں تک پہنچ تو سکتا ہوں

مگر یہ راہ بدن کی طرف سے آتی ہے

خیال میں ترا کھلنا مثال بند قبا
مگر گرفت میں آنا تو راز ہو جانا
وہ جاگنا مری خاکِ نوا میں نغموں کا
کسی کی انگلیوں کا نے نواز ہو جانا

غزل اور استعارۂ کربلا:

یہ بحث ایک مدت سے جاری ہے کہ افتخار عارف اور عرفان صدیقی میں کون بڑا شاعر ہے اور کس نے سب سے پہلے غزل میں کربلا کو ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا۔ میری معلومات کے مطابق اس سلسلے میں افتخار عارف کو نقشِ اول کی حیثیت حاصل ہے حالانکہ عرفان صدیقی کے پہلے مجموعۂ کلام ''کینوس'' میں کہیں کہیں اس استعارے کی جھلک ملتی ہے۔

تم جو کچھ چاہو وہ تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا تھا
تیز رفتار ہیں دشمن کے فرس تجھ سے سوا
میرے بعد اے مری بکھری ہوئی صف تُو بھی ہے
اب اس کے بعد گھنے جنگلوں کی منزل ہے
یہ وقت ہے کہ پلٹ جائیں ہمسفر میرے
سروں کے پھول سرِ نوکِ نیزہ ہنستے رہے
یہ فصل سوکھی ہوئی ٹہنیوں پہ پھلتی رہی
غربت کی دھول کیسے کسی کو دکھائی دے
میرے برہنہ سر کی ردا ہوگئی ہے شام

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد یہ کہنا نامناسب ہوگا کہ کربلا کو ایک استعارے کے طور پر برتنے کے سلسلے میں عرفان صدیقی کلی طور پر افتخار عارف سے متاثر تھے۔ یہ استعارہ پہلے سے ان کے شعری خمیر میں رچا بسا ہوا تھا۔ بہر حال اردو دنیا کے لئے دونوں شعرا لائق صد احترام ہیں، دونوں نے اپنے انداز سے غزل کو تنوع بخشا، دونوں کی محنتوں ریاضتوں اور عظمتوں کو سلام۔ آخر میں جملۂ معترضہ کے طور پر غزل کہنے والوں کی خدمت میں رؤف رضا کا ایک شعر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یہ استعارہ بہت پھیل سا گیا لوگو
جو کربلاؤں سے نکلو تو کچھ نیا ہوجائے

عرفان صدیقی اور ''تصوف''

کچھ عمائدین ادب کہتے ہیں کہ عرفان صدیقی کی شاعری زندگی سے نبرد آزما انسان کا استعارہ ہے، ذات کے گہرے داخلی رنگوں کی داستان ہے، کائنات کے انجان گوشوں کی جاں گداز تصویر کشی ہے۔۔۔۔ یہاں تصوف کی تلاش عبث ہے۔۔۔۔ میں کہتا ہوں جو شخص ایسی مملکتِ علم و معرفت (بدایوں) میں پیدا ہو کہ ''ہر گھر میں جس کے ایک مزارِ شہید ہے'' اگر وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کرے تو حیرت کیسی؟ آیئے آگے بڑھنے سے پہلے آپ کو روحانی نور و سرور کی اس کائنات کے کچھ گوشوں کی سیر کراتا ہوں جہاں عرفان صدیقی نے آنکھیں کھولیں۔ الفاظ کی ان نادر تصویروں کے مصور خود عرفان صدیقی ہیں۔۔۔۔

آئنہ چمکے تو ہوتا ہے سراپا روشن
دل جو روشن ہے مری جان تو دنیا روشن
کتنی گم گشتہ صداؤں سے خرابے آباد
خاکِ خاموش میں صدیوں کا دفینہ روشن

جاگتی راتوں میں لہراتے ہوئے حمد کے گیت
طاقِ مسجد میں کسی دل کی تمنا روشن
اجنبی دھوپ میں جلتے ہوئے رشتوں کے شجر
گھر کے آنگن میں مناجات کا پودا روشن
کانپتے ہاتھوں میں دلدار دعاؤں کے چراغ
اور اشکوں کے ستاروں سے مصلیٰ روشن

میرا خیال ہے تصوف ٹوپی۔ جبہ پوشی۔ لوبان۔ اگربتی۔ کھیلوں اور بتاشوں سے نہیں تزکیۂ نفس، صفائے قلب اور انکسار سے عبارت ہے اور عرفان صدیقی کی دل عزیز شخصیت میں یہ تمام اوصاف موجود تھے اور ان اوصاف کی چاندنی کہیں کہیں ان کی شاعری میں بھی منعکس ہوتی تھی۔

اتنا سادہ ہے مرا سایۂ خوبی کہ مجھے
کبھی عادت نہ رہی آئنہ برداری کی

مبصرین اور مقالہ نگاروں نے عنوان تصوف کے تحت کئی اشعار کوٹ کئے ہیں۔ میں ان تمام شعروں سے قصداً گریز کرتے ہوئے عشق نامہ کی صرف ایک غزل یاد دلا رہا ہوں جو عرفان صدیقی کے عرفانِ حق اور عرفانِ تصوف اور ان کے خانقاہی ورثے کی ترجمانی کرتی ہے۔۔۔

فقیر ہوں دل تکیہ نشیں ملا ہے مجھے
میاں کا صدقۂ تاج و نگیں ملا ہے مجھے
زباں کو خوش نہیں آتا کسی کا نان و نمک
عجب تبرکِ نانِ جویں ملا ہے مجھے
میں بوریا بھی اسی خاک پر کیا تھا بساط
سو یہ خریطۂ زر بھی یہیں ملا ہے مجھے

چراغِ گنبد و محراب بجھ گئے ہیں تمام
تو اک ستارۂ داغِ جبیں ملا ہے مجھے
یہ سر کہاں وہ کلاہِ چہار ترک کہاں
ابھی اجازۂ بیعت نہیں ملا ہے مجھے

تکمیل سفر کا احساس:

عرفان صدیقی کے بعض اشعار میں تکمیل سفر کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ ''عشق نامہ'' کی اشاعت کے بعد رؤف رضا، منیر ہمدم اور میرے درمیان کافی دنوں تک اس قسم کے اشعار موضوع بحث بنے رہے۔ کبھی ہم لوگوں نے ان شعروں کو ''عذابِ آگہی'' کا نام دیا تو کبھی ''آشوبِ آگہی'' کے عنوان سے تعبیر کیا۔۔۔

تمام جلنا جلانا فسانہ ہوتا ہوا
چراغ لمبے سفر پر روانہ ہوتا ہوا
یہ مرا وہم یا مجھ کو بلاتے ہیں وہ لوگ
کان بجتے ہیں کہ موجِ گزراں بولتی ہے
چاہتی ہے کہ کہیں مجھ کو بہا کر لے جائے
تم سے بڑھکر تو مجھے موجِ فنا چاہتی ہے
روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے
ہم پرندوں سے زیادہ تو نہیں ہیں آزاد
گھر کو چلتے ہیں کہ اب شام ہوا چاہتی ہے

عجیب لوگ تھے مجھ کو جلا کے چھوڑ گئے
عجب دیا ہوں طلوعِ سحر پہ راضی ہوں

''عشق نامہ'' کی اشاعت کے سات سال بعد یعنی ۲۰۰۴ء میں عرفان صدیقی ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ''تکمیل سفر کا احساس'' مکمل ہو گیا۔۔۔اندیشہ یقین گہرے درد میں تبدیل ہو گیا۔ عرفان صدیقی کی آخری غیر مطبوعہ غزل پروفیسر مغنی تبسم نے ''سب رس'' میں چھاپی تھی اس کے دو شعر یاد رہ گئے۔

پلٹ کے آئی صدا کس کے در سے آخری بار
یہ پوچھنا ہے دلِ بے خبر سے آخری بار
چلو کہ اس شبِ گریہ کو صبح تک لے جائیں
گزر رہا ہے یہ لشکر اِدھر سے آخری بار

اعتراف

میں نے اس مضمون میں عرفان صدیقی کی شاعری کے ان رنگوں اور ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جو مجھ سے مانوس ہو چلے تھے یا میری دسترس میں آچکے تھے۔۔۔ان کی شاعری میں بہت سے پہلو اور بہت سے رنگ اور بھی ہیں جو ابھی میرے محدود تنقیدی شعور کی رسائی سے باہر ہیں اور میری کیا اوقات و بساط اس عہد کے ممتاز اور قد آور نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی ''نیا دور'' کے عرفان صدیقی نمبر میں چھپے اپنے ایک مضمون میں یہ اعتراف کر چکے ہیں۔ ''عرفان صدیقی کے بارے میں لکھنا بہت مشکل کام تھا اور اب بھی مشکل ہے۔ ان کے اشعار کی تہہ داری ان کے لفظیات کا داستانی لیکن گہرا داخلی رنگ، ان کے تجربۂ عشق اور تجربۂ حیات کا دبدبہ اور طنطنہ یہ ایسی باتیں نہیں جن پر لفاظی اور انشا پردازی اور زورِ بیان کے ذریعے قابو پایا جا سکے۔''

(2015)

☆☆☆

تم سے بڑھ کر تو مجھے موجِ فنا چاہتی ہے

بنام عرفان صدیقی مرحوم

سعود عثمانی (لاہور)..................

غالباً انیس سو پچانوے یا چھیانوے کی بات ہوگی جب نامور ادبی پرچے سیارہ کے تازہ شمارے میں معروف باکمال ادیب و محقق جناب تحسین فراقی کا ایک مضمون شائع ہوا جو دراصل ایک مختصر سے اظہاریے کے ساتھ جناب عرفان صدیقی کی دو کتب شب درمیاں اور سات سماوات کا ایک انتخاب تھا۔ فراقی صاحب ان دنوں اور اس سے کچھ قبل ہندوستان کا سفر کئی بار کر چکے تھے اور جناب عرفان صدیقی صاحب کے شعری مقام و مرتبے سے آگاہ تھے۔

سچ یہ ہے کہ شعر و ادب سے گہری وابستگی اور خود شعر کہنے کے باوجود میری لاعلمی کا یہ حال تھا کہ میں عرفان صاحب کے نام اور کام سے زیادہ واقف نہ تھا ہاں اتنا ضرور تھا کہ نامور شاعر اور میرے قریبی رشتے دار جناب انور مسعود صاحب نے شاید انیس سو چوراسی یا پچاسی میں (ممکن ہے اس سے بھی پہلے) ایک خاندانی تقریب میں مجھے عرفان صاحب کا یہ مصرعہ سنایا تھا

اور پازیب کی جھنکار سے زینہ روشن

انور مسعود صاحب کو پہلا مصرعہ یاد نہیں تھا لہذا ہم یہ مصرعہ پڑھ پڑھ کر ہی اس کا لطف اٹھاتے رہے۔ تحسین فراقی صاحب کے اسی مضمون نے عرفان صدیقی کا تعارف مجھ سے کروایا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ ہندوستان کے شعراء کی غزلیں اور متفرق اشعار مجھ تک نہ پہنچتے رہے ہوں لیکن

ان شعروں کی غالب تعداد وہی تھی جو مشاعرے کے شعر سمجھے جاتے تھے اور جس میں وہ وسعت ،عمق اور پرت در پرت معانی نہیں تھے جس کا چسکہ مجھے پڑچکا تھا۔ایسے میں عرفان صاحب کے شعر پڑھتے ہی میں ان کا اسیر ہوگیا۔ یہ آواز جو میرے لیے اجنبی ہونے کے باوجود بے حد جانی پہچانی اور مانوس تھی بالکل ایسے ہی لگی جیسے کسی خوبصورت مگر نئے دیس میں پہلی بار ہونے والی بارش جو بہت اجنبی اور بہت آشنا ہو۔

یہ اشعار اسی وقت سے میرے حافظے کا حصہ بن گئے۔

اگلے دن کیا ہونے والا تھا کہ اب تک یاد ہے
انتظارِ صبح میں وہ سارے گھر کا جاگنا
یک بیک ہر روشنی کا ڈوب جانا اور پھر
آسماں پر اک طلسمِ سیم و زر کا جاگنا
یہ کس نے دست بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں نخلِ دعا نکل آئے
خدا کرے صفِ سردادگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

تم ہمیں ایک دن دشت میں چھوڑ کر چل دیے تھے تمہیں کیا خبر یا اخی
کتنے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر نکلنے میں یہ بال و پر یا اخی
زرد پتوں کے ٹھنڈے بدن اپنے ہاتھوں میں لے کر ہوا نے شجر سے کہا
اگلے موسم میں تجھ پر نئے برگ و بار آئیں گے تب تلک صبر کر یا اخی

(یا اخی کی اچھوتی ردیف میں یہ غزل ان کا ابتدائی تعارف بنی اور لوگ اس کا حوالہ دیا کرتے تھے۔اس ردیف میں بعد میں کئی دوستوں نے طبع آزمائی کی لیکن سچ یہی ہے کہ عرفان صدیقی

کی غزل اتنی بلند ہے کہ بعد کی کوئی غزل اسے نہیں پہنچتی)

یہ سرخ پھول سا کیا کھل رہا ہے نیزے پر
یہ کیا پرندہ ہے شاخِ شجر پہ وارا ہوا
ابھی زمیں پہ نشاں تھے عذابِ رفتہ کے
کہ پھر فلک پہ ہویدا وہی ستارہ ہوا
شاخ کے بعد زمیں سے بھی جدا ہونا ہے
برگِ افتادہ ابھی رقصِ ہوا ہونا ہے
ہم اپنے ذہن کی آب و ہوا میں زندہ ہیں
عجب درخت ہیں دشتِ بلا میں زندہ ہیں
ہوائے کوفۂ نامہرباں کو حیرت ہے
کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں
تو نے مٹی سے الجھنے کا نتیجہ دیکھا
ڈال دی میرے بدن نے تری تلوار پہ خاک
ہم نے مدت سے الٹ رکھا ہے کاسہ اپنا
دستِ دادار ، ترے درہم و دینار پہ خاک
رات اک شہر نے تازہ کیے منظر اپنے
نیند آنکھوں سے اڑی کھول کے شہپر اپنے
کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک
مسندِ خاک پہ بیٹھا ہوں برابر اپنے

مسندِ خاک پہ بیٹھے ہوئے اس سلطان کا یہ انتخاب میں نے بار بار پڑھا۔فراقی صاحب

کواس کی دادی اور عرفان صاحب کے بارے میں مزید معلومات کی کوششیں کیں۔ کچھ تہذیبی، کچھ معاشرتی اور کچھ ذہنی مماثلتیں ایسی تھیں کہ ان کے بارے میں زیادہ جاننے کو جی چاہتا تھا اور مسئلہ یہ تھا کہ ان کے بارے میں لوگ زیادہ جانتے نہیں تھے اور کتابیں ملنا تو گویا ناممکن تھا۔ کسی جگہ سے سات سماوات کی فوٹو کاپی ہاتھ لگی اور ہم چند دوستوں نے مل کر اس کا لطف اٹھایا۔ یہ ایک نشہ تھا جس میں بھیگا رہنا اچھا لگتا تھا۔ اس زمانے میں اوری انٹل کالج کے عزیز دوستوں، معین نظامی۔ شعیب احمد۔ مرغوب طاہر وغیرہ سے ملاقاتوں میں عرفان صدیقی کی شاعری مرکزی موضوعات میں سے ہوا کرتی تھی اور ہم دوست ایک نشے، ایک سرشاری میں اسے جرعہ جرعہ، گھونٹ گھونٹ پیا کرتے تھے۔

انیس سو ستانوے کے آخر میں میرا ہندوستان جانے کا پروگرام بنا۔ اس سے پہلے میرا ہندوستان جانا نہیں ہوا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ عزیزوں سے ملنے، گھومنے پھرنے کے ساتھ ایک بڑا محرک یہ تھا کہ عرفان صاحب سے بھی ملاقات کی جائے گی۔ ان دنوں بھی ہندوستان کا ویزا عام طور پر تین شہروں سے زیادہ کا نہیں ملتا تھا میں نے بھی تین بنیادی شہروں کا انتخاب کرنے کے بعد محض خانہ پری کے لیے مزید نو دس شہروں کے نام بغیر سوچے سمجھے لکھ دیے تھے کہ ویزا تو ملے گا نہیں بس فارم مکمل ہو جائے۔ لیکن ویزا آفیسر کی مہربانی ایسی ہوئی کہ وہ میرے لکھے ہوئے ہر شہر پر میرے روبرو صاد کرتا گیا صرف آگرہ پر یہ کہہ کر اعتراض کیا کہ وہ تو فوجی چھاؤنی ہے۔ میں نے بے ساختہ کہا آگرہ ہی تو ہندوستان کا تاج ہے۔ جانے کیا سوچ کر اس نے آگرہ پر بھی صاد کر دیا اور یوں یہ مرحلہ اس کی مہربانی سے میرے حسب منشاء پورا ہو گیا۔

جانے سے قبل جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کے مجلس ترقی ادب کے دفتر حاضر ہوا تو انہوں نے یہ کام میرے ذمے لگایا کہ عرفان صدیقی صاحب کی غزلیات فنون کے لیے حاصل کی جائیں۔ ندیم صاحب نے کہا کہ عرفان صاحب اب تک فنون میں نہیں چھپے ہیں اور میری

خواہش ہے کہ وہ اپنی تازہ چار غزلیات رسالے کے لیے عنایت کریں۔ میرے پاس عرفان صاحب کا لکھنؤ کا فون نمبر تھا جو میں نے ندیم صاحب کو پیش کر دیا۔ ندیم صاحب کی ایک غیر معمولی بات جو یاد کر کے کر آج بھی ان کی بڑائی محسوس ہوتی ہے ، یہ تھی کہ انھوں نے پندرہ خطوط مختلف شہروں کی مختلف شخصیات کے نام علیحدہ علیحدہ اپنے ہاتھ سے مجھے لکھ کر دیئے تا کہ ان سے میرا تعارف ہو سکے۔ وہ ایک ہی خط کی فوٹو کاپی کروا کر یا ٹائپ کروا کر اس کی نقول مجھے دے سکتے تھے لیکن انہوں نے ہر خط علیحدہ اپنے ہاتھ سے تحریر کیا۔ اور میرے لیے بہت تعریفی جملے ان میں لکھے۔ ایک نو وارد شاعر کے لیے یہ ان کی شفقت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

ایک خط عرفان صاحب کے نام بھی تھا۔ میں نے دہلی پہنچ کر عرفان صاحب کو فون کیا تو انہوں نے شناسائی کا اس وجہ سے بھی اظہار کیا کہ میں اپنی تازہ کتاب قوس انہیں ڈاک سے بھجوا چکا تھا اور اس لیے بھی کہ ندیم صاحب نے ان سے فون پر بات کر لی تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کا منتظر ہوں ، جب بھی پروگرام طے ہو مجھے اطلاع دیجیے اور میرے گھر پر ہی قیام کیجیے۔ میں نے اس محبت پر ان کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ صرف یہ زحمت کر دیجیے کہ اپنے گھر کے قریب کسی مناسب ہوٹل میں انتظام کروا دیجیے۔ نیز مجھے لکھنؤ میں پولیس رپورٹ کے لیے ایک مقامی پتہ درکار ہے۔ کیا میں آپ کا پتہ دے سکتا ہوں ۔ انہوں نے اظہار رضامندی کیا اور اس طرح فون پر بات ختم ہوئی۔ لیکن بات ختم کہاں ہوئی عظمت منزل ، گولہ گنج لکھنؤ کے الفاظ اس طرح ذہن نشین ہوئے کہ اب تک نہیں بھول سکا۔

چوبیس دسمبر انیس سو ستانوے کو لکھنؤ جانا ہوا۔ میرے ساتھ میرے ہندوستانی عزیز فرحان تھے۔ دھند اور سردی اتنی تھی کہ ٹرین بس رینگتی ہوئی چلتی رہی۔ خدا خدا کر کے علی الصبح ٹرین پہنچی۔ لکھنؤ میں ہوٹل میں سامان رکھنے کے بعد دس بجے صبح کے قریب عرفان صاحب تشریف لائے اور ان سے پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ایک مختصر الجثہ ، گہرے سانولے ،

کم آمیز، کم گو لیکن محبت بھرے شخص سے معانقہ ہوا جس کے ہنر کے سامنے بڑے بڑے شعراء اور ادیب سرنگم تھے اور جس کا مصرعہ سینوں سے دل نکال کرلے جاتا تھا۔

ایک تلخ یاد اس سلسلے کی یہ ہے کہ مختصر سی ملاقات کے بعد ہم سی آئی ڈی آفس لکھنؤ میں رپورٹ کروانے پہنچے۔ وہاں ایک نہایت ہی گھٹیا اہل کار سے سابقہ پڑا جو ہر طرح تنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ پانچ منٹ کے کام کے لیے اس نے ہمیں گھنٹوں بٹھائے رکھا۔ اور چونکہ عرفان صدیقی صاحب کا پتہ لکھا ہوا تھا، ان کے گھر بھی بار بار فون کر کے انہیں پریشان کرتا رہا۔ عرفان صاحب گھر پر نہیں تھے اس لیے ان سے بات ممکن نہ تھی۔ وہ ان کے اہل خانہ سے پوچھ گچھ کے انداز میں سوال جواب کرتا رہا اور میں بے حد شرمندہ ہوتا رہا کہ ہماری وجہ سے عرفان صاحب کو بے وجہ زحمت اٹھانی پڑ رہی ہے۔ بالآخر کئی گھنٹوں کے بعد اس مصیبت سے جان چھوٹی اور ہم ہوٹل پہنچے۔ عرفان صاحب نے ہم سے اس تکلیف پر معذرت کی حالانکہ معذرت تو مجھے کرنی تھی۔ اصل بات جو مجھے سمجھ میں آئی یہ تھی کہ عرفان صاحب محکمہ اطلاعات میں کام کرتے تھے۔ اس ادارے کی نیم حساس نوعیت کے پیش نظر، نیز اہل کار کے اپنے متعصبانہ رویے نے مل کر یہ مشکل پیدا کی۔ مجھے اب تک قلق ہے کہ عرفان صاحب کو اس دن ہماری وجہ سے زحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

عرفان صاحب بہت کشادہ دلی، اپنائیت اور محبت سے ملے۔ وہ فطرتاً کم آمیز اور کم گو تھے لیکن ان کی طبیعت مجھ سے کھل گئی۔ ہم غالباً دو دن اور دو رات لکھنؤ میں رہے۔ اور ہم پاکستان اور ہندوستان کے شعراء پر بات کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پاکستانی شعراء کی اچھی خاصی معلومات رکھتے تھے اور بدلتے رجحانات بھی ان کے سامنے تھے۔ اگرچہ انہوں نے براہ راست اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن وہ ہندوستان کے شعری منظر نامے سے قدرے شاکی نظر آئے اور یہ بات بھی محسوس ہوئی کہ وہ شعراء کی شعری ترجیحات سے بھی اختلاف رکھتے ہیں۔ صحبت ناجنس برا عذاب ہے اور یہ عذاب اس صورت

میں دگنا ہو جاتا ہے جب یہ شاعروں اور قلم کاروں کے یک جنس اور ہم قلم قبیلے کے اندر سے برآمد ہوتا ہو ۔عرفان صاحب بہت اکیلے نظر آئے ۔ایسے منفرد و یکتا شخص کو اکیلا ہونا ہی تھا اور شاید یہی ان کی غزل کو سیراب کرنے کا ایک قدرتی چشمہ بھی تھا۔

اگلے دن وہ ہمیں باکمال ادیب جناب پروفیسر نیر مسعود صاحب کے یہاں لے گئے۔عرفان صاحب سے نیر مسعود صاحب کا بہت گہرا تعلق تھا اور دونوں باکمال علم، وضعداری اور ادبی ترفع میں اپنی مثال آپ تھے، ہم نے اصرار کے ساتھ عرفان صاحب سے ان کی کئی غزلیں سنیں۔جن میں روشن ردیف کے ساتھ وہ کمال کی غزل مسلسل بھی تھی جو نیا قصیدہ کے نام سے کتاب میں شامل ہے

موجِ خوں نیلے سمندر کا سفر کرتی ہوئی
دجلہ روشن کبھی اس رنگ سے گنگا روشن

کانپتے ہاتھوں میں دل دار دعاؤں کے چراغ
اور اشکوں کے ستاروں سے مصلی روشن

شب کا لوبان سلگتا ہوا دالانوں میں
خانقاہوں میں خیالوں کا سویرا روشن

چھت پہ مہتاب نکلتا ہوا سرگوشی کا
اور پازیب کی جھنکار سے زینہ روشن

آؤ اب بند کریں کالی کتابیں ساری
رحل پر ہونے کو ہے سبز صحیفہ روشن

حاصلِ سیرِ بے دلاں ،کون و مکاں نہیں نہیں
کوئے حرم نہیں نہیں ، شہرِ بتاں نہیں نہیں

درد کی کیا بساط ہے جس پہ یہ پیچ و تاب ہو
دیکھ عزیز صبر صبر ، دیکھ میاں ، نہیں نہیں

وہ تازہ غزل بھی ان سے پہلی بار وہیں سننے کا اتفاق ہوا جو عشق نامہ میں شامل ہے

آؤ تمہاری نذر کریں ہم ایک چراغ حکایت کا
جب تک جاگو روشن رکھنا ، نیند آئے تو بجھا دینا
سینے کے ویرانے میں یہ خوشبو ایک کرامت ہے
ورنہ اتنا سہل نہیں تھا راکھ مین پھول کھلا دینا
خواجہ خضر سنو ہم کب سے اس بستی میں بھٹکتے ہیں
تم کو اگر تکلیف نہ ہو تو جنگل تک پہنچا دینا

اس کے علاوہ بھی کئی ایک غزلیں عرفان صاحب سے فرمائش کر کے سنی گئیں۔ ان دونوں سخن شناس سخنوروں کے سامنے اپنا کلام سنانے کی ہمت نہیں تھی لیکن ان کے حکم کی تعمیل کی اور بہت سے یادگار تعریفی جملے ان کی طرف سے عنایت ہوئے۔ اس موقع پر میں نے اپنے کیمرے سے کئی تصویریں کھینچیں جو نیر مسعود صاحب کی بیٹھک اور آنگن کے درخت تلے میں اتاری گئیں۔ افسوس کہ ان میں سے صرف ایک تصویر جو عرفان صاحب کی ہے اور بیٹھک میں اتاری گئی تھی، محفوظ رہ سکی ہے۔ اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ پچیس دسمبر ۱۹۹۷ کو کھینچی جانے والی یہ تصویر ایک یادگار کے طور پر اسی رسالے میں شامل کی جا رہی ہے۔

دو دن عرفان صاحب کے ساتھ خوب گھومنا پھرنا رہا۔ لکھنؤ کے مشہور کباب والے کے یہاں ان کی دعوت کا شرف حاصل ہوا۔ لکھنؤ کی خاص چکن کی کڑھائی کے مردانہ اور زنانہ کرتے مشہور ہیں۔ عرفان صاحب کے ایک واقف کی دکان سے ان کی ہمراہی میں ان کے مشورے اور کچھ صورتوں میں ان کی پسند سے خریداری کی گئی۔ ان کی تازہ کتاب عشق نامہ

انہی دنوں چھپ کر آئی تھی۔ انہوں نے اپنی خوبصورت تحریر اور دستخط کے ساتھ یہ کتاب مجھے بھی عطا کی۔ ان کی اس تحریر کا عکس بھی شامل کر رہا ہوں۔

عرفان صاحب نے شاید چھ کتب احمد ندیم قاسمی، تحسین فراقی، شہزاد احمد، صادق نسیم صاحب مرحوم وغیرہ کے لیے مجھے بطور امانت دیں۔ فنون کے لیے انہوں نے مجھے چار غزلیں بھی عنایت کیں جو واپسی پر ندیم صاحب کے سپرد کر دی گئیں اور بعد میں فنون کے اوراق کی زینت بنیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کا سبب میں بھی تھا۔ لکھنؤ کے انہی پراں شب و روز میں فرصت پاتے ہوئے میں ان سے مکالمے کی اپنی دیرینہ تشنگی مٹاتا، گاہے گاہے اپنے بے ربط سوال ان کے سامنے پیش کرتا اور ان سے براہ راست کلام سننے کا لطف اٹھاتا رہا۔ اس ملاقات کی یادگار وہ غیر مطبوعہ انٹرویو بھی ہے جو میں نے مسلسل ایک سے زائد نشستوں میں ان سے کیا اور ارادہ تھا کہ اسے صاف کر کے پاکستان میں کہیں چھپنے دے دوں گا۔ یہ انٹرویو غیر مطبوعہ، نادر، نایاب، تفصیلی، اور معاصر شعراء پر ان کی آراء کی منفرد خصوصیات تو رکھتا ہی تھا لیکن افسوس کہ اب اس میں گم گشتگی کا وصف بھی اس طرح شامل ہو گیا ہے کہ باوجود تلاش کے اپنے کاغذات میں کہیں مل نہیں پا رہا۔

اس سفر میں دہلی، لکھنؤ، آگرہ، متھرا، ممبئی، دیوبند، سہارن پور، تھانہ بھون۔ نانوتہ۔ جلال آباد، گنگوہ غرض بہت سے چھوٹے بڑے شہروں میں جانا ہوا اور بہت سے علمائے کرام، مشاہیر علم و ادب اور ہندوستان کے نمائندہ شعراء سے ملاقات ہوئی۔ کئی ایک مشاعرے پڑھے، انٹرویو دیے اور ایک مجموعی صورت حال کا اندازہ ہوا۔ کئی جگہ عرفان صاحب کا تذکرہ بھی رہا۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ اس بڑے غزل گو کی قدر اس طرح سے اہل ادب میں موجود نہیں ہے جس کے وہ بجا طور پر حقدار تھے۔ کئی ایک شاعروں نے تو با قاعدہ منفی رائے کا اظہار بھی کیا۔ جس کی وجہ بظاہر یہی تھی کہ عرفان صاحب کی تہذیبی اور اسلامی اساس ان کی

غزل کے رگ و ریشے میں پیوست تھی ۔ایک معروف شاعر نے طنزاً یہ بھی کہا کہ عرفان صاحب تو پاکستانی غزل لکھتے ہیں۔اس پر طرہ یہ کہ مشاعرے کے مخصوص پس منظر رکھنے والے شعراء کے نزدیک یہ کام سرے سے اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔

عرفان صدیقی سے دوسری ملاقات دو سال کے بعد غالباً انیس سو ننانوے میں اسلام آباد میں ہوئی جہاں وہ ڈاکٹر توصیف تبسم اور فیصل عجمی کی دعوت پر چند دن کے لیے تشریف لائے اور فیصل نے از راہ محبت اور عرفان صاحب سے میرے تعلق کے پیش نظر مجھے بھی اسلام آباد بلوا لیا۔انہی دنوں جناب ڈاکٹر توصیف تبسم صاحب کے زیرِ اہتمام عرفان صاحب کی اس وقت تک کی کلیات دریا شائع ہوئی تھی ۔ یہ بہت یادگار شب و روز تھے۔جس گھر میں قیام تھا اس میں عرفان صاحب کا اور میرا کمرہ ساتھ ساتھ تھا اور تمام وقت گپ شپ اور شاعری کے نشے میں گزرتا تھا۔۔کیا کیا محفلیں برپا ہوئیں ۔عرفان صدیقی، جناب ڈاکٹر توصیف تبسم جو عرفان صاحب کے قریبی رشتے دار بھی ہیں، ڈاکٹر ریاض مجید، اکٹر ریاض احمد ریاض۔ثمینہ راجہ مرحومہ جوان دنوں رسالہ آثار سے منسلک تھیں ۔فیصل عجمی اور سعود عثمانی۔مکمل فراغت کے ساتھ یہ تین چار دن ان اعلیٰ تخلیق کاروں کے ساتھ اس طرح گزرے کہ ویسی سرشاری شاید ہی اب کبھی نصیب ہو۔محفلوں کے ساتھ ساتھ فیصل عجمی کے اسی بنگلے پر ایک بڑے مشاعرے کا بھی انتظام کیا گیا جس میں راولپنڈی اور اسلام آباد کے کم و بیش تمام نامور لوگ شریک تھے۔صادق نسیم صاحب مرحوم مجھے خاص طور پر اس لیے یاد رہ گئے کہ ان سے پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔کیا یادگار مشاعرہ تھا۔نظامت توصیف تبسم صاحب نے کی اور عرفان صاحب سے بطور مہمان خصوصی بے شمار نئی اور پرانی غزلیں سنی گئیں ۔ یہ مبہوت کن کلام تا دیر جاری رہا۔اور ایسا لگتا تھا کہ ہم کسی اور زمین آسمان کسی اور جہان میں ہیں۔ یہ مشاعرہ معلوم نہیں ریکارڈ ہوا یا نہیں۔غالباً نہیں،لیکن مجھ جیسے عرفان صدیقی کے مداح کی سماعت میں آج بھی یہ شعر گونجتے ہیں

میں طلبگار بھی تھا کام کی آسانی کا
حکم ہے مجھ کو خرابوں کی نگہ بانی کا

اس ہوس میں کہ مرے ہاتھ نہ خالی رہ جائیں
کتنا نقصان ہوا ہے مری پیشانی کا

جسم میں جیسے لہو درویش گرداں کی طرح
لحظہ لحظہ پائے کوبی جابجا کرتا تھا رات

روشنی کی ایک سعیٔ رائیگاں کے باوجود
اک خلا آنکھوں سے منظر کو جدا کرتا تھا رات

کہا تھا تم نے کہ لاتا ہے کون عشق کی تاب
سو ہم جواب تمہارے سوال ہی کے تو ہیں

ذرا سی بات ہے دل میں اگر بیاں ہوجائے
تمام مسئلے اظہارِ حال ہی کے تو ہیں

چاہتی ہے کہ کہیں مجھ کو بہا کر لے جائے
تم سے بڑھ کر تو مجھے موجِ فنا چاہتی ہے

روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

میں جب تازہ تر تھا تو اکثر تصور میں عکس رخ دیگراں کھینچتا تھا
شبیہیں بناتا تھا اور ان کے اطراف نقش و نگار گماں کھینچتا تھا

عجب سلسلہ تھا وہ جنگ آزما خاک پر جاں بلب چھوڑ جاتے تھے مجھ کو
پسِ معرکہ ایک دستِ کرم میرے سینے سے نوک سناں کھینچتا تھا

تیرے تن کے بہت رنگ ہیں جانِ من اور نہاں دل کے نیرنگ خانوں میں ہیں

سامعہ لامسہ شامہ ذائقہ باصرہ سب مرے رازدانوں میں ہیں

ناقۂ حسن کی ہم رکابی کہاں ، خیمۂ ناز میں باریابی کہاں

ہم تو اے بانوئے کشورِ دل بری پاسداروں میں ہیں ۔ ساربانوں میں ہیں

اس مشاعرے ہی میں نہیں بلکہ عرفان صدیقی صاحب کے پورے قیام اسلام آباد کے دوران جناب افتخار عارف جوان دنوں اسلام آباد ہی میں تھے، ان سے ملاقات کے لیے نہیں آئے اور نہ ان سے کوئی رابطہ کیا۔ خود افتخار صاحب کا تعلق بھی لکھنؤ ہی سے ہے۔ یہ گریز جس کے اسباب مجھے معلوم نہیں، عرفان صدیقی پر بہت گراں گزرا۔ یہ بات مجھے اس لیے علم ہے کہ انہوں نے کئی بار ناراضگی آمیز تاسف کا اظہار مجھ سے بھی کیا اور مختلف افراد سے بھی۔ تین دن اکٹھے گزارنے کے بعد مجھے لاہور جانا تھا اور عرفان صاحب کو کراچی۔ سو بادل نخواستہ جدا ہوئے۔ میں نے پوچھا عرفان صاحب اب تو آپ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اب تو جلد جلد پاکستان آیا کیجیے تو جواب میں جو شعر انہوں نے پڑھا وہ انہی کے لہجے میں اب بھی کانوں میں گونج رہا ہے

کیا سبب ہے کہ فلک چھو نہیں پاتے ہم لوگ

اب تو وہ مسئلہ ء بے پر و بالی بھی نہیں

اور یہ شعر سنا ہے تو اسی غزل کا ایک اور شعر بھی سنتے جایئے

سرِ شوریدہ کو تہذیب سکھا بیٹھا ہوں

ورنہ دیوار مجھے روکنے والی بھی نہیں

یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ ظاہر ہے اس وقت کون سوچ سکتا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ اس وقت تو یہی لگتا تھا کہ سال دو سال کے وقفے کے بعد پھر ملیں گے۔ لیکن پھر

جب ملی تو ان کی علالت کی خبر اور پھر اس کے بعد وہ خبر جو نہ ہی ملی ہوتی تو اچھا تھا۔

بعض لوگوں سے ملاقاتیں کم اور تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ عرفان صدیقی سے میرا تعلق ایسا ہی تھا۔ لیکن ان سے زیادہ میرا تعلق ان کی غزل سے تھا جس سے میری ملاقاتیں بھی ان گنت ہیں۔ یہ خالص تعلق کی وہ قسم ہے جس میں زمان، مکان اور زبان بھی کے سہ ابعاد بھی اپنی جہتیں کھونے لگتے ہیں اور بس ایک بولنے والا اور ایک سننے والا گونجتے رہ جاتے ہیں۔

اسلامی تہذیبی روایات، فارسی تراکیب، امت مسلمہ کی مجموعی صورت حال اور ہندوستان میں مسلمانوں کے خصوصی مسائل۔ عرفان کی غزل میں اس ہنر مندی سے یہ سب کچھ سمویا ہوا ہے کہ غزل بیک وقت آگے بھی بڑھتی رہتی ہے اور پیچھے کا سفر بھی کرتی جاتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی پاسداری یا عرفان صاحب کے الفاظ میں خرابوں کی نگہبانی کا کام دیکھیں تو یہ بیک وقت اتنا کٹھن اور اتنا اہم کام ہے کہ اس کا بیڑا اٹھانا بھی ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں۔ ن کی غزل میں ایک خاموش تہذیبی اور تاریخی شعور رہ کر اسی طرح بولتا ہے جیسے ایک گہرے سناٹے میں بولنے والے کی آواز میں اس کے اطراف کا سکوت بھی شامل ہو جائے۔

عرفان صاحب کی قدر و منزلت اہل نظر اچھی طرح سمجھتے تھے اور میں نے بارہا ان شاعروں سے بھی ان کے لیے ستائشی کلمات سنے جو عام طور پر معاصر شعراء کی تعریف سے گریز بھی کرتے تھے اور جن سے عرفان صاحب کی دوستی بھی نہیں تھی کہ سوچا جائے کہ انہوں نے حق دوستی نبھایا ہے۔ ایک دل چسپ واقعہ مجھے یاد ہے کہ عرفان صاحب کے انتقال کے بعد ۲۰۰۶ میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں اودے پور، راجستھان جانا ہوا۔ پاکستان سے احمد فراز، امجد اسلام امجد، سعود عثمانی، عنبرین حسیب عنبر۔ اور ہندوستان سے شہریار، وسیم بریلوی، منور رعنا، منصور عثمانی، عازم گروندر کوہلی اور دیگر تمام نمائندہ شعراء

شریک تھے۔ اودے پور میں پاکستانی شعراء، گروندر کوہلی اور جناب شہر یار کو جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا وہ معیار میں تو اچھا تھا لیکن سختی سے سبزی خور مینو پر کار بند تھا۔ لہذا قیام کرتے ہی گوشت تو درکنار انڈے تک سے ہمارا جبری پرہیز شروع ہو گیا۔ یہ صورت حال ویسے تو سب کے لیے ہی غیر متوقع بلکہ ناگوار تھی لیکن فراز صاحب اکتاہٹ اور غصے کی جس ملی جلی کیفیت میں تھے اس کے لیے موزوں لفظ ابھی مجھے نہیں مل رہا۔ دو تین دن قیام میں ناشتے، دوپہر اور رات کے کھانوں نیز چائے پر ملاقات اکٹھے ہوتی تھی۔ اور اس میں منتظمین اور گوشت دونوں کی مسلسل غیر حاضری پر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ جناب شہر یار اور احمد فراز موجود لوگوں میں سب سے زیادہ سینیئر اور سب سے زیادہ مردم بیزار تھے اور اول الذکر حیثیت کا احساس انہیں بھی بخوبی تھا۔ چنانچہ کوئی نہ کوئی جملہ یا موضوع بحث برے وقت کی طرح اچانک آن پڑتا تھا۔ ایسے جملوں کے بعد مکمل سکوت، احترام اور توجہ کے ساتھ سبزیاں کھائی جاتی تھیں۔

ایک دن کسی کھانے پر ایسا ہوا کہ ہندوستان کے شعراء اور شاعری کا ذکر نکلا۔ میرے منہ سے اچانک نکل گیا کہ ہندوستان میں تو ایک ہی شاعر تھا اور وہ تھا عرفان صدیقی۔ جملہ کہتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ مجھے شہر یار کی موجودگی میں یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا اب میری کمبختی آئی۔ آج میں تو کیا میری سبزیاں بھی ذبح ہو جائیں گی۔ لیکن میری خوش قسمتی کہ جملہ سنتے ہی میرے بالکل سامنے بیٹھے ہوئے فراز صاحب نے کہا بالکل درست۔ انڈیا میں ایک ہی شاعر تھا اور وہ تھا عرفان۔ شہر یار تو جیسے تلملا گئے۔ انہوں نے پاکستانی شاعروں اور پاکستانی شاعری پر طویل اور بلیغ تبصرے کیے جس میں سے غصے کو نکال دیا جائے تو کوئی خاص بات نہیں بچتی تھی۔ فراز صاحب بھی ان سے بھڑ گئے۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ میری طرف سے شہر یار کی توجہ ہٹ گئی لیکن بات عرفان صاحب پر بھی نہیں ہوئی بلکہ عمومی طور پر بات

ہوتی رہی ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس قیام کے دوران یہ واحد مکالمہ تھا جس میں فراز صاحب نے ہم میں سے کسی کی بات کی تائید کی اور ہم ان کی حمایت میں بولے۔

میرے لیے اس واقعے میں دونوں رویے غیر متوقع تھے ۔ فراز صاحب کا عرفان صدیقی کے لیے اس طرح بات کرنا اور شہریار کا عرفان صاحب کے لیے اس طرح بات نہ کرنا۔ یہ ان دونوں ناموروں کا کمال تھا لیکن اصل کمال عرفان صدیقی کی غزل کا ہی تھا۔ سچ یہ ہے کہ مجھے فراز صاحب کی بہت قدر ہوئی اور اس بات کی ایک بار پھر تصدیق ہوئی کہ جس کی شاعری کو وہ دل سے مانتے تھے اس کا اظہار وہ برملا کرتے تھے حالانکہ عرفان صاحب سے ان کا کوئی دوستی کا تعلق نہیں تھا۔

میرے خیال میں عرفان صدیقی ہندوستان سے وہ واحد شاعر تھے جن کی غزل کو پاکستان میں نہ صرف سب سے زیادہ سراہا گیا بلکہ ان کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی گئیں اور ان کے اسلوب کا بھی اتباع کیا گیا۔ یہاں مراد ایک مجموعی تاثر ہے۔ انفرادی طور پر عرفان صاحب کی کتابوں میں بھی درجات موجود ہیں اور ان کی غزلوں میں بھی۔ ان کی نظم بھی یہاں زیر بحث نہیں ہے کہ ان کی بنیادی شناخت غزل ہی تھی ۔ مجھے بہت بار یہ محسوس ہوا کہ عرفان صاحب کے گھرانے کے مخصوص مذہبی پس منظر اور ثقافتی رخ نے ان کی غزل کی اساس کا کام کیا ہے اس پر مختلف علوم، زبانوں، تہذیبوں، پاک و ہند کے مخصوص حالات اور اس دور میں تیزی سے بدلتے زمین آسمان کے قریبی مطالعے اور مشاہدے نے ان کا اپنا اور ان کی غزل کا وہ مزاج متعین کیا جو ہم سب کے دلوں کے قریب تھا۔ ان کی غزل ایک تہذیب کی بازیافت ہے اور یہ تہذیب ان کی غزل کی دریافت ۔ اور یہ دونوں مل کر انکے شعری مزاج کی اس طرح تشکیل کرتے ہیں جیسے رنگ برنگ مشروب اس طرح ملا دئے جائیں کہ ایک ہی رنگ نظر آئے اور انہیں علیحدہ علیحدہ کرنا ممکن نہ رہے۔

ہم سب آئینہ در آئینہ در آئینہ ہیں
کیا خبر کون کہاں کس کی طرف دیکھتا ہے

عرفان صاحب! آپ جانتے ہیں کہ بہت کم ہوتا ہے کہ بات تو ایک شخص کرے لیکن بہت سی آوازیں اس کی آواز میں بولتی ہوں۔ آپ کی آواز چپ ہوئی سو ہوئی لیکن اب ہم ان آوازوں کو بھی شاید کبھی نہیں سن پائیں گے۔ سو دکھ ایک شخص کا نہیں ایک پورے قبیلے کا ہے۔

(2015)

عرفان ذات

.................منیر ہمدم (دہلی)

اقبال اشہر نے فون پر مجھ سے کہا۔منیر بھائی آپکو عرفان صدیقی صاحب کے لئے کچھ لکھنا ہے۔تو میری آنکھوں کے سامنے بے شمار ستارے جھلملانے لگے،عرفان صدیقی کے اشعار کی طرح۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے،ایک روز عظیم اختر صاحب نے فون پر مجھ سے کہا۔منیر عرفان آئے ہوئے ہیں تم رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔عرفان سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔رات میں (منیر ہمدم) اور اقبال اشہر عظیم بھائی کے گھر گئے۔ عرفان بھائی نے ہم دونوں کا کلام سنا۔ بہت داد اور دعاؤں سے نوازا۔ بعد میں ہم نے عرفان بھائی سے انکا کلام سنا۔وہ ملاقات اور اسکے بعد کی کئی ملاقاتیں آج بھی ہمارے ذہن میں تازہ ہیں۔

اللہ کے کچھ ہی ایسے بندے ہوتے ہیں جنہیں اپنی ذات اور کائنات کا عرفان ہوتا ہے۔ عرفان بھائی انہی میں سے ایک تھے۔دیکھنے میں دبلے پتلے عرفان بھائی۔معلوم نہیں ......کتنی دنیاؤں کا بوجھ اُٹھائے گھوم رہے تھے۔ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ۔ آنکھوں میں چمکتے ہوئے لاتعداد سیارے۔ عرفان بھائی۔اب اس منزل میں تھے جہاں ان کے لئے دین، دنیا، مذہب، ساجد کہ سکھ۔سب برابر تھے۔وہ روح،جسم،عشق، بدن کی قید سے بہت آگے نکل گئے تھے،تبھی تو ان کے ایک ایک لفظ سے ہزار، ہزار معنی دریافت ہوتے ہیں! تب ......آپ اور میں ......حیرتوں کے گہرے سمندروں میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں۔ان کی

خوبصورت شاعری ہمارے لئے خدا کا ایک نایاب تحفہ ہے۔

عرفان بھائی کا اسلوب، لفظوں کو برتنے کا سلیقہ بہت جدا تھا۔ لہجے کی انفراد
کے لئے مطلع پیش ہے

اٹھو یہ منظر شب تاب دیکھنے کے لئے
کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لئے

عرفان صدیقی جتنے عظیم شاعر تھے اتنے ہی شاندار اور باوقار انسان بھی تھے۔ عر
بھائی سے ہمارا رشتہ آنکھ اور آنسو کا تھا۔ جو تا عمر قائم رہے گا۔ جب کبھی عرفان بھائی کی شاعر
شخصیت کی بات ہوتی ہے تو۔ ہماری آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں۔ جب بھی ان کا کوئی شعر پڑ
سنتے ہیں تو وہ روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا عرفان صدیقی احسا
خلوص، صداقت اور جذبے کے شاعر تھے، جسے ہم محسوس تو کر سکتے ہیں مگر چھو نہیں سکے۔

(2015)

☆☆☆

تفہیمِ عرفان

نقد و نظر

سجا کے آئنۂ حرف پیشِ آئینہ
ہم اک کرن سے ہزار آفتاب ڈھالتے ہیں

سات سمٰوات

..................شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)

کبھی کبھی کوئی کتاب ایسی بھی بازار میں آجاتی ہے جسے اپنے زمانے کی کتاب تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ آج کے شعر سے زیادہ مستقبل کا پتہ دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ کسی دور دراز منزل کی بھی آوازیں اس کے لہجے کی تہ میں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ''سات سمٰوات'' ایسی ہی ایک کتاب ہے۔ آج جب کہ دو مصرعے موزوں کر کے بازارِ سخن میں یوسف غزل کی خریداری کا دعویٰ کرنے والے بہت سے ہیں اور آج جب کہ غزل کے نام نہاد انتشار خیال کے شاکی بھی کچھ کم نہیں، اور کوئی ہائیکو، کوئی ماہیا، کوئی ترائلے (خدا جانے یہ کس چیز کا نام ہے؟) کو بغل میں دبائے توتلی زبان میں شہنشاہ سخن ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے تو کوئی جدیدیت سے ہٹ کر اپنی راہ نکالنے کے فریب میں مبتلا ہے، عرفان صدیقی کی غزل ہی ایسی غزل ہے جو جدیدیت کی راہ میں اگلا قدم کہی جا سکتی ہے۔

تنقید کی ایک بیماری یہ بھی ہے کہ وہ فن کار کو چند جملوں (اور ہو سکے تو ایک جملے بلکہ ایک فقرے) میں محصور کر دینا چاہتی ہے۔ یہ چلن مشاعرے کی نظامت کرنے والے نیم خواندہ اساتذہ اور متشاعروں نے اور بھی عام کیا ہے۔ ''فلاں کے یہاں رنگ و آہنگ کا امتزاج ہے۔'' ، ''فلاں کے یہاں فکر کے ساتھ فن کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔''، ''فلاں کے یہاں کلاسیکی اقدار کی پاسداری اور جدید لہجے کا التزام نظر آتا ہے۔'' اس بات سے قطع نظر کہ یہ سب فقرے مہمل ہیں،

یہ اصول ہی غلط ہے کہ کسی شاعر، اور خاص کر اچھے شاعر کو چند فقروں میں چلتا کر دیا جائے۔ تبصروں اور مختصر تعارفی مضامین، رسم اجرا کے موقعے پر پڑھے جانے والے توصیف ناموں اور تنقیدی شعور کی ناکامی کے باعث، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تنقید کے پاس اچھی شاعری کو بیان کرنے کے لیے مناسب اصطلاحوں کی کمی کے باعث، آج سب سے زیادہ ستم عرفان صدیقی جیسے شعراء پر ہو رہا ہے، جن کی شاعری تفصیلی اور باریک بین مطالعے کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ شاعری اصرار کرتی ہے کہ معاصر ادبی منظر میں، اور گذشتہ غزل کے پس منظر میں اس کا مقام متعین کیا جائے۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ بعض علامتیں اور پیکر جن کا تعلق اسلامی تاریخ، خاص کر معرکۂ کربلا سے ہے۔ اور بعض تصوراتِ تہذیب و کائنات، جن کو جہد، مقاومت اور اپنے خون سے اپنی داستان لکھنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جدید شاعری میں عرفان صدیقی کے یہاں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ استعاراتی قوت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بات کہہ اس لیے رہا ہوں کہ یہ طرز اب اس قدر مقبول ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگ اس کی ''ایجاد'' کے دعوے دار ہو گئے ہیں۔ عرفان صدیقی کی غزل میں ایک المیاتی وقار اور جہدرائگاں کی تلخی ہے ۔ لیکن اس تلخی کا اظہار شور شیون کے ذریعے نہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی برتری کے اظہار اور دنیا پر ایک سرد اور تحقیری نگاہ کے ذریعہ ہوا ہے۔ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے جذبۂ رائگانیت کو ذرا اور شدت سے بیان کیا تو وہ انفعالی اور غیر توانا اور اشک ریزی برائے اشک ریزی کی دنیا میں داخل ہو جائے گا۔ یہاں جو چیز عرفان صدیقی کو ایسے انجام سے محفوظ رکھتی ہے وہ ان کا المیاتی احساس اور خود پر بھی ہنس لینے، خود سے بھی فریب شکستہ Disillusion ہونے کی صلاحیت ہے ورنہ جس شاعر کو اپنے درد، اپنے الم، اپنے تجربے کے بارے میں یہ خوش گمانی ہو کہ جیسی مجھ پر گذری ہے کسی اور پر گذر ہی نہیں سکتی، وہ خود فریبی اور اپنے بارے میں حد سے زیادہ سنجیدہ ہو جانے کی علت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ سلیم احمد کی آخری زمانے کی غزلیں

عرفان صدیقی کے لیے اور ہم سب کے لیے مینارۂ نور عمل کرتی ہیں۔ اپنے بارے میں خود اپنی غلط فہمیوں کا ازالہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ شاعر خود کائنات کا مرکز اور ہادی اور مہدی نہ سمجھے، بلکہ کائنات کی دردمندی، محزونی کو اپنے اندر سمو لے، اس طرح کہ خود اس کا وجود اس محزونی کا چھوٹا سا حصہ بن جائے۔ سلیم احمد اور بانی دونوں کے یہاں آخری زمانے میں یہ بات ملتی ہے کہ وہ اپنی ہستی سے باخبر ہیں، بیزار نہیں ہیں، لیکن اس کے پرستار بھی نہیں ہیں، بلکہ اس کو بعض کائناتی عوامل کا پابند سمجھتے ہیں۔ ظفر اقبال اور زیب غوری کی طرح وہ کائنات سے نبرد آزما ہو کر اپنی ہستی کو سب پر حاوی نہیں کرتے بلکہ اسے دوسری ہستیوں سے ملا دینے کو اپنے وجود کا ثبوت قرار دیتے ہیں۔ یہ شاعری جتنی خود آگاہ ہے اتنی ماحول آگاہ بھی ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی۔ اور اس آگاہی کو نئے نئے پیکروں میں زمانۂ حال کے نئے نئے تجربات کے بیان پر قدرت بھی ہے۔ عرفان صدیقی ؎

ہوائے درد کا رخ ہے مرے ہی گھر کی طرف
صدائے گریۂ ہمسایگاں کہاں جائے

اس کی آنکھیں ہیں کہ اک ڈوبنے والا انسان
دوسرے ڈوبنے والے کو پکارے جیسے

دست رفو نے سینے کے سب زخم سی دیئے
اندر کا حال ناز ہنر نے کہا نہیں

ہوگا یہاں نہ دست و گریباں کا فیصلہ
اس کے لیے تو حشر کا میدان چاہیے

عرفان صدیقی کے یہاں فارسی کا رنگ غیر معمولی چمک دمک کا رنگ ہے۔ زمینیں اکثر نئی ہیں، لیکن یہ نیا پن چونکاتا نہیں۔ دھیرے دھیرے اثر کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس

شاعری میں پیکر کی جدت، مضمون کی ندرت، ماحول کے احساس میں برہمی، محزونی اور تنہا درد جھیلنے کی کیفیت اس قدر ہے کہ بعض سامنے کی چیزوں پر آنکھ یا کان فوراً ٹھہرتے نہیں۔

در روحانیاں کی چاکری بھی کام ہے اپنا
بتوں کی مملکت میں کار سیلانی بھی کرتے ہیں

وہ ساری بستیاں وہ سارے چہرے خاک سے نکلے
یہ ساری دنیا پھر سے ہو زیر و زبر ایسا نہیں ہوگا

بہت ہے یہ بھی کہ موجوں کے روبرو کچھ دیر
رہا ہے ریگ رواں پر نشاں ہمارا بھی

پاؤں میں خاک کی زنجیر بھلی لگنے لگی
پھر مری قید کی معیاد بڑھا دی گئی کیا

میں کار عشق سے ترک وفا سے باز آیا
سب اس کے ہاتھ میں ہے میرے بس میں کچھ بھی نہیں

تیغ سہی زنجیر سہی پر ہوئے بیاباں کہتی ہے
اور بھی کچھ وحشت کے علاوہ شاید پائے غزال میں تھا

بانوے ناقہ نشیں دیکھ کے چہرہ ترا
بندۂ خاک نشاں کس کی طرف دیکھتا ہے

دل سکۂ زر تھا کہیں مقتل میں ہوا گم
اک کاسۂ سر نذر شہنشاہ میں آیا

فتح کے نشے میں یہ بات نہ بھولو کہ وہ لوگ
پھر پلٹ آئے تو یلغار بھی کر سکتے ہیں

یہ مشکل زمینیں ہیں، لیکن شعروں میں اتنا کچھ ہو رہا ہے (خاص کر انسان کا المیہ، کبھی کبھی اس المیے پر دیوانوں والی ہنسی، کبھی کبھی درویشی پر طنطنہ، کبھی دنیا کی فتح مندی کا گلہ) اور مشکل زمین کو غیر معمولی روانی اس خوبی سے پانی کر رہی ہے کہ یہ خیال بہت دیر میں آتا ہے کہ یہاں بڑی چالاک فن کاری بھی ہے۔

گذشتہ تین ادوار غزل پر سخت گزرے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ غزل میں ''جدت نگاری'' پر اس قدر زور دیا جانے لگا تھا کہ غزل بطور فن کا گلا گھونٹ کر رہ گیا تھا۔ جدید غزل گویوں نے فن کی اہمیت پھر سے قائم کی۔ عرفان صدیقی کی غزل میں فن کی اہمیت، بلکہ فن کی حرمت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ ان کے مصرعے انتہائی مربوط ہوتے ہیں اور ایک مصرع دوسرے کی پشت پناہی کرتا ہے۔ بات آگے بڑھتا ہے اور دونوں برابر مل کر مضمون قائم کرتے ہیں۔ یہ ایسا فن ہے جو آج بھی بہ مشکل ہی لوگوں کے قابو میں آسکا ہے۔

عرفان صدیقی کی غزل میں استعارے سے زیادہ پیکر اور براہ راست جذبات سے زیادہ مضمون کی تازگی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں نئے الفاظ اور نئے فقرے کثرت سے ہیں۔ کہیں کہیں ان پر انگریزی کا بھی ہلکا سا اثر ہے۔ فارسیت اور جدت کے امتزاج سے ان کی غزل کی فضا نہایت خوشگوار اور شائستہ ہے۔ جو چیز ان کی آواز کو مزید انفرادیت عطا کرتی ہے وہ اس کا ٹھہراؤ اور لہجے کی روانی ہے۔ ہسٹریائی وفور جذبات سے انکار اور بات کو بڑھا کر کہنے کی جگہ ذرا روک کر کہنے کی ادا ان کا خاصہ ہے۔ انھوں نے سنسکرت سے منظوم تراجم کے ذریعہ اپنی شخصیت کو بہت پہلے منوالیا تھا، لیکن ''شب درمیاں'' کی غزلوں سے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ نئی غزل اب اور ہی وادی میں ہے اور ہی منزل میں ہے کا مصداق ہو رہی ہے۔ ''سات سمٰوات'' ان کا تیسرا ہی مجموعہ ہے۔ یہ قافلۂ سخت جاں تو بہت دور تک جائے گا۔

عرفان صدیقی: مجاز اور حقیقت کا سنگم

مظہر امام (دہلی)

اب پرانے بادہ کش ہی نہیں، نئے بادہ کش بھی اٹھتے جا رہے ہیں۔ ویسے عرفان صدیقی کچھ ایسے نئے نہیں تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۵ سال کے آس پاس تھی۔ انھیں درجۂ اعتبار بہت بعد میں حاصل ہوا۔ عرفان صدیقی مزاجاً گوشہ نشیں اور کم آمیز تھے۔ ہر کس و ناکس کو شعر سنانے کا شوق نہ تھا۔ شعری محفلوں سے احتراز کرتے تھے۔ اپنے آپ میں مگن، اپنے شعری امکانات کو جلا دیتے ہوئے۔ ستائش اور صلے کی تمنا سے بالکل بے نیاز نہ سہی۔ مگر اس کے حصول کے لیے کسی طرح کی تگ و دو سے یکسر بے تعلق۔ عزتِ نفس کا سودا کرنا کسی طرح منظور نہ تھا۔ اس لیے ادبی دنیا میں ان کی شناخت اور شہرت کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ صرف اور صرف اپنے کلام کی خصوصیات سے، اپنی غزل سے پہچانے گئے۔ چالیس پینتالیس سال کی عمر تک ملک گیر سطح پر انھیں وہ مرتبہ نصیب نہیں ہوا جو ان کا مقدر تھا اور جو آنے والے برسوں میں انھیں حاصل ہوا۔ حکومت ہند کی انفارمیشن سروس سے وابستہ ہونے کے باعث ان کی پوسٹنگ کئی قسطوں میں دہلی میں بھی اچھے خاصے عرصے تک رہی، لیکن وہ یہاں کے ادبی حلقوں سے دور دور ہی رہے۔ ہر چند دہلی میں ان کے قیام کا زمانہ اس وقت کی نئی نسل یعنی جدیدیت سے وابستہ یا متاثر نسل کے عروج اور ہماہمی کا زمانہ بھی تھا۔ یہ اردو مجلس، اردو سروس اور کافی ہاؤس کے جمگھٹوں کا زمانہ تھا۔ رفعت سروش، بلراج کومل، عمیق حنفی،

کمار پاشی، بانی، زبیر رضوی، مخمور سعیدی، راج نرائن راز، محمود ہاشمی، کرشن موہن، بلراج مین را، سریندر پرکاش وغیرہ دہلی کے ادبی اُفق پر جگمگا رہے تھے، مگر عرفان صدیقی نے اس افق پر جھلملانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''کینوس'' ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ لیکن نہیں معلوم کس کس تک پہنچا اور کس کس نے اس کی پذیرائی کی۔ شاید لکھنؤ اور آس پاس کے علاقوں تک پہنچا ہو۔ سنا ہے فرحت احساس نے اس مجموعے پر ایک مضمون نما تبصرہ علی گڑھ کے ایک پندرہ روزہ میں لکھا تھا۔ عرفان صدیقی کا دوسرا مجموعہ ''شب درمیاں'' ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا اور یہیں سے ان کی باقاعدہ شناخت قائم ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ ان کے پہلے مجموعے کے مقابلے میں ان کی شعری شخصیت کے بلوغ کو ظاہر کرتا ہے۔

نیر مسعود اور شمس الرحمٰن فاروقی سے عرفان صدیقی کی دوستی ایک افسانہ نگار، ایک نقاد اور ایک شاعر کی دوستی رہی ہے۔ یہ ایک طرح کی تثلیث تھی جس کا مظاہرہ میرؔ، غالبؔ وغیرہ پر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیے گئے ان مذاکروں سے ہوا جنھیں پروگرام ایگزیکیٹو انوار احمد خاں نے پیش کیا تھا۔ مذاکروں کو صحیح سمت لے جانے میں عرفان صدیقی پیش پیش تھے۔ ''سوغات'' کے دور سوم کے پہلے شمارے پر گفتگو بھی اسی تثلیث نے کی تھی، جو اس جریدے کے دوسرے شمارے میں چھپی۔

''سوغات'' کے دور سوم (یعنی آخری دور) کے پہلے شمارے (۱۹۹۱ء) میں عرفان صدیقی کی غزلیں محمود ایاز نے اہتمام سے چھاپیں۔ مدیر ''سوغات'' کے نام ۱۵/ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو لکھے ہوئے اپنے خط میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ان غزلوں کی داد ان الفاظ میں دی: ''عرفان صدیقی ان دنوں بہت اچھی غزل کہہ رہے ہیں۔ یہاں بھی ان کی غزلیں سب پر بھاری نکلیں''۔

محمود ایاز ''سوغات'' کے مالک، مختار اور ایڈیٹر ہی نہ تھے۔ ان کے ادبی ذوق اور ان

کی ادب فہمی کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔''سوغات'' کے دوسرے شمارے میں ان کے یہ جملے (تحریر: یکم مارچ ۱۹۹۲ء) ذہن و دل کو دور تک اور دیر تک متاثر کرتے ہیں:

''تقریباً نصف صدی سے اردو ادب کا قاری ہوں۔کوئی اچھا افسانہ، اچھا مضمون، اچھا شعر، اچھی کتاب مل جائے تو دنوں ہفتوں اس کا لطف اٹھاتا ہوں ...... کوئی نیا لکھنے والا ''باصلاحیت'' نظر آجائے تو اس کی تحریریں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا ہوں ...... کچھ لوگ دو چار چیزیں غضب کی لکھ دیتے ہیں، پھر دنیا کے کسی نہ کسی چکر میں پڑ کر الگ ہی طرف نکل جاتے ہیں......اور اب تو یہ عالم ہے کہ برسوں میں کوئی نئی آواز ایسی سنائی نہیں دیتی، کوئی نئی تحریر ایسی سامنے نہیں آتی کہ ذہن و احساس کو اپنی گرفت میں لے، متاثر کرے، فکر پر مائل کرے۔ نیر مسعود کی ''سیمیا'' اور عرفان صدیقی کی غزل نے چونکایا۔اس کے بعد پھر وہی ہُو' کا سماں''۔

عرفان صدیقی کا تیسرا مجموعہ ''سات سماوات'' ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔اس کی ایک کاپی انھوں نے مجھے بھی بھجوائی تھی جس پر ۱۵/جون ۱۹۹۳ء کی تاریخ درج ہے۔عرفان صدیقی کی شاعری اپنی شان کے ساتھ قارئین اور ناقدین کے ایک بڑے حلقے تک اسی زمانے میں پہنچی، ہر چند اس سے کم و بیش دس سال پہلے سے وہ ایک غزل گو کی حیثیت سے اپنے وجود کا احساس دلا چکے تھے۔اپنے کلام کی اشاعت کے سلسلے میں بھی انھوں نے اپنے آپ کو ارزاں نہیں کیا۔''شب خون'' میں وہ باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ بے قاعدگی سے وہ بعض دوسرے جریدوں مثلاً ''ذہنِ جدید'' اور ''نیا ورق'' میں بھی نظر آجاتے۔محمود ایاز کے وہ محبوب شاعر تھے اور عرفان صدیقی کو نمایاں کرنے میں محمود ایاز کا بڑا ہاتھ ہے۔''سوغات'' میں عرفان صدیقی کی غزلوں کے علاوہ نعت، منقبت اور سلام کی اشاعت بھی ہوتی رہی۔۱۹۹۶ء کے شمارہ نمبر ۱۰ میں ان کی بارہ ''عشقیہ غزلیں'' شائع ہوئیں جن کی داد آصف فرخی نے ان الفاظ میں دی: ''عرفان صدیقی نے کیسے کیسے نازک مقامات سر کر لیے ہیں''۔

یہ غزلیں ان کے ذاتی واردات کا اظہار ہیں۔ انھوں نے یہ کہہ کر اسے چھپانا چاہا:

ع بھلا یہ عمر کوئی کاروبارِ شوق کی ہے

واقعہ یہ ہے کہ کاروبارِ شوق کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ ان کے قریبی دوست اس سے واقف تھے۔ محمود ایاز نے ''سوغات'' میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا تھا ''عشق نامہ'' میں یہ شعر بھی ملتا ہے:

آخر شب ہوئی آغاز کہانی اپنی
ہم نے پایا بھی تو اک عمر گنوا کر اس کو

زوالِ عمر کی محبت بہت شدید ہوتی ہے۔ عرفان صدیقی نے اس کا حق ادا کیا اور ایک سے ایک عمدہ غزلیں کہیں۔ ان کے عشق کی کامیابیوں یا ناکامیوں کے بارے میں تو ان کے قریبی احباب ہی بتا سکتے ہیں، لیکن اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ ان کی اس دور کی غزلوں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ ان میں سے بیشتر غزلیں ''سوغات'' اور ''شب خون'' میں نمایاں طور پر چھپیں، اور موضوعِ گفتگو اور مرکزِ توجہ بنیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عرفان صدیقی کی شہرت اور مقبولیت اپنے عروج کو پہنچی اور ان کے اثرات نئے شاعروں پر ہی نہیں بلکہ ان کے ہم عصروں پر بھی پڑے۔ یہ غزلیں ان کے چوتھے مجموعۂ کلام ''عشق نامہ'' میں شامل ہیں، جسے عام طور پر ان کا سب سے اچھا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک کاپی بھی انھوں نے مجھے بھجوائی تھی۔ اس پر دستخط کرتے ہوئے انھوں نے تاریخ ۲ رمئی ۱۹۹۸ء لکھی ہے۔ مجموعے پر سنہ اشاعت ۱۹۹۷ء درج ہے۔ اس کا انتساب ہے ''خدا کے خزانوں کے نام'' میرا خیال ہے عرفان صدیقی نے عورت کے حسن و جمال کی مختلف جہتوں کو خدا کے خزانوں سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے ان میں پیڑ، دریا، ہوا، روشنی اور خوشبو کو بھی شامل کر لیا ہے:

تیرے تن کے بہت رنگ ہیں جانِ من اور نہاں دل کے نیرنگ خانوں میں ہیں
لامسہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ، باصرہ سب مرے راز دانوں میں ہیں

اور کچھ دامنِ دل کشادہ کرو، دوستو! شکر نعمت زیادہ کرو
پیڑ، دریا، ہوا، روشنی، عورتیں، خوشبوئیں سب خدا کے خزانوں میں ہیں

اک ستارہ ادا نے یہ کیا کردیا، میری مٹی سے مجھ کو جدا کردیا
ان دنوں پاؤں میرے زمیں پر نہیں اب مری منزلیں آسمانوں میں ہیں

لپٹ سی داغ کہن کی طرف سے آتی ہے
جب اک ہوا ترے تن کی طرف سے آتی ہے

میں تیری منزلِ جاں تک پہنچ تو سکتا ہوں
مگر یہ راہ بدن کی طرف سے آتی ہے

ذاتی واردات اور تجربے کے بغیر ایسی شاعری معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔
ان اشعار میں ''بدن'' کا بار بار ذکر اور ایک سرشاری کی کیفیت بلا وجہ نہیں ہے۔ یہ اشعار بھی دیکھیے:

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

کہاں سے آتے ہیں یہ گھر اجالتے ہوئے لفظ
چھپا ہے کیا مری مٹی میں ماہ پارہ کوئی

عرفان صدیقی کی نازک خیالی، ان کے ڈکشن کی نفاست، ان کے شعور حیات کی رعنائی اور ان کے تصورِ عشق کی تہذیب ان کے اشعار سے چھلکی پڑتی ہے۔ ''عشق نامہ'' سے کتنے اشعار پیش کیے جائیں۔ دو ایک شعر اور:

اس کو رہتا ہے ہمیشہ مری وحشت کا خیال
میرے گم گشتہ غزالوں کا پتا چاہتی ہے

میں نے اتنا اسے چاہا ہے کہ وہ جانِ مراد
خود کو زنجیر محبت سے رہا چاہتی ہے

''گم گشتہ غزالوں کا پتہ'' عرفان صدیقی کے یہاں ایک اور شعر میں بھی آیا ہے:

میرے گم گشتہ غزالوں کا پتہ پوچھتا ہے
فکر رکھتا ہے مسیحا مری بیماری کی

جو لوگ معاملات محبت سے آشنا ہیں، انھیں تجربہ ہوگا کہ ''تازہ'' محبوبہ، عاشق کی ''سابقہ'' محبوباؤں'' (گم گشتہ غزالوں)'' کے بارے میں کسی نہ کسی حیلے سے واقف ہونا چاہتی ہے۔

عرفان صدیقی سے میرا ملنا جلنا بہت کم ہوا ہے۔ دہلی کے بعض مشاعروں میں رسمی ملاقاتیں رہی ہیں۔ تھوڑی بہت خط و کتابت بھی ہوئی ہے۔ البتہ اس محفل کی یاد ذہن سے محو نہیں ہوتی جو دہلی میں عرفان صدیقی کی آمد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے اعزاز میں معروف شاعر ڈاکٹر سجاد سید نے اپنی رہائش گاہ پر منعقد کی تھی۔ اس بزم کے شرکاء میں رفعت سروش، شہپر رسول، نسیم مخموری، محمد علی موج، احمد محفوظ، افسانہ نگار انجم عثمانی، مزاح نگار اسد رضا اور اردو اکادمی، دہلی کے سابق سکریٹری منصور احمد عثمانی کے چہرے یاد آ رہے ہیں۔ عرفان صدیقی کو رسمی طور پر متعارف کرانے کی خدمت میرے سپرد کی گئی تھی۔ میں نے ان کے کلام کی خوش آہنگی ،ان کی تازہ کار تراکیب کی جمال افروزی پر خاص زور دیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کی غزلیں ایک خاص نوع کی اہتزازی کیفیت سے آشنا کرتی ہیں۔ ان کے طرزِ اظہار کی نفاست اور دل آسائی فوری طور پر متوجہ اور متاثر کرتی ہے۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کی تازہ غزلیں عشق، وصال اور ہجر کو نئی معنویت عطا کرتی ہیں۔ ان کی یہ شاعری رنگ عام کی عشقیہ شاعری

نہیں ہے۔ انھوں نے عشق کو ایک مابعد الطبیعاتی جہت دی ہے۔ عشق نے انھیں ایک نئی سرشاری بخشی ہے۔ ان کا تخلیقی ابال اسی جذبے کا عطیہ ہے۔ مثال کے طور پر میں نے ان کا یہ شعر پیش کیا تھا:

کر گیا روشن ہمیں پھر سے کوئی بدرِ منیر
ہم تو سمجھے تھے کہ سورج کو گہن لگنے لگا

''پھر سے'' اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے بھی کوئی ''بدرِ منیر'' شاعر کو روشن کر چکا ہے۔ میں نے اس محفل میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے خود عرفان صدیقی کا پسندیدہ یہ شعر بھی پڑھا تھا:

رات کو جیت تو سکتا نہیں لیکن یہ چراغ
کم سے کم رات کا نقصان بہت کرتا ہے

اس شعر میں عرفان صدیقی کا وہ منفرد اسلوب، وہ لہجہ، وہ آواز نہیں ہے جو ان سے منسوب ہے۔ یہ ایک سیدھے سادے نثری اسلوب میں کہا ہوا شعر ہے اور بیان بھی نثری ہے، لیکن اس کے باوجود میں اسے ایک نہایت کامیاب شعر سمجھتا ہوں۔ خیر، یہ مسئلہ میرا نہیں، نقادوں کا ہے۔

عرفان صدیقی کے چار مجموعوں کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ان چاروں کو یکجا کر کے ایک مجموعہ ان کے بھائی نے اسلام آباد سے ''دریا'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ عرفان صدیقی کو پاکستان میں ایسی مقبولیت اور محبوبیت حاصل تھی کہ بہت سے لوگ انھیں وہیں کا شاعر سمجھتے تھے۔ پاکستان کے ایسے انتخابات میں جو صرف اور صرف وہیں کے لکھنے والوں کی نگارشات پر مشتمل ہوتے تھے، میں نے عرفان صدیقی کا کلام دیکھا ہے۔ صرف یہی نہیں، وہاں ایک دفعہ ایک کلینڈر میں بارہ مہینوں کے لیے بارہ پاکستانی شاعروں کی تصویریں شائع کی گئیں، ان میں سے ایک تصویر عرفان صدیقی کی تھی۔ میں نے سجاد سید کی آراستہ کی ہوئی محفل میں اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ عرفان صدیقی نے کہا کہ میں نے بھی سنا ہے، لیکن دیکھا نہیں۔ ان کا آخری مجموعہ ''ہوائے

دشت ماریہ" جو نعت، منقبت، سلام، رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہے، پاکستان میں چھپا ہے۔

عرفان صدیقی کی ابتدائی شاعری میں کربلا کا حوالہ بطور استعارہ یا علامت اکثر آتا رہا ہے، بلکہ ان کی شاعری کی پہچان کچھ لوگوں نے اسی تناظر میں کی ہے۔ "سات سماوات" کی ایک غزل کے یہ اشعار دیکھیے:

رستہ بدل کے معرکۂ صبر وجور میں
کس نے بدل دیا ہے مقدر لکھا ہوا
پانی پہ کس کے دست بریدہ کی مہر ہے
کس کے لیے ہے چشمۂ کوثر لکھا ہوا
ہے خاک پر یہ کون ستارہ بدن شہید
جیسے ورق پہ حرفِ منور لکھا ہوا

اس مجموعے کی ایک اور غزل کے یہ دو شعر بھی:

یہ کس نے دست بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں نخلِ دعا نکل آئے
خدا کرے صفِ سردادگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

افتخار عارف کے یہاں بھی واقعۂ کربلا کا استعاراتی اور علامتی استعمال کافی ہوا ہے۔ برسبیل تذکرہ میں علی گڑھ کے ایک گوشہ نشیں شاعر غوث محمد غوثی کا نام لینا چاہوں گا۔ میں نے ان کی شاعری پر چند سطریں لکھتے ہوئے کہا تھا: "غوث محمد غوثی کربلا کا تخلیقی، استعاراتی اور خلاقانہ استعمال کرنے والے اولین شعراء میں ہیں، یعنی افتخار عارف اور عرفان صدیقی سے پہلے ہی انھوں نے یہ شعر کہا تھا:

لب فرات عجب شان سرفرازی تھی
گماں تھا دشت میں نیزوں کے سر نکل آئے''

کہا جاتا ہے کہ کلاسیکی شعرا تعقید کو عیب نہیں مانتے تھے۔ میر اور غالب کے یہاں بھی تعقید کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی، بلکہ میرؔ کے کئی اشعار میں یہ عیب اس قدر نمایاں ہے کہ طبیعت منغض ہو جاتی ہے۔ اساتذہ کا جو رویہ بھی رہا ہو، میں تعقید کو عیب مانتا ہوں۔

شتر گربہ کا عیب شاعر کو قابلِ قبول بننے سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ پھر بھی آج کی شاعری میں یہ عیب اکثر مل جاتا ہے کیوں کہ اب شعرا پیدائشی ''فارغ التحصیل'' ہوتے ہیں۔ احمد فراز کے مشہور شعر:

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

میں ''ہم'' اور ''میں'' کے استعمال سے شتر گربہ کا التباس ہوتا ہے اور اس پر اعتراض بھی کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں۔ پہلے مصرعے میں ''ہم'' عاشق اور محبوب دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے (یعنی ہم دونوں کس کس کو جدائی کا سبب بتائیں گے) اور دوسرے مصرعے میں ''میں'' صرف عاشق کے لیے۔

''حشو'' کی کئی سطحیں ہیں، اور ان میں سے کسی کے لیے بھی جواز پیش کرنا درست نہیں۔ لیکن بلا وجہ اب، بھی، وہ، یہ، تو وغیرہ کا استعمال فوری طور پر ذہن و ذوق کو گراں گزرتا ہے۔ یہ عیب آج کے شعرا کے یہاں ہی نہیں، اساتذہ کے یہاں بھی ملتا ہے۔

بہر حال، ہر غلطی کو عیب کے زمرے میں شامل کرنا مناسب نہیں۔ مثلاً اقبال کے مصرعے:

اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

پر آج سے نہیں، ستر اسی سال پہلے سے اعتراض وارد ہوتا رہا ہے، کہ ''پرہیز'' تذکیر ہے۔ ظاہر ہے اقبالؔ کو بھی اس کا علم ہوگا مگر ''پرہیز'' کو یہاں کسی اور طرح باندھنا ممکن نہ تھا، ورنہ ''بال جبریل'' کی اشاعت کے وقت اقبالؔ اسے ضرور درست کر دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ''عیب جوئی'' مقصد اور پہلے سے طے شدہ نہ ہو تو یہ شعر پڑھتے وقت ایک لمحے کو بھی احساس نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی غلطی یا عیب ہے۔ یہ اقبال کے لفظی در و بست اور اس سے پیدا کردہ روانی اور خوش آہنگی کا کمال ہے کہ یہ غلطی بھی حسن بن گئی ہے۔

یہ بہ ظاہر بے تعلق باتیں بلاسبب نہیں ہیں۔ عرفان صدیقی کی غزل کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کے یہاں اس طرح کے عیوب یا غلطیاں نہیں ہیں۔ کم از کم مجھے نہیں ملیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں انھیں استاد فن کا درجہ دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کچھ نے کہا ہے (منسوب رشید احمد صدیقی سے ہے) کہ اساتذہ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ان کے یہاں کوئی عیب نہیں ہوتا اور عیب یہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ لہٰذا عرفان صدیقی کو ''اساتذہ'' میں شمار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اول تا آخر ایک خوش گو شاعر ہیں، جنھیں آداب فنی سے پوری آگہی ہے اور انھیں برتنے پر پوری قدرت ہے۔

لیکن یہاں میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عرفان صدیقی نے اپنی بہت سی غزلوں کی ردیفوں میں ایک ایسی ''بے تکلفی'' برتی ہے جس سے مجھے ہمیشہ الجھن ہوئی ہے، ہر چند اسے فنی عیب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً ''عشق نامہ'' کی پہلی ہی غزل کو لیجیے جس کا وزن فاعلاتن فعلاتن، فعلاتن فَعِلُن'' ہے:

خانہ ٔ درد ترے خاک بسر آگئے ہیں
اب تو پہچان کہ ہم شام کو گھر آگئے ہیں

''گئے ہیں'' بروزن ''فاعلن'' استعمال ہوا ہے۔ اسے بروزن ''فعولن'' ہونا چاہیے۔ اسی بحر میں

دوسری غزل:

ہم سے وہ جان سخن ربط نوا چاہتی ہے

یہاں بھی 'ہتی ہے' کا استعمال اسی طرح ہوا ہے۔ اسے بھی بروزن ''فعولن'' ہونا چاہیے۔ ایک دوسرے وزن ''مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن'' میں لکھی ہوئی دو غزلوں کے یہ پہلے مصرعے دیکھیے:

ذرا سا وقت کہیں بے سبب گزارتے ہیں

عجیب نشہ ہے، ہشیار رہنا چاہتا ہوں

''رتے ہیں'' اور ہتا ہوں'' بروزن ''فعلن'' استعمال ہوئے ہیں۔ انھیں بھی بروزن ''فعولن'' ہونا چاہیے۔ دوسرے مصرعے میں یوں بھی دو عیب ہیں ''رہنا'' اور ''چاہتا'' دونوں میں الف بری طرح دبتی ہے۔ یہ روانی اور خوش آہنگی دونوں کو متاثر کرتی ہے اور ان صفات کے لیے عرفان صدیقی کو داد دی جاتی رہی ہے۔ یہ فنی عیب نہ سہی، فنی کمزوری تو ہے ہی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، عرفان صدیقی کے یہاں ایسی غزلیں خاصی تعداد میں ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ایک طرح ان کا Forte بن گیا تھا۔ کیوں کہ اس طرح کی غزلیں مجھے ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شکیب جلالی، احمد مشتاق، شاذ تمکنت، بانی وغیرہ کے یہاں نہیں ملیں۔ اصغر، حسرت، فانی، جگر، فراق کے یہاں تو ہیں ہی نہیں۔ عرفان صدیقی کی تقلید میں اسعد بدایونی کی کئی غزلیں آئیں، پھر سلطان اختر کی بھی۔ میں نے اسعد بدایونی اور سلطان اختر سے الگ الگ موقعوں پر اس کا ذکر کیا تھا۔ اسعد خاموش رہے۔ سلطان اختر نے کہا کہ اب وہ اس طرح کی غزلیں کہنے سے احتراز کریں گے۔

عرفان صدیقی پر یہ اعتراض بھی ہوا ہے کہ ان کے موضوعات محدود ہیں اور زندگی کے مختلف النوع مظاہر اور جہات پر ان کی نظر نہیں ہے۔ مگر ان کے یہاں شعر کہنے کا جو سلیقہ ہے وہ ان کی دوسری کمیوں کی تلافی کر دیتا ہے۔ جس طرح کوئی نرم خوندی آہستہ خرامی کے ساتھ

دائیں بائیں دیکھے بغیر بہتی جاتی ہے، مجھے احساس ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی کی غزل بھی اسی نرم رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتی جاتی ہے اور مطلق فکرمند نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی رفتار کے بانکپن کو دیکھ رہا ہے یا نہیں۔

ساہتیہ اکیڈمی انعام کے سلسلے میں عرفان صدیقی کا نام کئی بار سننے میں آیا، لیکن نظرِ انتخاب ان پر نہیں پڑی۔ البتہ ان کی علالت کے دنوں میں ۲۰۰۳ء کے اواخر میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے انھیں شاعری کا ''غالب ایوارڈ'' دینے کا فیصلہ کیا جس سے ادبی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اتفاق سے ان کے ساتھ ہی نیر مسعود کو بھی تحقیق و تنقید کے ''غالب ایوارڈ'' کے لیے منتخب کیا گیا۔ باقاعدہ اعلان سے پہلے ہی میں نے دونوں کو مبارک باد کا خط لکھا اور توقع ظاہر کی کہ تقسیم انعامات کے جلسے میں ان سے ملاقات ہوگی۔ عرفان صدیقی کے دماغ کے ٹیومر (Tumour) کا آپریشن ہوا تھا، اور وہ اسپتال سے گھر واپس آ گئے تھے۔ نیر مسعود نے اپنی صحت کی خرابی کے باعث جلسے میں شرکت سے معذوری ظاہر کی تھی اور لکھا تھا کہ عرفان صدیقی اب بہتر ہیں اور وہ شریک ہوں گے۔ عرفان صدیقی سے میری اور سجاد سید کی فون پر گفتگو بھی ہوئی۔ وہ جلسۂ تقسیم انعامات میں شرکت کے لئے تیار نظر آئے، مگر عین وقت پر ڈاکٹروں نے یہ اجازت نہ دی۔ وہ ایک بار پھر سجاد سید کے یہاں یا میرے یہاں مل بیٹھنے کے لیے رضامند ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ہی ان کی صحت تیزی سے گرتی گئی۔ کینسر کے مرض کو وہ آخر وقت تک ہمت اور حوصلے سے جھیلتے رہے۔

عرفان صدیقی نے عمرانیات میں ایم۔ اے کرنے کے علاوہ دہلی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن سے صحافت میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا تھا۔ ''رابطۂ عامہ'' اور ''عوامی ترسیل'' نامی کتابیں بھی تالیف کی تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے لکھنؤ کے روزنامہ ''صحافت'' کی ادارت قبول کر لی تھی اور وہ اس کے لیے اداریے لکھا کرتے تھے۔ ''صحافت'' سے وابستگی نے انھیں سیاست کے زوال اور اس کی ریشہ دوانیوں اور معاشرے کی

تجزیہ کرنے کا موقع فراہم کیا، لیکن ان کے دل ودماغ پر اس کے منفی اثرات پڑنے لگے۔ گجرات کے سانحے نے ان کی روح کو زخم زخم کرڈالا اور ایسے میں ان کی ایک غزل "شب خون" میں شائع ہوئی جس نے پوری ادبی شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ گجرات فسادات اور انسانیت کشی کے پس منظر میں عرفان صدیقی کی اس غزل سے بہتر کوئی ایسی تخلیق سامنے نہیں آئی جو نشتر کی طرح رگ و پے میں اترتی چلی جائے۔ یہ غزل اقبال کے "شکوہ" کی یاد دلاتی ہے اور اسی کی طرح پر تاثیر ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری کا کوئی حوالہ اس غزل کے بغیر مکمل نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں دس اشعار کی یہ غزل عرفان صدیقی کی تخلیقی بصیرت اور فنی توانائی کا نقطۂ عروج ہے۔ چند شعر:

حق فتح یاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا
تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا

جب حشر اسی زمیں پہ اٹھائے گئے تو پھر
برپا یہیں پہ روزِ جزا کیوں نہیں ہوا

وہ شعلہ ساز بھی اسی بستی کے لوگ تھے
ان کی گلی میں رقص ہوا کیوں نہیں ہوا

کیا جذب عشق مجھ سے زیادہ تھا غیر میں
اس کا حبیب اس سے جدا کیوں نہیں ہوا

کرتا رہا میں تیرے لیے دوستوں سے جنگ
تو میرے دشمنوں سے خفا کیوں نہیں ہوا

جو کچھ ہوا وہ کیسے ہوا جانتا ہوں میں
جو کچھ نہیں ہوا وہ بتا کیوں نہیں ہوا

☆☆☆

عرفان صدیقی کی غزلیں

.................اسعد بدایونی (علی گڑھ)

ہمارا عہد کاذب آوازوں اور پُر فریب لفظوں کا عہد ہے اور جملہ شعبہ ہائے زندگی ان جھوٹی اور پرفریب صداؤں کی لپیٹ میں ہیں۔ادبی منظرنامے پر بھی کئی صادق آوازوں کا وجود گہری تاریک رات میں چمکنے والے جگنوؤں کی طرح ہے جو کچھ لحظہ کے لئے روشنی تو پھیلاتے ہیں اور آنکھوں کو بھلے بھی لگتے ہیں مگر تاریکی میں کمی کا باعث نہیں ہوتے۔ادھر کچھ عرصہ سے شہرِ ادب مستقل سیاہ راتوں کی زد میں ہے اور کساد بازاری کا جو عالم ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔طلوع کی نوید نہ جانے کب حاصل ہوگی۔خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔بات دراصل عرفان صدیقی کی غزلیہ شاعری کی ہے اور یہ شاعری سرد سیاہ رات میں چمکنے والے جگنو کی طرح ہے۔ادبی منظرنامے پر جلتے بجھتے صادق ناموں میں سے ایک نام ہے عرفان صدیقی۔

شاعری احساسات کے اظہار کا دوسرا نام ہے اور ان احساسات کا منبع کائنات ہے۔موسموں کے تغیر، انسانی رشتوں کی رنگارنگی نفرت ومحبت کی قدریں اور بنیادی جبلتیں، ان تمام عوامل وعناصر کی ترکیب وتہذیب سے شاعری وجود میں آتی ہے اور جہاں کہیں یہ عناصر اپنی پوری قوت کے ساتھ متشکل ہوتے ہیں کسی توجہ طلب فنکار کا ظہور ہوتا ہے۔عرفان صدیقی ایسے ہی فنکاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے فطرت کی جملہ نیرنگیوں کو مس کیا ہے اور حیرتوں کے بے شمار چراغ جلائے ہیں۔عرفان صدیقی کی غزل اپنے زمانے کا سچا اور کھرا اعلامیہ بن کر

ابھرتی ہے۔اس میں وہ تمام اعمال وافعال موجود ہیں جنھیں عرف عام میں ''عصری حسیت''
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

عرفان صدیقی کی شعری کائنات کا احاطہ اگر صرف چند لفظوں میں کرنے کی کوشش
کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ گم شدہ تہذیب وثقافت کی باز آفرینی اور حال سے مثبت رابطے
کی کوشش کے شاعر ہیں، مگران چند الفاظ سے ان کی شاعری کو پوری طرح سمجھا نہیں جاسکتا کہ
یہ صرف گم شدگی اور رابطوں کی کہانی نہیں ہے۔اس میں جو زیریں لہجہ ہے وہ ایک حساس فنکار
کے ذہن کا مواج سمندر ہے اوراس سمندر کی لہریں غضب نا کی وطرب نا کی کا مجموعہ ہیں۔

گرتی دیواروں کے نیچے سائے جیسے آدمی
تنگ گلیوں میں فقط عکسِ ہوا جیسے ہوا

آدمیوں کی یہ پرچھائیاں اور ہوا کے بجائے عکسِ ہوا کا احتمال عرفان صدیقی کی غزل پر شاید
ہماری گرفت مضبوط کر سکے اور ہم ان کے بنائے ہوئے طلسم میں داخل ہونے کا کوئی راستہ
نکال سکیں۔

عرفان صدیقی کی غزل کا لہجہ دعاؤں کے گداز سے تشکیل پاتا ہے۔یہاں احتجاج
کی لے اتنی تیز نہیں کہ چیخ وپکار بن جائے۔بلکہ یہ احتجاج نرم گرم سسکیوں سے عبارت ہے اس
احتجاج کا سفر ذات سے شروع ہوتا ہے اور بیکراں کائنات تک پھیل جاتا ہے سو ہم اسے خالص
داخلی شاعری کا نام بھی نہیں دے سکتے اور اپنی آسانی کے لئے اسے خارجی مسائل ومناظر کا
شاعرانہ اظہار بھی نہیں کہہ سکتے۔یہاں خارجی اور داخلی کیفیتیں اپنی جملہ نیرنگیوں کے ساتھ اس
طور ظہور کرتی ہیں کہ ان دونوں تنقیدی اصطلاحوں کو ایک کر کے دیکھے بغیر چارہ نہیں یعنی خارج و
داخل حسب ضرورت یہاں ایک دوسرے سے ہمکنار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس
ہمکناری سے جو شعری پیکر وجود میں آتے ہیں وہ عرفان صدیقی کی غزل کا امتیاز ہیں۔

اگلے دن کیا ہونے والا تھا اب تک یاد ہے
انتظارِ صبح میں وہ سارے گھر کا جاگنا

اِک ذرا خم ہو کے میں پیشِ ستم گر بچ گیا
میری پگڑی گر گئی لیکن مرا سر بچ گیا

عجب حریف تھا میرے ہی ساتھ ڈوب گیا
مرے سفینے کو غرقاب دیکھنے کے لئے

عرفان صدیقی کو تباہی و تاراجی کے مہیب منظر سے مثبت نتیجے نکالنے پر دسترس حاصل ہے۔ شاید اسی لئے میں انہیں گم شدہ ماضی اور حال کے اثبات کا شاعر کہہ رہا ہوں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

کم سے کم اب کسی شب خون کا خطرہ تو نہیں
کردیا جلتے ہوئے خیموں نے صحرا روشن

خیموں کی خرابی کے ساتھ ساتھ صحرا کے روشن ہونے اور اس روشنی سے کسی مزید بڑے خطرے سے محفوظ ہوجانے کا اطمینان اپنے اندر جو جذباتی تشنج رکھتا ہے اسے محسوس کرنا ہی بڑا جان لیوا عمل ہے چہ جائیکہ اس کا شاعرانہ اظہار اور ہمارا شاعر یہاں سے سرخرو گزرتا ہے سرنگوں نہیں۔

ناامید فضاؤں اور ملال کے منظروں میں معجزوں کا منتظر ہمارا شاعر آنے والے دنوں سے مایوس نہیں۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ پیک سحر اس کے فصیل شہر کے اندر بھی آئے گا اور پردہ افلاک پر کوئی ستارۂ غیب چمکے گا۔ دریاؤں کی طغیانی اور راستوں کی عدم موجودگی کے باوجود وہ جب یہ کہتا ہے۔

عجب نہیں کہ یہ دریا نظر کا دھوکا ہو
عجب نہیں کہ کوئی راستہ نکل آئے

تو احساس ہوتا ہے کہ وہ آج بھی رفتہ و گزشتہ ادوار کو زندہ کرنے کے عمل میں مبتلا ہے۔ نہ صرف خود مبتلا ہیں بلکہ چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اس سوچ میں شریک ہوں۔

خدا کرے صفِ سردادگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

لیکن جب اسے اپنا کوئی ہم سفر نظر نہیں آتا تو وہ صدا لگاتا ہے:

ہے کوئی شخص مرے دشتِ زیاں کا سفری
ہے کوئی شخص جو اس دھوپ کو بادل کر دے

کھوئے ہوؤں کی جستجو میں اتنی شدت کے باوجود بھی وہ حال سے غافل نہیں۔ اسے اپنے سارے فیصلوں کے لئے جو جگہ درکار ہے وہ یہی دنیا ہے۔

میں چاہتا ہوں یہیں سارے فیصلے ہو جائیں
کہ اس کے بعد یہ دنیا کہاں سے لاؤں گا میں

اُسے احساس ہے کہ وحشتِ جاں کا علاقہ بڑھائے بغیر، نئے دشت تسخیر کئے بغیر آزادی فضول ہے اور یہ سوچ ایک مثبت ذہن اور کھلی آنکھوں کے شاعر کی سوچ ہے۔

اگر وسعت نہ دیجے وحشتِ جاں کے علاقے کو
تو پھر آزادیٔ زنجیرِ پا سے کچھ نہیں ہوتا

عرفان صدیقی کی غزل میں تلمیحات کا استعمال بڑے خوبصورت اور پر تاثیر انداز میں ہوا ہے۔ انہوں نے کربلا کے استعارے کو اپنے عہد کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ واقعہ کربلا کی استعاراتی معنویت کے سبب یہ اردو شعر و ادب کا ایک مضبوط اور رائج استعارہ ہے۔ مگر عرفان صدیقی نے اس استعارے میں اپنی سوچ کے اتنے رنگ بھر دیے ہیں کہ یہ ان کا غزلیہ شاعری کا ایک مخصوص حوالہ بن گیا ہے۔ اس رنگ کے چند اشعار دیکھیے۔

ہوائے کوفۂ نا مہرباں کو حیرت ہے
کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں
ایک پیمانِ وفا خاک بسر ہے سر شام
خیمہ خالی ہوا تنہائی عزاکرتی ہے
دولتِ سر ہوں سو ہر جیتنے والا لشکر
طشت میں رکھتا ہے نیزے پہ سجاتا ہے مجھے
سر اگر سر ہے تو نیزوں سے شکایت کیسی
دل اگر دل ہے تو دریا سے بڑا ہونا ہے
کہ جیسے میں سرِ دریا گھرا ہوں نیزوں میں
کہ جیسے خیمۂ صحرا سے تو پکارتا ہے

اس کے علاوہ ان کی لفظیات میں قدیم آلاتِ جنگ اور طریقۂ جنگ سے متعلق بھی بہت سے الفاظ شامل ہیں جنھیں ہم واقعۂ کربلا ہی کا ایک حصہ سمجھ سکتے ہیں۔

میں گر چکا تھا کہ نصرت کا راہوار لئے
مجھے مصاف سے کوئی نکالنے آیا
میں کہاں گلاب شجر کروں، میں کشادہ سینہ کدھر کروں
کوئی نیزہ میرے یمین میں، کوئی تیغ میرے یسار میں
جو گرتا نہیں ہے اسے کوئی پامال کرتا نہیں!
سو وہ سربریدہ بھی پشتِ فرس سے اترا نہیں
پرند جھیلوں پہ آتے ہیں لوٹنے کے لئے
سبھی رُکے ہوئے لشکر رکاب کرتے ہیں

اُنہیں کیا خبر کہ دلاوری کوئی شرط فتح و ظفر نہیں
کہ بکھرتی صف کے پیادگاں نہ شمار میں نہ قطار میں

عرفان صدیقی کی غزل میں عورت کے روپ بڑے دلکش اور پر تاثیر انداز میں آئے ہیں مگر عورت ان کی غزل کا حوالہ اس طور سے نہیں بنتی جس طرح وہ ہمارے دوسرے غزل گو شاعروں کے یہاں نظر آتی ہے۔ یہ بات نئی بھی ہے اور انوکھی بھی، ممکن ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر عورت کو اپنی غزل میں داخلے کی اجازت بہت کم دی ہو۔ ان کی غزل میں عورت زیادہ تر ماں کے روپ میں نظر آتی ہے۔ میں صرف ایسے اشعار پیش کر رہا ہوں جن میں عورت کے دوسرے روپ نظر آتے ہیں۔

جسم کا شیشہ کاجل کرتی کالی رات خرابی کی
آنکھوں کی محراب میں روشن چہرہ اک سیدانی کا

تجھ سے ملے تو ہم نے یہ جانا کہ آج کل
آہو شکاریوں کو گرفتار کرتے ہیں

عجب گداز پرندے بدن میں اڑتے ہوئے
اُسے گلے سے لگائے زمانہ ہوتا ہوا

سپردگی میں بھی انداز دسترس کا ہے
یہ کاروبارِ محبت اسی کے بس کا ہے

اجلی لڑکی، دنیا میں بڑی کالک ہے پر ایسا ہو
مانگ میں تیری جگنو چمکیں لونگ تری لشکارا دے

عرفان صدیقی تجربات و حادثات کے بیکراں طلسم زار میں اپنی کھوئی ہوئی لوح کے متلاشی ہیں۔ وہ لوح جو انہیں خطرات سے محفوظ کرتی اور مقابلے کی قوت بخشتی تھی۔ ہمیں یقین

ہے کہ بہت جلد وہ اس لوح کو ضرور تلاش کر لیں گے اور ''تصویرِ ہنر'' میں جو رنگ ہلکا رہ گیا ہے وہ گہرا اور بہت گہرا ہو جائے گا۔

میں اپنی کھوئی ہوئی لوح کی تلاش میں ہوں
کوئی طلسم مجھے چار سو پکارتا ہے

(1987)

عرفان صدیقی

..................وارث کرمانی (رامپور)

عرفان صدیقی کے بارے میں اتنا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے یا کم از کم میرا اپنا تاثر یہی ہے کہ ان کی غزل اپنے زمانے کی منفرد چیز ہے۔اس کی اپنی ایک ادا اور آب و تاب ہے جیسے آسمان پر صبح کے وقت زہرا ستارہ تیز روشن اور اکیلا سا نظر آتا ہے، یہی حال عرفان صدیقی کی غزل کا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ غزل کا میدان بالکل صاف ہے اور عرفان یکہ تاز عرصہ سخنوری ہیں۔ برصغیر میں اور بھی بہت سے اعلیٰ درجہ کی غزل کہنے والے ہیں جو عرفان صدیقی سے زیادہ سینئر اور مشہور وممتاز ہیں، ان کی غزلیں نیا رنگ و آہنگ بھی رکھتی ہیں اور مجموعی طور سے جدید دور کی نمایندگی کرتی ہیں لیکن ان میں اب فرسودگی کا احساس ہونے لگا ہے یا اگر فرسودگی نہ بھی کہیے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ قاری کو ان سے اچھی خاصی شناسائی ہوگئی ہے۔یہ شناسائی آگے چل کر خطرناک ہوسکتی ہے۔آپ نے انگریزی کی یہ مثل سنی ہوگی Familiarty breeds contempt، میں اسی انسانی فطرت کی بنا پر خطرناک کا لفظ استعمال کررہا ہوں۔ مثال کے طور پر ظفر اقبال کی غزل کے آڑے ترچھے شعروں سے ہم عرصے سے واقف ہیں اور ان کے فنی کمال اور قدرت کلام سے ہم ان سے اس سے زیادہ وقیع اور بہتر شاعری کی توقع رکھتے ہیں۔کبھی کبھی جب وہ نثر لکھتے ہیں تو مختصر خطوں اور مضامین کی شکل ہی میں کیوں نہ ہو نہایت بلیغ، سادہ اور جاذب ہوتی ہے۔شاعری میں بھی ہم ایسی ہی وزدیدہ و پوشیدہ کارفرمائی

کی امید رکھتے ہیں لیکن اب ان کی عادت جیسی پڑ چکی ہے اس سے وہ مجبور ہیں۔ منیر نیازی سے بھی ہم خاص قسم کی توقعات رکھنے میں حق بجانب ہوں گے۔ ہمیں ان کی ڈگر معلوم ہے اور ان کا عرصۂ خیال انہیں کا دریافت کردہ سہی لیکن اس کا حدود اربعہ ہماری دانست میں ہے۔ احمد مشتاق البتہ جدید رجحان میں سو فیصد بند نہیں کیے جا سکتے۔ ان کے لئے انتظار حسین کا یہ جملہ کہ ''میں احمد مشتاق کے شعر کب سے پڑھ رہا ہوں مگر عجب شاعری ہے اپنا نام نہیں بتاتی'' ان کی شاعری کا پورا تشخص کر دیتی ہے۔ ایک سادہ اور مختصر جملہ ایک طرف اور بیسیوں صفحات کا تنقیدی مقالہ ایک طرف۔

ان معروضات کے بعد عرفان صدیقی کے بارے میں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ قابل فہم ہو جائے گی۔ وہ بات یہ ہے کہ ان کی غزل پر سکہ بند جدیدیت کی کہیں چھینٹ بھی نہیں پڑی ہے۔ وہ کسی اور سرزمین کے سیاح معلوم ہوتے ہیں۔ اس سرزمین کا ہمیں اندازہ نہیں ہو پاتا اور جس مال کے وہ سوداگر ہیں وہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ان کی غزل کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی تنقیدی خانے میں فٹ نہیں ہوتی۔ کلاسیکی، نو کلاسیکی، حالی والی جدیدیت، ترقی پسند اور رومانیت، موجود جدیدیت یا مابعد جدیدیت (Post-Modernism) کوئی بھی لیبل، اس پر چسپاں نہیں ہوتا مگر ہر لیبل کی خوشبو اس میں مل جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کے یہاں ایسے اشعار بھی مل جائیں گے جو اردو غزل کے تقریباً پانسو برس کے میدان کے اس پار جست لگا کر سعدیؔ اور منوچہریؔ کے وجدان کی یاد دلاتے ہیں۔ اس شعر پر غور کیجئے۔

ناقۂ حسن کی ہمرکابی کہاں خیمۂ ناز میں باریابی کہاں
ہم تو اے بانوے کشور دلبری پاسداروں میں ہیں ساربانوں میں ہیں

سب لوگ آج کل فارسی تو نہیں جانتے پھر بھی شیخ سعدیؔ کا یہ شعر اتنا سادہ ہے کہ اردو والے بھی اس میں اور عرفان کے شعر میں جو ربط ہے اسے محسوس کر لیں گے۔

اے سارباں آہستہ راں کارام جانم می رود
واں دل کہ باخود داشتم با دلستانم می رود

یہ بات ماننا پڑے گی کہ ہر اچھے شاعر کی طرح عرفان صدیقی کی غزل میں بھی فنکاری کا عنصر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے لب ولہجہ کی تازگی لفظوں کا انتخاب اور استعاروں اور بندشوں کی تراش ان کے شعروں میں وہ معنویت پیدا کر دیتی ہے جس پر عالم رویا میں ان کی نظر پڑتی ہے۔ لیکن یہ عالم رویا کون سا ہے اور اس کے اظہار وابلاغ کے لئے جو تخاطب یا ٹون Tone وہ لاتے ہیں وہ کیسے وجود میں آتا ہے اسے وہ خود نہیں بتا سکتے، ناقد کیا خاک بتائے گا۔ کسی غزل کا تجزیہ کرنا، شعر کی تحلیل نفسی کرنا اور ان عناصر کا پتہ لگانا جن کی بنا پر اس کی غزل جیسی ہے ویسی کیوں ہے بڑا مشکل کام ہے، بلکہ میں ذاتی طور سے اس قسم کے پوسٹ مارٹم کو ایک شوق فضول سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا کیوں کہ اس میں پوسٹ (Post) میں کچھ نہیں ملتا بس Mortem رہ جاتا ہے۔ وہ ناقدین جو مغربی مفکرین کی آیتوں اور روایتوں کے حوالے دے کر کسی شاعر کی شناخت اور اس کے اجزائے ترکیبی سے قارئین کو باخبر کرتے رہتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں یا انہوں نے پورے طور سے ہمارے نظریہ ساز نقادوں کی عملی تنقید کو پڑھا ہی نہیں ہے جن میں مثال کے طور پر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی سرفہرست نظر آتے ہیں کہ وہ خود آخر میں اپنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور شعر کے نہاں خانے کے انکشاف کو انسانی وسائل سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ میں نے ابھی حال میں نارنگ کی کتاب اسلوبیات میرؔ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی موجودگی میں خود انہیں کے الفاظ کا اقتباس دے کر اپنی بات کی تصدیق کرائی تھی اور بہت سے دوسرے مستند ناقدین جو شریک محفل تھے سب نے خاموشی سے میری بات سنی تھی اور کسی نے تردید میرے پوچھنے کے باوجود نہیں کی۔ اس لئے میرا خیال ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ نظریات کی مدد سے شعر کی تفہیم میں ماشہ بھر بھی فرق نہیں پڑتا۔ حاشیہ آرائی ضرور

ہوتی رہتی ہے مرکز نہیں ٹوٹتا sanctum sanctorum یا حسن حصین اسی طرح نا قابل تسخیر رہتا ہے بلکہ بڑے شاعر کے کلام پر تو اس کا اثر الٹا ہی پڑتا ہے۔ جبھی تو مرزا صائبؔ اصفہانی نے برہم ہو کر کہا تھا ''شعر مرا مدرسہ کہ برد'' یعنی میرے شعر کو مدرسہ کس نے پہنچا دیا۔ اب یاد نہیں شعر کون سا تھا ممکن ہے مشکل ہو یا مبہم ہو تو غالبؔ کا ایک بالکل عام فہم اردو شعر لے لیجئے

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

اس شعر میں جو کیفیت یا لطف بیان ہمیں ملتا ہے اس کی تفسیر یا تعبیر کر کے ایک نقاد کیا اضافہ کر سکتا ہے وہ تو اسے چھوتے ہی نیچے لے آئے گا۔ میتھیو آرنلڈ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ عظیم شاعری کیا ہوتی ہے لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ عظیم شاعری کہاں ہے اس کے بعد وہ وڈزورتھ کے شعروں سے مثالیں دے کر بتاتا ہے کہ عظیم شاعری یہاں موجود ہے۔

عرفان صدیقی کی غزل پڑھ کو جو لذت ہمیں ملتی ہے اس پر جب بھی میں غور کرتا ہوں تو یہی مجبوری لاحق ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ ان پر عجمی روایت کا اثر ہے یا وہ کلاسکیت کا دامن پکڑے ہوئے ہیں کافی نہیں معلوم ہوتا ہے کیونکہ جگرؔ، اصغرؔ، حسرتؔ وغیرہ اور لکھنؤ دہلی کے قریب العصر اساتذہ کے یہاں بھی عجمی روایت اور کلاسکیت کے اثرات عرفان صدیقی سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن عرفان ان کے جانشیں یا مشابہ نہیں معلوم ہوتے، جس طرح ابھی حال میں جذبیؔ اور مجروحؔ وغیرہ اپنی انفرادیت اور تازہ کاری کے باوجود ان استادوں سے وابستہ معلوم ہوتے ہیں۔ تو کیا عرفان کو جدید شاعروں کی صف میں کھڑا کیا جائے جو پچھلے متغزلین استادوں کے رنگ سخن سے کٹ کر بلکہ اکھڑ کر اور ان کی صدیوں کی شاہراہ خیال سے علیحدہ ہو کر نئے ہموار راستوں پر چل پڑے تھے، جن کی غزلیں پچھلے تیس چالیس برسوں سے رسالوں میں چھپ رہی ہیں۔ عرفان کی غزل یہاں بھی علیحدہ نظر آتی ہے۔ ان کے محسوسات و

مشاہدات کسی ایک فرد واحد کی ملکیت معلوم ہوتے ہیں اور ان کے لئے جو استعارے اور اسلوب بیان استعمال کیا گیا ہے وہ بھی ایسی پوشاک کی طرح ہے جو اسی فکری پیکر کے لئے قطع کر کے تیاری کی گئی ہے، لیکن محض اس خصوصیت کی بنا پر ان کا امتیاز قائم نہیں ہوتا۔ ان کے شعروں کی انوکھی صفت یہ ہے کہ ان کے الفاظ کی چھوٹ یعنی side effects بہت تیز ہوتے ہیں اور ان کی چمک دمک دماغ کے گوشوں میں ادھر ادھر روشنی پھینکتی ہے۔ ناسخ لکھنوی کے ایک شعر سے میری بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔

کی جو خیاط ازل نے تری پوشاک درست

بچ گئے قطع میں یہ شمس و قمر دو ٹکڑے

مگر اس تمام تعارف کے بعد قاری کو یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے کہ آپ نقاد بن کر صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ عرفان یہ نہیں ہیں وہ نہیں ہیں، اردو شاعری میں یہاں سے وہاں تک کہیں وہ آپ کو نظر ہی نہیں آتے، کسی تحریک کسی شاعر سے ان کا رشتہ ہی نہیں ہے اور اگر ایسا ہے تو آپ نے یہ سب بکواس کیوں کی ہے اور خود آپ کے پسندیدہ شاعر نے اپنا سر کہاں پھوڑا ہے؟ کوئی فلسفہ نہ سہی زندگی کی کوئی معنویت تو کہیں ہوگی جسے آپ اپنی نا اہلی سے بتا نہیں پا رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کا جواب دراصل پوچھنے والے یا پڑھنے والے کے ظرف اور بصیرت پر منحصر ہے یعنی جواب کی آدھی ذمہ داری خود اس پر بھی ہے۔ میں یعنی ناقد اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ میں ایک کان جواہر کا پتہ دوں گا تو وہ معدنیات کے دوسرے میدان میں گشت لگاتے نظر آئیں گے۔ غالبؔ کا ایک مشہور شعر آپ نے سنا ہوگا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

عرفان صدیقی غالبؔ کے معشوق کے برعکس ہیں۔ ان کی تقریر میں لذت تو ہے لیکن ہمیشہ وہ

آپ کے دل کی بات نہیں ہوتی بلکہ کوئی اور بات ہوتی ہے جس سے مانوسیت کے بجائے استعجاب پیدا ہوتا ہے۔ان کی شناخت اوران کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ وہ اپنے اور اپنے قاری کے درمیان فاصلہ رکھتے ہیں اور اس شناسائی سے گریز کرتے ہیں جو بعد میں آسودگی اور اکتاہٹ کی شکل اختیار کرلے جس کی طرف اس مضمون کے شروع میں اشارہ کیا جاچکا ہے۔ان کی شاعری کا سوتا بھی سربستہ اور پوشیدہ ہے۔کم از کم پچھلے ایک ہزار سال کے اردو فارسی شاعروں میں کسی سے ان کی راہ ورسم نہیں معلوم ہوتی تو کیا ان کی شاعری کا مخزن بقول حافظؔ بحر ظلمات میں ہے۔

که آب چشمه حیواں درون تاریک است

عرفان صدیقی کے بارے میں ایک مفروضہ قاری سے جو سوالات اوپر کی سطروں میں اٹھائے گئے ہیں جن کا جواب دینے سے میں نے انکار کیا تھا اس سلسلے میں بہت سی معلومات ایک مضمون سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ جو 'عرفان صدیقی سے ایک گفتگو' کے عنوان سے شب خون کے شمارہ نمبر 289 میں چھپا ہے اور گفتگو پہلے کسی وقت نیر مسعود اور محمد مسعود نے کی تھی۔ گفتگو خاصی طویل اور مفصل ہے اور عرفان کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرلیتی ہے اس سے مفروضہ قارئین کو شاعر کو سمجھنے میں خوب مدد مل سکتی ہے کیونکہ عرفان صدیقی جیسے کم سخن اور محتاط و محترز شاعر کو دو ماہرین ادب نے اپنے گھیرے میں لے کر زبردستی نہیں تو کم از کم دراز دستی کرکے بہت سے انکشافات کرا لیے ہیں جس سے ادب دوستوں کو بہت فائدہ ہوگا۔لیکن خود عرفان شاعر کا بڑا نقصان ہوا ہے اور اسے شاید اس کا احساس بھی تھا ایسا لگتا ہے کہ اس نے اپنے عزیز دوست نیر مسعود کی مروت میں آکر ان کے سارے سوالوں کے جواب دے ڈالے ہیں۔ نیر مسعود صاحب نے اپنی نرم گفتاری سے انہیں بہلا بہلا کر بہت سی محرمانہ باتوں کا اقرار کرالیا ہے۔ان کے اس 'بار

خاطر' کے بجائے 'یار شاطر' جانے پر حیرت ہوتی ہے۔ رہی بات عرفان صدیقی کی تو وہ اب دسترس کے باہر جا چکے ہیں ان سے کیا کہا جائے۔ اب خدائے سخن میرؔ ہی ان سے کہہ سکتے ہیں۔

تجھ سے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کوئی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

اچھے شاعر کو زیادہ نہ بولنا چاہیے اس سے اس کی وقعت کم ہو جاتی ہے بس شعر سنا کر چپ ہو جانا چاہیے اس مختصر مضمون میں وہ کام میں کیے دیتا ہوں چند شعر جو حافظہ سے میں پڑے رہ گئے ہیں انہیں لکھ رہا ہوں ضروری نہیں کہ عرفان کے بہترین شعر ہوں۔

قبا سے کیا ہوا ہنگامۂ شوق تماشا میں
ہم آنکھیں بند کر لیں گے تو عریانی سے کیا ہوگا

کب سے پتھر ہوں بیابان فراموشی میں
میرے ساحر مجھے چھو لے کہ بدن ہو جاؤں

مری شاعری مری عاشقی ہے سمندروں کی شناوری
وہی ہمکنار اسے چاہنا وہی بیکراں اسے دیکھنا

کیسے ممکن ہے کسی تنگ قبا کی تجرید
جو مجسم ہے خیالی کبھی ہوتا ہی نہیں

کیا تعلّی ہے میر انیسؔ سے شانہ بشانہ ہو رہے ہیں۔ انیسؔ کا شعر تو مشہور ہے لیکن لکھے دے رہا ہوں۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

شہنشاہ قلمرو لکھنوٴ کی فصاحت کا کیا ٹھکانہ۔ عرفان نے کان پکڑ کر اپنا شعر پیش کیا ہوگا مگر خوب کہا ہے۔

لوٹ لے جاوٴ سر و برگ نوا ہم سخنو
یہ خزانہ مرا خالی کبھی ہوتا ہی نہیں

اور کچھ دامن دل کشادہ کرو مومنو شکر نعمت زیادہ کرو
پیڑ دریا ہوا روشنی عورتیں خوشبوئیں سب خدا کے خزانوں میں ہیں

وہی سچ ہے جو آنکھوں سے ہویدا ہوتا رہتا ہے
اگر ہونٹوں سے پوچھو گے تو وہ انکار کر دیں گے

تیرا سراپا میرا تماشا کوئی تو برج زوال میں تھا
رات چراغ ساعت ہجراں روشن طاق وصال میں تھا

ناچیز بھی خوباں سے ملاقات میں گم ہے
مجذوب ذرا سیر مقامات میں گم ہے

اس خرابے میں بھی ہوجائے گی دنیا آباد
ایک معمورہ پس سیل بلا چلتا ہے

ورنہ ہم ابدال بھلا کب ترک قناعت کرتے ہیں
ایک تقاضا رنج سفر کا خواہش مال و منال میں تھا

اب دو شعر جو علمائے ادب کے معتوب و مردود ہو سکتے ہیں کیا کروں عاشقانہ مزاج رکھتا ہوں بغیر لکھے رہا نہیں جاتا۔

کیا تنگ لباسی ہے کہ وہ پیکر نازک
قاتل ہے کسی خنجر عریاں سے زیادہ

دیکھو میں کوئی یوسف ثانی تو نہیں ہوں

الجھو نہ مرے پیرہن جاں سے زیادہ

اور وہ پوری غزل جو اس قطع سے شروع ہوتی ہے اور ہر دردمند دل پر بجلی بن کر گرتی ہے۔

حق فتحیاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا

تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا

(2005)

عرفان صدیقی: حدیث خلوتیاں کا شاعر

.................مجاور حسین رضوی (الہ آباد)

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویا می ایست
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز ایما نیست

مشاہدات اور تجربات انسانی جذبے اور احساس کو فکر و شعور عطا کرتے ہیں اور یہ وہ منزل ہوتی ہے جہاں پہونچ کر فکر جذبے کی آنچ سے پگھل کے شعر میں ڈھل جاتی ہے شاعر اپنے موضوعات کے انتخاب میں اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ وہ اپنے تخیل سے اب جو پیکر تراشتا ہے وہ منفرد ہوتے ہیں ان میں روایت سے انحراف تو نہیں ہوتا لیکن شعری صداقتوں کو نیا لب و لہجہ دینا ایک طرح کی نئی روایت سازی بن جاتی ہے۔

عرفان صدیقی روایت ساز شاعر تھے انھوں نے کہنہ روایات کو ایک جگہ نگینہ سے استعارہ کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ انھیں یہ بھی احساس ہے کہ روایات کا لباس شکستہ ہو چکا ہے اور ابھی نئی روایات تخلیقی کرب میں مبتلا ہیں اس لئے ان کے یہاں روایت سازی کا عمل جب رموز وعلائم سے کام لیتا ہے۔ ایک شعری فضا کی تخلیق کرتا ہے تو کہیں کہیں یہ احساس ہونے لگتا ہے جیسے یہ باتیں ہمارے عہد کی نہیں بلکہ غالبؔ کی زبان میں کسی عندلیب گلشن نا آفریدہ کی نوائے مضطرب ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی نے صحیح لکھا ہے کہ "وہ آج کے شعر سے زیادہ مستقبل کا پتہ دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ساتھ ہی ساتھ کسی دور دراز لہجہ کی آوازیں اس کی تہہ میں صاف سنائی

دیتی ہیں۔[1] اسی وجہ سے اکثر رنگ ایمائیت ابہام کی سرحدوں میں داخل ہوجاتی ہے اور شاعر اپنی تخلیق کردہ دنیا کو اپنے قاری کے حوالے کردیتا ہے اب یہ قاری کا کام ہے کہ وہ جس طرح چاہے شعر کی تہہ داری سے معنی کے موتی نکالے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کے ہاتھ کچھ نہ لگے، کسی کو عقیق دیا قوت ملے تو کسی کو لولو و مرجان۔

عرفان صدیقی نے بھی یہی کیا ہے۔ انھیں اس سے سروکار ہیں کہ ان کے اشعار کے بارے میں کیا سوچا جائے گا، کیا کہا جائے گا، ان کے اوپر کتنی تہمتیں آئیں گی، اس سے کوئی غرض نہیں۔ وہ اپنے الفاظ کے پیکر اپنے قاری کے حوالے کردیتے ہیں، اپنی تمام تر تہہ داریوں کے ساتھ۔ ان کے بارے میں مرزا شفیق حسین شفق لکھتے ہیں: ''عرفان صدیقی کی شاعری کا یہ بھی پہلو قابلِ ذکر ہے کہ وہ کبھی کوئی بات کھل کر نہیں کہتے جو بات بھی کہنی ہوتی ہے آدھی کہتے ہیں اور آدھی ہمارے وجدان اور ذوق شاعری کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ وہ تفصیل کے تئیں اجمال کے شاعر ہیں۔ ان کے شعروں میں وہ اشارتی انداز اور کہی ان کہی کے درمیانی کیفیت ہوتی ہے جیسے لفظ سرگوشی کررہے ہوں۔ وہ خوبصورت استعاروں، نئی ترکیبوں اور لفظوں کی تکرار سے ایک معنوی فضا تیار کرتے ہیں جسے محسوس کیا جاتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔''[2]

اس اجمال اور ابہام کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جو علامات منتخب کی جاتی ہیں۔ ان کی جڑیں اگر اسی زبان کی تہذیبی روایات میں پیوست ہوتی ہیں تو پھر وہ اجمال، وقت، پسندی میں بدل جاتا ہے اس کی شرح آسان ہوتی ہے یا مشکل لیکن ممکن ہوتی ہے۔ مگر گذرے ہوئے وقت کے ساتھ بہت سارے لفظ اتنے بوڑھے ہوجاتے ہیں کہ وہ جن علامتوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں وہ اپنی ضعیفی کے سبب سے ناقابل فہم ہوجاتی ہیں۔ علامت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے پس منظر میں ہماری کہنہ روایات کے نگینے ہوں یہ اور بات ہے کہ ان نگینوں کے جڑنے میں شاعری کی مرصع سازی اور اس کا فن سامنے آجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۰ء کے فوراً بعد کی جو شاعری ہے اس میں

محمد علوی، عادل منصوری، افتخار جالب اور اسی طرح کے بہت سے شعراء کے یہاں ایسی علامتیں ملتی ہیں جن کے لئے ذہنی ورزش کے ساتھ قاموسی علم بھی کافی نہیں ہوتا۔ عرفان صدیقی کے یہاں مقام شکر ہے کہ عمیر ابونضیر کے علاوہ ایسی کوئی علامت نہیں ملتی۔ جہاں تک ''کاوہ سے '' کا سوال ہے۔ کم سے کم شاہنامہ فردوسی پڑھ کے اور درفش کا ویرانی کا تذکرہ دیکھ کے اس نظم کا مطلب نکالا جاسکتا ہے مگر ان تمام باتوں کے باوجود ان کا اجمال، ابہام اور رمز دایمان کی سرحدیں اتنی متصل ہیں کہ قاری کی ذراسی ذہنی لغزش اسے ابہام کے اندھیروں میں ڈھکیل سکتی ہے۔ اسی لئے یہ کہا جاسکتا کہ ان کے اشعار خواص پسند ہیں اور وہ بلند ذہنی سطح کے خواص کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں علامتیں، استعارے، ترکیبیں، لہجہ، اسلوب تخیل اور فکر نئی ہے۔ وہ جو بھی کہتے ہیں اس میں ملک کی عصری تاریخ اور روایات کے تابندہ موتی باہم پیوست نظر آتے ہیں۔ وہ شاعری کو یا تخلیقی اظہار کو زمان و مکان کا پابند نہیں سمجھتے وقت کا سیل رواں تو صرف نام دیتا رہتا ہے جو آج ہے وہ گذرے ہوئے کل کا مستقبل تھا اور جو وقت آنے والا ہے وہ کسی لمحہ حال بن جائے گا۔ کہتے ہیں۔

اتنی امید نہ آتے ہوئے برسوں سے لگا
حال بھی تو کسی ماضی کا ہی مستقبل ہے

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی نظر میں تعین زمانی صرف انسانی تخیل کا کرشمہ سازی ہے۔ نہ حال ہے اور نہ مستقبل جو لوگ انھیں مستقبل کا شاعر کہتے ہیں وہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کے پاس مستقبل کی کوئی فکر ہی نہیں۔ ہر چیز، ہر شے وقت کے سیلاب میں ہی جا رہی ہے ان میں اور اقبال میں یہی فرق ہے۔ اقبال عشق کی اصطلاح کے ذریعہ وقت کے سیل رواں کو روک دیتے ہیں۔

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانہ کی رد
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عرفان کے پاس عشق کا کوئی تصور نہیں وہ وقت کو روکنا نہیں جانتے بلکہ ان کے خیال میں وقت کے ساتھ جو شے زندہ رہ جائے گی وہ روایت تشنہ لبی ہے اس لئے ان کے استعاروں میں یہ رمز چھپا ہوا ہے کہ بے شک کل من علیہا فان ۴ لیکن اسی کے ساتھ قرآن حکیم میں یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام ۵ بھی ہے یعنی جلال و کرم والے کا چہرہ باقی رہ جائے گا۔ ظاہر ہے پروردگار کے پاس کوئی چہرہ نہیں ہے لیکن وہ کرم کرنے والا ہے۔ جس چہرے پر اللہ کا کرم ہے وہ باقی رہ جائے گا۔ اسی لئے اسلامی تاریخ ایک شخص کو کرم اللہ وجہہ کہتی ہے۔ رضی اللہ بہت ہیں کرم اللہ وجہہ ایک ہے عرفان کی نظر میں وہی فنا کی دست برد سے محفوظ ہے۔

اس طرح رمزیت اور ایمائیت سمجھنے کے لئے منزل قدس کا خلوتی ہونا ضروری ہے میر ۶ صاحب نے خلوتی منزل قدس کی ترکیب وضع کر کے یہ بتا دیا کہ خلوتی راز نہاں ہے اگر حدیث خلوتیاں بیان کردے گا تو عالم شور نشور سے تہہ و بالا ہو جائے گا۔ چنانچہ جو عرفان صدیقی کے یہاں حدیث خلوتیاں ہے وہی اقبال ۷ کے یہاں حرف راز ہے۔ عرفان صدیقی کے پاس نفسِ جبریل نہیں ہے مگر ان کو اس کی تمنا بھی نہیں ہے اس لئے کہ وہ صرف عرفان نہیں ہیں صاحب عرفان ہیں اور انھیں ان روایت مقدسہ کا عرفان حاصل ہے جو حدیث خلوتیاں سنانے والے تھے چنانچہ ان کے استعارے، انکی علامتیں، ان کی رمزیت، ان کی ایمائیت بالکل ہی نئی دنیا کی تخلیق کرتی ہے ان کے یہاں محبوب پر زور نہیں ہے محبوبیت پر زور ہے وہ جفا جو، ستمگر اور قاتل کی تلاش میں نہیں نکلتے بلکہ جفا کا محرک کیا ہے۔ قاتلِ کسے قتل کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے نیزہ ہے مگر اس کا کام صرف چبھنا نہیں ہے سینے سے کھنچا جانا بھی نہیں ہے اسے تو سر بلند کرنا ہے۔ سرفراز کرنا ہے۔ کون سر بلند ہوا۔ کون سرفرز ہوا کس کے حلق بریدہ نے تقریر کی۔ وہ نام نہیں لیتے ہوائے دشت ماریہ تک آپ کو نام نہیں ملے گا اس لئے کہ انھیں اپنے قاری پر بھروسہ ہے۔ اس قاری پر جو کل تھا جو آج ہے جو کل رہے گا جو ایسا قاری ہے جس

کی وجہ سے ہر آنے والا زمانہ باقی رہے گا اگر انسان اس کے حق میں تکلم نہ کرے گا تو پرندوں کے ترنم سے صدائے گریہ بلند ہوگی۔ عرفان کے یہاں صرف اشارے ہیں اور وہ تفصیل و تشریح کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسے کوئی شاداب گلاب سے پنکھڑیاں نوچ کر یہ بتانا شروع کرے کہ اس میں بہتر (۷۲) پنکھڑیاں ہیں۔

ان کی رمزیت اور ایمائیت کہیں بھی کسی بھی دور میں کسی طرح کے حالات پر صادق آسکتی ہے مثلاً تقسیم کا المیہ اس کی پوری تاریخ ہے عرفان سمجھتے ہیں کہ وہ مورخ نہیں ہیں لیکن انھیں یہ بھی احساس ہے کہ واقعات میں نہ جانے کتنے خنجر چبھوئے ہیں کنبہ کا بٹوارہ کیا ہے۔ خاندانوں کو تقسیم کیا ہے تہذیبوں کے ٹکڑے کر دیے ہیں بہت غور وفکر کے بعد انھیں عربی کا ایک لفظ اچھا لگا یا اخی، اے بھائی صرف یہ شعر پڑھ لیجیے۔

تم ایک دن دشت میں چھوڑ کر چل دئے تھے تمہیں کیا خبر یا اُخی
کتے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر نکلتے ہیں یہ بال و پر یا اخی
یہ بھی اچھا ہوا تم اس آشوب میں اپنے سر سبز باز و بچالے گئے
یوں ہی کوئے زیاں میں لگانا ہی تھا ہم کو اپنے لہو کا شجر یا اخی

یہ صدا برلن والے نے بھی لگائی ہوگی۔ کوریا والا بھی لگا تا ہوگا کنیڈا سے بھی یہ آواز آتی ہوگی۔ ہندوستان و پاکستان سے تو مسلسل صدائیں آتی رہتی ہیں۔

وہ اہل سیاست کو اپنے اسی رمزیت کے ساتھ ایک نفسیاتی نکتہ سے باخبر کرتے ہیں۔ یہ بات عاشق و معشوق کی بھی ہوسکتی ہے یہ سماج میں فرقوں کی بھی ہوسکتی ہے اور یہ بات ہندوستان و پاکستان کے درمیان بھی ہوسکتی ہے۔

شوق دونوں کو ہے ملنے کا مگر رستے میں
ایک پندار کی دیوار گراں حائل ہے

یہ کلیت ہے جوان کی علامت نگاری کو ان کی رمزیت کو ابہام کی گرد سے بچالے جاتی ہے۔

انھوں نے نئی ترکیبیں وضع کی ہیں۔ آپ دیکھیے تو لفظوں کے اندھیرے میں استعارے کے تارے چمکتے ہوئے نظر آئیں گے ان کے معنی متعین نہیں ہوتے بلکہ انکے امکانات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ کی اپنی زمین اور اپنا آسمان ہے۔ یہ سارے الفاظ اردو میں شعراء کے یہاں بکھرے پڑے ہیں مگر عرفان نے انھیں نئی معنویت عطا کی ہے۔ مرزا شفیق حسین شفقؔ نے اپنے تحقیقی مقالے میں ایسے بہت سے الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔ ''عرفان صدیقی کے اسلوب کا خاص وصف یہ ہے کہ ان کی ایمائیت معنی کی مختلف جہات کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ البتہ ان کا وہ کلام جو داخلی طور پر ان کے عمیق اور تہہ دار تجربات کا استعاراتی باز آفرینی کرتا ہے مشکل ضرور ہے اور قاری کے لئے تفہیم کی دشواری پیدا کرتا ہے''۔ [8]

لیکن ان کی آخری سطر سے یقیناً اختلاف کی گنجائش ہے کسی کے بھی داخلی تجربات کی تفہیم اسی وقت ہوسکتی ہے جب تفہیم کرنے والا خود بھی مشاہدات اور احساسات کو جذبے کی آنچ میں پگھلانے کا شعور رکھتا ہو۔ عرفان اپنے اشعار پیش کر دیتے ہیں جس قاری کا جیسا ظرف ہو ویسا شعری تجربہ ان کے یہاں سے لے جائے۔ ان کے اشعار کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جو اردو کے بہت سارے حرف شناسوں کی فہم وادراک سے اس لئے بالاتر ہے کہ وہ اردو کے استعاراتی مزاج اور تاریخیت کے ساتھ وابستہ واقعات سے باخبر ہونا ہی نہیں چاہتے مثلاً عرفان صدیقی کا مرکزی استعارہ کربلا ہے کربلا کے ساتھ جو الفاظ کی ایک دنیا ہے اور جو احساس کی شاہراہوں کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ بہت قارئین کی تفہیم کے لئے دشواریاں پیدا کرسکتی ہیں۔ عرفان نے اردو شاعری کی روایات کی پاسداری ضرور کی لیکن انھیں یہ بھی احساس رہا ہے کہ۔

ہمارے داغ چھپاتیں روایتیں کب تک　　لباس بھی تو پرانا تھا پھٹ گیا آخر

یہ محسوس ہوتا ہے کہ روایات کی شکست وریخت پر انھیں صدمہ تو ہے مگر ہلکی سی کسک کی شکل میں انھوں نے اپنی شاعری میں اردو سمجھنے کی روایتی استادی کی مثالیں بھی پیش کی ہیں مثلاً ایک مسلسل غزل جو اردو کی قدیم فنی وشعری روایت کی آئینہ دار ہے ان کے یہاں کہیں کہیں دوسرے شعراء سے استفادہ کی مثالیں بھی ملتی ہیں مثلاً فانی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

اپنے دیوانے پر اتمام کرم کر یا رب
در و دیوار دئے اب بھی انھیں ویرانی دے

عرفان کہتے ہیں۔

اے خدا سبزۂ صحرا کو بھی تنہا مت رکھ
اس کو شبنم نہیں دیتا ہے تو پامالی دے

بعض جگہ ایسی ترکیبیں ملتی ہیں جن سے اردو کلاسکی مزاج یاد آنے لگتا ہے مثلاً ان کے ایک مجموعہ کا نام ہے ''ہوائے دشت ماریہ'' ہوائے دشت کی ترکیب اقبال کی مجبوب ترکیب ہے۔ انھیں ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی تھی۔ اس طرح بے شمار ترکیبیں ہیں جو اساتذہ کی یاد دلاتی ہیں مگر انھیں عرفان نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے اور جس کی معنویت قاری کے ذوق سلیم پر ہے پھر بھی دو چار ترکیبیں ایسی ہیں جو شاید اپنے محبوب مطالعہ کی وجہ سے دور حاضر کے شعراء کے یہاں اس انداز سے نہیں ملتی جیسے زہر فکر، پانی کا مزاج، بام انجمی، آگ کے جسم پر خوابوں کی ردا، چاند رتھ، پیاس کی نہر، نیند کی اجلی پریاں اور نہ جانے کتنی ترکیبیں ہوں گی جن پر شعریات کی تحقیق کرنے والے نظر ڈالیں گے۔ دراصل ان کی شاعری کے لئے بہت سے عنوانات ایسے ہیں جن پر دانشگاہوں میں تحقیق کی جاسکتی ہے۔ پروفیسر نیر مسعود نے جب ان کا تحریری تعارف اس خاکسار سے کرایا تھا تو ان کی شاعری میں جو مختلف جہات سے سطحیں اور تہہ داری تھی اس کی طرف متوجہ کیا تھا اور یہ سب

مقالے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ان پر یہ ساری باتیں لکھنے کے بعد اگر یہ نہ لکھا جائے کہ انکی فکر کربلا پر مرتکز ہے تو شاید یہ ایسی فروگذاشت ہوگی کہ عالم ارواح میں ان کا نورانی پیکر ہمیں معاف نہ کرسکے گا۔ان کی شاعری کا بیشتر حصہ جو استعارات کا قصر تیار کرتا ہے وہاں سرخی ہی سرخی ہے۔خون کی شادابی ہے وہ ایک ایسی فضا کی تخلیق کرتے ہیں کہ پانی شرمندۂ نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنی کلیات کا نام ہی دریا رکھا ہے اور اس پر پہلا شعر یہ ہے۔

یا مراد ہم ہے یہ نغمۂ موجِ گزراں
یا کوئی نہر ہے اس کوہِ گراں کے پیچھے

اب اس شعر کی تشریح کی ضرورت نہیں۔اگر کربلا کے استعارے سے باخبری ہے، پیاس کی سرخ روہے، نیزوں کو فخر ہے کہ ان پر سر بلند ہے۔جو باتیں رمز و ایمان اور استعارات میں تھیں جوان کی تشبیہات میں دوشیزگی تھی استعارات میں طرفگی تھی وہ کھل کر ہوائے دشت ماریہ میں نظر آنے لگتی ہے۔اس مجموعہ کو چھوڑ کر ان کی صدائے گریہ سسکیوں میں بھی سنائی نہیں دیتی بلکہ ان کا پورا وجود آنسوؤں کی ایسی بوند ہے جس سے خورشید شرمندہ نظر آتا ہے۔کچھ شعر لکھے جارہے ہیں ان میں سے ہر شعر پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ان کی تشریح کے لئے ایسے قلم کی ضرورت ہے جو خون دل میں ڈوبا ہوا ہو، جنوں کی حکایت خوں چکاں لکھنے کے لئے ہاتھ قلم کرتے رہیں۔اپنے پاس وہ ظرف کہاں کہ اس کی تشریح کرسکیں کچھ شعر لکھے جارہے ہیں۔

گلوئے خشک میں سوکھی پڑی ہے پیاس کی نہر
خبر نہیں کہ ہے پانی کا ذائقہ کیسا

ایک ہی چیز کو رہنا ہے سلامت پیارے
اب جو سر شانوں پہ رکھا ہے تو دیوار نہ رکھ

کچھ ایسی تیز نہ تھی اس کے انتظار کی آنچ
یہ زندگی ہی مری برف تھی پگھلتی رہی
سروں کے پھول سر نوک نیزہ ہنستے رہے
یہ فصل سوکھی ہوئی ٹہنیوں پہ پھلتی رہی
تو وہ شب بھر کی رونق چند خیموں کی بدولت تھی
اب اس میدان میں سنسان ٹیلوں کے سوا کیا تھا

ان کی یہ نظم بھی ملاحظہ ہو۔

نقشِ ظفر تھا لوحِ ازل پر لکھا ہوا
تلوار کاٹ سکتی تھی کیوں کر لکھا ہوا
صحرا کو شاد کام کیا اس کی موج نے
تھا سر نوشت میں جو سمندر لکھا ہوا
تابندہ ہے دلوں میں لہو روشنائی سے
دنیا کے نام نامۂ سرور لکھا ہوا
مجرائیوں کے قدموں سے لپٹی ہوئی زمیں
پیشانیوں پہ بختِ سکندر لکھا ہوا
رستہ بدل کے معرکۂ صبر وجور میں
کس نے بدل دیا ہے مقدر لکھا ہوا
پانی پہ کس کے دستِ بریدہ کی مہر ہے
کس کے لئے ہے چشمۂ کوثر لکھا ہوا

ہے خاک پر یہ کون ستارہ بدن شہید
جیسے ورق پہ حرفِ منور لکھا ہوا

نیزے سے ہے بلند صدائے کلامِ حق
کیا اوج پر ہے مصحفِ اطہر لکھا ہوا

روشن ہے ایک چہرہ بیاض خیال پر
لو دے رہا ہے بیت ثنا گر لکھا ہوا

سرمہ ہے جب سے خاک درِ بو تراب کی
آنکھوں میں ہے قبالۂ منظر لکھا ہوا

فہرست چاکراں میں سلاطیں کے ساتھ ساتھ
میرا بھی نام ہے سرِ دفتر لکھا ہوا

ان اشعار میں رثائیت نہیں ہے۔ نہ انیسؔ و دبیر کا درد و کرب ہے، نہ اقبالؔ و جوشؔ کا
ہے، نہ آلِ رضا، جمیل مظہری، امید فاضلی اور وحید اختر کی فلسفۂ شہادت کے اسرار و
سے گہری واقفیت کا ادراک لیکن ان سب کے باوجود ان اشعار میں ایک کسک ہے وہی
حدیثِ خلوتیاں کہا گیا۔ آج کا انسان جب ان واقعات کو پڑھتا ہے اور خلوتیاں
قدس کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں بھی ایک تمنا جاگ اٹھتی ہے کاش ہم اس منظر کا ایک
بن سکتے۔ وہی تمنا عرفان صدیقی کے یہاں بھی ہے، کہتے ہیں۔

زندہ ہم سب نوحہ گر بس یہ خبر سننے کو ہیں
لٹ گئے رہزن، گروہِ اشقیا مارا گیا

حواشی

۱ دریا۔ ڈاکٹر توصیف تبسم ص ۱۸

۲۔ عرفان صدیقی شخص اور شاعر۔ مرزا شفیق حسین شفق ص ۱۱۴

۳۔ شب درمیاں ص ۱۸۱

۴۔ سورہ رحمٰن

۵۔ سورہ رحمٰن

۶۔ عشق یہ ہے کہ جو تھے خلوتیٔ منزل قدس
وہ بھی رسوائے سر کوچہ و بازار ہوئے

۷۔ وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبریل دے تو کہوں

۸۔ عرفان صدیقی: شخص اور شاعر۔ مرزا شفیق حسین شفق ص ۱۳۳

(2010)

☆☆☆

عرفان صدیقی: بے نوا شہر میں بارِ دگر آنے کو نہیں

.................سید عبد الباری

اردو غزل کو ایک صدمۂ جانکاہ لاحق ہوا اور ہمارے عہد کا ایک ممتاز و معتبر شاعر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ وہ فن کار تھا جو جدید لب ولہجہ کے ساتھ پروفیسر شمیم حنفی کے الفاظ میں ایک بہت بیدار اور طاقتور تہذیبی یادداشت رکھتا تھا۔ اسے اپنی اقدار اور روایات سے بے پناہ عشق تھا۔ غزل کے کلاسیکی رموز و علائم کو اس نے اس طرح برتا گویا وہ اس عہد کی حسیات کے لیے مناسب ترین وسیلۂ اظہار ہوں۔ وہ جب غزل سرا ہوتا تو محسوس ہوتا کہ ولؔی دکنی، میر تقی میرؔ، مومن خاں مومنؔ ان کے سُر میں سُر ملائے ہوئے کھڑے ہیں۔ مگر وہ گوشہ گیر انسان تھے۔ بقول شمیم حنفی ان سے ملنے پر ان کی اضطرار آمیز ذہانت و زندہ دلی کے ساتھ ان کی عجیب پُر اسرار جلد بازی اور کم فرصتی کا گمان ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی انداز میں وہ اچانک دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مجھے ان سے پہلی بار اس وقت رو برو ہونے کا موقع ملا جب میرے مرحوم دوست ابن فرید صدیقی نے جو عرفان صدیقی کے بڑے قدر شناس تھے لکھنؤ جا کر ان سے ملنے اور مزاج پرسی کرنے نیز رسالہ ''پیش رفت'' کے لیے ان کا کلام حاصل کرنے کا مجھے مشورہ دیا۔ میں بارود خانہ میں ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوا اور اس سراپا مہر و محبت اور پیکر ذکاوت و ذہانت فنکار سے مل کر بے حد مسرور ہوا کہ ابھی ایسے لوگ ہماری تہذیب و فن کے سانچے میں ڈھلے ہوئے موجود ہیں جن میں اس قدر ذکاوت کے ساتھ فروتنی، انکسار، خودداری، تخلیقی جودت و بیکرانی پائی جاتی ہے۔ عرفان صاحب اس بے حد و حساب ہنگامہ و آشوب

سے لبریز وقت کے سمندر میں محسوس ہوا کہ ایک ایسا جزیرہ ہیں جہاں قدیم وجدید کا ایک نرالا اتصال پایا جاتا ہے۔ان کی غزلوں کی زبان بے حد مترنم سبجل اور دلکش تھی جہاں ہمارا لسانی وفنی ورثہ اپنی تمام تر تخلیقی رعنائیوں کے ساتھ ظہور میں آیا ہے اور جہاں ہماری دلربا تلمیحات ، اساطیری علائم، استعارے اور علامتیں اپنے تاریخی تناظر اور معنویت ودلکشی کے ساتھ موجود ہیں۔ان کی تراکیب ہمیں علامہ اقبال کی یاد دلاتی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے زندہ وتابدار اور زندگی کی حرارت سے بھرپور ماضی میں سانس لے رہے ہیں مگر خوبی یہ ہے کہ حال کے تقاضوں سے بے خبر نہیں۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں غزل کے مزاج شناس فنکار انگلیوں پر شمار کیے جاسکتے تھے۔ان میں خال خال ہمارے رموز وعلائم کو ان کی بھرپور معنویت کے ساتھ برتنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔عرفان صدیقی نے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے عظیم کلاسیکی فنکاروں کے حسنِ بیان کا جوہر کشید کرلیا ہے۔وہ اس عہد پر آشوب میں جب کہ میکانکی تمدن کی گرانباری نے انسان سے اس کا ذوقِ لطیف سلب کرلیا ہے وہ ہمیں ایک ایسی فضا میں پہنچا دیتے تھے جہاں بیابانوں میں خیمے نصب ہیں، شمعیں فروزاں ہیں، دلداری ودلجوئی کی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، کہیں آہوئے تتاری رم کررہا ہے، کہیں مسیحا اپنے بیماروں کی طرف متوجہ ہے، ہم کبھی ہجر کی برگ ریزی اور کبھی وصال کی گرمجوشی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔عرفان صدیقی کی چھ پسندیدہ علامتیں ان کی غزلوں میں بڑے دلکش معنوی پیرہن میں سامنے آتی ہیں اور فنکار کی چابکدستی سے نئی نئی معنوی جہتوں کے ساتھ ہمیں متوجہ کرتی ہیں۔مثلاً ''لب'' کی علامت کی لطیف معنویت ملاحظہ کریں:

ذرا سا وقت کہیں بے سبب گزارتے ہیں
چلو یہ شام سرِ جوئے لب گزارتے ہیں

جنبشِ لب ہو تو نقد دل و جاں دیتے ہیں
ہم نئے باج گزاروں میں ہیں سلطانہ لب
وہ تو یہ کہیے کہ اک نام سخن میں آیا
پھول کھلتے ہی کہاں تھے سرِ ویرانہ لب

اسی طرح وہ بدن کے استعارہ سے خوب کام لیتے ہیں اور مجاز سے حقیقت تک کا سفر بحسن وخوبی طے کرتے ہیں۔ مسوقیت اور لذت پرستی کی کوئی بھی پرچھائیں نہیں پڑتی۔ انسانی پیکر بہر حال خدا کی نفاست تخلیق کا مظہر ہے اس لیے ہر عہد میں مرکز توجہ رہا ہے۔ عرفان صدیقی کی نگاہ سطحی نہیں بلکہ وہ گہرائیوں میں اترتی ہے اور اس طرح کے اشعار سامنے آتے ہیں:

میں تیری منزلِ جاں تک پہنچ تو سکتا ہوں
مگر یہ راہ بدن کی طرف سے آتی ہے
روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے
ہے مری خاک بدن آئینہ گر تیرا کمال
تو نے کس چیز کو آئینہ بنا رکھا ہے
اپنے لہو کے شور سے تنگ آچکا ہوں میں
کس نے اسے بدن میں نظر بند کردیا
مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

عرفان صدیقی استعاروں اور علامتوں کا بڑا دلکش ذخیرہ رکھتے ہیں۔ ان کے مرقعوں

میں ایک طرف خیمے نصب ہیں۔ شمعیں فروزاں ہیں تو ناقہ سوار اور زقند بھرتے ہرن، روشن ستارے و ماہتاب سے ایک عجیب انجمن آراستہ کردی گئی ہے۔ کبھی وہ تاریخ کے جھروکوں سے جھانک کر بے حد دلگداز واقعات کی یاد تازہ کرتے ہیں:

شمع خیمہ کوئی زنجیر نہیں ہم سفر اب
جس کو جانا ہے چلا جائے اجازت کیسی
وہ ملا تھا نخل مراد سا ابھی مجھ کو نجدِ خیال میں
تو ذرا غبار شمال میں مرے سارباں اسے دیکھنا
شہروں سے نکل کر ترے دیوانے کہاں جائیں
کم پڑنے لگے دشت غزالاں کے لیے بھی
پس غبار مسافت چراغ جلتے ہیں
خدا رکھے یہ پر اسرار بستیاں آباد
ایک چہکار نے سناٹے کا توڑا پندار
ایک نو برگ ہنسا دشت کی ویرانی پر

عرفان صدیقی کی انجمن شعر و سخن، پرانی یادداشتوں کے حیات بخش دریچے کھول دیتی ہے۔ درخشاں ماضی کے دلکش چہرے سامنے آتے ہیں جو ہمارے اعلیٰ وارفع تصورات کی قندیلیں روشن کردیتے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ کسی درویش کی خانقاہ میں آگئے ہیں جہاں بسیط انسان دوستی کی روشنی سے ذرہ ذرہ چمک رہا ہے اور ہماری برگزیدہ اقدار کے نئے نئے پہلو ہمارے سامنے روشن ہورہے ہیں۔ انسانی دردمندی سے فضا معطر ہے۔ انتقالِ ذہنی کے اس عمل سے ہمیں کچھ دیر کے لیے اس ماحول سے چھٹکارا مل جاتا ہے جہاں ہماری رگوں کا ہر قطرہ خون نچوڑ لینے کی مسابقت جاری ہے۔ یہاں کس کے پاس فرصت ہے کہ وہ دوسروں کا غم غلط کرسکے۔ اس آشوب اختلال

میں عرفان صدیقی کے اشعار ہمارے زخموں کے لیے مرہم جاں بن جاتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے
کہ ہماری گردن میں ایسے بازوحمائل ہوگئے ہیں جو غمگساری سے سرشار ہیں:

فقیر ہوں دل تکیہ نشیں ملا ہے مجھے
میاں کا صدقہ تاج و نگیں ملا ہے مجھے

زباں کو خوش نہیں آتا کسی کا آب و نمک
عجب تبرک نان جویں ملا ہے مجھے

فقیر جاتے ہیں پھیرا لگا کے ڈیرے کو
مدام دولت سرائے یار زیاد

بس اپنے دل کی صدا پر نکل چلیں اِس بار
کہ سب کو غیب سے آتا نہیں اشارہ کوئی

پھر بار فقیروں کا اُٹھانا مرے داتا
پہلے تو یہ کشکول فقیرانہ اٹھالے

مولا پھر مرے صحرا سے بن برسے بادل لوٹ گئے
خیر شکایت کوئی نہیں ہے اگلے برس برسا دینا

گماں نہ کر کہ ہوا ختم کارِ دل زدگاں
عجب نہیں کہ ہو اس خاک میں شرارہ کوئی

عرفان صدیقی کا تغزل ان کے دلکش اسلوب اظہار اور غزل کے کلاسیکی آہنگ کی پاسداری ہی سے نہیں بلکہ ان کی فکر رسا سے نکھرتا ہے جو انھیں تہذیبی ورثہ کے طور پر ملا ہے۔ ان کے کلام سے اس حقیقت کی بار بار تصدیق ہوتی ہے کہ اعلیٰ فکر ہی اعلیٰ درجہ اسلوب تک رسائی کے قابل ہوتی ہے۔ بلندی فکر سے محروم لوگ محض الفاظ کے سامری ہوتے ہیں جن کی

کاوشیں عارضی طور پر شعبدے دکھا کر تہہ نشین ہوجاتی ہیں۔ عرفان صاحب کی اس بلند فکر کا راز ان کے عقائد واقدار کے سرمایہ میں پوشیدہ ہے جسے انھوں نے عالی مرتبت اسلاف سے حاصل کیا ہے اور جس پر وہ جدید آبرو باختہ فنکاروں کی طرح نگاہ حقارت نہیں ڈالتے بلکہ فکر و خیال کی ہر وادی میں اسے چراغ راہگزر کے طور پر ساتھ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کلام میں ایسے ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں اسلوب کی ندرت کے ساتھ خیالات کی رفعت انھیں جواہر پارہ بنا دیتی ہے جن کی قدر و قیمت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ بعض اشعار ہمارے ذہن وضمیر کو جھنجھوڑتے اور ہمارے اذعان وایقان کی دھار تیز کر دیتے ہیں۔ بعض اشعار میں مغرب کی فتنہ جو تہذیب پر چوٹ کی گئی ہے جو انسان کو حیوان بنانے پر مصر ہے:

گر گئی قیمت شمشاد قداں آنکھوں میں
شہر کو مصر کا بازار کیا ہے اس نے

اب سحر تک میں جلوں گا کوئی آئے کہ نہ آئے
مجھ کو روشن سر دیوار کیا ہے اس نے

عجیب لوگ تھے مجھ کو جلا کے چھوڑ گئے
عجب دیا ہوں طلوع سحر پہ راضی ہوں

ایک ہی رنگ ترے اسم دل آویز کا رنگ
اور میرے ورق سادہ میں کیا رکھا ہے

بے دلاں کار نظر ختم کہاں ہوتا ہے
رک بھی جائیں تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے

چراغ گنبد و محراب بجھ گئے ہیں تمام
تو اک ستارۂ داغ جبیں ملا ہے مجھے

دل طرف دار حرم جسم گرفتار فرنگ
ہم نے کیا وضع نکالی ہے میاں دیکھیے گا

سخن میں رنگ تمہارے خیال ہی کے تو ہیں
یہ سب کرشمے ہوائے وصال ہی کے تو ہیں

ابھی پیکر ہی جلا ہے تو یہ عالم ہے میاں
آگ یہ روح میں لگ جائے تو کامل ہوجاؤں

میں ہوں یا موجِ فنا اور یہاں کوئی نہیں
تم اگر ہو تو ذرا راہ میں حائل ہوجاؤ

رات دن سوچتے رہتے ہیں ترے خاک بسر
اس نے چاہا ہے تو دیوار میں در آگئے ہیں

بعض اشعار میں عرفان صاحب لسان الغیب بن جاتے ہیں، کبھی کبھی حضور اکرمؐ کے فرمودات کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں:

اور کچھ دامن دل کشادہ کرو دوستو شکر نعمت زیادہ کرو
پیڑ دریا ہوا روشنی عورتیں خوشبوئیں سب خدا کے خزانوں میں ہیں

کبھی کبھی عشق و عاشقی کے باب میں وہ میرؔ کی بلندیوں پر کھڑے نظر آتے ہیں، وہی لوچ و گداز، وہی بانکپن وہی تیور۔ شاید عشق و جنوں کے ان مضامین سے کسی بڑے فنکار کو مفر نہیں جو ہمارے عالی مرتبت اساتذہ نے ہمارے حوالہ کیا ہے:

کوئی آکے ہمیں زنجیر کرے
ہم رقصِ جنوں فرمانے کو ہیں

جس شہر سے اس نے کوچ کیا
ہم کون وہاں رہ جانے کو ہیں
خانۂ درد ترے خاک بسر آگئے ہیں
اب تو پہچان کہ ہم شام کو گھر آگئے ہیں
لپٹ سی داغ کہن کی طرف سے آتی ہے
جب اک ہوا ترے تن کی طرف سے آتی ہے
انھیں دیوار جاں ہی سے الجھنے دو کہ وحشی ہیں
اگر چھیڑا تو دیوار جہاں مسمار کردیں گے
جان وتن عشق میں جل جائیں گے جل جانے دو
ہم اسی آگ سے گھر اپنا اجالے ہوئے ہیں
اجنبی جان کے کیا نام و نشاں پوچھتے ہو
بھائی ہم بھی اسی بستی کے نکالے ہوئے ہیں
ہم تو زنجیر سفر شوق میں ڈالے ہوئے ہیں
ورنہ یہ انفس و آفاق کھنگالے ہوئے ہیں

مگر اس اعلیٰ سنجیدگی اور رفعت جذبات کے ساتھ ہی ساتھ وہ زمین پر بھی پیر رکھ دیتے ہیں اور نظیر اکبر آبادی کے لب ولہجہ میں ہمکلام ہوتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ آگرہ کا دوسو سال پرانا شاعر پھر اپنی درویشانہ وضع کے ساتھ تاریخ کے پردے سے باہر آگیا ہے:

کوئی چٹھی لکھو رنگ بھری کوئی مٹھی کھولو پھاگ بھری
کبھی دن بیتیں بیراگ بھرے کبھی رت آئے انوراگ بھری

جہاں خاک بچھونا رات ملے مجھے چاندسی صورت ساتھ ملے

وہی دکھیارن وہی بنجارن وہی روپ متی وہی بھاگ بھری

سنو اپنا اپنا کام کریں سُر تال پہ کیوں الزام دھریں

میاں اپنی اپنی بانسریا کوئی راگ بھری کوئی آگ بھری

کبھی کبھی عرفان صدیقی غالبؔ کا تعقل پسندانہ اور فلسفیانہ طرز اختیار کرتے ہیں اور اس عالم ہست و بود پر بلندیوں سے نگاہ کرتے ہیں:

ہمارے کنج ابد عافیت میں کچھ بھی نہیں

یہ کار گاہِ عناصر یہ عالمِ ایجاد

دل اگر دل ہے تو دریا سے بڑا ہونا ہے

سر اگر سر ہے تو نیزوں سے شکایت کیسی

یہاں وہ حشر بپا تھا کہ میں بھی آخر کار

اگر چہ نقش تھا دیوار سے نکل آیا

حاصل نہ ہوا مجھ کو وہ مہتاب تو معبود

کیا فرق ترے ثابت و سیار میں آیا

ہمیں عطیہ ترک و طلب قبول نہیں

تو ہم تو اس کی عنایت پہ خاک ڈال آئے

کبھی کبھی عرفان صدیقی اس زمین کا حق بھی ادا کرتے ہیں جہاں وہ مدتوں مقیم رہے اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے اور فکر سخن کے لیے سازگار ماحول عطا کیا۔ چنانچہ لکھنؤ کی خاص الخاص رعنائی اظہار کی ایک جھلک دیکھیے:

سمٹتی دھوپ ترے روپ کی سہیلی تھی

پہنا گئی ترے کانوں میں گوشوارۂ شام

عاشقوں کے سر تسلیم کو تسلیم سے کام

اب یہ ابرو ہے کہ تلوار ہے میں کیا جانوں

اک ستارہ ادا نے یہ کیا کردیا میری مٹی سے مجھ کو جدا کردیا

ان دنوں پاؤں میرے زمیں پر نہیں اب مری منزلیں آسمانوں میں ہیں

کبھی کبھی عرفان صدیقی کے یہاں داغؔ کا تیور اور شاد عارفی کا بے تکلف اور کھرا لہجہ نظر آتا ہے جو ہماری جدید شاعری کی شناخت ہے۔ ان اشعار میں بھی تہہ داری اور عالمِ اسفل سے بلندیوں تک لے جانے کی صلاحیت موجود ہے:

گرفت ثابت و سیار سے نکل آیا

میں اک کرن تھا شب تار سے نکل آیا

اور ہم ڈھونڈھتے رہ جائیں گے خوشبو کا سراغ

ابھی لے جائے گی اک موج اڑا کر اس کو

کہا تھا تم نے کہ لاتا ہے کون عشق کی تاب

سو ہم جواب تمہارے سوال ہی کے تو ہیں

کوئے قاتل کی روایت ہی بدل دی میں نے

ورنہ دستور یہاں لوٹ کر آنے کا نہیں

عشق میں کہتے ہیں فرہاد نے کاٹا تھا پہاڑ

ہم نے دن کاٹ دیے یہ بھی ہنر ہے سائیں

عرفان صدیقی اس عہد کے غزل کے ایک ممتاز فنکار ہیں۔ ان کی بلندی کا راز یہ

ہے کہ وہ اپنی جڑوں سے الگ نہیں ہوتے۔ وہ اپنی نوا سنجی کا سر چشمہ اپنے خالق کی ذات کو قرار دیتے ہیں جس کی نوازش سے ان کا ساز سخن نغمہ ریز ہے۔ وہ اپنی شاعری کو اقبال کی طرح خون جگر کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور یہ علامت ہے ان کے بے گراں خلوص اور لازوال یقین کی جس نے ان کے دل کی دھڑکنوں کو کائنات کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر دیا ہے:

عزیزو! تم سے راز خوشنوائی کیا چھپانا ہے
میں دل کے چند ٹکڑے اپنے ساز ینے میں رکھتا ہوں

مرا رنگِ ہنر تو ایک تصویر خیالی ہے
میں اک سادہ سا چہرہ دل کے آئینے میں رکھتا ہوں

شاعری کون کرامت ہے مگر کیا کیجیے
درد ہے دل میں سو لفظوں میں اثر ہے سائیں

کہاں سے آتے ہیں یہ گھر اجالتے ہوئے لفظ
چھپا ہے کیا مری مٹی میں استعارہ کوئی

ہم لفظ سے مضمون اٹھا لاتے ہیں جیسے
مٹی سے کوئی گوہر یک دانہ اٹھالے

میں کوئی جگنو نہ تارہ میں کوئی سورج نہ چاند
اور تو دیکھے تو ہے معنی کے اندر روشنی

یہ آئینہ گفتار کوئی اور ہے مجھ میں
سوچا بھی نہ تھا میں نے جو اظہار میں آیا

عرفان صدیقی اگر محض فنکار ہوتے اور فن برائے فن کے علمبردار ہوتے تو شاید وہ اتنے دلوں میں اپنی یادوں کے چراغ روشن نہ کر جاتے۔ ہم ان کی دردمندی و انسان دوستی،

اخلاص و ہمدردی سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ انھیں بار بار یاد کرتے ہیں:

میرے مولا ہجر کی تاریک راتوں کے طفیل
زندگی بھر چاہتیں اور زندگی بھر روشنی

جس کو ہونا ہے وہ فریاد میں شامل ہو جائے
بے نوا شہر میں بارِ دگر آنے کو نہیں

پاؤں کی فکر نہ کر بار کم و بیش اتار
اصل زنجیر تو سامانِ سفر ہے سائیں

یہ جہاں کیا ہے بس اک صفحہ بے نقش و نگار
اور جو کچھ ہے ترا حسنِ نظر ہے ساقی

غبار راہگزر کا یہ حوصلہ بھی تو دیکھ
ہوائے تازہ ترے ساتھ چل رہا ہوں میں

کیسے اس شخص کی تعبیر پہ اصرار کریں
وہ کوئی خواب دکھانا بھی نہیں چاہتا ہے

تو مجھے اس کی خم و پیچ بتاتا کیا ہے
کوئے قاتل تو مری راہگزر ہے سائیں

ایک میں ہوں کہ اس آشوب نوا میں چپ ہوں
ورنہ دنیا مرے زخموں کی زباں بولتی ہے

ہو کا عالم ہے گرفتاروں کی آبادی میں
ہم تو سنتے تھے کہ زنجیرِ گراں بولتی ہے

عرفان صدیقی بیسویں صدی کے آخری عشروں میں اردو غزل کے ان بیدار مغز

فنکاروں میں تھے جنھوں نے غزل کو لطیفہ گوئی، فقرہ بازی، لایعنی لفاظی اور لچر پن سے محفوظ رکھا۔ نظریہ کی توانائی سے شاعری کو محروم کرنے والوں کو بے اثر بنادیا۔ ان کے کلام سے ہماری موجودہ نسلوں کو لاسمتی و فکری خلا سے نجات ملی۔ صحت مند و حیات بخش اقدار کی قدر و منزلت بحال ہوئی۔ ان ذہین و طباع فنکاروں نے غزل کے فنی لوازم کے ساتھ ایسی حکیمانہ باتیں کیں کہ ہمارے کلاسیکی فنکاروں کی یاد تازہ ہوگئی۔ عرفان صدیقی کے ہمعصر سہیل احمد زیدی نے بھی انھیں کی طرح سچائیوں سے آنکھیں چار کرنے اور حقائق کو بلا جھجک گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ بہت زیادہ علم کی شیخی بگھارنا اور فن کرنا انسان کے لیے مشاہدہ حق کی راہ میں حجاب اکبر بن جاتا ہے۔ کچھ فنکار اپنے فکری کھوکھلے پن اور محرومی اخلاص و گداز پر پردہ ڈالنے کی کوششوں میں غزل کو تختۂ مشق بناتے رہے ہیں لیکن عرفان صدیقی اس بازار میں کھرے مال کے تاجر ہیں جس میں کوئی کھوٹ نہیں۔ وہ اس عہد کی عقلی لاچاری اور احساسات کی بے مائیگی کا ذکر بڑے دلکش پیرایے میں کرتے ہیں:

ہم بڑے اہلِ خرد بنتے تھے یہ کیا ہوگیا
عقل کا ہر مشورہ دیوانہ پن لگنے لگا

ہم کہاں کے یوسف ثانی تھے لیکن اس کا ہاتھ
ایک شب ہم کو بلائے پیرہن لگنے لگا

بتانِ شہر سے یہ دل تو زندہ ہو نہیں سکتا
بہت ہوگا تو میری خواہشیں بیدار کردیں گے

یہ موجِ تازہ مری تشنگی کا وہم سہی
میں اس کی سراب میں سرشار رہنا چاہتا ہوں

فیصلہ کر کم و بیش تہہ دریا کی نہ سوچ
مسئلہ ڈوبنے کا ہے ابھر آنے کا نہیں

عرفان صدیقی اچانک ہم سے جدا ہو گئے۔ شاید یہ عہد بے بصراں کی قدر دانی کا حق ادا نہ کر سکا۔ وہ خود بھی قلندروں کی طرح گوشہ گیر رہے۔ اپنے فن کی نمائش اور بازار میں اس کی قیمت وصول کرنا گناہ سمجھتے رہے اور بالآخر یہ کہہ کر رخصت ہو گئے:

جہانِ گم شدگاں کے سفر پہ راضی ہوں
میں تیرے فیصلۂ معتبر پہ راضی ہوں

لیکن اس خاموش اور راضی برضائے یار فنکار کو ہمارے جدید ادب کی تاریخ فراموش نہ کر سکے گی۔

☆☆☆

کنارِ دریا

〈کلیات 'دریا' کا دیباچہ〉

..................توصیف تبسم (اسلام آباد)

اچھی شاعری ذہن و نفس انسانی کی آبیاری کا وسیلہ ہے تا کہ یہ زندگی ہم سب کے لیے زیادہ خوبصورت، بامعنی اور امن و سکون کا گہوارہ بن سکے۔ شعر و ادب نسلِ انسانی کی مشترکہ میراث ہے کیوں کہ اسی آئینے میں عہد بہ عہد آدمی کے خواب تعبیر کی شکل اختیار کرتے رہتے ہیں۔

عرفان صدیقی بھارت کے مردم خیز شہر بدایوں میں جنوری ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ ایم، اے تک تعلیم حاصل کر کے ۱۹۶۲ء میں انڈین انفارمیشن سروسز میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۹۷ء میں اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے سلسلہ میں وہ دہلی اور لکھنؤ میں رہے، اب وہ لکھنؤ میں مستقل رہائش پذیر ہیں اور صحافت کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ ان کے خاندان میں شعر گوئی کی ایک مستحکم روایت قدیم زمانے سے موجود رہی ہے۔ ان کے والد سلمان احمد ہلالی کا شمار اپنے زمانے کے خوش گو شعراء میں ہوتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں محشر بدایونی، دلاور فگار اور نیاز بدایونی، عرفان کے انتہائی قریبی عزیز ہیں۔

عرفان نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ کیا۔ اب تک ان کے چار شعری مجموعے ''کینوس'' (۱۹۷۸ء)، ''شب درمیاں'' (۱۹۸۴ء)، ''سات سماوات''

(۱۹۹۲ء) اور ''عشق نامہ'' (۱۹۹۷ء) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے کالی داس کی طویل نظم ''رت سنگھار'' اور کالی داس ہی کے ڈرامہ ''مالویکا اگنی متر'' کا ترجمہ براہ راست سنسکرت سے اردو میں کیا۔ مراکش کے ادیب محمد شکری کے خودسوانحی ناول کا ترجمہ بھی ان کے تراجم میں شامل ہے۔ یہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ابلاغیات پر تین کتابیں لکھیں جو مکتبہ جامعہ اور نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی نے شائع کیں۔ اردو ادب کا ایک جامع انتخاب (۱۱۰۰ء۔۱۸۵۰ء) بھی کیا جو ساہتیہ اکاڈیمی کی طرف سے شائع ہوا۔ ادب، کلچر اور لوک ادب پر ان کے متعدد مضامین ان تصانیف و تراجم کے علاوہ ہیں۔ اتر پردیش کی حکومت نے ان کی مجموعی ادبی خدمات پر ۱۹۹۸ء میں میرا اکادمی کے اعزاز سے نوازا۔

عرفان کا شمار برصغیر کے ممتاز اور معروف غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام چونکہ ہمارے یہاں با آسانی دستیاب نہیں، اس لیے ''دریا'' کی اشاعت کا مقصد جہاں اچھی شاعری کو عام کرنا ہے، وہیں ان اصحاب کی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنا بھی ہے جو ایسی شاعری کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ ''دریا'' میں صرف چار مجموعے شامل ہیں۔ عرفان کی ادبی شناخت چونکہ ان کی غزل ہی کے حوالے سے ہے، اس لیے ہم نے خود کو ان کی شاعری کے ان مجموعوں ہی تک محدود رکھا ہے۔

عرفان صدیقی کی غزل پر کسی تفصیلی اظہار خیال کا یہاں نہ موقع ہے اور نہ ضرورت پھر بھی اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جس ذہنی و جذباتی فضا میں برصغیر کے مسلمان سانس لے رہے تھے، عرفان نے اس کو کمال ہنر مندی کے ساتھ اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے۔

تم ہمیں ایک دن دشت میں چھوڑ کر چل دیئے تھے، تمہیں کیا خبر یا اخی
کتنے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر نکلتے ہیں یہ بال و پر یا اخی

یہ بھی اچھا ہوا تم اس آشوب سے اپنے سر سبز بازو بچا لے گئے
یوں بھی کوئے زیاں میں لگانا ہی تھا ہم کو اپنے لہو کا شجر یا اخی

ہم اپنے ذہن کی آب و ہوا میں زندہ ہیں
عجب درخت ہیں دشتِ بلا میں زندہ ہیں
خدا کا شکر ابھی میرے خواب ہیں آزاد
مرے سفر مری زنجیر پا میں زندہ ہیں

عرفان کا خواب امن وآشتی کا خواب ہے۔ ان آنے والے دنوں کا خواب جب نفرت اور مغائرت کی دیواریں گر جائیں گی اور یہ دنیا اس جنت موعودہ میں بدل جائے گی جس کی آرزو ابتداء ہی سے آدمی کے دل میں آنکھیں جھپکاتی رہی ہے۔

سرحدیں اچھی کہ سرحد پر نہ رکنا اچھا
سوچئے آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

آج کا انسان جس کربلائے عصر میں کھڑا ہے وہ تخلیقی سطح پر اپنا اظہار چاہتی ہے۔ غالبًا اسی لیے عرفان نے سانحۂ کربلا کو بطور ایک زندہ استعارہ اور علامت کے استعمال کیا ہے۔

جو گرتا نہیں ہے اسے کوئی پامال کرتا نہیں
سو وہ سر بریدہ بھی پشت فرس سے اترتا نہیں

ہوائے کوفۂ نا مہرباں کو حیرت ہے
کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں

عرفان ماضی پرست نہیں بلکہ وہ ماضی کے زندہ اور بہترین عناصر کو اپنی غزل کا حصہ بنا کر آنے والی نسلوں کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔

مجھے الجھا دیا دانش کدوں نے صرف خوابوں میں
کوئی تعبیر رکھ دو میرے بچوں کی کتابوں میں
گھر میں خوابیدہ نکلتے ہوئے سورج کی نوید
میز پر کاپیاں ، بستر پہ کھلونا روشن

ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کا سفر، دراصل تہذیب انسانی ہی کے تسلسل کا دوسرا نام ہے۔عرفان اسی تسلسل حیات کا شاعر ہے، اس کے یہاں زندگی ایک مسلسل بہاؤ کی صورت میں موجود ہے۔عرفان کی اس خصوصیت کے بارے میں، نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں: ''کبھی کبھی کوئی ایسی کتاب بھی بازار میں آجاتی ہے جسے اپنے زمانے کی کتاب تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ وہ آج کے شعر سے زیادہ مستقبل کا پتہ دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ کسی دور دراز گزشتہ منزل کی بھی آوازیں اس کے لہجے کی تہہ میں صاف سنائی دیتی ہیں۔''

آیئے اس مہذب اور شائستہ لہجہ کی شاعری کا استقبال کریں جس میں ہم سب کی آواز بھی شامل ہے۔

(1999)

☆☆☆

عران صدیقی کی پیکر تراشی

.................شہپر رسول (دہلی)

عرفان صدیقی کی غزلوں میں حال کی نا آسودگیوں سے پیدا ہونے والا کرب و ملال، ماضی کی پراسرار جہانوں کی کشش اور مستقبل کے فلک پر ستارۂ غیب کے طلوع ہونے کی توقع نیز دشت زیست میں اچانک ظہور پذیر ہونے والے امکانات ایک ایسا منظرنامہ مرتب کرتے ہیں جو ان کی شعری فکر کی تجسیم کرتا ہے۔ وہ جب اپنے داخلی تاثر کو کائنات کی خارجی وسعتوں سے ہمکنار کرتے ہیں تو ان کے لہجے کا گداز اور کھردراپن مدھم مدھم احتجاج کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ شعری احتجاج انسانی مسائل کی دردمندانہ پیش کش، طنز کی زیریں لہروں اور حال و ماضی کے مثبت اختلاط سے عبارت ہے۔ یہی شعری احتجاج ان کی سوچ کو قوت بخشتا ہے اور ایسے کثیر العناصر شعری پیکروں کی بنیاد بنتا ہے جو ہجر و وصال، کمال و زوال، جلال و جمال، محبت و نفرت، خلوص و منافقت، رنج و راحت، ماضی کے ایوان، حال کے بحران اور مستقبل کے امکان، گویا ایک دنیا پر کمند شعر ڈالتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں چراغ، شہر اور مہتاب کے الفاظ نہ صرف کثرت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عرفان صدیقی نے ان کلیدی الفاظ کے حوالے سے شعری اظہار میں اپنے بیشتر حواس کی شرکت و شمولیت کا سراغ دیا ہے۔ گویا مذکورہ کلیدی الفاظ نے عرفان صدیقی کے بہترین پیکروں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

چراغ کے پیکر کی معنوی نیز تخلیقی سرحدوں پر نظر کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کبھی حال کے

گھپ اندھیروں میں زندگی کرنے کے عزم کو روشن کرتا ہے، کبھی اگلے زمانے کے بزرگوں کے ساتھ گم ہو جانے والی تہذیب کا نشان بن جاتا ہے اور کبھی آنے والی ساعتوں کے انتظار کا منظر پیش کرتا ہے۔ ذیل کے اشعار سے چراغ کی لو میں گردش کرنے والے مختلف رنگوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

یہی رہے گا تماشا مرے چراغوں کا
ہوا بجھاتی رہے گی جلائے جاؤں گا میں

بڑی گھٹن ہے چراغوں کا کیا خیال کروں
اب اس طرف کوئی موجِ ہوا نکل آئے

تیرا سراپا میرا تماشا کوئی تو برجِ زوال میں تھا
رات چراغِ ساعتِ ہجراں روشن طاقِ وصال میں تھا

کون بجھتے ہوئے منظر میں جلاتا ہے چراغ
سرمئی شام ، یہ تحریرِ حنا کس کی ہے

وہ تیز روشنیوں کا دیار ہے ورنہ
چراغ تو کسی تاریک گھر کا میں بھی ہوں

رات بھر رہتا ہے زخموں سے چراغاں دل میں
رفتگاں تم نے لگا رکھا ہے میلہ اچھا

لے گئے سارے دیے اگلے زمانوں کے بزرگ
خیر ہم لوگوں نے طاقوں میں سجا لی دنیا

تمام جلنا جلانا فسانہ ہوتا ہوا
چراغ لمبے سفر پر روانہ ہوتا ہوا

ہوا سے لڑتا ہوا چراغ، جس میں جلتے ہوئے بے فیض چراغ، طاق وصال میں روشن ساعت ہجراں کا چراغ، بجھتے ہوئے منظر کو اجالتا ہوا چراغ، تاریک گھر کا چراغ، رفتگاں کی یاد میں جلتے ہوئے زخموں کے چراغ، اگلے زمانے کے بزرگوں کے ساتھ چلے جانے والے چراغ اور تمام جلنے جلانے کو فسانہ کر کے لمبے سفر پر روانہ ہوتا ہوا چراغ وغیرہ ایک ایسے منظر نامے کے تشکیلی اجزا ہیں جو شاعر کی فکری انفرادیت، معنوی ندرت اور تجربات کے تنوع کو ظاہر کرتے ہیں۔ عرفان صدیقی نے عصر رواں کی پیچیدگیوں، رفتگاں کی عظمت اور ان سے عقیدت نیز ہجر و وصال کے جمالیاتی اظہار کے لیے چراغ کے پیکر کا معنی خیز استعمال کیا ہے۔ یہ پیکر قاری کے کئی حواس کو متحرک کرنے کے علاوہ شاعر کے تصور و تخیل کی کثیر الجہتی کو روشن کرتا ہے۔ اس کی تعمیر و تشکیل میں دیگر فنی و فکری امور کے ساتھ ساتھ بصری اور حرکی عناصر نے بھی خصوصی طور پر حصہ لیا ہے۔

عرفان صدیقی کا خلق کردہ دوسرا پیکر ''شہر'' ہے۔ انھوں نے شہر کے پیکر کو اس پناہ گاہ کی شکل میں پیش کیا ہے جو فرد کو کائنات کے دردِ سر سے محفوظ رکھتی ہے، گھٹن کے احساس کے پیش نظر شہر کو جنگل کر دینے کی دعا بھی مانگی ہے، دن بھر کی تھکن کے باعث شہر کی شب کے ہر دروازے کی زنجیر بن جانے کا اظہار بھی کیا ہے، آسیب صدا کی موجودگی کے باوصف شہر کے ویران وادی ہو بننے سے بچ جانے کا طنز بھی کیا ہے، شہر کی نسبت سے حق تلفی اور بے سائبانی کا شکوہ بھی کیا ہے اور کسی کے چلے جانے کے سبب شہر کے بے رونق ہو جانے کے تعلق سے اپنے قریۂ جاں کی ویرانی کو بھی مجسم کیا ہے:

یہ شہر ذات بہت ہے اگر بنایا جائے
تو کائنات کو کیوں دردِ سر بنایا جائے

در و دیوار میں کچھ تازہ ہوا حل کر دے
کوئی رات آئے اور اس شہر کو جنگل کر دے

دروازوں پر دن بھر کی تھکن تحریر ہوئی
مرے شہر کی شب ہر چوکھٹ کی زنجیر ہوئی

اب بھی سینے تو اک آسیب صدا باقی ہے
شہر ویران نہیں وادیٔ ہو کی صورت

شہر کے ایوان اپنی مٹھّیاں کھولیں ذرا
اس زمیں پر ایک ٹکڑا آسماں میرا بھی ہے

لکھ رہی ہیں سلگتی ہوئی انگلیاں
دھوپ کے شہر میں سائبانوں کے نام

تو یہاں تھا تو بہت کچھ تھا اسی شہر کے پاس
اب تو جو کچھ ہے مرے قریۂ جاں جیسا ہے

ان اشعار میں شہر کا پیکر اپنے بصری، سماعی اور تخیلی عناصر کے حوالے سے زیست کی متعدد پیدا و پنہاں حقیقتوں اور مختلف سطحوں کی معنی خیز تعبیر میں اس طرح معاون ہوتا ہے کہ شاعر کی فکری اپج اور فنی ولسانی دسترس کو آئینہ کر دیتا ہے۔

عرفان صدیقی الفاظ کے راست اور مجازی استعمال پر قادر ہیں اور تخلیقی امکانات کی شناخت بھی رکھتے ہیں۔ بعض اوقات احساس کی گہرائی اور خیال کی پیچیدگی پر الفاظ کی گرفت چست نہیں ہو پاتی، عرفان صدیقی ایسے موقع پر زبان کے مجازی اور تخلیقی استعمال کے ذریعے لسانی اور فنی خوش سلیقگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جس کی مثال حال کی سفا کی اور زبوں حالی کی شعری صورت گری کے ضمن میں واقعات کربلا کے استعارات اور تلمیحات کا تخلیقی استعمال ہے جس کی بنیاد پر انھوں نے پر تاثر، خیال انگیز اور معنی آفریں نقش گری کی ہے:

کسی لشکر سے کہیں بہتا پانی رکتا ہے
کہیں جوئے رواں کسی ظالم کی جاگیر ہوئی

دیکھیے کس صبح نصرت کی خبر سنتا ہوں میں
لشکروں کی آہٹیں تو رات بھر سنتا ہوں میں

کہ جیسے میں سر دریا گھرا ہوں نیزوں میں
کہ جیسے خیمۂ صحرا سے تو پکارتا ہے

دولت سر ہوں تو ہر جیتنے والا لشکر
طشت میں رکھتا ہے نیزے پہ سجاتا ہے مجھے

ادھر تیر چلنے کو تھے بیقرار
اُدھر سارے مشکیزے بھرنے کو تھے

ہوائے کوفۂ نامہرباں کو حیرت ہے
کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں

ان اشعار میں لشکر، خیمہ، کوفہ اور مشکیزہ اساسی الفاظ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور جوئے رواں، ظالم، آہٹیں، رات، سر دریا، نیزہ، صحرا، طشت، تیر، سر، صبح نصرت، کوفۂ نامہرباں، صبر و رضا اور دولت سر وغیرہ تراکیب و الفاظ اساسی الفاظ کے منسلکات کے طور پر برتے گئے ہیں۔ شاعر کی داخلی کیفیات اور خارجی معاملات کی مربوط اور متحد شعری پیش کش میں مذکورہ اساسی الفاظ اور ان کے منسلکات اس طور روبہ عمل ہوتے ہیں کہ معنوی جہات قاری کے پردۂ ذہن پر بھرپور تاثر کے ساتھ مرتسم ہو جاتی ہیں۔ اس طرح یہ تلمیحی پیکر شعر کی ترسیل کے بہترین وسائل بھی ثابت ہوتے ہیں اور کلام میں حسن و آراستگی کا سامان بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ ان پیکروں کی وساطت سے عرفان صدیقی نے کربلا کے تاریخی واقعات اور اقدار کو موجودہ

معاشرتی صورتِ حال سے اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ تاریخی حقائق کی بازیافت کے ساتھ ساتھ ایک نئی معنوی جہت سامنے آ گئی ہے۔ ان پیکروں کی بنیاد پر ان کے بصری، سماعی، حرکی اور محسوساتی شعری تصویری عناصر کی سحر کاری کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

عرفان صدیقی تجربات و تصورات کی نقش گری میں تفکر و تخیل کو متعدد سطحوں پر برتنے کا ہنر جانتے ہیں اور پیکر تراشی کے عمل میں اپنے بیشتر حواس کو بروئے کار لانے پر قادر ہیں۔ چراغ، شہر اور کربلا سے متعلق شعری استعاروں نیز تلمیحات کی بنیاد پر تشکیل پانے والے شعری پیکر ان کی غزل میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں علاوہ ازیں کچھ ذیلی پیکر بھی نمودار ہوتے ہیں جو کلیدی پیکروں کی قوت و معنویت میں اضافہ کرتے ہیں اور ان کی جملہ خصوصیات کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس طرح شاعر کی تخلیقی انفرادیت اور اس کی تخلیقات کے حسن، معنویت نیز زندگی سے اس کے فنکارانہ ربط کے نقوش روشن ہوتے ہیں۔

(2015)

عرفانؔ صدیقی اور روایت کی پاسداری

.................توقیر عالم توقیرؔ (پٹنہ)

انسانی زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ ہر آدمی کسی نہ کسی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے، اس سے اثرات قبول کرتا ہے اور اس کے نقش قدم پر چلنے کو باعث افتخار جانتا ہے۔ ایک باپ کا عکس اگر بیٹے میں نظر آئے تو اس کی توضیح یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے باپ کی شخصیت سے متاثر ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ انسانی فکر پر لازمی طور پر کسی نہ کسی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ بعض خصوصیات میں انسان کا ایک دوسرے سے مماثل ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ ہم ذہنی اور تخیلی ہم آہنگی کو انسان کی اپنی پسند کی شخصیت سے اثر پذیر ہونے کی اہم وجہ قرار دے سکتے ہیں۔ آدمی کو پرکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ وہ کن چیزوں کو پسند کرتا ہے اور کن ہستیوں سے متاثر ہے۔ اگر کوئی ہٹلر کو پسند کرے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر جارحیت اور جبر ہے۔ انسان اپنی سوچ کے مطابق ہی اپنا قبلہ وکعبہ متعین کرتا ہے۔ شاعر اور فن کار بھی انسان ہوتا ہے، اس لئے بعید از قیاس ہے کہ وہ کسی سے متاثر نہ ہو اور اس کے فن یا کلام پر دوسرے کے اثرات نہ پائے جائیں۔ علامہ اقبالؔ کی فکر اور شخصیت پر جہاں مولانا جلال الدین رومیؒ کی صوفیت اور مثبت سوچ کا اثر نمایاں ہے (جس کی بنا پر اقبالؔ نے علانیہ رومیؔ کو اپنا روحانی مرشد تسلیم کیا) وہیں اسد اللہ خاں غالبؔ، مرزا عبدالقادر بیدلؔ کو بے حد پسند کرتے تھے۔ ایسے میں کسی کی شخصیت سے متاثر ہونا اور اس کے کلام پر کسی کے اثرات کا پایا جانا معیوب تصور نہیں

کیا جاسکتا۔ ہاں! شعروادب میں ایک فنکار کیلئے یہ بات اس وقت معیوب بن جاتی ہے جب وہ اثرات اس انداز سے قبول کرے کہ اس پر سرقہ کا دھوکہ ہو یا تتبع اس نوعیت کا ہو کہ اس میں فن کاری نہ پائی جائے۔

کسی فنکار پر اثرات مرتب ہونے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ فنکار اپنے پسندیدہ فنکار کا تتبع کرے۔ دوسرے یہ کہ خیال کی ہم آہنگی کے سبب توارد کی صورت پیدا ہوجائے۔ موخرالذکر کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے یا تسلیم کی جاتی ہے جب دو فنکاروں کا تعلق ایک ہی عہد سے ہو، ورنہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے اپنے پیش رو کا تتبع کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ اپنے پیش رو سے متاثر ہے۔ لیکن فطری فنکار اتباع کے باوجود اپنے قاری کو اس بات کا احساس کم ہی ہونے دیتا ہے کہ اس کے فن پر اس کی پسندیدہ شخصیت کا پرتو بھی ہے اور اپنے فن کی تعمیر میں اس نے کسی سے استفادہ کیا ہے۔ عرفاؔن صدیقی ایک ایسے ہی فنکار کا نام ہے، جس نے اپنے پیش رو شعراء سے اثرات قبول کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اس کا فن کسی پیش رو فنکار کا تتبع نہ بن جائے۔ عرفاؔن کے کلام میں پیش رو شعرا سے اثرات قبول کرنے کی کئی صورتیں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

عصر حاضر میں بعض ناقدین اس خیال کا بار بار اظہار کرتے رہے ہیں کہ جتنی باتیں کہی جانی تھیں وہ کہی جاچکیں۔ اس عہد کا شاعر، اُن کہی ہوئی باتوں کو دہرا رہا ہے۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ آج کوئی نیا خیال اور نئی بات پیدا نہیں ہورہی ہے۔ آج کی شاعری میں معنوی طور پر کوئی جدت نہیں ہے، ایسا کہنا حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف ہوگا۔ البتہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اردو شاعری پر آج ایک ایسا دور رواں ہے کہ جدت اور ندرتِ خیال کی کمی نظر آتی ہے۔ سارا معاملہ غور وفکر کا ہے۔ گوہرِ نایاب کے جویا آج بھی غواصی کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی قیمتی موتی ان کے ہاتھ لگ ہی جاتا ہے۔ عرفان کے یہاں اثرات قبول کرنے کی سب سے

بہتر صورت یہی ہے کہ انہوں نے بعض پیش روؤں کے خیالات سے نئی بات پیدا کی ہے۔ عرفان کی فنکاری یہ ہے کہ وہ آغاز تو اسی نقطے سے کرتے ہیں جہاں سے کسی فنکار نے پہلے کیا تھا مگر اس کے ساتھ چلتے نہیں بلکہ اپنا رخ کسی اور جانب موڑ لیتے ہیں۔ یعنی مرکز یا نقطۂ آغاز ایک ہوتا ہے لیکن سمت اور منزلیں جدا ہو جاتی ہیں۔ گویا بات سے بات اور نکتے سے نکتہ پیدا کرنے کا عمل آج بھی جاری ہے اور حقیقی فنکار کے یہاں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ عرفاؔن صدیقی کے یہاں اس کا خاص التزام ملتا ہے۔ عرفاؔن صدیقی کا ایک ایسا ہی شعر دیکھیں جس کے آغاز میں یک ذرا گمان تو گذرتا ہے کہ انہوں نے کسی کا تتبع کیا ہے لیکن جیسے ہی شعر مکمل ہوتا ہے، قاری اپنے ذہن میں لئے ہوئے خیال سے جدا ہو کر دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے۔ لیکن پہلے اردو غزل کے سب سے بڑے شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی یہ گوہر افشانی دیکھیں ۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

عرفاؔن صدیقی نے غالبؔ سے اس طور پر استفادہ کیا ہے ۔

اس نے کیا دیکھا کہ ہر صحرا چمن لگنے لگا
کتنا اچھا اپنا من اپنا بدن لگنے لگا

غالبؔ عشق میں اپنے سوا کسی کو نہیں گردانتے ۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

عرفاؔن صدیقی نے اس خیال کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری محسوس نہیں کر پاتا کہ اس شعر میں کسی کا اتباع کیا گیا ہے۔ عرفاؔن کا شعر دیکھیں، معنی وہی ہے جو غالب کے مذکورہ شعر کا ہے لیکن عرفان نے ایک نئی دنیا آباد کر دی ہے۔ یعنی اسی خیال میں انہوں نے

تصوف کا رنگ بھر دیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک

مسندِ خاک پر بیٹھا ہوں برابر اپنے

آتؔش نے اسی 'سلطانی' کو عشق سے جوڑ کر اس طور پر اپنا سکہ جمایا ہے۔

زمیں پر بوریا اور بوریے پر مرگ چھالا ہے

فقیر عشق بھی سہ منزلہ کا رہنے والا ہے

غالبؔ نے ایک شعر میں بے پروائی، بے نیازی اور لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔ غالبؔ کی بے نیازی میں قدرے مایوسی ہے اور لہجہ سنجیدہ ہے۔ اسی مضمون کو عرفانؔ صدیقی نے ایک شعر میں باندھا ہے جس میں بے نیازی نے تصوف کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اس میں جلال بھی ہے جس کی بدولت عرفانؔ کی بے نیازی اختیاری معلوم ہونے لگتی ہے۔ عرفان کا جلال تو اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ اس نے دستِ دادار کی ملامت بھی کر ڈالی ہے۔ غالبؔ نے "جام و سبو" اور "بادہ گلفام" جیسی ترکیبوں کا استعمال کر کے اپنا مافی الضمیر ادا کیا جبکہ عرفانؔ نے کاسہ، دست دادار اور درہم و دینار جیسے لفظوں کا انتخاب کر کے اپنا رنگ قائم کر دیا ہے۔ غالبؔ اور عرفانؔ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا

آسماں سے بادہ گل فام گر برسا کرے غالبؔ

ہم نے مدت سے الٹ رکھا ہے کاسہ اپنا

دستِ دادار ترے درہم و دینار پہ خاک عرفانؔ

غالبؔ کے لہجے کی بے نیازی پر مایوسی کا سایہ ہے جبکہ عرفانؔ کے لہجے میں طنطنہ ہے لیکن مدعا دونوں کا ایک ہے یعنی بے نیازی۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس بے نیازی کے اظہار

میں دونوں کے یہاں 'طلب' کا پہلو کہیں نہ کہیں پوشیدہ ہے۔ یہ طلب دست وادار پر غصے کے اظہار کی صورت میں ہو یا بادۂ گلفام برسانے والے آسمان سے روٹھ جانے کی شکل میں ہو۔ ان دونوں شعروں میں جو سب سے اہم فرق ہے وہ یہ ہے کہ غالبؔ نے جام وسبو توڑ ڈالے ہیں اور عرفانؔ نے کاسہ توڑا نہیں ہے بلکہ الٹ دیا ہے۔ عمل کے اسی فرق سے دونوں کے لہجے میں امتیاز پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح غالبؔ کا یہ شعر ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

لاجواب ہے۔ بعض ناقدین کے مطابق اس میں واقعۂ معراج کی طرف اشارہ ہے۔ میرے نزدیک دوسرا مفہوم یہ ہے کہ انسانی زندگی آرزوؤں اور خواہشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ اتمامِ خواہش کبھی نہیں ہوتا اور ایسے میں 'دشت امکاں' بھی ایک 'نقش پا' معلوم ہوتا ہے۔ خواہشوں کے اسی انبوہ کی جانب غالبؔ نے ایک اور شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بہر کیف عرفانؔ نے غالبؔ کے ''دشتِ امکاں'' سے متاثر ہو کر ''دشتِ افلاک'' کی ترکیب نکالی ہے اور 'خیال' کو تمناؤں کے ہجوم سے نکال کر ''وحشت جاں'' کا پیراہن عطا کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

وادیٔ ہُو میں پہنچتا ہوں بیک جستِ خیال
دشتِ افلاک مری وحشت جاں سے کم ہے

غالب کا استفہامیہ اور استفساریہ انداز بھی عرفان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ عرفان کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

وہ جو اک شرط تھی وحشت کی اٹھا دی گئی کیا
میری بستی کسی صحرا میں بسا دی گئی کیا

غالب کی ایک نہایت معروف غزل کا انداز بھی استفہامی ہے۔اس غزل میں بعض اشعار تصوف کے ہیں۔غالب کہتے ہیں ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

عرفانؔ نے غالبؔ کی طرح استفہامیہ انداز اختیار کیا ہے لیکن غالب نے کائنات کے حوالے سے ذاتِ خداوندی کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ وحدت الشہود کا نظریہ ہے، لیکن عرفان نے کائنات کے حوالے سے ذات کے اثبات و وجود کا درک پیدا کیا ہے۔شعر دیکھیں ؎

دکھا رہا ہے کسے وقت ان گنت منظر
اگر میں کچھ بھی نہیں ہوں تو پھر یہ سب کیا ہے

اسے ہم عرفان صدیقی کی ،کائنات کے حوالے سے ذات کو سمجھنے کی کوشش بھی کی قرار دے سکتے ہیں اور اپنے وجود کے حوالے سے خالق کو دریافت کرنے کی سعی بھی۔یہ نظریۂ وحدت الوجود کی تردید بھی ہے۔اسے اس باطل نظریے کا جواب بھی کہا جاسکتا ہے، جس کی بدولت انسان نے اپنے وجود سے انکار کر دیا تھا۔انسان اور کائنات کے وجود کے حوالے سے انسان ہمیشہ سے متجسس رہا ہے۔یہ نظریہ اب بھی قائم ہے کہ آیا انسان اور کائنات کا وجود ہے یا نہیں۔ایک زمانے میں یونان میں اسے محض فریب نظر سمجھا گیا تھا۔اس فلسفہ سے ایک دنیا متاثر ہوئی لیکن ڈیکارڈ نے اس خود فریبی کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہا: ''دنیا کے متعلق تو خیر سوچا جاسکتا ہے کہ ہے یا نہیں ہے لیکن مجھے اپنے وجود پر شبہ نہیں ہوسکتا۔'' (اقبال سب کے

لئے۔فرمان فتح پوری۔ص۔۶۵۔۶۴، بحوالہ فکر اقبال۔مرتبہ غلام دستگیر رشید۔ص۔۱۳۲)

بعد میں اقبال نے اسی خیال کی توثیق کرتے ہوئے کہا: ''میں یہ مان سکتا ہوں کہ اس جہاں میں رنگ و بو اور زمین و آسمان کا کوئی وجود نہیں ہے، یہ بھی فرض کر لیتا ہوں کہ یہ کائنات محض خواب و افسانہ اور حقیقت پر ایک طرح کا پردہ ہے، یہ بھی تسلیم کہ جو کچھ دیکھ اور سن رہا ہوں وہ چشم و گوش کا فریب اور میرے ہوش وحواس کا فتور ہے۔'' لیکن اس بات کو میں کس طرح مان لوں کہ میں نہیں ہوں اگر یہ سمجھوں کہ میرا وجود محض وہم و گمان ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ میرے اندر وہ کون ہے جو مجھے اپنے وجود کے انکار کا احساس دلا رہا ہے۔ یہ احساس اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ میں موجود ہوں اور میری روح یا میری انا یا میری خودی ساری کائنات سے زیادہ یقینی اور قطعی ہے۔'' (گلشن راز جدید۔ بحوالہ اقبال سب کے لئے۔ص۔۶۵۔۶۶)

اقبال کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اگر گوئی کہ من وہم و گماں است
نمودش چوں نمود این و آں است
بگو با من کہ دارائے گماں کیست
یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست

عرفان نے اسی فلسفے کو شعری جامہ پہنایا ہے اور کائنات کو ذات کی اور ذات کو کائنات کی دلیل بنا دیا ہے۔ یہ شعر ایک بار پھر دیکھیں۔

دکھا رہا ہے کسے وقت ان گنت منظر
اگر میں کچھ بھی نہیں ہوں تو پھر یہ سب کیا ہے

عرفان صدیقی فلسفۂ زماں سے متعلق وہی نظریہ رکھتے تھے جو اقبال کا ہے۔ ایک انٹرویو میں وقت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے عرفان نے کہا تھا: ''......وقت جو ہے، وہ

جیسا کہ ہم سب واقف ہیں وقت سے زیادہ mysterious اور پراسرار اور سمجھ میں نہ آنے والی چیز کوئی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ انسانی ذہن کی گویا مجبوری ہے کہ ہمیشہ انسان نے اس کے بارے میں سوچا ہے کسی نہ کسی شکل میں، کسی نہ کسی نہج پر۔ میرے یہاں بھی صاحب وقت کا تصور کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک تو وہ زمان کا معاملہ ہے کہ جس کے حصے آپ کر سکتے ہیں کہ جو صاحب، کہ ایسا زمان جو پہلے مستقبل تھا، پھر حال ہوا اور آگے ماضی ہو جائے گا۔ اور پھر زمان مستقل ہے جس میں نہ ماضی ہے نہ حال ہے کچھ نہیں ہے۔ یہ دونوں پہلو مجھے بے حد mysterious لگتے ہیں۔ اور ان میں آدمی کہاں کھڑا ہوا ہے یہ موضوع ایسا ہے جس پر میں نے کچھ سوچا بھی ہے اور جو کچھ اندر اس سلسلے میں وارد ہوا اس کے اظہار کی کوشش بھی کی......"

اسی انٹرویو میں وہ آگے اپنا ایک شعر یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ذرا سوچو تو اس دنیا میں شاید کچھ نہیں بدلا
وہی کانٹے ببولوں میں وہی خوشبو گلابوں میں

تو ایک زمان یہ ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جو قائم رہتی ہیں۔ یعنی خارج میں بھی ان کا وجود قائم رہتا ہے۔ حالانکہ زمان اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔ یہ تو صرف خارجی علامات ہیں ورنہ زمان کو تو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ تو وقت مجھے انسانی زندگی میں سب سے زیادہ پراسرار چیز لگتی ہے۔ میں طرح طرح سے اس پر غور کرتا ہوں۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا لیکن سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

زمانے کے خارجی اور داخلی پہلو پر اقبالؔ نے نہایت موثر اور واضح انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" کا آغاز ہی اسی فلسفۂ زماں سے ہوتا ہے ؎

سلسلۂ روز و شب، نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب، تارِ حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب، صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اسی نظم کے اگلے بند میں اقبال نے زمانے کی رو کو تند و سبک سیر کہا ہے۔ اور "ساقی نامہ" میں زندگی اور موت کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے زندگی کو "رمِ یک نفس" قرار دیا ہے جو ازل سے ابد تک جولاں ہے اور آخر میں اقبال نے اس "رمِ یک نفس" کو زمانہ سے ہمکنار کردیا ہے۔

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں، بڑی زود رس
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس
زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

اقبال نے اپنی نظم ''زمانہ'' میں زمانے کے اسی خارجی پہلو کا اظہار اس انداز میں کیا ہے۔

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

عرفان صدیقی کہتے ہیں۔

اس خرابے میں بھی ہوجائے گی دنیا آباد
ایک معمورہ پس سیل بلا چلتا ہے

''مسجد قرطبہ'' کا ایک شعر جو اوپر درج ہوا اسے یاد کریں یعنی۔

تیرے شب وروز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اور قرآن کہتا ہے: ''کیا انسانوں پر ایسا زمانہ نہیں تھا کہ قابل ذکر کوئی شے نہیں تھی؟''

(سورۃ الدہر)

قرآن کا یہ استفہامی انداز استفہامی نہیں بلکہ خبریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آگاہ کر رہا ہے کہ انسانوں پر ایک ایسا زمانہ بھی تھا کہ ذکر کے قابل کوئی شے ہی نہیں تھی اور ہم نے اسے قابل ذکر بنایا۔

تو زمانہ ایک رو ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات ہے لیکن ہم اپنی آنکھوں سے لیل ونہار کو آتے جاتے دیکھتے ہیں۔ یہی زمانے کا خارج ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل اسی خارج سے متشکل ہوتے ہیں۔ اسی کو اقبال نے ''دموں کے الٹ پھیر'' سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری طرف اقبال نے مذکورہ آیت کے مفہوم کو عشق کے ساتھ مربوط کر دیا ہے لیکن اشارہ اسی جانب ہے۔

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

گویا زمانہ عشق کا ملزوم ہے۔ زمانہ بھی سیل ہے عشق بھی سیل ہے۔ بہ الفاظ دیگر عشق ہی زمانہ ہے۔ جب عشق نے داخل سے خارج میں ظہور کیا تو زمانہ بھی خارج میں آ گیا۔

عرفان صدیقی کے یہاں ''زنجیر'' اور ''سفر'' جیسے الفاظ علامت کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور اسی سفرِ مسلسل کے سہارے بعض مقامات پر عرفان صدیقی فلسفۂ زماں کی گتھیاں بھی سلجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت کے مفہوم کو گردش پیہم کے ساتھ وابستہ کر کے عرفان نے جو شعر نکالا ہے وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس شعر کو پڑھنے کے بعد آنکھوں کے سامنے زمانہ چلتا ہوا اور عرفانؔ اس کے ساتھ دوڑ لگاتا ہوا نظر آئے گا۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

وقت کے ساتھ طے کیے ہم نے عجیب مرحلے

کچھ مہ وسال کے بہ فیض، کچھ مہ وسال کے بغیر

یعنی کچھ ایسے زمانے بھی گزرے ہیں جن میں مہ وسال کی قید نہ تھی، جس کا واضح اشارہ قرآن کی مذکورہ آیت میں ہے۔ اقبالؔ نے اسی آیت سے استفادہ کیا اور پھر عرفان کے پیش نظر بھی یہی بات رہی۔ اسی مفہوم کو پیش کر کے ایک شاعر نے اس انداز میں اپنی مطلب برآری کی ہے۔

کب سے ہوں مبتلائے غم عشق یہ نہ پوچھ

تخلیق کائنات سے پہلے کی بات ہے

زمانہ کے سلسلے میں ایک واضح حدیث بھی ہے۔ یہ حدیث اقبال نے ایک ملاقات میں برگساں کو سنائی تھی اور وہ اچھل پڑا تھا۔ یعنی لاتسبو الدہر......الخ۔ (زمانے کو برا نہ کہو کیونکہ زمانہ خود خدا ہے۔) اس سے زمانے کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ خدا ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ گویا زمانہ، خدا سے ہے تو زمانہ بھی ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ ایسے

میں سلسلۂ روز و شب کی حقیقت خارجیِ محض ہے۔ اور زمانِ حقیقی ایک سبک سیر رو یا سیل ہے۔ (واللہ اعلم)

بہر کیف عرفان صدیقی نے اپنے پیش رووں سے بے دریغ اثرات قبول کیے ہیں۔ ان میں شاہ نصیر، ذوق، مصحفی، میر اور بلکہ پوری کلاسیکی شاعری شامل ہے۔ اس کا اعتراف عرفان صدیقی نے خود کیا ہے کہ وہ چھوٹا سا پتھر کا ٹکڑا بھی کہیں پڑا ہوا دیکھتے ہیں تو لے لیتے ہیں۔ اسے انہوں نے اپنا حق جانا ہے۔ میرؔ اور غالبؔ سے اثرات قبول کرنے کے تعلق سے وہ کہتے ہیں: ''......سمجھ میں اب تک نہیں آتا کہ میں، اگر گروہ ہو سکتے ہیں شاعری میں تو میں میرؔ کے گروہ کا شاعر ہوں یا غالبؔ کے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان دونوں کے گروہوں میں آدھا آدھا بٹا ہوا ہوں۔ اس لئے کہ بہت زیادہ فیصلہ نہ کر سکنے کے باوجود یہ طے ہے کہ غالب کی شاعری مجموعی طور پر میرؔ سے مختلف ہے۔ یہ تو ضرور طے ہے، تو پھر یہ بھی طے ہے کہ یہ دونوں شاعر الگ الگ طرح کے ہیں۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے دونوں ہی اس قدر پراسرار اور اتنے اپنی طرف کھینچ لینے والے اور اپنے میں جذب کر لینے والے لگتے ہیں کہ میں کبھی اس طرف جاتا ہوں کبھی اس طرف جاتا ہوں۔ بلکہ ایک ہی وقت میں دونوں طرف بٹا ہوا رہتا ہوں۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی شعر میں۔ یہ عجیب و غریب معاملہ ہے اور یہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن دل میرا میرؔ کی طرف بہت کھنچتا ہے۔'' (شب خون۔ نمبر ۲۸۹)

عرفان نے یہ اعتراف تو کر لیا لیکن ان شعرا سے براہ راست طور پر استفادہ کم ہی کیا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش زیادہ کی ہے۔ زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ ان دونوں شعراء کے چند اشعار دیکھیں۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا　　　غالبؔ

زیر افلاک ستاروں کا سفر جاری ہے

اب کے نکلیں گے ہم اے شام زوال اور کہیں — عرفاںؔ

عشق نے غالب نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے — غالبؔ

میں تجھ سے بچ کے بھی کیا دوسروں کے کام آیا
تو اب ملے گا تو بن جاؤں گا نشانۂ لب — عرفاںؔ

اور میرؔ نے کہا ہے ۔

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

عرفان کے یہاں میرؔ کا رنگ دیکھیں ۔

ہم کو تو دلبر خوب ملا خیر اپنی اپنی قسمت ہے
پھر بھی جو کوئی رنج اٹھانا چاہے عشق ضرور کرے

میرؔ کا ایک مشہور شعر ہے ۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

عرفان کہتے ہیں ۔

میں کارِ عشق سے ترکِ وفا سے باز آیا
سب اس کے ہاتھ میں ہے میرے بس میں کچھ بھی نہیں

چند اشعار اور دیکھیں ۔

کیا حال پوچھتے ہو اے پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے میرؔ

اجنبی جان کے کیا نام و نشاں پوچھتے ہو
بھائی ہم بھی اسی بستی کے نکالے ہوئے ہیں عرفانؔ

یہاں لفظ 'بستی' جنت کا استعارہ بھی ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ عرفان صدیقی نے کہا تھا کہ میرؔ سے توفیض یاب ہونا مجبوری ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عرفان صدیقی بعض مرحلوں پر میرؔ کے اثرات کو پوشیدہ نہیں رکھ پائے ہیں۔ یہاں ان کی فنکاری جیسے لاجواب ہوگئی ہو۔ وہ کوئی نکتہ پیدا نہیں کرسکے۔اس نوع کے ایک دو اشعار اوپر درج کیے گئے۔لیکن دوسرے مقام پر وہ اپنے لب و لہجے میں نظر آتے ہیں۔میرؔ کا ایک بڑا مشہور اور عمدہ شعر ہے ۔

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

عرفانؔ صدیقی کا اسی سے ملتا جلتا ایک شعر ہے لیکن کیفیت اور ہے ۔

پاؤں میں خاک کی زنجیر بھلی لگنے لگی
پھر مری قید کی میعاد بڑھادی گئی کیا

یہاں جگر مرادآبادی مجھے یاد آرہے ہیں۔زمانے کی روش پر ان کا یہ پیارا شعر ۔

کیا حال پوچھتے ہو میرے کاروبار کا
آئینہ بیچتا ہوں میں اندھوں کے شہر میں

عرفان صدیقی کو بھی زمانے سے یہی شکوہ ہے۔

بہت ہے آئینے جن قیمتوں پہ بک جائیں
یہ پتھروں کا زمانہ ہے شیشہ گر میرے

ایک اور شعر دیکھیں۔ اس میں شاعر نے جو کچھ ملا ہے وہی لوٹانے کی بات کہی ہے۔ عرفان صدیقی اس لینے اور لوٹانے کے عمل کو ایک دوسرے تناظر میں معیوب اور گناہ قرار دیتے ہیں کیونکہ انہیں اندیشہ ہے کہ اس رویے سے رسم وفا گناہ بن کر رہ جائے گی۔ کسی کا عمدہ اور زبان زد شعر ہے لیکن اس کی مقبولیت نے شاعر کا نام ذہن سے محو کر دیا ہے۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اور عرفان صدیقی کہتے ہیں۔

ہمیں دنیا جو دے گی ہم وہی لوٹائیں گے اس کو
گنہ بن جائے گی رسم وفا آہستہ آہستہ عرفاںؔ

عرفان صدیقی کا اردو شعر و ادب کا مطالعہ جہاں وسیع تھا وہیں ہم عصر شعرا کے فکر و فن کو بھی انہوں نے بغور دیکھا تھا۔ اگر اس بات کا تعین کیا جا سکے کہ انہوں نے اپنے معاصرین سے بھی استفادہ کیا ہے تو بجا طور پر ظفر اقبالؔ اور ندؔا فاضلی وغیرہ کے اثرات ان کے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہم عصر ہونے کے ناطے یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ کس نے کس کا تتبع کیا ہے؟ یا یہ توارد ہے؟ یہ تحقیق طلب ہے۔ بہر حال ندؔا فاضلی اور عرفاںؔ صدیقی کا ایک ایک شعر ملاحظہ ہو۔

زنجیر کی لمبائی تک آزاد ہے قیدی
صحرا میں پھرے یا کوئی گھر بار بسالے ندؔا فاضلی

بحدّ وسعت زنجیر گردش کرتا رہتا ہوں
کوئی وحشی گرفتارِ سفر ایسا نہیں ہوگا عرفاںؔ

عرفان صدیقی کا ایک اور شعر ہے ۔

اور اک جست میں دیوار سے ٹکرائے گا سر
قید پھر قید ہے زنجیر کی وسعت پہ نہ جاؤ

اسی طرح ظفر اقبال اور عرفان صدیقی ایک مقام پر مماثل نظر آتے ہیں۔ زمین ایک ہے آہنگ ایک ہے۔ ردیف میں ''ہے'' اور ''ہیں'' کا فرق ہے ۔اور عرفان کے یہاں ''کے'' کا استعمال اضافی ہے۔البتہ قافیے جدا ہیں۔تاہم ایک کو بڑھنے کے بعد دوسرا خود بخود ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے ۔

نوا کے زیر و زبر نوحۂ نوا ہی تو ہے
خلا کے جس بھی طرف دیکھئے خلا ہی تو ہے ظفر اقبال

سخن میں رنگ تمہارے خیال ہی کے تو ہیں
یہ سب کرشمے ہوائے وصال ہی کے تو ہیں عرفان

''ہی تو ہے'' کا بطور ردیف استعمال عرفان نے ''سات سماوات'' کی دوسری غزل میں کیا ہے۔ یہ غزل دراصل رسول علیہ کے حضور میں نذرانۂ عقیدت ہے۔غزل کا مطلع ہے ۔

نبض عالم میں رواں تیری حرارت ہی تو ہے
کہ یہ عالم ترے ہونے کی بدولت ہی تو ہے

بڑی ناانصافی ہوگی اگر افتخار عارف کا ذکر نہ کیا جائے۔ کیوں کہ عرفان صدیقی اور افتخار عارف میں لہجے کی، لفظیات کی جو مماثلتیں ہیں وہ ایک دوسرے کی بار بار یاد دلاتی ہیں۔حتیٰ کہ بعض اوقات ان کی نشاندہی مشکل ہوجاتی ہے۔خصوصاً واقعہ کربلا کا علامتی اور استعاراتی استعمال ان دونوں کو بہت قریب کردیتا ہے۔خوفِ طوالت کے سبب صرف ایک دو اشعار پر اکتفا کرنا ہوگا۔ افتخار عارف کا ایک نعتیہ شعر ملاحظہ ہو ۔

اپنے آقا کے مدینے کی طرف دیکھتے ہیں
دل الجھتا ہے تو سینے کی طرف دیکھتے ہیں

اور عرفان صدیقی کا یہ مطلع ۔

اے مرے طائر جاں کس کی طرف دیکھتا ہے
ناوک کور کماں کس کی طرف دیکھتا ہے

راس آنے لگی دنیا تو کہا دل نے کہ جا!
اب تجھے درد کی دولت نہیں ملنے والی — افتخار عارف

جاؤ اب دشت ہی تعزیر تمہارے لیے ہے
پھر نہ کہنا کوئی زنجیر تمہارے لیے ہے — عرفان صدیقی

بین سنتا ہے نہ فریاد و فغاں دیکھتا ہے
ظلم انصاف کے معیار کہاں دیکھتا ہے — افتخار عارف

ازل سے کچھ خرابی ہے کمانوں کی سماعت میں
پرندو! شوخیِ صوت وصدا سے کچھ نہیں ہوتا — عرفان صدیقی

میثاق اعتبار میں تھی اک وفا کی شرط
اک شرط ہی تو تھی جو اٹھادی گئی تو کیا — افتخار عارف

وہ جو اک شرط تھی وحشت کی اٹھادی گئی کیا
میری بستی کسی صحرا میں بسادی گئی کیا — عرفان صدیقی

برسبیل تذکرہ عرفانؔ کی اسی غزل کا ایک نہایت عمدہ شعر ہے دیکھتے چلیں ؂

دیر سے پہنچے ہیں ہم دور سے آئے ہوئے لوگ
شہر خاموش ہے سب خاک اڑا دی گئی کیا

عرفان صدیقی نے خیالات و مضامین ہی نہیں اردو کے شعری سرمایے سے اپنے لئے لفظوں کا انتخاب بھی کیا ہے اور یہاں بھی وہ خصوصیت کے ساتھ میرؔ اور غالبؔ وغیرہ سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ عرفان نے زنجیر، وحشت، بوریا، خاک، قاتل، مقتل، شجر وغیرہ جیسے الفاظ بار بار استعمال کئے ہیں۔ اور جہاں بہت سی ترکیبیں وضع کی ہیں وہیں قدیم شاعری سے کچھ لینے میں کوئی تامل نہیں کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید اردو شاعری میں اپنے قدیم شعری سرمایے سے استفادے کا ایک نمایاں رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ عرفان سے ہی مخصوص نہیں ہے دوسرے شعرا نے بھی اس جانب توجہ دی ہے۔ قاضی افضال حسین کہتے ہیں: ''نیا شاعر اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق اپنے ماضی سے استفادہ کی جہتیں خود تشکیل دیتا ہے۔ چنانچہ بعض معاصر شعرا نے اپنی روایت سے متن سازی کے بعض اصول اپنے لئے کچھ منتخب کئے اور کچھ نے کلاسیکی متن سے ابھرنے والے بعض مخصوص کردار کو اپنا غالب محرک قرار دیا ہے۔ ہمارے سینئر معاصرین میں ناصر کاظمی اور منیر نیازی کے بعد شہریار اور عرفان صدیقی نے تجدید پر محسوس کو اور استعارے کے فکری حوالوں پر اس کی حسی دلالتوں کو فوقیت دی۔ ان مشترکہ صفات کے علاوہ ان سب کے یہاں signifiers کا کردار اور ان کے باہم ارتباط کا طریقہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔'' (بحوالہ: آزادی کے بعد اردو شاعری مقالات و مباحث)

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرفان صدیقی نے جہاں نیا آہنگ و لہجہ پیدا کیا، نئی ترکیبیں اور لفظیات وضع کیں جو ان کی انفرادیت کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں وہیں انہوں نے اردو شاعری کی روایت سے استفادہ بھی کیا ہے اور بیشتر مقامات پر قدیم خیالات و

لفظیات کو اپنی ہنرمندی سے نئی صورت بھی عطا کی ہے۔ لیکن یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ یہ عرفان صدیقی کی شناخت اور پہچان نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری کا ایک قلیل جز ہے۔ عرفان کا امتیاز ان کے لہجہ، آہنگ اور ان کے مخصوص لفظیات، استعاراتی نظام اور ان کی ہنرمندی سے قائم ہوتا ہے۔

مسند خاک کا شاعر: عرفان صدیقی

ابرار رحمانی (دہلی)

۱۳/اپریل کو حسب معمول لنچ کے بعد ہم یارانِ بے تکلف پارلیمنٹ اسٹریٹ کی پی ٹی آئی بلڈنگ کے ٹی اسٹال پر حالات حاضرہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ گفتگو اپنے شباب پر تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ ایسے سنجیدہ اور سیریس ماحول میں اچانک ہمارے دوست خورشید اکرم نے برجستہ ایک شعر پڑھا:

ہمیں سچ مچ کوئی آزار ہے ایسا نہیں لگتا
کہ ہم دفتر بھی جاتے ہیں غزل خوانی بھی کرتے ہیں

شعر سن کر ہم بے ساختہ پھڑک اٹھے۔ معلوم ہوا کہ شعر عرفان صدیقی کا ہے اور کسی زمانے میں پارلیمنٹ اسٹریٹ پر یارانِ بے تکلف کے ساتھ گزارے لمحات کا عرفان صدیقی کا خود کا اپنا تجربہ ہے (واضح ہو کہ عرفان صدیقی نے دوردرشن، پریس انفارمیشن بیورو اور ڈیفنس میں پبلک ریلیشنز افسر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات دہلی کے اس پارلیمنٹ اسٹریٹ پر بھی گزارے)۔ اور پھر ہماری گفتگو کا رخ عرفان صدیقی کی شاعری کی طرف مڑ گیا۔ دیر تک گفتگو کا موضوع عرفان صدیقی کی شاعری رہا۔ کسے معلوم تھا کہ ادھر دہلی میں ان کے چاہنے والے ان کے اور ان کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کر رہے ہیں اور اُدھر لکھنؤ میں عرفان صدیقی آخری سانسیں گن رہے ہیں۔ شاید intution اسی کو کہتے ہیں۔ غالباً

ہم ان کی زندگی میں ہی ان کی تعزیت کر رہے تھے۔ ۱۵/اپریل کو عرفان صدیقی ہم سے بچھڑ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس گفتگو میں خورشید اکرم اور ناچیز کے علاوہ جناب اکرام خاور بھی شامل تھے، جنہوں نے عرفان صدیقی کے مصرعہ 'مسندِ خاک پر بیٹھا ہوں برابر اپنے' سے متاثر ہوکر اپنی نظموں کے مجموعے کا نام 'مسندِ خاک' رکھا ہے۔

عرفان صدیقی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ شاعری میں دیر سے وارد ہوئے لیکن بہت جلد انہوں نے اپنی الگ شناخت قائم کرلی۔ ادھر دو دہے سے اردو شاعری کے منظر نامے پر چھائے رہے تھے۔ غزل گوئی میں اپنا الگ اسلوب وضع کیا تھا اور اپنے اسی منفرد اسلوب کے سبب وہ سب سے الگ اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ خواہ لفظیات ہوں یا ڈکشن سب میں انہوں نے الگ پہچان بنائی تھی۔ اُردو میں ہر دور میں شعراء کی تعداد سب سے زیادہ رہی ہے اور ان شعراء میں غزل گویوں کی تعداد ہی سب سے زیادہ رہی ہے۔ ایسے میں شاعری کرنا اور بات ہے اور شاعری کرتے ہوئے اپنی پہچان بنالینا دیگر بات ہے۔ وہ اس دور کے اہم ترین غزل گو شاعر تھے۔ کینوس، شب درمیاں، سات سماوات اور عشق نامہ (چاروں مجموعہ غزلیات) اور ہوائے دشتِ ماریہ (مجموعہ منقبت) کے نام سے ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔

پاکستان میں ان کے پہلے چار مجموعوں کو ایک ساتھ بطور کلیات عرفان صدیقی 'دریا' کے نام سے شائع کیا گیا، جو کام ہندوستان میں ہندوستان کے اربابِ ادب کو کرنا تھا، وہ کام غیروں نے اور پڑوسیوں نے کر ڈالا۔ برا ہو ادبی سیاست کا کہ ہندوستان کے سب سے بڑے ادبی ادارے نے انہیں اب تک نظر انداز کیا جب کہ اسی ادارے نے ان سے کمتر درجے کے شعراء کو بھی نوازا ہے۔ عرفان صدیقی اس ادبی سیاست اور توڑ جوڑ سے ہمیشہ دور ہی رہے۔ اور صرف اپنے فن سے ہی مطلب رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں کھرا پن اور تجربات و مشاہدات کی سچائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ آیئے ان کے چند اشعار سے ہم آپ بھی محظوظ ہوتے ہیں:

دو جگہ رہتے ہیں ہم ' ایک تو یہ شہرِ ملال
اور اک وہ جو خوابوں میں بسایا ہوا ہے

خدا کرے صفِ سردادگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

یہ درد ہی مرا چارہ ہے تم کو کیا معلوم
ہٹاؤ ہاتھ میں بیمار رہنا چاہتا ہوں

ریت پر تھک کے گرا ہوں تو ہوا پوچھتی ہے
آپ کیوں آئے تھے اس دشت میں وحشت کے بغیر

وہ مرحلہ ہے کہ اب سیلِ خوں پہ راضی ہیں
ہم اس زمین کو شاداب دیکھنے کے لیے

اک ذرا خم ہو کے میں پیشِ ستمگر بچ گیا
میری پگڑی گر گئی لیکن میرا سر بچ گیا

چاہتی ہے کہ کہیں مجھ کو بہا کر لے جائے
تم سے بڑھ کر تو مجھے موجِ فنا چاہتی ہے

کھنچی ہوئی ہے فضا میں دھوئیں کی ایک لکیر
چراغ کوئی سفر پر روانہ ہو گیا ہے

میں چاہتا ہوں کہ سب معرکے یہیں پہ ہو جائیں
کہ اس کے بعد یہ دنیا کہاں سے لاؤں گا میں

ہم کسے اپنے سوا عشق میں گردانتے ہیں
ہم نے لکھا بھی تو لکھیں گے قصیدہ اپنا

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک
مسندِ خاک پر بیٹھا ہوں برابر اپنے

پہلے شعر میں تجربے کی شدت محسوس کی جاسکتی ہے۔یقیناً ہر انسان دوہری زندگی جینے پر مجبور ہے۔ایک تو وہ حقیقی زندگی جسے شاعر نے 'شہرملال' سے تعبیر کیاہےاور دوسرے وہ جو ہر انسان کے خوابوں میں بسی ہوتی ہے جسے جمیل مظہری نے 'فریب پیہم' سے تعبیر کیا ہے۔جمیل مظہری نے کہاہے:

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ہم میں سے اکثر لوگ اک شہر جو خوابوں میں بسایا ہوا ہے' جو فریب پیہم بھی ہے' اسی میں جیتے رہتے ہیں۔اب چاہے یہ سراب ہو' چاہے دھوکہ ہی ہو لیکن ایک سہارا تو ہے۔
ہر شعر پر گفتگو نہ کرتے ہوئے آیئے ہم سیدھے ان کے اس شعر پہ غور کرتے ہیں:

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک
مسندِ خاک پر بیٹھا ہوں برابر اپنے

کہنے کو یہ تعلّی کا شعر ہے لیکن یہاں اس تعلّی میں بھی وہی شاعرانہ خودی نظر آتی ہے جو جمیل مظہری کے یہاں بھی ہے' اقبال کے یہاں بھی اور غالب کے یہاں بھی بلکہ کسی نہ کسی شکل میں تقریباً سبھی شعراء کے یہاں موجود ہے۔یہ عرفان صدیقی کا استغنا' بے نیازی اور حد درجہ خودی ہی ہے کہ وہ کسی سلطان کو بھی خاطر میں لانا پسند نہیں کرتے۔حالانکہ شاعر کا مسند کوئی تختِ طاؤس بھی نہیں بلکہ 'مسند خاک' ہے۔مسندِ خاک کا استعمال اس شعر کو عرش پر پہنچاتا ہے اور شاعر فی الحقیقت عبدالغنی یعنی بے پروا اور بے نیاز نظر آتا ہے۔
مسند خاک کے اس شاعر کے بیشتر اشعار ہمیں زندہ احساسات و جذبات سے ہمکنار

کرتے ہیں کہ یہ اشعار تجربات و مشاہدات کی بھٹی میں تپ کر نکلے ہیں۔ عرفان صدیقی کے بقیہ مندرجہ اشعار بھی محض تفریح طبع کے لیے نہیں بلکہ ان میں سے ہر شعر اپنے اندر جہان معنیٰ لیے ہوئے ہے اور ہر شعر ایک نئی دنیا سے متعارف کراتا ہے۔ عرفان صدیقی دراصل دنیا کے تمام تر معاملات دنیا کے تمام تر معرکے یہیں کر لینے کے قائل تھے:

میں چاہتا ہوں کہ سب معرکے یہیں پہ ہو جائیں
کہ اس کے بعد یہ دنیا کہاں سے لاؤں گا میں

لیکن کچھ ایسا بھی ہے کہ یہ معرکے کچھ اس انداز سے کیے گئے کہ کسی بات سے نہ وہ کبھی جھنجھلائے، نہ کبھی جھلائے، نہ کبھی اُلجھے، نہ ستائش کی تمنا کی، نہ صلے کی پروا۔ انہوں نے اس معاملے میں بڑی حد تک خود فریبی سے ہی کام لیا اور کبھی کسی کی قصیدہ خوانی نہیں کی:

ہم کے اپنے سوا عشق میں گردانتے ہیں
ہم نے لکھا بھی تو لکھیں گے قصیدہ اپنا

ادب میں افراط و تفریط، اقرباء پروری، گروپ بندی کے اس دور میں عرفان صدیقی کا یہ شعر ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ (2015)

☆☆☆

عرفان صدیقی ایک مطالعہ

.................آفاق عالم صدیقی (شموگہ)

غزل ہماری تخلیقی قوت مندی اور تہذیبی ثروت مندی کے اظہار کا ایسا آبگینہ ہے جس میں خارجی اور باطنی دونوں زندگی کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل اپنی ابتدا سے لے کر آج تک لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی ہے۔ یہ ایسی صنف شاعری ہے جس میں فکر و نظر کے نت نئے چراغ روشن کیے جاتے ہیں تو احساسات و جذبات اور تجربات و مشاہدات کے مرقعے بھی خلق کیے جاتے ہیں، میر تقی میر سے لے کر غالب تک اور غالب سے لے کر اقبال اور پھر اقبال سے لے کر فراق و عرفان صدیقی تک غزلیہ شاعری کی ایسی مربوط و مضبوط اور زرخیز و دلپذیر روایت قائم ہو چکی ہے جو یقیناً آنے والی نسل کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

اگر یہ کہا جائے کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے جس جدید شاعری کی بنیاد ڈالی تھی وہ شاد و حسرت، اصغر و جگر اور اقبال و فانی سے ہوتی ہوئی ناصر کاظمی، منیر نیازی، شکیب جلالی، ظفر اقبال، عادل منصوری، احمد مشتاق، شہریار، اور عرفان صدیقی تک پہنچ کر کمال کو پہنچی تو بے جا نہ ہوگا۔

اردو زبان و ادب میں کئی بار ایسا ہوا کہ کسی نہ کسی تحریک اور رجحان نے غزل کے مزاج و منہاج اور آہنگ کو بدلنے کی کوشش ضرور کی مگر غزل اپنی حدود میں رہ کر نئے پن کے احساس کے ساتھ اپنا وجود قائم رکھنے میں کامیاب رہی اور تحریک و رجحان کے بادِ سموم کے گزرتے ہی نئے برگ و بار کے ساتھ اپنے وجود کے استحکام کا احساس دلا دیا۔

ترقی پسندوں نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے سب سے زیادہ توجہ افسانے اور نظم پر دی تو جدیدیت نے غزل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور نظمیہ شاعری کے میدان میں نت نئے تجربے کیے جو مقبول بھی ہوئے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جدید فضا میں غزل کا دم گھٹنے لگا اور اس میں بہت کچھ یکسانیت و یک رنگی پیدا ہوگئی۔ مگر یہ کیفیت زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہی۔ ۱۹۷۰ء کے آس پاس بشمول غزل کے تمام اصناف ادب میں تبدیلی واقع ہونا شروع ہوگئی (جو ۱۹۸۰ء کے بعد والی تخلیقی صورتحال کی شکل میں پہچانی گئی) اس تبدیلی کے تحت غزل میں کلاسکی سرمائے اور تاریخی و تہذیبی ورثے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جانے لگی۔ اس نئی تخلیقی صورتحال میں جن شاعروں نے غزل کا مثبت ارتقاع کیا اور اپنی پہچان بنائی ان میں عرفان صدیقی کا نام بہت نمایاں ہے۔

عرفان صدیقی ایک ایسے شاعر کا نام ہے جو اپنی خوبیوں کی وجہ سے پوری اردو دنیا میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ان کی شاعری بمشکل تمام تیس سالوں پر محیط ہے لیکن یہ ان کی شاعری کی ظاہری عمر ہے، معنوی طور پر ان کی شاعری صدیوں پرانے انسانی احساسات و جذبات اور تہذیب کے بکھراؤ اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل، کشمکش اور دکھ کی امین ہے، ان کا لہجہ، ان کا اسلوب، ان کا طرز تخاطب، ان کی فکر، ان کا شعور، اور ان کا تخیل صرف ہمعصروں ہی میں نہیں پیش روؤں میں بھی سب سے انوکھا اور دلپذیر ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''کینواس'' ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا مگر اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ ایسا شاید اس لیے ہوا کہ اس وقت تک ادب پر جدیدیت کے خاص موضوعات کی پکڑ مضبوط تھی اور ان کے ہمعصر بلراج کومل، عمیق حنفی، کمار پاشی، بانی، اور زبیر رضوی وغیرہ پوری طرح سرگرم عمل تھے، جب کہ ''کینواس'' کی شاعری بہت حد تک اپنے ہمعصروں کے پسندیدہ موضوعات سے صرف نظر کر رہی تھی، اس کا فکری نظام کھلے طور پر تہذیبی روایت کی طرف مراجعت کرتا محسوس ہو رہا تھا، گویا

عرفان صدیقی بھیڑ میں اپنی راہ آپ تلاش کر رہے تھے۔

مظہر امام صاحب نے لکھا ہے کہ: ''عرفان صدیقی مزاجاً گوشہ نشیں اور کم آمیز تھے، ہر کس و ناکس کو شعر سنانے کا شوق نہ تھا، شعری محفلوں سے احتراز کرتے تھے۔'' (تنقید نما)

ظاہر ہے کہ جو شاعر بھیڑ میں گم ہونا یا بھیڑ کا حصہ بننا گوارہ نہیں کرتا ہے اور عام مذاق سے ہٹ کر کچھ کہنا چاہتا ہے اسے آسانی سے شہرت اور مقبولیت نہیں ملتی ہے۔ ایسا ہی کچھ عرفان صدیقی کے ساتھ بھی ہوا۔

ان کا دوسرا مجموعہ کلام ''شب درمیاں'' ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔ مگر یہ مجموعہ کلام بھی زیادہ مقبول نہیں ہوسکا، البتہ شاعر کی شخصیت کا احساس دلانے میں کامیاب رہا، اور سنجیدہ حلقے میں ایک اچھے شاعر کی آمد کے امکان پر ہلکی پھلکی گفتگو کا آغاز ہوگیا، لیکن جب ان کا تیسرا مجموعہ کلام ''سات سماوات' ۱۹۹۲ء میں افق ادب پر نمودار ہوا تو اس نے اپنی تابناکی سے قارئین کو چونکا دیا اور تخلیقی سچائیوں کے پارکھ اور غواص معانی کے خوگر فنکار و ناقد نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عرفان صدیقی کو نمایاں کرنے میں شمس الرحمٰن فاروقی اور محمود ایاز صاحبان کا بڑا ہاتھ ہے، عرفان صدیقی فاروقی صاحب کے حلقہ احباب میں شامل تھے تو محمود ایاز صاحب انہیں اپنا محبوب شاعر بتاتے تھے، میں سمجھتا ہوں کہ اگر فی الواقع ایسا ہی تھا تو کہنا چاہیے کہ عرفان صدیقی کی شاعری اس وقت بھی بہر حال اس پایہ کی تھی کہ اپنے وقت کا بڑا ناقد اس سے متاثر ہوتا اور اپنے وقت کے سب سے اہم رسالے کا فاضل مدیر اسے اپنا محبوب شاعر گردانتا، گویا عرفان صدیقی کی شاعری میں ابتدا ہی سے وہ خوبی پائی جاتی تھی جس نے بعد میں ان کی شخصیت کو استحکام بخشا۔ مگر عام لوگوں پر ان کی شاعری کی خوبی ''عشق نامہ'' کی اشاعت کے بعد کھلی۔

عرفان صدیقی کی تخلیقی سنجیدگی اور انہماک کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا

ہے کہ انہوں نے زمانے کے فیشن کے مطابق نہ تو غزل کے ساتھ کھلواڑ کیا اور نہ سستی شہرت کی طرف توجہ دی، مظہر امام صاحب نے لکھا ہے کہ ''حکومت ہند کی انفارمیشن سروس سے وابستہ ہونے کے باعث ان کی پوسٹنگ کئی قسطوں میں دہلی میں بھی اچھے خاصے عرصے تک رہی، لیکن وہ یہاں کے ادبی حلقوں سے دور ہی رہے، ہر چند دہلی میں ان کے قیام کا زمانہ اس وقت کی نئی نسل یعنی جدیدیت سے وابستہ یا متاثر نسل کے عروج اور ہما ہمی کا زمانہ بھی تھا۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی تخلیقی قوت پر بھروسہ رکھنے والے ایک خود آگاہ شاعر تھے، انہیں یہ گوارہ نہیں تھا کہ وہ کسی طرح کی ہنگامہ آرائی کے ساتھ اپنی پہچان پر اصرار کریں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ رسالوں میں شائع ہونے کے معاملے میں بھی دوسرے شاعروں کی طرح افراط وتفریط کے شکار نہیں ہوئے۔ تخلیقی خود اعتمادی اور شعور کی پختگی کی یہی وہ طاقت تھی جس نے ان سے ایسا شعر کہلوایا۔

ہم کسے اپنے سوا عشق میں گردانتے ہیں
ہم نے لکھا بھی تو لکھیں گے قصیدہ اپنا

عرفان صدیقی کے یہاں جدیدیت کی بہترین صفتیں تو ضرور پائی جاتی ہیں مگر وہ بعض شدت پسند جدید شاعروں کی طرح محض، تشکیک ، تنہائی، وجودیت، فردیت، اور دوسرے ٹریڈ مارک موضوعات تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کے اشعار کسی ایسے وجدانی تجربے کا حصہ معلوم ہوتے ہیں جن میں اقدار کے حوالہ سے ماضی کی طرف مراجعت اور روحانی رشتوں کی بازیافت کی کوشش نمایاں نظر آتی ہے۔

سفر طویل ہے اگلا قدم اٹھاتا ہوں
میں پھر سے گم شدگاں کے علم اٹھاتا ہوں

میں اپنی کھوئی ہوئی لوح کی تلاش میں ہوں
کوئی طلسم مجھے چار سو پکارتا ہے

غزل گوئی کی پوری روایت کے پس منظر میں ماضی کی طرف مراجعت اور روحانی سہارے کی اس ضرورت کو ایک طرح کے صوفیانہ رویہ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ماضی اور روحانیت کی بازیافت کے اس صوفیانہ رویے کی تشکیل میں تاریخ کے وسیلے سے تلمیحات اور مذہبی واقعات کی مدد سے قدروں کی بازآفرینی نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ عرفان صدیقی نے متذکرہ عوامل سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ اسلوب و انداز کے ساتھ ساتھ الفاظ و تراکیب اور استعارہ سازی میں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ کربلا کا سانحہ ہماری شاعری میں طرح طرح کے استعاراتی معنیٰ و مفاہیم کا شروع ہی سے مخرج رہا ہے۔ اس سانحہ کو بہتیرے فنکاروں نے اپنی صلاحیت کے مطابق استعارہ اور علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لیکن عرفان صدیقی نے جس خوبی اور کمال فنکاری کے ساتھ اس سانحہ کو اپنی شاعری میں بطور استعارہ کے استعمال کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے کربلائی صورتحال کو پس منظر کے طور پر استعمال کر کے کربلا کے سانحہ کو جس خوبصورتی سے ہزار معنیٰ استعارہ بنا کر اپنی شاعری کے پیکر میں روح کی طرح حل کر دیا ہے۔ وہ بس انہیں کا خاصہ ہے۔

اے لہو میں تجھے مقتل سے کہاں لے جاؤں
اپنے منظر ہی میں ہر رنگ بھلا لگتا ہے

وہ مرحلے ہیں کہ اب سیل خوں پہ راضی ہیں
ہم اس زمین کو شاداب دیکھنے کے لیے

میں چاہتا ہوں کہ سب معرکے یہیں سر ہو جائیں
کہ اس کے بعد یہ دنیا کہاں سے لاؤں گا میں

دیکھیئے کس صبح نصرت کی خبر سنتا ہوں میں
لشکروں کی آہٹیں تو رات بھر سنتا ہوں میں

دولت سر ہوں سو ہر جیتنے والا لشکر
طشت میں رکھتا ہے نیزوں پہ سجاتا ہے مجھے

ہوائے کوفۂ نامہرباں کو حیرت ہے
کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں

ان تمام اشعار میں معنویت کا ایک جہان سانس لے رہا ہے۔ علامت واستعارے نے معنویت کا ایک سیل رواں کر دیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ معنیات کا یہ جہان نو سانحہ کربلا کی لفظیات وتلازمات سے خلق ہوا ہے۔ کربلا سے متعلق الفاظ وتراکیب اور تلازمات ہر شعر کو معنویت کا اپنا تناظر فراہم کرتا ہے۔ لہو، مقتل، سیل خوں، معرکے، نصرت، لشکر، دولت سر، طشت، نیزہ، کوفہ، خیمہ صبر ورضا، یہ تمام الفاظ وتراکیب کربلا کے استعاراتی تناظر میں زندگی کی سچائیوں سے متعلق معنویت کا ایک سمندر آسا جہان خلق کر دیتے ہیں۔ ابوالکلام قاسمی صاحب نے بالکل درست کہا ہے کہ واقعات کربلا کے گرد پسندیدہ طور پر استعارہ سازی کرنے والے شاعر عرفان صدیقی نے وقت کے ساتھ ساتھ حق وباطل کی کشمکش، جذبہ قربانی، اقدار پر اصرار، آزمائشی لمحات کی بازیافت اور مقصد اور عقیدے سے ماخوذ جنون کی حدوں کو چھوتی ہوئی سرشاری جیسے تہذیبی، اخلاقی اور انسانی قدروں کو ان کے لوازم کے ساتھ پیش کرنے کی طرف زیادہ توجہ کرنا شروع کر دیا ہے۔

جدید غزل کے تناظر میں عرفان صدیقی کا نام ایک انفرادی پہچان رکھتا ہے انہوں نے غزلیہ شاعری کو اس کی صحت مند تہذیبی روایت کے دائرے میں رکھ کر ہمعصر زندگی کے تمام تر مسائل کو کربلا کے استعاراتی تناظر میں اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ غزل کا محسوساتی نظام

ابدیت کی رمزیت کا حامل بن گیا ہے۔ کربلا کے استعارہ کو استعمال کرنے والے فنکاروں میں عرفان صدیقی کا نام سب سے معتبر اس لیے ہے کہ انہوں نے دوسرے فنکاروں کی بنسبت خود کو کربلائی صورتحال اور کربلا کے تہذیبی انسلاکات سے زیادہ قریب محسوس کیا ہے۔ اگر کربلا کے استعارہ کو عرفان صدیقی کی شاعری سے خارج کردیا جائے تو یقیناً ان کی شاعری انفرادیت اور تنوع سے بہت حد تک محروم ہو جائے گی۔ گویا ان کا پورا تخلیقی اور تفکیری نظام کربلا کے ہزار معنیٔ استعارہ پر قائم ہے۔ یہ ان کا ہی کمال ہے کہ انہوں نے زندگی کے تمام مسائل، واقعات، حادثات، سانحات اور جذبات کو اس ایک استعارہ سے اس طرح روشن کردیا ہے کہ اکتاہٹ کے بجائے ایک طرح کی دلپذیری پیدا ہوگئی ہے۔

یہ کم حیرت کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کی پوری عمارت ایک استعارہ پر تعمیر کرلی ہے۔ وہ بھی اس خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ کہ یکسانیت اور گھٹن کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔

نوکِ سناں نے بیعت جاں کا کیا سوال
سر نے کہا قبول نظر نے کہا نہیں

خدا کرے صف سرداد گاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

تری تیغ تو میری ہی فتح مندی کا اعلان ہے
یہ بازو کٹتے اگر میرا مشکیزہ بھرتا نہیں

ایک رنگ آخری منظر کے دھنک میں کم ہے
موج خوں اٹھ کے عرصہ شمشیر میں آ

عرفان صدیقی نے نقل مکانی اور ہجرت کے کرب کو بھی بڑی شدّت سے محسوس کیا ہے۔ ہجرت کے اس کرب کو ان کے یہاں کربلا سے بھی جوڑ کر دیکھا جاسکتا ہے اور ہند

و پاک کے تقسیم کے تناظر میں بھی اس ہجرت کے کرب کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔اس سے بھی اہم بات یہ کہ اگر کوئی چاہے تو فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجہ میں بے گھر ہونے کے کرب اور روزی روٹی کی تلاش میں وطن سے بے وطن ہو جانے کے درد کو بھی اس تناظر میں محسوس کر سکتا ہے۔

میں اپنی کھوئی ہوئی بستیوں کو پہچانوں
اگر نصیب ہو سیر جہانِ گم شدگاں
دو جگہ رہتے ہیں ہم ، ایک تو یہ شہر ملال
اور اک وہ جو خوابوں میں بسایا ہوا ہے
سفر طویل ہے اگلا قدم اٹھاتا ہوں
میں پھر سے گم شدگاں کے علم اٹھاتا ہوں

یا پھر ان کا شعر

نہر اس شہر کی بھی بہت مہربان ہے مگر اپنا رہوار مت روکنا
ہجرتوں کے مقدر میں باقی نہیں اب کوئی قریہ معتبر یا اخی

عرفان صدیقی کی غزلوں میں صوفیانہ روایت کے حامل اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ جب روشن خیالی کی فکر میں ہمارے بیشتر فنکار مغرب سے روشن خیالی کشید کر رہے تھے۔اور اسی کشید کی گئی روشن خیالی کے زعم میں تہذیبی ورثے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔عرفان صدیقی اپنے تہذیبی سرچشمے سے رشتہ بنائے ہوئے تھے۔اور اپنی روحانی سرشاری کیلئے اپنے ہی سرمایہ سے سیرابی حاصل کرنے میں طمانیت محسوس کر رہے تھے۔

ورنہ ہم ابدال بھلا کب ترک قناعت کرتے ہیں
اک تقاضا رنج سفر کا خواہش مال و منال میں تھا

یہ درد ہی میرا چارہ ہے تجھے کیا معلوم
ہٹاؤ ہاتھ میں بیمار رہنا چاہتا ہوں

عرفان صدیقی کی شاعری میں روحانی اور وجدانی تجربے کا جو رجحان پایا جاتا ہے اس میں مذہبی تقدیس کی بحالی، ہجرت کا دکھ، اور کربلا کا سانحہ مثلث بن کرا بھرتا ہےاور عرفان صدیقی کی تخلیقی ثروت مندی کواعتبار بخش جاتا ہے۔

میں اپنی کھوئی ہوئی لوح کی تلاش میں ہوں
کوئی طلسم مجھے چار سو پکارتا ہے

ماضی اور تاریخ کی اس بازگشت کوصرف ماضی کی بازگشت کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ حدتو یہ ہے کہ موجودہ صورتحال سے فرار کے تناظر میں بھی اس بازگشت کونہیں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ اسے نہ منفعلانہ رویہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے نہ ناسٹلجیا کا نام دیا جاسکتا ہے اور نہ اسے قنوطیت ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ماضی اور تاریخ کے اس سیاق وسباق میں آج کے اس انسان کی روح کا نوحہ گونج رہا ہے جونقلی دانشوری کا شکار ہو کر اپنے محور سے کٹ چکا ہے۔ وہ اس دور شتر بے مہار میں اپنی شخصیت کی تعمیر سے محروم ہو چکا ہے، اس کا وجود کثافت کی نذر ہو کر اپنی پہچان کھو چکا ہے۔ آج کے دور کا انسان حد سے بڑھی مادیت پرستی کے جال میں پھنس کر ہشت پا مکڑیوں کا نوالہ بنتا جارہا ہے۔ وہ مادیت کے چکرویو میں اس طرح پھنس کر رہ گیا ہے کہ اس کے پاس روحانی طمانیت حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں بچا ہے۔ اخلاقی بحران کا ایسا منظرنامہ خلق ہو چکا ہے کہ تمام قدریں بے معنیٰ ہو کر رہ گئی ہیں۔

اگر وسعت نہ دیجئے وحشت جاں کے علاقے کو
تو پھر آزادی زنجیر پا سے کچھ نہیں ہوتا

عرفان صدیقی کی غزلیں شعری کائنات کو تازگی، شگفتگی اور تطہیری فکری نظام سے آشنا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ ان کی شاعری میں عقیدے کے استحکام کی سعی پیہم کے ساتھ ساتھ عابد و معبود کے رشتوں کی تقدیسی بحالی کے احساسات کا نور جگہ جگہ لشکارے مارتا نظر آتا ہے۔

یہ کس نے دست بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں دست دعا نکل آئے

حمد و ثنا، دعا و التجا، فقر و غنا، اور صبر و رضا میں یقیناً وہ قوت پنہاں ہے۔ جو عقیدے اور ایقان کے سرے کو مضبوطی سے تھامے رہنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اس شعر میں مذہبی استعاروں کی مدد سے جو روحانی اور وجدانی فضا پیدا کی گئی ہے وہ انسانی تمدن کی مایہ ناز قدروں کی بازیافت کی سعی ہے۔ یہ روحانیت اور تطہیر ذات کا وہی عقیدت مندانہ احساس ہے جس کی عدم موجودگی نے جدید اور ترقی پسند غزل کو مادی رشتوں کی کثافت کا ایسا دیار بنا دیا تھا جہاں روح کی سناٹگی اور اکتاہٹ کے سوا کچھ بھی نہیں بچ گیا تھا۔ اس طرح یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ عرفان صدیقی نے ہماری غزلیہ شاعری کو ایک نیا تناظر فراہم کیا۔ سوچنے سمجھنے کا نیا انداز دیا۔ استعارہ سازی کیلئے اپنے سابقہ سرمایوں کی طرف متوجہ ہونے کا حوصلہ دیا۔ قدیم استعاروں کو جدید مسائل کے تناظر میں ہزار معنیٰ کی خوبیوں سے آگاہ کیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ غزل کو اس کے تہذیبی لباس میں رکھ کر تمام تر چیلنج کا سامنا کرنے کے قابل بنایا۔

تم جو کچھ چاہو وہ تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا تھا

عرفان صدیقی کو بیشتر لوگوں نے ''عشق نامہ'' کے بعد ہی پہچانا اور اسی شاعری کے حوالے سے یاد کیا، یہ بات درست ہے کہ ''عشق نامہ'' کی شاعری غزلیہ شاعری کے

موضوع کا ارتفاع کرتی ہے اور سچے جذبے کی تطہیر کا بہت کچھ حق ادا کر دیتی ہے۔ مگر دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ کیا محض عشقیہ جذبے ہی کے اظہار اور عشق کے ہزار رنگ پہلوؤں کے انعکاس سے ہی غزل عبارت ہے؟ اب تک کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ عرفان صدیقی اپنی ''عشق نامہ'' کی شاعری کی عدم موجودگی میں بھی ایک انفرادی مقام کا استحقاق رکھتے ہیں۔ ویسے انہوں نے ''عشق نامہ'' میں اپنا جو کلام پیش کیا ہے وہ بھی غزل کی روایتی شاعری کا ارتفاع کرتی ہے اور جذبات انسانی کے ان گوشوں کو اجاگر کرتی ہے جہاں تک کوئی تربیت یافتہ صاحب دل ہی پہنچ سکتا ہے۔

یہ عرفان صدیقی کا بڑا کمال ہے کہ انہوں نے عشق کی وارفتگی کے باوجود اظہار کے سلیقے کی ندرت کو برقرار رکھا ہے۔ یہ چند اشعار دیکھئے جو اپنے وقت میں بے حد مشہور ہوئے تھے اور آج بھی اسی وارفتگی سے پڑھے جاتے ہیں۔

تیرے تن کے بہت رنگ ہیں جان من اور نہاں دل کے نیرنگ خانوں میں ہیں
لامسہ ، شامہ ، ذائقہ ، سامعہ ، باصرہ ، سب مرے راز دانوں میں ہیں
اور کچھ دامن دل کشادہ کرو دوستو! شکر نعمت زیادہ کرو
پیڑ ، دریا ، ہوا ، روشنی ، عورتیں ، خوشبوئیں سب خدا کے خزانوں میں ہیں

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی
لپٹ سی داغ کہن کی طرف سے آتی ہے
جب اک ہوا ترے تن کی طرف سے آتی ہے
کر گیا روشن ہمیں پھر سے کوئی بدر منیر
ہم تو سمجھے تھے کہ سورج کو گہن لگنے لگا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عرفان صدیقی کو آخری عمر میں عشق ہو گیا تھا، اسی عشق کی آگ نے ان کی شاعری کو جلا بخشی اور وہ اس مقام پر پہنچ سکے۔ مگر خورشید اکرم صاحب اس خیال سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں۔ ویسے اس بات کی ایسی کوئی خاص اہمیت ہے بھی نہیں کہ انہیں فی الواقع کسی سے عشق ہوا تھا کہ نہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ان کی شاعری میں جو تازگی اور توانائی ہے وہ آنے والی نسل کے لیے مشعل راہ ہو سکتی ہے یا نہیں۔

عرفان صدیقی کے یہاں شاعری کا جو جوہر پایا جاتا ہے وہ داخلی آگ سے روشن تو ہے ہی، مگر اس میں خارجی حالات کا آتش سیال بھی شامل ہے۔

انہیں خوب معلوم تھا کہ شاعری زندگی کا رخ نہیں موڑ سکتی ہے مگر زندگی کے بارے میں سوچنے کا جذبہ ضرور پیدا کر سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

رات کو جیت تو سکتا نہیں لیکن یہ چراغ
کم سے کم رات کا نقصان بہت کرتا ہے

فنکار نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کی تبدیلی کا ادراک رکھتا ہے بلکہ وقت اور حالات کی ستم ظریفی سے بھی واقف ہوتا ہے۔ دراصل یہی وہ چیز ہوتی ہے جو کسی بھی فنکار کے فن کو اعتبار بخشتی ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری صرف زبان و بیان کی جدت و ندرت ہی کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ موضوع کے نئے پن کے احساس کی وجہ سے بھی قابل توجہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی شاعری کا کھلے ذہن کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور ان کے یہاں تخلیقی قوت مندی کا جو احساس پایا جاتا ہے اسے نمایاں کیا جائے۔ کیوں کہ تخلیقی قوت مندی کا یہی احساس انہیں اپنے ہمعصروں میں اور اس سے زیادہ اپنے پیش رووں میں ممتاز بناتا ہے۔

☆☆☆

عرفان صدیقی کا عرفان

شاہین عباس (لاہور)

عرفان صدیقی نے نہ صرف ہندوستان کی اردو غزل کو اپنے منفرد طرزِ سخن سے اعتبار بخشا، بلکہ پاکستانی غزل پر بھی ایک ایسے دور میں اپنے اثرات مرتب کیے، جس دور میں ایک عمومی تاثر کے تحت جدید اردو غزل کا مرکز پاکستان کو قرار دیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ تاثر آج بھی برقرار ہے۔ تاہم ایسا کیوں کر ممکن ہوا، تقابل و تفاخر کے باب کی یہ ایک الگ بحث ہے۔ اقبال، فیض اور ناصر کاظمی سے چل کر ظفر اقبال اور احمد مشتاق تک آتے آتے غزل کے مخالفین کی تنقید بھی غیر اہم اور غیر متعلق ہونے لگی ہے، اور اِس نیم وحشی کی وحشت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔ کسی بھی غزل گو شاعر کا اختصاص اور امتیاز قائم کرنے کے لیے اُس کی فکر اور جذبے کے ماخذات اور منابع تک رسائی ضروری ہوتی ہے۔ اِسی کلیے کا اطلاق ادب کی دیگر اصناف اور جانچ پرکھ کے دوسرے معیارات اور اقدار پر بھی ہوتا ہے۔ عرفان صاحب کی غزل کے منبع و ماخذ کو ایک ایسی سرشار تاریخ اور بیدار تہذیب کا نام دیا جاسکتا ہے، جن کے قائم کردہ نشانات کی نہ تو کوئی ظاہری حد ہے نہ باطنی۔ دوسرے لفظوں میں وہ تاریخ کے آدمی ہیں، سن و سال کے قدیمی جلو میں صورتِ کارواں رواں دواں، اور تاریخ در تاریخ اپنے فن کی فعالیت اور تکمیل میں سرگرم رہتے ہیں۔ مگر اِس طرح سے کہ انھوں نے شعری پیرائے میں اپنی اِس کلید کو بروئے کار لاتے ہوئے، خود کو بالعموم کسی کلیشے یا سٹیس کی

نذر نہیں ہونے دیا، جس کا احتمال بعض اوقات معلوم و مقسوم کی رعایت کو من و عن تسلیم کر لینے کے عمل میں ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو منتخب ہی اِس لیے کیا گیا کہ وہ ان منطقوں کی ثقافتی حدود کو ایک تخلیقی وسعت سے ہمکنار کرتا رہے، جہاں طبعی یا غیر طبعی، مرئی یا غیر مرئی طور پر اُسے اتارا جائے۔ اس قبیل اور افتاد کے شعراء کو مدینہ، کربلا، لکھنؤ، کراچی اور لاہور، گویا خطہ بہ خطہ اور قریہ بہ قریہ سب علاقے ورقِ سادہ پر بنا بنا کر دکھا جاتے ہیں اور وہ عالم انسانی کا کچھ اِس طور نمائندہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

سرحدیں اچھی ، کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچیے ، آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا !

ہم سب آئنہ درآئنہ درآئنہ ہیں
کیا خبر کون کہاں کس کی طرف دیکھتا ہے

عجب حریف تھا ، میرے ہی ساتھ ڈوب گیا
مری سفینے کو غرقاب دیکھنے کے لیے

دیدنی ہے مجھے سینے سے لگانا اُسکا
اپنے شانوں سے کوئی بوجھ اتارے جیسے

اُس کی آنکھیں ہیں کہ اک ڈوبنے والا انسان
دوسرے ڈوبنے والے کو پکارے جیسے

عرفان صدیقی کے یہاں یہ معاملہ انسان دوستی سے زیادہ انسان شناسی کا ہے اور اگرچہ بعینہٖ تسلیم و رضا کے محدودات کا پابند نہیں، مگر مکمل طور پر تکفیر و الحاد کا بھی متحمل نہیں۔ بس اِن دو کے بین بین ہے، جس میں ارتقا بھی ہے، احیا بھی۔ روایت کی بازیافت بھی ہے اور ماورائے روایت امکانات کی دریافت کا سلسلہ بھی۔ اُن کی کلیات ''دریا'' کے مطالعے سے

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مضمون نو یا شعرِ دگر کی اُس صورت گری کے قائل ہیں، جو آہستہ روی سے واضح تر ہوتی ہے اور ہمہ وقت مائل بہ تکمیل رہتی ہے۔ اُن کا تخلیقی عمل رویوں اور رجحانات کی فی زمانہ غیر فطری تیز رفتاری کے دباؤ سے آزاد ہے، مگر ہر تیز رو پر نظر جمائے ہوئے ہے۔ عرفان صاحب خیال کی اُس کڑی اور جذبے کے اُس موڑ سے اپنے متخیلہ کو متحرک کرتے ہیں، جس سے آگے بات صرف اور صرف شعر ہی کی زبان میں کہی اور سنی جا سکتی ہے، کسی اور پیرائے میں نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زبان کے روائتی سانچوں اور روزمرہ کی قدیم ساخت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کس طور بڑی غزل لکھی جا سکتی ہے جبکہ مذکورہ بندشوں کے ساتھ تو بڑا کام کرنے والے کر چکے۔ تو کیا زبان کو توڑ دیا جائے؟۔ کہا جاتا ہے کہ زبان کو توڑنا ایسے ہے جیسے کسی کے عقیدے یا مسلک کو چھیڑنا۔ ایسے میں اعتقادات پر ضرب لگانے کا ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے ظاہر سے زیادہ باطن پر انحصار۔ زبان سے بڑھ کر بیان کی فکر، یعنی بالکل صوفیاء کا سا طرزِ عمل۔ بات سن بھی لی اور بات میں بات بھی رکھ دی اور پھر کہتے چلے گئے، جیسے متن سے معانی برآمد ہوئے تو ہوتے ہی چلے گئے۔ تخلیق نے سب کو پچھاڑ دیا، ایسی تشکیل کو بھی جو خالی از تخلیق ثابت ہوئی۔ عرفان صاحب کی شاعری ایک حد تک رسمی ضرور ہے کہ آپ اگر رسم ورواج کے پابند رہیں تو فسادِ خلق کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ مگر یہ کلام ایک نہج پر غیر رسمی اور غیر روائتی بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ شعر میں کچھ نیا محسوس کرنا، کچھ نیا معلوم کرنے سے زیادہ بڑا عمل خیال کیا جاتا ہے۔ اُن کی زبان مانوس اور الفاظ و تراکیب کا در و بست رسمیات کا پابند سہی، مگر بیان کی جمالیات انوکھی اور خاص اپنی طرز کی ہیں جس پر دور دور تک کسی دوسرے کی کوئی چھاپ نہیں۔ مصرع بہ مصرع علامت نگاری کا ایک مربوط اور منضبط نظام ہے جو میکانکی طرز کی جمع خرچ اور حاصل حصول سے بڑھ کر

ہے۔اُن کے پورے کلام میں جہاں ایک طرف موضوع اور سرنامہ کی اکائی کا تاثر ملتا ہے، وہاں ہر شعر اور غزل کے اپنے اپنے ذیلی اور ضمنی عنوانات بھی موجود نظر آتے ہیں، جو کلیت سے مزاحم ہیں نہ بنیادی قضیئے کے ساتھ متصادم۔ سامراجیت کا رد اِن ذیلی عنوانات کا ایک رُخ ہے، کہیں اصل کا سابقہ، کہیں لاحقہ اور کہیں از خود اصل کی صورت۔ وہ بزم سے رزم تک آتے ہیں، اور پھر واپس بزم میں لوٹ جاتے ہیں۔ وہ شکار ہوتے ہیں اور کرتے بھی ہیں، مگر غزل کو آخرِ شب کی اسٹیج کی بھگدڑ یا تادیر چوراہوں کا ہنگامہ نہیں بننے دیتے۔ ایسا ہنگامہ جو درانداز یوں سے آغاز ہوا اور لاحاصل اتھل پتھل پر منتج، عرفان صاحب کے ہاں نہیں ملتا، مگر اِس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ غزل کی روایت میں اضافہ یا تبدیلی نہیں چاہتے۔ اب اُن کے دو شعر ملاحظہ ہوں

کوئی شے طشت میں ہم سر سے کم قیمت نہیں رکھتے
سو اکثر ہم سے نذرانہ طلب ہوتا ہی رہتا ہے

یہ تیر اگر کبھی دونوں کے بیچ سے ہٹ جائے
تو کم ہو فاصلۂ درمیاں ہمارا بھی

مذکورہ اشعار میں ٹریٹمنٹ کا فرق اُتنا ہی نمایاں ہے جتنا کہ آگ کی لپٹوں اور آنچ کی لو میں ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات جذبے کا فشار اعصاب پر ایسا حاوی ہو جاتا ہے کہ پھر فیتے اور فتیلے کا ستعمال شعر کہنے والے کے اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔ بعدازاں خاکستر ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ روشنی کے نام پر کیا کام ہوا، اچھا یا برا۔ عرفان صاحب کے یہاں بھی کہیں کہیں وابستگی ور سپردگی کا معاملہ ایسا بلند آہنگ ہو گیا ہے، جس سے مافی الضمیر تو سامنے آجاتا ہے، مگر آرٹ وجھل یا متاثر ہوتا ہے۔ تاہم ایسے مقامات کم ہیں۔ اور اگر ہیں بھی تو شائد اِس لئے کہ تخلیقی عمل ن کے نزدیک داد طلبی کا نہیں نجات طلبی کا دوسرا نام ہے۔

جانتے سب ہیں کہ ہم رکھتے ہیں خم طرفِ کلاہ
اور کیوں رکھتے ہیں ، یہ اہلِ ستم جانتے ہیں

سب نام دستِ ظلم ، تری دسترس میں ہیں
لیکن جو نام ہے مرے اندر لکھا ہوا

مگر وہ کبھی کبھی وہ اپنی عمومی ڈگر سے کچھ ہٹ کر بھی بات کر جاتے ہیں۔ کچھ اِس طور سے کہ پہلے سے دلائی ہوئی وفا اور نباہ کی یقین دہانیوں پر بھی حرف نہیں آتا اور شعرِ اصیل کا سلسلہ بھی شروع ہونے لگتا ہے۔

میرے ہونے میں کسی طور سے شامل ہو جاؤ
تم مسیحا نہیں ہوتے ہو تو قاتل ہو جاؤ

اور اِس صورتِ حال کو مزید اجاگر کرتا ہوا ایک اور شعر

تو نے مٹی سے الجھنے کا نتیجہ دیکھا ؟
ڈال دی میرے بدن نے تری تلوار پہ خاک

یوں تو شعر سے حظ اٹھانے کا کوئی ضابطہ مقرر نہیں کہ لکیر کھینچ کر کہہ دیا جائے کس حد تک کوئی جا سکتا ہے۔ ادب کی قرات وسماعت پر قاری یا سامع کے ردِ عمل کا انحصار شخصی کیفیات پر بھی ہوتا ہے اور شخصی امتیازت پر بھی۔ بڑے ادب کو عام طور پر سننے کی نہیں، پڑھے جانے کی چیز کہا جاتا ہے۔ شاید اِس لیے کہ سماعت میں بصارت شامل نہیں سمجھی جاتی اور سنا ہوا لفظ دھوکہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر بصارت میں سماعت کسی نہ کسی رنگ روغن سے بار پا کر در آتی ہے۔ حظ اور لطف کی تین ممکنہ صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ آپ نے شعر پڑھا اور شعر میں باندھے گئے مضمون نے آپ کو ماضی میں وہاں لے جا کر چھوڑ دیا جہاں آپ خود بھی جانا چاہتے تھے۔ دوم، شعر میں ایسا تجربہ بیان ہوا جس کی قرات سے آپ کو اپنی موجودہ حالت کی تائید کے لیے گواہی میسر

آ گئی۔ سوم یہ کہ شاعر کے ساتھ ہوا کے دوش پر اڑتے ہوتے ایسی وادیٔ فردا میں جا نکلے جہاں تک رسائی یا باریابی کا آپ نے سوچ رکھا تھا۔ یہ تینوں صورتیں متنِ شعر سے لطف اٹھانے میں گارگر ثابت ہوتی ہیں۔ ''دریا'' کے شاعر نے احوال و آثار کو دراصل نئی زمانی ترتیب سے گزار کر آثار و احوال بنا دیا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ عرفان صاحب کے یہاں تہذیب کسی بنتی بگڑتی تصویر کا نام نہیں، بلکہ پھلوتی اور پھیلتی ہوئی فصلِ گزشتہ ہے، جو کہ حال بھی ہے اور فردا بھی۔ یوں وہ چراغ بجھا کر اِسے دوبارہ نہیں جلاتے بلکہ چراغ سے چراغ جلاتے ہیں۔ گویا ان کے شعری اسلوب میں تخریب کے مقابلے میں تعمیر، اور تعطل کے برعکس تسلسل کی اہمیت ہے۔ ایسا تسلسل اور غیر منقسم اسلوب ہمیں اُنہی شعراء کے کلام میں ملتا ہے، جو روایت کو زحمت نہیں بلکہ آگے آنے والوں کی امانت سمجھتے ہیں، اور نسل در نسل جہاں جہاں اِس امانت کے اہل نظر آئیں، ان کے لیے خود مسندِ ارشاد خالی کرتے جاتے ہیں، مگر اِس طرح سے کہ ایسے امانت دار اپنے غیاب میں بھی موجود نظر آتے ہیں۔ جا کر بھی نہیں جاتے۔ آپ عرفان صاحب کی غزل کسی بھی بارہ دری کے جھروکوں میں بیٹھ کر، یا راہ میں پڑتے کسی مینار کی سیڑھیوں سے آتے جاتے ہوئے پڑھیے تو از خود آپ کا سفر طے ہوتا جاتا ہے۔ ایک محراب سے دوسری محراب، ایک برج سے دوسرا برج، یہاں تک کہ ایک سواری سے دوسری سواری تک خود بخود نشست بدلتی رہتی ہے۔ عشق کو بھی توڑیں تو اندر سے دوسرا، تیسرا عشق باہر لپکنے کو ہاتھ پاؤں مارتا نظر آتے گا۔ مگر نہ ہجر ایک سے دو میں بدلتا ہے نہ وصال۔ قبول کی یہ تکثیریت اور اصول کی یہ قطعیت مادہ سے زیادہ ورائے مادہ شخصی اور شعری تربیت و میلان کا پتہ دیتی ہے۔ عرفان صاحب اسطورہ کی قدامت کو چیلنج نہیں کرتے اور نہ اس سے وابستہ اعتقادات کو نشان زد کرتے ہیں، مگر بیچم بیچ ایک ایسی جست بھرتے ہیں کہ اسطورہ ماضی سے زیادہ حال کا ترجمان بن جاتا ہے۔ وہ ان قدیمی لہروں کا شمار کرتے کرتے اندر ہی اندر ایک زیریں لہر کا اپنی طرف سے بھی اضافہ کر

دیتے ہیں، کچھ اِس طرح سے کہ اسطورہ سینہ بہ سینہ اعتقاد کی تاریخی سطح سے بلند ہو کر مذکورہ زیریں سریت کے باعث کسی جادوئی بیانیہ کے قریب ہونے لگتا ہے اور یہیں سے شاعر کی انفرادیت قائم ہونا شروع ہوتی ہے۔ یہ بیانیہ یقین کی سطح پر نان فکشن، اور گمان کی سطح پر فکشن سے متصف و مملو ہے۔

شمعِ خیمہ کوئی زنجیر نہیں ہم سفراں
جس کو جانا ہے چلا جائے، اجازت کیسی

ندی سے پھول نہ گنجِ گہر نکلتا ہے
جو طشتِ موج اٹھاتا ہوں، سر نکلتا ہے

میں تو اِس دشت میں خود آیا تھا کرنے کو شکار
کون یہ زین سے باندھے لیے جاتا ہے مجھے

مجھے کھنچی ہوئی تلوار سونپنے والے
میں کیا کروں کہ طرف دار سر کا میں بھی ہوں

بس یہی ایک لہر ہے،، نظر نہ آنے والی لہر، جو عرفان صاحب کی اپنی اختراع ہے اور جس کا پانی جرعہ بہ جرعہ تاریخ اور تہذیب کے پانیوں کا ہم رنگ ہے۔ یہ سہ رویہ ہم رنگی کچھ اِس نوع کی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کب اور کہاں ایک رنگ ختم ہوا اور دوسرا شروع۔

(2015)

☆☆☆

عرفان صدیقی، غزل کا ایک نادر لہجہ

.................اسلم عمادی (کویت)

گذشتہ پچاس برس کا دور اردو غزل کے لئے تجرباتی دور میں شمار کیا جاسکتا ہے۔اس دور میں اظہار کے اس تنگ راستہ میں نت نئے انداز کے آہنگ اور اسلوبیاتی پہلوؤں کو بدل بدل کر نہ جانے کتنے خوبصورت اور نادر پرتو پیش کئے گئے ہیں۔ ہر لہجہ اور ہر اسلوب اپنے نئے نویلے پن کے سبب عجیب سی ساحری اور دل فریب سی کشش رکھتا ہے۔ وہیں اس مدت میں اتنا یابس اور فاضل کلام بھی شائع ہوا کہ اس خرمن سے سوزن کا چننا کارِ دارد ہے۔اس تخلیقات کے طوفان بے کراں میں چند ہی قابل قدر شعری فکر کے نمائندہ جزیرے نظر آتے ہیں جس سے ادب کی زندگی پر ایقان باقی رہتا ہے۔ایسا ہی تازہ کار فکر و نظریات سے آباد ایک جزیرہ عرفان صدیقی کی شاعری ہے۔

عرفان صدیقی کے اشعار سے میرا تعلق دیر سے ہوا، لیکن دیر پا ہوا، ان کے اشعار ہمارے فکری نظام سے اس قدر مانوس کیفیات رکھتے ہیں کہ ذہن پر چسپاں ہو جاتے ہیں لیکن ان اشعار میں عمومی الفاظ بالکل جدا ملبوس اور مختلف رنگ و آہنگ میں ایسے ملتے ہیں کہ آپ جس مقصود معنی کی امید رکھ رہے تھے اس سے ہٹ کر بالکل نئی بات سے روشناس ہو جاتے ہیں۔ یہ تو بڑی خلاقیت ہے کہ سادہ الفاظ کو آپس میں ٹکرا کر یا پھر کبھی مدغم کر کے بالکل نئی ترسیلی زبان میں کچھ کہا جائے۔ عرفان اس میں امید اور سامع کی تمنا سے بڑھ کر اپنی قادر الکلامی کی

دلیل پیش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں کچھ مثالیں شاید اس تجزیے کی بہتر تشریح کریں:

ابھی زمیں پہ نشاں تھے عذاب رفتہ کے
پھر آسماں پہ ظاہر وہی ستارہ ہوا

یہ موج موج کا اک ربط درمیاں ہی سہی
تو کیا ہوا میں اگر دوسرا کنارہ ہوا

اب اس کے بعد گھنے جنگلوں کی منزل ہے
یہ وقت ہے کہ پلٹ جائیں ہمسفر میرے

ہیں اسی کوچہ میں اب تو مری آنکھیں آباد
صورتیں اچھی، چراغ اچھے، دریچہ اچھا

ان اشعار میں نہ تو کوئی نو ساختہ ترکیب ہے، نہ کوئی اجنبی استعارہ یا تشبیہ! بالکل صریح سی زبان ہے لیکن لفظوں سے جھلکنے والے مطالب میں بعید از قیاس انوکھے پن کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ ہر شعر عذاب رفتہ کے کسی المیہ کا نشان یا اشارہ بن کر یا پھر حق و باطل کے رزم سے اٹھی ہوئی آواز بن کر سامنے آتا ہے۔ موج موج کے درمیان ربط کی موہوم سی تمنا حیات سے کس قدر انسیت کی آئینہ دار ہے۔ سوچیے تو ''آنکھیں'' کے ساتھ ''آباد'' کا لفظ اور ''گھنے جنگلوں'' کی پیش گوئی کے غیر عمومی استعمال دونوں اشعار کس قدر تحیر آمیز لگتے ہیں۔

میرا اندازہ ہے (یقین کے ساتھ تو کہنا مشکل ہے) کہ عرفان اپنے اشعار میں قوت شامل کرنے کے لئے الفاظ کے انتخاب میں ان کی نشست اور مناسبت کو خوب پرکھتے تھے، بڑی محنت سے ہر شعر کو اظہار کا ایک کامران پیکر بنا کر پیش کرتے تھے۔ ان کی غزلوں میں کم زور، بھرتی کے اور فقط رسمی قسم کے اشعار مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ ہر شعر ان کے زور بیاں اور منتخب اسلوب کی مثال بن گیا ہے۔

ان کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ احساس ابھرتا ہے کہ اسی لفظ کو جو ہم سے عام ملبوس میں ملتا ہے تو مروجہ معنی سے آگے نہیں جاتا، شاعر نے اس لفظ کے حرف حرف اور صوت صوت کو خوشنمائی سے لکھ کر نئے آہنگ سے روشناس کر دیا ہے۔ وقف و تحرک کے ٹکراؤ سے اس میں ایک نئی کھنک آ گئی ہے۔ گویا یہ لفظ پھر ناطق بن گیا ہے۔ یہ فن کاری محض مشاقی سے نہیں بلکہ گہرے اسلوبیاتی مطالعہ سے ناتج ہو سکتی ہے۔ اس طرح ایسا فن پارہ سامع/قاری کو عجیب سی مسرت بخش دیتا ہے۔

ان کی شاعری کے تقریباً تمام موضوعات ان کی ذات پر مرکوز ہیں، وہ اکثر اشیاء اور تجربوں کو اپنی ذات سے منسلک رمتعلق کر کے دیکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس میں خلوص بھی ہے اور داخلی حرارت بھی۔ اسی وجہ سے یہ شعر ہم خیالوں کو قریب تر لگتے ہیں۔ بہت سے لفظی استعمالات، دولفظی، ہوئے ہیں اور دولفظوں کے واسطے سے ایک داخلی منظرنامے کا پردہ فاش ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں بھی ملاحظہ فرمائیں:

یہ درد ہی مرا چارہ ہے تم کو کیا معلوم (مرا چارہ)

ترے سمند بھی بر ے غزال بھی آزاد (مرے غزال)

ہوا کی طرح نہ دیکھی مری خزاں کی بہار (مری خزاں)

اس کو منظور نہیں ہے مری گم راہی بھی (مری گم راہی)

عجب ہے میرے ستارہ ادا کی ہم راہی (میرے ستارہ ادا)

اگر ان کے کلام کی اس نقطۂ نگاہ سے تحلیل کی جائے تو ایسی مبنی بر متکلم تراکیب بے شمار ہیں اور ہر ترکیب ایک جدا پہلو لئے ہوئے ہے۔ مذکورہ بالا تراکیب ہی کو لیں تو ان میں ایک غیر محسوس سا ابہام بھی ہے اور دزدیدہ کنایہ بھی۔ ''مرا چارہ'' ایک قطعاً غیر مستعمل لیکن معنی خیز سی بات ہے۔ ''بر ے غزال'' غالباً غزال تخیلات سے متعلق ہے اسی طرح 'مری خزاں''

''مری گم راہی'' اور ''میرے ستارہ ادا'' خوب لفظی مرکبات ہیں جو اپنائیت کا رخ بھی رکھتے ہیں اور ندرت کا بھی۔ اردو شاعری میں ایسے الفاظ پر مرکوز لسانی روش بہت کم ملتی ہے۔ ظفر اقبال اور منیر نیازی نے بھی اس طرح کے لسانی تجربے کئے ہیں لیکن ان کا انداز کچھ اور ہی ہے۔ بہتر ہے کہ اس طرح کے قادر الکلام شعرا کی درجہ بندی سے احتراز کیا جائے۔ لیکن ایک طرح سے یہ بات بھی واضح ہوئی ہے ارادی طور پر ممیز اور جداگانہ رکھا ہے۔ عین ممکن ہے کہ رویہ فطرتاً بھی ہو لیکن اس کی شناخت تو شاعر ہی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کے پڑھنے اور اور سننے والے وارفتگی کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ شاید یہ کلام ہمارے مزاج کی نوعی اور مخفی حرارت سے مطابقت رکھتا ہے۔

ایک اہم رخ عرفان کی شاعری میں رومانوی ماحول کا پس منظر ہے۔ عشق اور شوق جو کہ صدیوں اردو شاعری (بلکہ مشرقی شاعری) کی عنصری طاقت رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں مختلف ڈرامائی سچویشن جیسے سین کے پیچھے بدلتی ہوئی روشنی کا کام کرتے ہیں۔ اس ڈرامے کے کردار شاید مخصوص نام اور شناخت نہیں رکھتے لیکن کسی منتخبہ جذبے کی غیر مرئی تجسیم ضرور کرتے ہیں۔ عاشق/معشوق/رقیب یہ تو پرانے کردار تھے جو اب بالکل نئے ظروف میں نظر آتے ہیں۔ ذرا عشق کے تناظر میں یہ بھی سنیں:

کسی افق پہ تو ہو، اتصال ظلمت و نور
کہ ہم خراب بھی ہوں اور وہ خوش خیال بھی آئے

عجیب روشنیاں تھی وصال کے اس پار　　میں اس کے ساتھ رہا اور ادھر چلا بھی گیا
میں نے اتنا اسے چاہا ہے کہ وہ جانِ مراد　　خود کو زنجیر محبت سے رہا چاہتی ہے

مری عاشقی، مری شاعری ہے سمندروں کی شناوری
وہی ہم کنارا سے چاہنا، وہی بے کراں اسے دیکھنا

واہ بے حد قدیم موضوع کو بے حد تازہ اسلوب میں کس خوبی سے برتا گیا ہے۔ گویا عرفان صدیقی نے ایک بے حد باوفا عاشق کے کردار کی تصویر کشی اس طرح کی ہے کہ "اک رنگ کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں" کا لطف آ گیا ہے۔

عرفان واقعات، حادثات اور مناظر کی عکاسی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ منبع اور اصل کی طرف توجہ نہ جائے۔ اور اصل کے مقصود کی تصویر ایک آرٹ کی طرح پیش ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی بے شمار غزلوں میں تلمیحاتی اظہار کا استعمال کیا ہے۔ کبھی وہ کسی غزوہ یا جنگ کا ماحول وضع کرتے ہیں تو کبھی کسی خانہ بدوش بے سمت قسم کے مسافر قبیلہ کے فرد بن جاتے ہیں کبھی وہ شہادت حسینؓ سے دلی نسبت سے سوگوار ہوتے ہیں تو کبھی بزم عرفان میں حلقہ بدوش ہو جاتے ہیں۔ وہ اکثر اہل صفا کے قافلے کے ساتھ ہوتے ہیں جو نشۂ ایماں میں مست و بے خود، تشنہ لب، ایقان بہ قلب، صدق بر لسان ظالم کے سامنے سینہ سپر ہے اس طرح حق و باطل کی جنگ میں شاعر حق کے لئے جہاد اور جستجو کر رہا ہے۔

اکثر غزلوں میں عرفان حالات حاضرہ کو اسی تناظر میں رکھ کر، اس سے متناسب زیریں رو کے مدھم سر سے ابھر کر بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ ہر بار ان کی جذباتی صالحیت نعرہ فگن نظر آتی ہے تیر و تبر کے سامنے ان کی جری فکر سینہ سپر رہتی ہے۔ وہ اس مجسم خوبی پیمبر/امام/رہبر/مرشد/ شیخ کے تابع ہیں جو محبوب تر ہے۔ ذرا شہادت حسینؓ/واقعہ کربلا کو ذہن میں لا کر عرفان کے یہ اشعار پڑھیں:

جو گرتا نہیں ہے اسے کوئی پامال کرتا نہیں
سو وہ سر بریدہ بھی پشت فرس سے اترتا نہیں
ذرا کشتگاں صبر کرتے تو آج
فرشتوں کے لشکر اترنے کو تھے

اسیر کس نے کیا موج موج پانی کو
کنار آب ہے پہرہ لگا ہوا کیسا

پانی پہ کس کے دست بریدہ کی مہر ہے
کس کے لئے ہے چشمہ کوثر لکھا ہوا

پانی نہ پائیں ساقی کوثر کے اہل بیت
موج فرات اشک ندامت کہاں سے لائے؟

بلاشبہ عرفان صدیقی ترسیل کی راہوں میں شمع جلا کر اپنے مسافروں کو غزل کی طرف لے جانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔کوئی نا کام نامکمل ترسیل ان کے پاس نہیں ملتی۔انہوں نے بنیادی طور پر کوئی قابل بیان فنی تجربہ نہیں کیا، نہ تو اسلوب میں نہ فارم میں۔متوقع راستہ سے انحراف ان کا طریقہ نہیں۔وہ زندگی کے حقائق سے قریب تر رہ کر غزل کی بنیادی تعریف اور مستند ڈکشن سے ہٹے بغیر نئی وضع اور نئی طرح سے یوں کہا ہے کہ سامع اور قاری کی توجہ نہیں ہٹتی۔

تصوف اور عرفان ذات کی راہوں میں بھی وہ اسی قلندریت سے چلے ہیں، جنونِ شوق سے سرشار، 'عشق' کو حسن کی تابنا کی میں گم کرنے کے لئے کوشاں۔یہ عارفانہ کلام بھی کچھ عام نہیں ہے اس میں بھی وہ ندرت اور قوت ملتی ہے۔ان کی فکری کی خانقاہ بسیط اور وسیع ہے۔ ان کی بے نیازی بے مثل ہے۔ان کی فنائیت بقا سے بلند تر ہے۔

مثلاً

ان کا فقیر دولتِ عالم سے بے نیاز
کاسے میں کائنات کا ٹکڑا پڑا ہوا

شاخ کے بعد زمیں سے بھی فنا ہونا ہے
برگ افتادہ ابھی رقصِ ہوا ہونا ہے

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرے شریک
مسندِ خاک پہ بیٹھا ہوں برابر اپنے
ابھی مرا کوئی پیکر نہ کوئی مری نمود
میں خاک ہوں ہنر کوزہ گر پہ راضی ہوں

عرفان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے ہم ایک آراستہ پیراستہ گلشن سے گذر رہے ہیں جس کے درختوں، جھاڑیوں، فضاؤں میں مناظر کی طرح کمال فن کاری سے تخلیق شدہ پھل، پھول، پتے، شگوفے سجادیے گئے ہیں۔

امید کہ زود فراموش اردو والے اس اہم شاعر کو فصیل فراموش گاری کے پیچھے نہیں بھیج دیں گے اور یہ کلام اردو نئی شاعری کے ہر انتخاب میں مناسب مقام پائے گا۔

(2015)

عرفان صدیقی کی شعری کائنات

محمد اختر (وارانسی)..................

اردو شاعری کی روایت بنیادی طور پر غزل کی رہی ہے۔ میر و سودا کے عہد سے لے کر آج تک کی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو یہ بات خود بخود عیاں ہو جاتی ہے۔ حسن و عشق کے معاملات کے ساتھ زندگی اور اس کے مسائل/مصائب بھی غزلیہ شاعری کے نمایاں موضوع رہے ہیں۔ غم عشق کے ساتھ غم روزگار کا مسئلہ ہو یا پھر زندگی کے اور دوسرے مسائل۔ ہر عہد کے شعرا نے ان سب موضوعات و مسائل کو اپنی شاعری میں نہایت ہنرمندی سے پیش کیا ہے، جس سے غزلیہ شاعری متنوع و متمول ہے۔

ترقی پسند تحریک سے قبل کا زمانہ ہو یا بعد کا۔ ہر جگہ سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل موضوع بحث رہے ہیں۔ کہیں سماجی مسائل و میلانات کا غلبہ رہا، تو کہیں ادبی اقدار کی بحالی پر زور دیا گیا۔ تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کے ساتھ شکست ذات، تنہائی، خوف اور عدم تحفظ کے مسائل بھی ایک زمانے تک حاوی رہے ہیں، آہستہ آہستہ معاملہ مقامی و ثقافتی اقدار کی بازیافت تک آ پہنچا۔ شعرا نے بھی وقت اور حالات کے تقاضے کا ساتھ دیا۔ کبھی اپنی شناخت قائم رکھنے کے لیے، کبھی کسی جماعت کا حصہ بننے کے لیے، کبھی انعام و اکرام کی لالچ تو کہیں آئیڈیالوجی کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔ غرضیکہ تغیر و تبدیلی اور رد و قبول کا یہ معاملہ فطری عمل کے طور پر ادب میں ہمیشہ سے جاری ساری رہا ہے۔ ایک رجحان پروان چڑھتا ہے، عروج کو پہنچتا ہے

اور پھر انتہا پسندی کا شکار ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ گویا ادب کا پورا معاملہ انحراف و انجذاب سے عبارت ہے۔

ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کے برعکس معاصر شاعر/ادیب اس فکر و شعور کا ترجمان ہے، جس سے انسان اور معاشرہ دوچار ہے۔ یہ رجحان ہی دراصل انسان اور اس کی زندگی کی تفہیم سے عبارت ہے۔ آج کا انسان مختلف واہموں، اندیشوں اور وسوسوں میں گرفتار ہے۔ کہیں سیاسی وسماجی استحصال، کہیں معاشی و جنسی استحصال، کہیں فسادات کا لامتناہی سلسلہ، گویا زندگی کے ہر موڑ پر ایک نئی مصیبت انسان کا استقبال کر رہی ہے۔ ایسی صورت حال میں شاعر/ادیب جو معاشرے کا سب سے حساس اور باشعور فرد ہے۔ اس کی بے چینی اور الجھن ایک عام انسان سے سوا ہوتی ہے۔ انتشار و بے چینی کے اس دور میں مصائب و آلام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جہاں مایوسی/ ناامیدی پیدا کرتا ہے، وہیں انسان کے اعتماد کو بھی متزلزل کرتا ہے۔ اس سچویشن میں شاعر/ادیب عوام میں یہ اعتماد بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ آنے والا وقت آج سے بہتر ہوگا۔ عرفان صدیقی انہی شعرا میں سے ایک ہیں، جو شام کی آمد سے گھبراتے نہیں بلکہ اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ ستارے ضرور اپنی کرامات دکھلائیں گے۔ ان کی شاعری میں مایوسی، ناامیدی اور بے بسی کے برعکس امید، خوشی اور یقین کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے، جہاں کہیں حزن و یاس کی کیفیت نظر آتی ہے تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ معاشرے اور انسان کے اس درد و کرب کو بیان کرنا چاہتے ہیں، جو آج کے انسان کا مقدر ہے۔ چند اشعار کے ذریعہ عرفان صدیقی کی شاعری کے رجائی پہلو کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اشعار بطور مثال درج ہیں:

طے ہو چکے سب آبلہ پائی کے مرحلے
اب یہ زمیں گلابوں سے ڈھک جانا چاہیے

طلوع ہونے کو ہے پھر کوئی ستارۂ غیب
وہ دیکھ پردۂ افلاک ہٹا جاتا ہے
پھر ہواؤں سے ملنا کسی امکاں کی نوید
پھر لہو میں آرزوئے تازہ تر کا جاگنا
زرد چہروں پہ بھی انجان امیدوں کی چمک
سانولے ہاتھوں پہ بھی مہندی کا لکھا روشن
سرپھری لہروں سے لڑتے ہوئے بازو تھک جائیں
پھر بھی آنکھوں میں رہے کوئی جزیرہ روشن

عرفان صدیقی کی شعری کائنات کافی وسیع ہے۔ حسن و عشق کے معاملات سے لیکر سانحۂ کربلا تک کے واقعات ان کی شاعری کا موضوع قرار پائے ہیں، لیکن جب ہم اپنی کلاسیکی روایت کے تہذیبی سیاق وسباق میں عرفان صدیقی کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نے اردو کی عشقیہ شاعری سے از سر نو اپنا رشتہ استوار کیا ہے۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کا ایک انوکھا اور پاکیزہ تصور ہے، جو ہوس پرستی کے بجائے ناموس عشق کی حفاظت پر زور دیتا ہے۔ عشق سے وابستہ اقدار کی بحالی اس کا شیوہ ہے۔ چند اشعار کے ذریعہ اس پاکیزہ تصور کو سمجھا جا سکتا ہے:

دھیرے دھیرے ختم ہونا سر کا سودا، دل کا درد
رفتہ رفتہ ہر صدف کا بے گہر کرنا مجھے
پہلے ایسا تو نہ تھا ذائقہ ہجر و وصال
اس تعلق میں کیا چیز ملادی اس نے

کیا عجب ہے کہ ہوس روح کو کردے کندن
جسم اس آگ میں جل جائے گا جل جانے دو
وہ یہاں ایک نئے گھر کی بناڈالے گا
خانۂ درد کومسمار کیا ہے اس نے

عشق و عاشقی کی موجودہ صورت حال پر شاعر ماتم کناں ہے۔خود عرفان صدیقی کا خیال ہے کہ عشق کی پاکیزگی کوگہن لگ گیا ہے، ہجر ووصال کے معنی بدل چکے ہیں۔عاشق ومعشوق دونوں کا کردار مشکوک ہوگیا ہے۔دونوں خودغرضی اور ہوس پرستی کا شکار ہیں۔لہٰذا حسن و عشق کی صالح روایت پر حرف آنے کے ساتھ تخلیقی سرگرمیاں بھی بڑی حد تک ماند پڑگئی ہیں۔تخلیقی سرگرمیوں کا ایک بڑا محور یہ حسن وعشق ہی تھا،لیکن آج ہوس پرستی میں تبدیل ہوکر غلط سمت جاپڑی ہے،جس کا انہیں ملال ہے اور شکوہ بھی۔عرفان صدیقی کے مطابق شاعری میں جلال و جمال کی جو رنگ آمیزی تھی وہ سب عشق کے کرشمے تھے۔اسی لیے انہوں نے فرمایا تھا:

سخن میں رنگ تمہارے خیال ہی کے تو ہیں
یہ سب کرشمے ہوائے وصال ہی کے تو ہیں
اگر تراوش زخمِ جگر نہیں کوئی چیز
تو رنگ بے ہنری میں کہاں سے آتے ہیں

یا پھران کا یہ فرمانا: ---------------------

شاعری کون کرامت ہے مگر کیا کہیے
درد ہے دل میں سولفظوں میں اثر ہے سائیں

''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں'' کے برعکس دردِ دل اور زخمِ جگر کو شاعری کا سبب

بیان کرنا بہت با معنی لگتا ہے۔ جب دردِ دل اور زخمِ جگر ہوا ہوتا ہے تو خود بخود اظہار کے راستے ڈھونڈ لیتا ہے، شاعری بھی اس درد کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ عرفان صدیقی نے اپنی کلاسیکی شعری روایت سے استفادہ کرتے ہوئے ایک خاص لب و لہجے کی پرورش کی ہے۔ ان کے یہاں محبوب کا قرب اور لمس کس طرح اپنا کرشمہ دکھاتا ہے کہ خار و خس یعنی مردہ تن میں بھی جان آجاتی ہے۔ دو شعر بطور مثال پیش ہے:

ذرا سا لمس شرر نے عجب کمال کیا
میں سوچتا تھا مرے خار و خس میں کچھ بھی نہیں

وہ خوش بدن ہے نوید بہار میرے لیے
میں اس کو چھو لوں تو سب کچھ نیا نیا ہو جائے

عرفان صدیقی کی شاعری کا سب سے اہم اور قابل قدر موضوع عشق ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ ان کی شہرت کی بنیاد ہی بڑی حد تک ''عشق نامہ'' پر قائم ہے۔ یہاں ''عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو'' والا معاملہ کارفرما ہے۔ حسن و عشق کی تمام کیفیات / واردات کو عرفان صدیقی نے قدرے جدید ڈھنگ سے برتا ہے۔ لفظیات اور ڈکشن بھی نئے وضع کیے ہیں، ساتھ ہی ساتھ پیش کش کا انداز بھی جدا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے ہم عصروں میں منفرد اور ممتاز ہیں۔ چند اشعار کے ذریعہ عرفان صدیقی کی انفرادیت کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے:

اس نے کیا دیکھا کہ ہر صحرا چمن لگنے لگا
کتنا اچھا اپنا من ، اپنا بدن لگنے لگا

دیکھ لیتا ہے تو کھلتے چلے جاتے ہیں گلاب
میری مٹی کو خوش آثار کیا ہے اس نے

شعلۂ عشق بجھانا بھی نہیں چاہتا ہے
وہ مگر خود کو جلانا بھی نہیں چاہتا ہے

یہ درد ہی مرا چارہ ہے تم کو کیا معلوم
ہٹاؤ ہاتھ میں بیمار رہنا چاہتاہوں

وقت اور حالات نے انسان کوایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کوفراموش کر بیٹھا ہے۔ چھوٹے بڑے کے آداب، تہذیب وثقافت، حتیٰ کہ عاشقی کے آداب تک آج کا انسان بھول بیٹھا ہے۔ عرفان صدیقی کا خیال ہے کہ عشق وعاشقی کے بھی اپنے کچھ آداب اور طور طریقے ہوتے ہیں۔ آہ وفغاں اور گریہ وزاری کی گنجائش اس میدان میں ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں محبوب کی رسوائی اور بدنامی کا خطرہ مسلسل بنا رہتا ہے۔ وہ تو میرؔ کی طرح ناموس عشق کی حفاظت کی بات کرتے ہیں۔ تبھی تو یہ فرماتے ہیں:

عاشقی کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں
زخم کھایا ہے تو اب شور مچانے لگ جائیں

عرفان صدیقی کا محبوب/معشوق ظلم وستم اور جور وجفا کے برعکس لطف وکرم کے صفت سے متصف ہے۔ وہ اپنے عاشق کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ اپناتا ہے۔ اس کی عنایت اور مہربانی ہمیشہ اپنے عاشق کے ساتھ بنی رہتی ہے، جسے ہم خود سپردگی سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن عرفان صدیقی کے بعض اشعار اس بات کے بھی شاہد ہیں کہ ان کا محبوب/معشوق ستم پیشہ بھی ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ عرفان صدیقی کے یہاں آخر یہ تضاد بیانی کیوں ہے۔ انہوں نے اس کی وضاحت خود ہی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری کلاسیکی غزلیہ شاعری کی روایت یہی رہی ہے۔ اس لیے اس کی اتباع میں میں نے یہ رویہ اپنایا ہے۔ ورنہ ان کا محبوب ستمگر اور ستم پیشہ کے برعکس سراپا نیاز ہے، بقول عرفان صدیقی:

غزلوں میں تو یوں کہنے کا دستور ہے ورنہ
سچ مچ میرا محبوب ستم گر نہیں تھا

عرفان صدیقی کا محبوب عام غزلیہ شاعری کے برعکس سراپا تسلیم ورضا اور مائل بہ کرم ہے، ن
کے بجائے وصال کا طالب ہے۔ یہ دو شعر بہ طور خاص دیکھیے:

ہم سے وہ جان سخن ربط نوا چاہتی ہے
چاند ہے اور چراغوں سے ضیا چاہتی ہے
کیا ہرن ہے کہ کبھی رم نہیں کرتا ہم سے
فاصلہ اپنا مگر کم نہیں کرتا ہم سے

عرفان صدیقی کی شاعری کا ایک اہم پہلو ظلم وستم کے خلاف ان کا احتجاجی رویہ
ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے اس موضوع پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے
کہ ظلم دراصل ظالم کے خلاف مظلوم کی خاموشی سے پنپتا اور پروان چڑھتا ہے۔ یعنی ظلم کے
فروغ میں خود مظلوم کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جب تک مظلوم احتجاج اور مزاحمت کا رویہ نہیں
اپناتا تو ظالم کا حوصلہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ ظلم وستم کو خاموشی سے سہہ لینا بھی ظلم کے ساتھ تعاون
ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ظلم وستم کے خلاف احتجاج پر مشتمل ہے:

بہت کچھ دوستو بسمل کے چپ رہنے سے ہوتا ہے
فقط اس خنجر دست جفا سے کچھ نہیں ہوتا

یعنی ظلم کے فروغ میں صرف ظالم کا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ مظلوم کی خاموشی بھی مددگار
ثابت ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی خاموشی توڑے، ظالم کے خلاف احتجاج کرے تو اس کا حوصلہ
پست ہوگا۔ مصلحت پسندی اور خاموشی کی وجہ سے ظالم مزید طاقتور ہو جاتا ہے۔ اس کی دادا
گیری بڑھتی جاتی ہے، اگر یہ رویہ لوگ ترک کر دیں اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف

سینہ سپر ہو جائیں تو ظالم خود بخود ہتھیار ڈال دے گا۔ عرفان صدیقی نے ظلم کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں ظلم کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے، بقول عرفان صدیقی: ''......زمانہ اور زمانے کے معاملات اتنے پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ اب ظلم کو بہت آسانی کے ساتھ پہچانا نہیں جا سکتا۔ بہت سے ظلم ایسے ہیں جو بظاہر مہربانی اور عنایت نظر آتے ہیں، لیکن ہیں ظلم......اگر ظلم کوئی بہت آسانی......اور بہت خاموشی سے سہہ لیتا ہے تو وہ خود بھی ظالم ہے، وہ ظلم کا حصہ بن جاتا ہے''

اس عبارت سے عرفان صدیقی کے نظریۂ ظلم کو سمجھا جا سکتا ہے۔ موجودہ عہد میں منافقت کا جو کاروبار ہے وہ بھی ظلم ہی کا ایک حصہ ہے۔ کیوں کہ عنایات و اکرامات کے پس پردہ بھی ظلم کی کوئی نہ کوئی نوعیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ شخص جو بظاہر مخلص اور ہمدرد نظر آتا ہے، وہ بھی آپ کا دوست نما دشمن ہوتا ہے۔ عرفان صدیقی نے اس طرح کے رویے کو بھی ظلم ہی کا حصہ ٹھہرایا ہے۔ اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

جسم کی بنیاد ڈھادے گا یہ اندر کا سکوت
شور کرنا چاہیے، کہرام کرنا چاہیے
ایسے آشوب میں کس طرح سے چپ بیٹھا جائے
خون میں تاب و تب حوصلہ داراں بھی تو ہے

اس طرح کے اشعار عرفان صدیقی کی شاعری میں بکثرت موجود ہیں۔ فکری اور معنوی سطح پر بھی ان کی شاعری کا کینوس کافی وسیع ہے۔ عرفان صدیقی بنیادی طور پر ایک تمثال گر ہیں۔ وہ رات دن شعروں میں تمثال گری کرتے رہتے ہیں، جبکہ ان کا کوئی خیالی محبوب بھی نہ تھا۔ بقول عرفان صدیقی:

رات دن شعروں میں تمثال گری کرتا ہوں
طاق دل میں کوئی تصویر خیالی بھی نہیں

عرفان صدیقی الفاظ کی حرمت، اس کی تقدیس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ بسا اوقات تلاش و جستجو کا یہ عمل مہینوں پر محیط ہوتا تھا۔ اس سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ الفاظ کو اس کے صحیح تہذیبی پس منظر میں استعمال کر سکیں۔ الفاظ کے سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ صرف لغت دیکھ کر کسی لفظ کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ Contexts بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہر زبان کی اپنی تہذیب و ثقافت ہوتی ہے، اس کو نظر انداز کر کے کوئی بھی قابل قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا ہے۔

عرفان صدیقی نے تشبیہات و استعارات کے استعمال میں بھی خوب ہنر مندی دکھائی ہے۔ خاک ، ہوا، سمندر، ستارہ، بادباں، چراغ، ابر اور باراں جیسے الفاظ ان کی شاعری میں بار بار آتے ہیں۔ وہ ان الفاظ کو ایک نیا معنی پہنانے پر قادر بھی ہیں۔ یہ الفاظ خارجی حقائق سے زیادہ باطنی حقائق کا حوالہ ہیں۔ جنھیں دیکھنا ان پر غور و فکر کرنا دراصل حیات و کائنات پر غور و فکر کرنا ہے۔ چند اشعار کے ذریعہ اس بات کو بحسن و خوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اشعار بطور مثال پیش ہیں:

چار دیوار عناصر کی حقیقت کتنی
یہ بھی گھر ڈوب گیا دیدۂ خونبار پہ خاک

الٹ گیا ہر اک سلسلہ نشانے پر
چراغ گھات میں ہے اور ہوا نشانے پر

وہ حبس ہے کہ دعا کر رہے ہیں سارے چراغ
اب اس طرف کوئی موج ہوا بھی آئے

سواد شب میں کسی سمت کا سراغ نہیں
یہ سیمیا ہے ستارہ نہیں، ٹھہر جاؤ
لاؤ اس حرف دعا کا بادباں لیتا چلوں
سخت ہوتا ہے سمندر کا سفر سنتا ہوں میں

عرفان صدیقی نے بعض متروک الفاظ کا استعمال بھی اپنی شاعری میں بہت ہی ہنرمندی سے کیا ہے، جس سے انکی معنویت دو چند ہوگئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کسی لفظ کو متروک قرار دینا دراصل اس کا قتل کرنا ہے۔ سو، تلک وغیرہ الفاظ جنہیں متروکات کے خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری میں ان الفاظ کا جوہر قابل دید ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

ہوں مشت خاک مگر کوزہ گر کا میں بھی ہوں
سو منتظر اسی لمس ہنر کا میں بھی ہوں

معاصر عہد میں انسان مختلف طرح کے مسائل و مصائب سے دوچار ہے، بربادی اور آفات کا ایک سیل رواں ہے جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ عرفان صدیقی اس صورت حال کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ ظلم و ستم اور مصائب و آلام کی اس کہانی کو وہ کربلا کے تناظر میں دیکھنا سمجھنا چاہتے ہیں۔ عرفان صدیقی کی شاعری کا ایک اہم پہلو واقعہ کربلا بھی ہے۔ چند اشعار کے ذریعہ ان کے نظریے کو سمجھا جاسکتا ہے۔ دو اشعار بطور مثال پیش ہیں:

خدا کرے صف سر دادگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے
کوئی نیزہ سرفرازی دے تو کچھ آئے گا یقیں
خشک ٹہنی پر بھی آتے ہیں ثمر سنتا ہوں میں

سانحۂ کربلا اردو شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ سے قبل اور بعد اس

کی ایک مضبوط اور توانا روایت رہی ہے۔ عرفان صدیقی نے بھی اس موضوع کو بطور خاص اپنایا، سانحۂ کربلا کو ایک نئے استعاراتی ابعاد میں دیکھنے اور برتنے کی کاوش، انکے یہاں بہت حد تک نمایاں ہے۔ چند اشعار کے ذریعہ ان کی اس انفرادیت کو سمجھا جا سکتا ہے:

اے لہو تجھے مقتل سے کہاں لے جاؤں
اپنے منظر ہی میں ہر رنگ بھلا لگتا ہے

وہ مرحلے ہیں کہ اب سیلِ خوں پہ راضی ہیں
ہم اس زمین کو شاداب دیکھنے کے لیے

میں چاہتا ہوں کہ سب معرکے یہیں سر ہو جائیں
کہ اس کے بعد یہ دنیا کہاں سے لاؤں گا میں

ان اشعار میں معنی کا ایک جہاں پوشیدہ ہے۔ علامات واستعارات نے معنویت کو مزید جلا بخشا ہے۔ معنی کا یہ جہاں سانحۂ کربلا کے لفظیات/ تلازمات کے ذریعہ تخلیق ہوا ہے۔ لہو، مقتل، معرکے، نیزہ، چشمۂ حیراں وغیرہ اور ان جیسے بہت سے دوسرے الفاظ کربلا کے سیاق وسباق میں جہانِ دیگر کے مالک ہیں۔

ہم عصر زندگی کو کربلا کے تناظر میں دیکھنے کا ہنر بھی عرفان صدیقی کا خاص اپنا ہے۔ انہوں نے دوسرے فن کاروں کے بہ نسبت زیادہ ہنرمندی سے کربلائی صورت حال اور اس کے تہذیبی انسلاکات کو برتا ہے۔ کربلا کا استعارہ عرفان صدیقی کی شاعری کا ایک منفرد اور متنوع پہلو ہے۔ اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے آفاق عالم صدیقی لکھتے ہیں: ''کربلا کے استعارہ کو استعمال کرنے والے فن کاروں میں عرفان صدیقی کا نام سب سے معتبر اس لیے ہے کہ انھوں نے دوسرے فن کاروں کی بہ نسبت خود کو کربلائی صورت حال اور کربلا کے تہذیبی انسلاکات سے زیادہ قریب محسوس کیا ہے۔ اگر کربلا کے استعارے کو عرفان صدیقی کی شاعری

سے خارج کر دیا جائے تو یقیناً ان کی شاعری انفرادیت اور تنوع سے بہت حد تک محروم ہو جائے گی''

بلاشبہ عرفان صدیقی کی شاعری کا ایک اہم حصہ واقعۂ کربلا پر مشتمل ہے۔ ایثار و جرأت، صبر و توکل اور حق و باطل کی کشمکش جیسے سوالات انہیں بار بار اس واقعے کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ وہ ظالم کے خلاف اور مظلوم کے حمایتی ہیں۔ انسان اور انسانیت کا خیال ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہے۔ انسان، انسانیت کا احترام وہ شے ہے جس پر بڑی سی بڑی چیز قربان کی جاسکتی ہے۔ یہی بنیادی سبب ہے کہ کربلا اور شہادت حسین کے ذکر سے ان کی شاعری تابندہ ہے۔ چند اشعار بطور مثال دیکھیے :

دلِ سوزاں پہ جیسے دست شبنم رکھ دیا دیکھو
علی کے نام نے زخموں پہ مرہم رکھ دیا دیکھو

تابندہ ہے دلوں میں لہو روشنائی سے
دنیا کے نام نامۂ سرور لکھا ہوا

ہے خاک پہ یہ کون ستارہ بدن شہید
جیسے ورق پہ حرف منور لکھا ہے

عرفان صدیقی کی رثائی شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے ان کے اس عقیدت و محبت کو سمجھیں جو انہیں اہل بیت سے تھی۔ اس سلسلے میں پہلی مدد ہمیں ان کے سلسلۂ نسب سے مل سکتی ہے۔ پھر یہ راز خود بخود منکشف ہو جائے گا کہ وہ کربلا کے واقعہ کو اتنا اہم کیوں سمجھتے ہیں اور وہ ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع کیوں ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری کی انفرادیت اور تنوع کو اس حوالے کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔

عرفان صدیقی کے شعر مجموعے ''کینوس'' سے لیکر ''عشق نامہ'' تک پر ایک سرسری

نگاہ ڈالیں تو ہر جگہ ان کا منفرد اور ممتاز لب ولہجہ نمایاں ہے۔ ان کا خاص اسلوب ہر جگہ چمکتا دمکتا نظر آتا ہے۔ چند اشعار کے ذریعہ ان کی شاعری کے تنوع اور امتیازات کو سمجھا جا سکتا ہے:

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

کر گیا روشن ہمیں پھر سے کوئی بدر منیر
ہم تو سمجھے تھے کہ سورج کو گہن لگنے لگا

خیر اگر تم سے نہ جل پائیں وفاؤں کے چراغ
تم بجھانا مت جو کوئی دوسرا روشن کرے

زمیں سے اٹھ کے مری خاکِ جاں کہاں جائے
یہ نا مراد تہہ آسماں کہاں جائے

غبار تیرہ شبی بھر گیا ہے آنکھوں میں
یہیں چراغ جلے تھے دھواں کہاں جائے

ذرا سوچو تو اس دنیا میں شاید کچھ نہیں بدلا
وہی کانٹے ببولوں میں، وہی خوشبو گلابوں میں

عرفان صدیقی اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ شاعری کے ذریعہ زندگی کے دھارے کو نہیں موڑا جا سکتا ہے، لیکن شاعری زندگی کو نئی امنگ اور حوصلہ ضرور دیتی ہے، زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ حالات سے نمٹنے میں مددگار ہو سکتی ہے۔

جدید اردو شاعری میں تہذیب وثقافت کی شکست وریخت، ہجرت، تنہائی، دہشت، خوف اور فسادات جیسے موضوعات بطور خاص نمایاں ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد سے لیکر آج تک کے حالات کا جائزہ لیں تو صورتِ حال مزید بگڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اقلیت کو بار بار یہ

احساس دلایا جاتا ہے کہ تم اس ملک کے وفادار نہیں۔ بابری مسجد کا سانحہ ہو یا گجرات فساد جس طرح کی بربریت اور سفاکی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا ہے۔ اس سے انسانیت کراہ اٹھتی ہے۔ دماغ معطل ہو جاتا ہے۔ عرفان صدیقی جیسا حساس شاعر بھی اس واقعہ (گجرات) سے لرز اٹھتا ہے۔ وہ ظالموں کے بجائے خدا سے شکوہ بہ لب ہوتا ہے:

حق فتح یاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا
تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا
جو کچھ ہوا وہ کیسے ہوا جانتا ہوں میں
جو کچھ نہیں ہوا وہ بتا کیوں نہیں ہوا

عرفان صدیقی کا یہ لب و لہجہ اقبال کی یاد دلاتا ہے۔ فسادات کو کم و بیش ہر شاعر و ادیب نے موضوع سخن بنایا ہے۔ بعض شعرا نے ان موضوعات کو قدرے جدید ڈھنگ سے برتا ہے۔ تشبیہات، استعارات اور علامات کا استعمال بھی ان کے یہاں انوکھا اور چونکانے والا ہے۔ عرفان صدیقی بھی ان ہی چند شعرا میں سے ایک ہیں جو اپنی انفرادیت اور لب و لہجہ سے ہر جگہ پہچان لیے جاتے ہیں۔ چند اشعار سے ان کے درد و کرب کو محسوس کیا جاتا ہے:

اے پرندو! یاد کرتی ہے تمہیں پاگل ہوا
روز اک نوحہ سر شاخ شجر سنتا ہوں میں
آخر اسی خرابے میں زندہ ہیں اور سب
یوں خاک کوئی میرے سوا کیوں نہیں ہوا
قاتلوں کے شہر میں بھی زندگی کرتے رہے
لوگ شاید یہ سمجھتے تھے کہ مرجائیں گے لوگ

عرفان صدیقی کی شخصیت متنوع اور ہمہ جہت تھی۔ وہ عالمی شہرت یافتہ شاعر کے

ساتھ ایک بڑے صحافی بھی تھے۔ شعر و ادب ان کا شوق تھا اور صحافت پیشہ۔ دونوں ہی میدانوں میں انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ شاعری نے انہیں بین الاقوامی شہرت بخشی اور صحافت نے عزت و ناموری، لیکن شعر و ادب کی گہما گہمی میں صحافی عرفان کہیں گم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ صحافت کے اصول وضوابط پر باقاعدہ ان کی کتابیں ہیں، کچھ تراجم بھی کیے۔ نوجوان صحافیوں کی ایک بڑی تعداد ہے جنکی انھوں نے تربیت کی ہے۔ مخلصانہ مشورے دیئے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ روزنامہ 'صحافت' سے وابستہ ہو گئے تھے اور بطور مدیر اعلا انہوں نے اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی نبھائیں۔ ان کی نظر ملکی اور عالمی مسائل پر گہری تھی۔ بابری مسجد سانحہ ہو یا پھر گجرات کا منظم فساد۔ ان موضوعات پر وہ کھل کر اور مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ بسا اوقات اپنے احساسات وجذبات کی ترجمانی کے لیے شاعری کا بھی سہارا لیتے تھے۔ انکا خیال ہے کہ ہمارے ملک ہندوستان میں فتنہ وفساد اچانک رونما نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کے پیچھے ایک منظم اور مسلسل سازش ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے لیے زمین ہموار کی جاتی ہے۔ حالیہ فسادات اس کی کھلی مثال ہیں۔ بقول عرفان صدیقی:

اچانک دوستو! میرے وطن میں کچھ نہیں ہوتا
یہاں ہوتا ہے ہر اک حادثہ آہستہ آہستہ

عرفان صدیقی نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن ان کا اصل کارنامہ ان کی غزلوں کو کہا جاسکتا ہے۔ غزلوں کے علاوہ ان کی چند نظمیں بھی بہت عمدہ ہیں، جو اردو ادب میں ایک اہم اضافہ کہی جاسکتی ہیں۔ سفر کی زنجیر، شہر خوف، نیا قصیدہ وغیرہ کا شمار ایسی ہی نظموں میں ہوتا ہے۔ ان کی نظم ''شہر خوف'' نمونے کے طور پر حاضر ہے:

گلی میں خوف
دریچوں میں خوف

آنکھ میں خوف

فصیلِ شہر پہ سفاک وقت ٹھہرا ہوا
سماعتوں میں پر اسرار آہٹوں کا ہجوم
ابھی وہ آئیں گے
میرے شکستہ زینے سے
اور اس مکان کے سارے چراغ، سارے گلاب
مری کتابیں، مرے خواب، میری تصویریں
مرے یقیں
مری ناممکنات کی دنیا
دھواں بنادیں گے
عجیب زہر لہو میں اترتا جاتا ہے
مگر یہ بچہ جو سوتے میں مسکراتا ہے

(شہر خوف)

ہمارا (موجودہ) عہد صارفیت اور گلوبلائزیشن کے ساتھ منافقت اور شکم پروری کا ہے، جسے زمانہ سازی کا ہنر نہیں آتا یا مکر و فریب نہیں جانتا۔ حالات، ظالم افراد سے سمجھوتہ نہیں کرتا، تو اسے بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ (عرفان صدیقی نے بھی وہ قیمت چکائی ہے) کم تر اور دوئم درجے کے شعرا/ ادبا کو خلعت و انعام سے نوازا جاتا ہے۔ ہر طرف ان کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی ہوتی ہے۔ اسے عہد کا سب سے بڑا شاعر اور دانشور قرار دیا جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں نیک طبع اور غیور شاعر/ ادیب (جو یقیناً مستحق ہوتے ہیں) کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ عرفان صدیقی بھی انہی خوددار اور باوضع شعرا میں سے ایک تھے جنھوں نے مصلحت پسندی

سے کام نہیں لیا، بلکہ زمانے کو ہمیشہ اپنی ٹھوکر میں رکھا۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے بڑے سے بڑا انعام حاصل کر سکتے تھے۔ ناقدین کی جھوٹی خوشامد سے اپنے اوپر رسائل و جرائد کے خصوصی نمبر مرتب کروا سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اپنی ضمیر کی آواز پر لبیک کہا۔ خوشامد اور منافقت سے کوسوں دور رہے اور یہ کہہ کر بات کو ختم کر دیا:

رکھنا یا فہرست میں تم میرا نام نہ رکھنا
مجھ کو اس انجمن سے کوئی کام نہ رکھنا
ہیں یوں تو اہل زر کے خزانے بھرے ہوئے
مولا کا یہ غلام ضرورت کہاں سے لائے

عرفان صدیقی طبعاً خاموش اور خلوت پسند تھے۔ محفلوں سے گریزاں اور اپنے آپ میں خرم و شاداں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حق تلفی ہوئی، ان کی طرف نقادوں/ ادیبوں نے توجہ بہت بعد میں دی، لہٰذا ان کو شہرت بھی ذرا دیر سے ملی، لیکن ان کو اس کا ذرا بھی ملال نہ تھا۔ بلکہ وہ ہمیشہ شانِ بے نیازی سے گیسوئے اردو کو سنوارتے رہے اور مسلسل اس کوشش میں رہے جو انہیں اوروں سے ممتاز اور منفرد کرے۔ عرفان صدیقی کی دلی خواہش اور تمنا کیا تھی مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

کچھ تو ہو جو تجھے ممتاز کرے اوروں سے
جان لینے کا ہنر ہو کہ مسیحائی ہو
غزل تو خیر ہر اہل سخن کا جادو ہے
مگر یہ نوک پلک میرے فن کا جادو ہے
شمع تنہا کی طرح، صبح کے تارے جیسے
شہر میں ایک ہی دو ہوں گے ہمارے جیسے

نقش پا ڈھونڈنے والوں پہ ہنسی آتی ہے
ہم نے ایسی تو کوئی راہ نکالی بھی نہیں

ان اشعار میں شکوہ ہے، درد ہے، تعلّی اور خودنمائی کا پہلو بھی ہے۔ بلاشبہ وہ اس بات کے حق دار تھے کہ ہر بڑے شاعر وادیب کی طرح اپنے کارنامے پر فخر کریں اور ان کا یہ فخر بجا بھی تھا۔ وہ شاعری میں کسی کو بھی اپنا شریک/حریف نہ سمجھتے تھے، انہیں یہ احساس تھا کہ ہمعصروں میں ایک دو کو چھوڑ کر کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ ایک منفرد اسلوب اور انداز کے مالک ہیں۔

عرفان صدیقی جھوٹی شہرت اور ناموری کے برعکس اس بات کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے کہ وہ کس طرح اپنے فن کو کمال تک پہنچائیں۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اگر فن پارے/شاعری میں جان ہوگی تو اسے کوئی نظر انداز نہیں کر پائے گا۔ یہ ان کی خوداعتمادی ہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی شکوہ بہ لب نہ ہوئے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے عمل لانے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے رہے، لیکن جب کچھ لوگ ان کی آواز کو لے اڑے جسے انہوں نے مر مر کے پالا تھا تو مجبوراً انہیں کہنا پڑا:

ملالِ دولت بردہ پہ خاک ڈالتے ہیں
ہم اپنی خاک سے پھر گنج زر نکالتے ہیں
میں اپنے نقد ہنر کی زکوٰۃ بانٹتا ہوں
مرے ہی سکے مرے ہم سخن اچھالتے ہیں
چڑھا کے میرے معانی پہ لفظ کا زنگار
مرے حریف مرے آئینے اجالتے ہیں

ان اشعار میں معاصرین کی بے غیرتی اور ڈھٹائی کا شکوہ ہے اور اپنے ہنر وکمال پر فخر ومباحات بھی۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا عرفان صدیقی کا وطیرہ تھا۔ وہ بے لوث اردو زبان وادب

کی خدمت کرتے رہے۔

خلاصۂ بحث یہ کہ عرفان صدیقی معاصر اردو ادب کے ایک اہم اور منفرد شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں تشبیہات، استعارات، علامات اور تلمیحات کی جہاں ایک دنیا آباد ہے۔ وہیں بعض الفاظ کو نئے استعاراتی ابعاد میں برتنے کا کمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ بعض متروک الفاظ کا استعمال بھی ان کی شاعری میں خوب سے خوب تر ہے۔ عرفان صدیقی نے بہت ہی دانش مندی کے ساتھ ان الفاظ کو اپنی شاعری کا جز بنایا ہے۔

عرفان صدیقی کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہوئے اور آہستہ آہستہ وہ وہاں جا پہنچے جہاں ہر بشر کو ایک دن جانا ہے۔ شاید انھیں اپنی زندگی کے آخری لمحات کا احساس ہو گیا تھا۔ تبھی تو ان کی زبان سے یہ شعر نکل پڑا:

بجھ رہی ہیں میری شمعیں، سو رہے ہیں میرے لوگ
ہو رہی ہے صبح، قصہ مختصر کرتا ہوں میں

عرفان صدیقی کی شمعِ حیات بالآخر بجھ گئی، لیکن انہوں نے اپنے خونِ جگر سے جو چراغ روشن کیا تھا۔ اس سے ایک نئی روشنی مسلسل پھوٹ رہی ہے، جس سے آنے والی نسلیں مستقل مستفید ہوتی رہیں گی۔ شاید وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے:

جل بجھیں گے کہ ہم اس رات کا ایندھن ہی تو ہیں
خیر دیکھیں گے نئی روشنیاں دوسرے لوگ

☆☆☆

عہد آفریں آواز: عرفان صدیقی

‹عشق نامہ کی روشنی میں›

عاصم شہنواز شبلی (کولکاتا)

غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس سے والہانہ عشق بھی کیا گیا اور جس پر طعن و تشنیع کے تیر بھی چلائے گئے۔ لیکن اس نے ہر تیر کو خندہ پیشانی سے سہا اور زبان سے اُف تک نہ کی۔ نتیجے کے طور پر غزل کے شیدائیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن غزل ہر ایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کا اپنا ایک مزاج ہے۔ یہ رمز وایما کا فن ہے۔ یہاں وضاحت سے زیادہ اشاریت سے کام لیا جاتا ہے۔ تہہ داری و معنی آفرینی اور علائم واستعارات اس کا بنیادی حسن ہیں۔ اس سے ہماری زندگی کی روایت اور تہذیب کی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے شاعروں کی تعداد بہت کم ہے جو اس صنف کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوں۔ زباں پر گرفت، لطافت، دلکشی، دل پذیری، لب ولہجہ کی نرمی، جمالیاتی ذوق اور الفاظ و معانی کا توازن ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ جب یہ ساری بنیادی خصوصیات ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں تو غزل اس کو اپنا محبوب بنا لیتی ہے اور یہ محبوب عرفان صدیقی کی صورت میں اردو شعر وادب کو میسر آیا ہے۔

عہد قدیم سے اب تک اردو غزل نے بڑا طویل سفر طے کیا ہے۔ نئی حسیت، نئی علامتیں، نئے استعارے، نئی امیجری، منفرد طرزِ احساس کے ساتھ درباروں اور خانقاہوں سے

گزرتی ہوئی گھر آنگن سے جڑتی ہوئی اور زندگی کے عمومی پہلوؤں سے ساز باز کرتی غزل ہماری شاعری کی محبوب ترین صنف بن چکی ہے۔انتہائی آسان اور انتہائی مشکل صنف...... جلوہ مستانہ بھی ،نغمہٗ دلنواز بھی...... ہر عہد کے جذبے کی زبان...... ہماری آج کی غزل قدیم روایات سے اپنا انسلاک رکھنے کے باوجود اپنے رنگ و آہنگ اور سوز و گداز میں منفرد اور ممتاز ہے۔علامتیں اور استعارے قدیم ہوں یا جدید،غزل نے دونوں کے امتزاج سے روحِ عصر کی نمائندگی کی ہے۔عرفان صدیقی بھی اردو غزل کی اسی خوشگوار روایات کا سلسلہ ہیں۔گزشتہ دس پندرہ برسوں میں جن شعراء کو ہند و پاک کی ادبی دنیا میں اعتبار حاصل ہوا ان میں ایک اہم نام عرفان صدیقی کا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ میں نے کسی افہام و تفہیم اور مطالعہ و مشاہدہ کے بغیر یہ دعویٰ یا حکم صادر کر دیا ہے۔آپ میرے ساتھ ساتھ اس سفر میں جوں جوں آگے بڑھیں گے میری رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں گے۔

عرفان صدیقی نے چہرۂ غزل کو آب و تاب دی۔غزل ہی ان کا واحد ذریعۂ اظہار ہے۔کلاسیکی روایات سے عرفان صدیقی کا ہمیشہ انسلاک رہا ہے،لیکن وہ ساتھ ہی نئے تقاضوں سے بھی آشنا رہے ہیں۔نئے اور تازہ ہوا کے جھونکوں کا بھی خیر مقدم کرتے رہے اور غالباً یہیں سے ان کی طبیعت میں زبان و بیان کے سلسلے میں احتیاط کی روش نے فروغ پایا۔عرفان صدیقی محتاط غزل گو ہیں۔وہ جذبوں کی صداقت میں محتاط انداز اختیار کرتے ہیں۔جذبے کی رو میں بہنا، جذباتی لہجے میں گفتگو کرنا اور ہیجان انگیز الفاظ کا انتخاب کرنا انھیں پسند نہیں۔وہ ٹھہر ٹھہر کر سنبھل سنبھل کر سلجھے ہوئے احساسات کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ہر جگہ سنبھلی ہوئی کیفیات کا مظاہرہ ہے۔مگر قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اس سنبھلی ہوئی کیفیت کی تہہ میں جو اضطراب ، جو طوفان ، جو شدت اور جو تیزی کارفرما ہے اسے محسوس کرنے کے لیے شعور و سرور اور دل و دیدہ کی ضرورت پڑتی

ہے۔عرفان صدیقی نے بڑے سلیقے اور احتیاط سے اپنے محشر اضطراب کو شعر کی قالب میں ڈھالا ہے:

میں بہر حال اسی حلقۂ زنجیر میں ہوں
یوں تو آزاد کئی بار کیا ہے اس نے

تو اک چراغ جہان دگر ہے کیا جانے
ہم اس زمین پہ کس طرح شب گزارتے ہیں

جسم سے روح تلک راہ نوردی کے لیے
ہو عنایت مرے ہونٹوں کو بھی پروانۂ لب

لپٹ سی داغِ کہن کی طرف سے آتی ہے
جب اک ہوا ترے تن کی طرف سے آتی ہے

اول اول اس سے کچھ حرف و نوا کرتے تھے ہم
رفتہ رفتہ رائیگاں کارِ سخن لگنے لگا

کہیں خرابۂ جاں کے مکیں نہیں جاتے
درخت چھوڑ کے اپنی زمیں نہیں جاتے

یوسف نہیں ہوں مصر کے بازار میں نہ بیچ
میں تیرا انتخاب ہوں ارزاں نہ کر مجھے

ہوا کا چلنا دریچوں کا باز ہوجانا
ذرا سی بات پہ دل کا گداز ہوجانا

ان مختلف اشعار میں ایک کیفیت، احساس، گہرے تجربے اور بے لاگ تجربے کی نمو ہے۔ یہ اشعار ایک خاص سادہ لب و لہجے میں ہیں۔ کہیں کہیں عرفان صدیقی نے قدیم رمز و

کنایات کا سہارا لے کر ان اشعار کے معانی میں زیادہ سے زیادہ وسعتیں پیدا کردی ہیں۔
کوزے میں سمندر بند کرنا دراصل اسی کو کہتے ہیں۔ بظاہر عرفان صدیقی کے اشعار ہمیں پہلی نظر میں بہت عام فہم اور زود رس لگتے ہیں لیکن معانی سے ایسے لبالب مفاہیم کے اعتبار سے ایسے تہہ در تہہ ہیں کہ اہلِ دانش ہی عرفان صدیقی کی غزل کا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں اور اس کی داد دے سکتے ہیں۔

عرفان صدیقی کی غزلیں نہ صرف ہمیں نئے شعری ڈکشن سے آشنا کرتی ہیں بلکہ اس ڈکشن کے وسیع امکانات کی طرف بھی لے جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب تک کسی بھی صاحبِ طرز ادیب، شاعر یا فنکار کا اپنا خاص اسلوب یا لب ولہجہ نہیں ہوتا ہے اس وقت تک اس کی اپنی حیثیت یا پہچان نہیں ہو پاتی ہے۔ ایک تخلیق کار اپنے احساسات وجذبات کو کتنی سچائی کے ساتھ پیش کرتا ہے؟ اس کا انداز فکر اور پیش کش کیسا ہے؟ لفظیات میں کیا انفرادیت ہے؟ مشاہدات وتجربات میں کتنی گہرائی وگیرائی ہے اور اس کی سوچ میں کتنی شدت وصداقت ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی کہ تخلیق کار کا اظہار عام قاری کے دل پر کیسے اثرات مرتب کرتا ہے؟ یہ ساری چیزیں اسلوب اور لب ولہجے کو نہ صرف پر کشش بناتی ہیں بلکہ انفرادی لب ولہجے کی پہچان بھی بن جاتی ہیں۔ عرفان صدیقی کے یہاں یہ سارے لوازم وعلائم بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ عرفان صدیقی کے اسلوب اور لب ولہجہ میں شبنم کے قطرے جیسی نرمی اور نغمگی بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔
یہ اشعار دیکھیے جو میری گفتگو کو سندِ اعتبار بخشیں گے:

جان و دل کب کے گئے ناقہ سواروں کی طرف
یہ بدن گرد اڑانے کو کدھر آگئے ہیں

اس نے کیا دیکھا کہ ہر صحرا چمن لگنے لگا
کتنا اچھا اپنا من اپنا بدن لگنے لگا

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

تیرے تن کے بہت رنگ ہیں جانِ من اور نہاں دل کے نیرنگ خانوں میں ہیں
لامسہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ، باصرہ سب مرے رازدانوں میں ہیں

روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

قیامت استعارہ ہے اشارہ میرے قاتل کا
کہ ہم ابروہی کیا سارا بدن تلوار کردیں گے

میرے اندر کا ہرن شیوۂ رم بھول گیا
کیسے وحشی کو گرفتار کیا ہے اس نے

یہ اور اس کے قبیل کے بہت سارے اشعار ہمیں عرفان صدیقی کے یہاں بغیر کسی تلاش وجستجو کے بآسانی مل جاتے ہیں۔ لفظ بدن ان کی شاعری میں اور درج بالا اشعار میں بڑی شدت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ بدن کے کئی ڈائمنشن (جہات) اور نکات سامنے آگئے ہیں۔ ہر شعر میں بدن کو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور بعض اشعار میں تو بدن کو کئی صورتوں میں پیش کیا گیا ہے جسے اہلِ نظر بخوبی پرکھ لیں گے۔ چوں کہ عرفان صدیقی کو اظہار پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اور موضوع کی بے پناہی اور فراوانی ہے اس لیے ان کا اسلوب اور لب ولہجہ ان کے ہمعصروں سے قدرے مختلف اور جداگانہ ہے۔ عرفان صدیقی کے یہاں صرف نیا طرز احساس ہی نہیں ہے بلکہ نئی امیجری بھی ہے۔ ان کی غزلوں میں جگہ جگہ ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں کلیدی الفاظ کے پیکر کا رنگ ڈھنگ بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ مجھے علم ہے کہ محض فکر وخیال کی سطح پر عملی زندگی

کے جز و اور ان کے مشاہدات کو برتنا کافی نہیں ہے بلکہ غالب کی زبان میں دل گداختہ میں پیوست کر لینا ہے، جذبوں میں ڈھال لینا ہے اور محسوسات میں منتقل کر لینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جذبہ اور احساس اگر سچا اور شدید ہے تو اپنے نکاس کا راستہ نکال لیتا ہے۔ سچے جذبات و محسوسات کی ترجمانی مشکل الفاظ و تراکیب یا اصطلاحات یا لغات کی محتاج نہیں ہوتی ہے۔ اور اس کی مثال عرفان صدیقی ہیں۔

عرفان صدیقی کی جہاتِ غزل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی غزلوں نے روایت کو نئے ابعاد سے آشنا کیا ہے اور بدلے ہوئے طرز احساس اور نئے طرز اظہار کے وسیلے سے ایک نئی روایت کی بنیاد بھی ڈالی ہے۔ جذبے اور کیفیت کو ٹھوس معروض کی شکل میں پیش کر کے ایک جہت کا اضافہ کیا ہے۔ عرفان صدیقی کی غزل ایک ساتھ کئی حواس کو متحرک بھی کرتی ہے اور امیجز کے ذریعے تخلیقی حسن بھی پیدا کرتی ہے۔ ان کے ہم عصروں میں بہت کم شعراء کے یہاں امیجز اور حواس کا ایسا کارآمد امتزاج نظر آتا ہے اور غالباً یہی امیجز اور تخلیقی حسن عرفان صدیقی کو ان کے ہم عصروں میں ممتاز رکھتا ہے۔

گر گئی قیمت شمشاد قداں آنکھوں میں
شہر کو مصر کا بازار کیا ہے اس نے

اپنے چاروں سمت دیواریں اٹھانا رات دن
رات دن پھر ساری دیواروں میں در کرنا مجھے

صید کرتا ہے کسی اور کی مرضی سے مجھے
خود بھی صیاد گرفتار ہے میں کیا جانوں

پاؤں کی فکر نہ کر بارِ کم و بیش اتار
اصل زنجیر تو سامان سفر ہے سائیں

تجھے پا کر بھی تیری ہی طلب سینے میں رکھتا ہوں
تماشہ کر کے میں کشکول گنجینے میں رکھتا ہوں

دشت سے دور بھی کیا رنگ دکھاتا ہے جنوں
دیکھنا ہے تو کسی شہر میں داخل ہو جا

فقیر ہوں دل تکیہ نشیں ملا ہے مجھے
میاں کا صدقہ تاج و نگیں ملا ہے مجھے

قیمت شمشاد کا گرنا، مصر کا بازار ہونا، دیواریں اٹھانا اور پھر دیواروں میں در کرنا، صید کرنا، صیاد کا گرفتار ہونا، پاؤں کی زنجیر دیکھنا اور پھر سامانِ سفر کا سوچنا، محبوب کے حصول کی خواہش کرنا، کشکول کا گنجینے میں رکھنا، دشت و جنوں اور شہر کے امتیازات، فقیر تکیہ نشیں کے توسط سے تاج و نگیں کا ملنا وغیرہ ایک روایتی موضوع سے وابستہ ہونے کے باوجود کلیشے (cliche) اور محاوراتی استعارے سے ایک گریز ہے۔ عرفان صدیقی نے پرانے، متروک اور غیر رسمی الفاظ کو نئے سیاق و سباق کے ساتھ نئے مفاہیم کے ساتھ پیش کیا ہے اور بعض نئے استعاروں کو اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے نیا حسن دیا ہے۔ صرف نیا طرز احساس ہی عرفان صدیقی کی شناخت نہیں ہے بلکہ نئی امیجری بھی ہے۔ خوشبو، رنگ، روشنی، توانائی اور زندگی اپنے ایک انفرادی رنگ کے ساتھ ہر جگہ نمایاں ہے۔ الفاظ کے بصری پیکر کا رنگ ڈھنگ بالکل نیا اور انوکھا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ عرفان صدیقی کے ان تخلیقی رویوں اور تجربوں میں قاری شامل رہتا ہے۔

عرفان صدیقی ان خوش قسمت شاعروں میں سے ہیں جن کی شاعری کو ان کے ہم عصروں نے نئے انداز سے سمجھا، پرکھا اور اس پر گفتگو کی۔ ساتھ ہی نئی نسل نے بھی ان کے تخلیقی سفر کی ستائش کی اور ان کے اشعار پر سر دھننا اپنا شیوہ بنایا۔ یہ خوش قسمتی بہت کم شاعروں کے حصے میں آتی ہے کہ ان کو ان کی زندگی میں ہی recognition مل جائے اور آسمانِ شعر و

ادب پر ان کا نام ستارے کی طرح روشن ہو جائے۔

عرفان صدیقی کی شعری شخصیت نکھری ہوئی، منفرد، صاف و شفاف ہے۔ غمِ پنہاں کی ایک ہلکی سی جھلک مدھم مدھم احتجاج، الفاظ میں درد کے پہلو اور لہجے میں انکساری، لیکن اس انکساری میں بھی خود اعتمادی نے ان کی شاعری کو ایک ایسی منزل پر لا کھڑا کر دیا ہے جہاں پہنچنے کی للک اور خواہش ہر شاعر کے دل میں موجزن ہے۔ لیکن یہ مرتبہ ہر کس و ناکس کے حصے میں کہاں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے بڑے معرکے سر کرنے پڑتے ہیں، فکر و فن کی جولان گاہ کو جوان رکھنا پڑتا ہے، تصورات و تجربات کی نقش گری میں تفکر و تخیل کو برتنے کا ہنر جاننا پڑتا ہے، ایک لمبی ریاضت سے گزرنا پڑتا ہے، الفاظ و معنی کی بھٹی میں جل کر کندن بننا پڑتا ہے، زبان کے تخلیقی استعمال کے ذریعے لسانی و فنی خوش سلیقگی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر عرفان صدیقی جیسا البیلا، سجیلا اور بانکا شاعر اردو غزل کو ملتا ہے۔

تشنہ رکھا ہے نہ سرشار کیا ہے اس نے
میں نے پوچھا ہے تو اقرار کیا ہے اس نے

کون ایسی بستیوں سے گزرتا ہے روز روز
میرے کرشمہ ساز بیاباں نہ کر مجھے

ہم تو صحرا ہوئے جاتے تھے کہ اس نے آکر
شہر آباد کیا نہر صبا جاری کی

وہ ایک خواب سہی سایۂ سراب سہی
یہ عمر بھر کی تھکن اک شجر کے نام تمام

شاعری میں تو بہت دشت و بیابان کا ذکر
زندگی میں گلۂ دربدری آخر کیوں

عجب لوگ تھے مجھ کو جلا کے چھوڑ گئے

عجب دیا ہوں طلوعِ سحر پہ راضی ہوں

عمر کیا چیز ہے احساس زیاں کے آگے

ایک ہی شب میں بدل جاتی ہے صورت کیسی

کب سے راضی تھا بدن بے سروسامانی پر

شب میں حیران ہوا خون کی طغیانی پر

میں نے یہ اشعار عرفان صدیقی کے عشق نامہ سے کسی کوشش کے بغیر منتخب کیے ہیں۔ ہر صفحے پر آپ کو ایسے قیمتی، خوبصورت خیال انگیز اور معنی آفریں اشعار ملتے ہیں اور ایک نئی معنوی جہت کے ساتھ دل ودماغ پر اپنے گہرے اثرات مرتسم کرتے جاتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ عرفان صدیقی کی شاعری کے مختلف ڈائمنشن (جہات) ہیں اور ہر ڈائمنشن کا احاطہ کرنا مجھ جیسے ادب کے ادنیٰ طالب علم کی بات نہیں ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان کی رنگِ سخن، ان کی انفرادیت اور زندگی سے ان کے فنکارانہ ربط کے روشن نقوش کو اپنی بساط کے مطابق بیان کرسکوں۔

بحیثیت مجموعی عرفان صدیقی کی غزلوں نے اردو غزل کو ایک نیا موڑ دیا ہے جہاں الفاظ و معنی میں ہم آہنگی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں نے اپنی زمین سے اپنا رشتہ استعارہ رکھا ہے۔ وہ غزل کے مزاج داں ہونے کے ساتھ ساتھ غزل اور اپنے عہد کے نباض بھی ہیں۔ طرزِ نو کی گونج ان کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تازگی، جدت طرازی، تجربات کا تنوع، قدیم علامتوں اور استعاروں کے نئے مفاہیم اور نئے علائم واستعارے کی تخلیق عرفان صدیقی کی غزلوں کا بنیادی وصف ہیں۔ نئے عہد کے سراغ سے عرفان صدیقی نے غزالوں کو ہمہ جہتی عطا کی ہے۔ غزل کو زندہ اور تازہ لہو عرفان صدیقی جیسے شاعروں سے ملتا ہے۔ وگرنہ راکھ میں

پھول کھلا دینا کس کی ہمت ہے:

سینے کے ویرانے میں یہ خوشبو ایک کرامت ہے
ورنہ اتنا سہل نہیں تھا راکھ میں پھول کھلا دینا

(2015)

☆☆☆

عرفان صدیقی کی غزل

.................جمال اویسی (پٹنہ)

ان دنوں ادب میں بہت سے معاملے فرض کیے ہوئے ہیں۔ تنقید مان کر چلتی ہے کہ کسی نکتہ کی وضاحت یوں کی جائے تو ایک نئی شکل ضرور تیار ہو جائے گی۔ حالانکہ فرض کرنا علم ریاضی کا سب سے قوت مند ہتھیار ہے اور علم ریاضی اس نکتہ کے سہارے جو کچھ پیش کرتا ہے وہ بھی کچھ نہیں کے برابر ہی ہوتا ہے۔ ان فرضیات اور واجبات سے روگردانی کرتے ہوئے کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے تو اس کو پھیلا کر ایک اثبات کی صورت گری بھی کی جاسکتی ہے۔

عرفان صدیقی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ان کی موت نے اردو والوں سے ایک خوش اسلوب غزل نگار شاعر چھین لیا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم بولتے بولتے چپ ہو جاتے ہیں۔ شب خون کے تازہ شمارے میں ان کا مکتوب دیکھنے کو ملا تھا جس میں وہ اپنے مداح کی غزل کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں: ''آپ نے اپنی نئی غزل مرے دل سے نکل گئی ہے کوئی چیز کی شکل میں میرے لیے نادر تحفہ بھیجا ہے۔ کیا کیا عمدہ اور اثر انگیز شعر کہے ہیں واقعی شاعری آپ کی محبت ہے۔'' (شب خون رشمارہ مارچ ۲۰۰۴ء نمبر ۲۷۸)

عرفان صدیقی نے شمس الرحمٰن فاروقی کی غزل کی تعریف کی ہے جو پچھلے کسی شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ فاروقی صاحب کی غزل کو خوب کہنے والوں میں عرفان صدیقی کے علاوہ نیر مسعود اور شہر یار بھی شامل ہیں۔ یہ حقیقت بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ فاروقی شاعر اور

نقاد سے زیادہ بہتر فکشن رائٹر ہیں۔ کم از کم مجھے یہ بات لکھتے ہوئے کوئی تامل نہیں کہ فاروقی کو اگلے زمانے کے لوگ ''سوار'' آفتاب زمین اور کئی چاند تھے سر آسماں، کی نثر کے حوالے سے یاد کریں گے۔ ان شاہکاروں میں جو ادبی نثر پیش کی گئی ہے۔ اس کی نظیر پورے سو سال کے درمیان نہیں ملتی۔

لیکن مان لیجئے اگر وہ غزل کے اچھے شاعر کہے بھی جاتے ہیں تو غزل کے اچھے شاعر کا معیار متعین کرنے والا پیمانہ پچھلی ایک صدی سے نایاب ہے۔ مگر یہاں پر یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ عرفان صدیقی کی غزلیہ شاعری کو اعتبار بخشنے میں فاروقی صاحب کی تنقید کی زبردست خدمات رہی ہیں۔ فاروقی صاحب کے قلم سے تعریف نکلنے کے بعد دوسرے احباب نے بھی عرفان صدیقی کی غزل کی تعریف کرنی شروع کر دی۔ اگر سنجیدگی سے ایک نکتہ پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پہلے پہل عرفان صدیقی کی غزل کی خوش آہنگی نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بعد اس غزل کے دوسرے اسرار و رموز کھلے۔ عرفان صاحب کی غزل پر ایک طرف اقبال کی غزل کی خوش آہنگی کا اثر صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے تو دوسری طرف انہی کے نسبتاً سینئر غزل گو شاعر عبدالعزیز خالد کی غزل کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے۔ غزل کا شاعر بہت ہشیار اور چالاک ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ وہ نئی شعری اصطلاح بنا لینے کے لیے سر مارتا ہے لیکن یہ بہت مشکل کام ہے اور آج کے غزل گو شاعروں کے لیے تقریباً ناممکن امر ہے۔ پھر بھی جو شعرا تھوڑا بہت کامیاب ہوئے ہیں ان میں عرفان صدیقی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل ان معنوں میں بھی الگ نظر آتی ہے کہ اس کا آہنگ معاصر غزل سے میل نہیں کھاتا۔ گرچہ مسالے اور مسائل وہی رہتے ہیں جو معاصر غزل کے لیے مرغوب اور پسندیدہ ہیں۔ عرفان صدیقی کی شعور مندانہ کوشش غزل کو کچھ حد تک کامیاب بنانے میں کام کر جاتی ہے بلکہ عرفان صاحب اس ہنر میں بھی یکتا ہو گئے تھے کہ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی اپنے خاص

رنگ میں بیان کرتے جاتے ہیں لیکن اس کے علاوہ غزل سے متعلق بڑی بڑی باتوں کی توقع ان سے نہیں رکھنی چاہیے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ عرفان صاحب کی غزل میں امکانی انقلاب کی آہٹ سنائی نہیں دیتی۔ وہ زندگی کی رنگارنگ جہتوں کے شاعر نہیں تھے۔ وہ ہر پست و بلند پر نظر نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ غزل کی شاعری میں نئے بشر کے بارے میں فکری یا وجدانی سطح پر کوئی حکیمانہ خیال پیش نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اقبال کی غزل کی خوش آہنگی کو اپنانے کی شعوری کوشش کرتے ہیں لیکن اقبال کی فکری رمز فشانی کی طرح اپنا کوئی فکری نظام پیدا نہیں کرتے۔ ضروری نہیں کہ عرفان صاحب ایسا ہی کرتے تو بہتر ہوتا۔ لیکن یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ عرفان صاحب نے غزل کی خوش آہنگی کو سب کچھ مان لیا تھا اور یہ بھی عجیب حقیقت ہی ہے کہ غزل کی شاعری میں خوش آہنگی ایک طرح سے مرکزی رول ادا کرتی آئی ہے مگر میں اسے حسن کاری یا ایک حسین پردہ تصور کرتا ہوں جو کسی لطیف خیال، احساس یا فکر کو گھیرے ہوئے رہتا ہے۔

عرفان صدیقی کی انفرادیت یہ ضرور رہی ہے کہ ان کی غزل میں مسلمانوں کے تہذیبی اور ثقافتی کردار کی واضح جھلک ملتی ہے۔ عرفان صاحب کے جمالیاتی احساس میں بھی مسلم تاریخ و تمدن کی کارفرمائی ہے اور ان کی غزلوں میں جو تلمیح اور استعارہ نظر آتا ہے اس کا تعلق بھی اسلامی تاریخ اور بہت کچھ ہند اسلامی تاریخ سے ہے۔ ان کے اشعار میں دست بریدہ کے بونے کے بعد دست دعا کے تخیل اُگ آنے کا تصور بھی اسی ہند اسلامی تاریخ سے ہے۔ اپنے دور کے مسلم طبقہ کا کرب ان کے اشعار میں اشاروں اور کنایوں سے پھوٹ پڑتا ہے۔ عرفان صدیقی کی غزل صالح انسانی اقدار کی حامل بھی ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی غزل کی طرح یہاں بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں تقسیم ہند کے بعد سیکڑوں بلکہ ہزاروں ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں اور ان فسادات میں مسلمانوں کی کثیر تعداد

ہلاک ہوئی ہے۔ گجرات کا معاملہ ابھی تازہ ہے۔ 'شب خون' شمارہ نمبر ۲۷۲ میں عرفان صاحب کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس میں گجرات کے المناک حادثوں کا پورا پس منظر دکھائی دیتا ہے اس غزل کے چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

حق فتح یاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا
تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا

جب حشر اسی زمیں پہ اٹھائے گئے تو پھر
برپا یہیں پہ روز جزا کیوں نہیں ہوا

آخراس خرابے میں زندہ ہیں اور سب
یوں خاک کوئی میرے سوا کیوں نہیں ہوا

کیا جذب عشق مجھ سے زیادہ تھا غیر میں
اس کا حبیب اس سے جدا کیوں نہیں ہوا

یہ امر بہت مستحسن ہے کہ ان کے دل میں اپنی قوم کی بے چارگی اور بے بسی کا احساس موجزن رہتا ہے اور انہوں نے اپنی غزل کی استواری میں اپنی قوم کے عروج و زوال کی داستان کے کردار تراشے تھے۔ اس حساب سے دیکھیں تو اقبال ہی کی طرح ان کی غزل میں بھی مسلمان قوم سے متعلق خیالات ملتے ہیں۔ بعض مرتبہ ان کی غزل ایک انوکھے لب ولہجہ کی حامل بھی نظر آتی ہے اور وہ تصویر کشی میں کامیاب ہوتے ہیں::

یہ کس نے دست بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں دستِ دعا نکل آئے

یہ ہو کا وقت یہ جنگل گھنا یہ کالی رات
سنو یہاں کوئی خطرہ نہیں ٹھہر جاؤ

عرفان صدیقی کے یہاں صوفیوں جیسی مستی اور فقر و غیور کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ دنیاداری اور دنیاپرستی دونوں سے پرہیز نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ عشق اور جنون کے مضامین بھی بڑی خوبصورتی سے ان کے یہاں نظر آتے ہیں۔اگر وہ اپنی غزل کے مخصوص لہجہ اور دائرے کو توڑ کر باہر آتے تو یقیناً اس Excellence کو چھو لیتے جو غالب و اقبال کی غزل میں دکھائی دیتا ہے۔عرفان صدیقی نے جس آہنگ کو پیدا کیا وہ یقیناً دامن دل کو کھینچتا تھا اور اسی آہنگ کی تعریف میں نیر مسعود، محمود ایاز اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے بلند مرتبت ادیب و ناقد لگے رہتے تھے۔اس تعریف و توصیف کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرفان صدیقی نے اپنے آہنگ شعری کو بہت قیمتی سمجھا اور اس کو مزید مانجھنے میں لگے رہے۔چنانچہ عرفان صاحب کبھی بھی اپنے قائم کردہ حصار سے باہر نہیں نکل پائے۔کچھ مخصوص بحروں میں وہ بہت خوبصورتی سے کہہ کے نکل جاتے تھے۔غور کرنے والی بات یہ بھی ہے کہ جب شاعر کسی خاص محور میں مسلسل گردش کرتا ہے تو کرافٹ کے ذریعہ اپنی غزل سجاتا اور سنوارتا رہتا ہے۔عرفان صدیقی کے کرافٹ کا بہترین نمونہ یہ غزل کہی جائے گی۔ملحوظ رہے کہ اس غزل میں ان کی پسندیدہ بحر ہے جس کے آخری رکن کو وہ اکثر (خوش آہنگی پیدا کرنے کی خاطر) فعلان بنا دیا کرتے تھے۔اس کرتب کو قاری کیا سمجھے گا۔البتہ شاعر اچھی طرح سمجھتا ہے۔غزل پیش ہے:

اسی دنیا میں مرا کوئے نگاراں بھی تو ہے
ایک گھر بھی تو ہے اک حلقہ یاراں بھی تو ہے

آہی جاتی ہے کوئی موج ہوائے نمناک
اس مسافت میں کہیں خطہ باراں بھی تو ہے

راستوں پر تو ابھی برگ خزاں اڑتے ہیں
خیر، اطراف میں خوشبوئے بہاراں بھی تو ہے

کچھ نظر آتی نہیں شہر کی صورت ہم کو
ہر طرف گرد رہ شاہ سواراں بھی تو ہے
حاکم وقت کو یوں بھی نہیں گوش فریاد
اور پھر تہنیت نذر گزراں بھی تو ہے
ایسے آشوب میں کس طرح سے چپ بیٹھا جائے
خون میں تاب و تب حوصلہ داراں بھی تو ہے

غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ یاراں، باراں، بہاراں، سواراں کے قافیوں کو خوش آہنگی پیدا کرنے کے لیے باندھا گیا ہے۔ مذکورہ اشعار میں جمالیاتی احساس کے سوا کوئی معنی خیزی یا نکتہ آفرینی نہیں ہے۔ پانچویں شعر میں جو مضمون ہے وہ عرفان صاحب اکثر باندھا کرتے تھے۔ اس غزل کا تیسرا شعر بار بار پڑھا جائے تو ایک منظر ضرور ابھرتا ہے مگر فوراً ایک بیزاری بھی پیدا ہوتی ہے۔ اب ایسے اشعار محض خوش بیانی اور خوش ذائقگی کے لیے تو بار بار نہیں پڑھے جا سکتے۔

لیکن اتنا کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ عرفان صدیقی کی غزل محدود ہونے کے باوجود معاصر غزلیات کی بھیڑ میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ خاص کر ایسے دور میں جب دولخت اشعار کی بہتات ہے اور بہت سے نئے شعرا اپنے لہجہ کی کرختگی کو شعری وصف سمجھ بیٹھے ہیں۔ عرفان صاحب کی غزل مدتوں نئے لکھنے والوں کو شعر بنانے کے ڈھنگ سکھاتی رہے گی اور شعر بھی ایسے جو شعری مزاج کی تربیت میں حصہ داری کریں:

ان بھیڑیوں کے بیچ بسر کر رہے ہیں ہم
جن کے لیے ہے طفل دو روزہ بھی کشتنی
جس پر تیغ چلے وہ چیخے، اور کوئی چلائے کیوں
خلق خدا سے آس نہ رکھنا خلق خدا تو پتھر ہے

سر کے سوا کیا جیتا تم نے سر کے سوا ہم ہارے کیا
آگے قسمت اپنی اپنی اب تک کھیل برابر ہے

تم اس حریف کو پامال کر نہیں سکتے
تمہاری ذات ہے دنیا نہیں ٹھہر جاؤ

یہ آخری شعر جتنا متاثر کرتا ہے۔ کاش عرفان صدیقی کی غزلوں میں ایسے اشعار کی بہتات ہوتی۔ لیکن جیسی اور جتنی بھی تعداد ایسے شعروں کی ہے وہ ان کے نام کو سر بلند رکھنے کے لیے کافی ہے اور وہ ہمیشہ اردو غزل کے خوش فکر اور خوش آہنگ شاعر سمجھے جائیں گے۔

☆☆☆

''سات سماوات'' کے سات رنگ

راشد انور راشد (علی گڑھ)

چاہتی ہے کہ کہیں ساتھ بہا کر لے جائے
تم سے بڑھ کر تو مجھے موجِ فنا چاہتی ہے
روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

اور بالآخر بیچ کی یہ دیوار ۱۵؍اپریل ۲۰۰۴ء کی شب گر ہی گئی اور اپنے ساتھ موج فنا اس فن کار کو ہم سے بہت دور لے گئی جو موجودہ عہد میں اردو غزل کی آبرو تھا۔ عرفان صدیقی کی موت اردو شاعری کے لیے نا قابل تلافی نقصان ہے اور آنے والا عہد ہر مرحلے پر ان کی کمی محسوس کرتا رہے گا۔

عرفان صدیقی ۱۹۳۹ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے اور ۶۵ سال کی کامیاب زندگی گزارنے کے بعد انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ برین ٹیومر کے مرض میں مبتلا تھے جس کی تشخیص چار مہینے قبل ہی ہو پائی تھی۔ آپریشن کے بعد حالاں کہ وہ پہلے کی طرح چاق و چوبند دکھائی دینے لگے تھے اور تیزی کے ساتھ رو بہ صحت ہونے لگے تھے لیکن آخر موت سے کس کو رستگاری ہے۔ زندگی کی شام ہوتے ہی وہ خاموشی کے ساتھ اپنے ٹھکانے کو لوٹ گئے۔

ہم پرندوں سے زیادہ تو نہیں ہیں آزاد
گھر کو اب لوٹ چلیں، شام ہوا چاہتی ہے

عرفان صدیقی نے مرکزی حکومت میں محکمۂ پی آئی بی سے اپنی سروس کا آغاز کیا اور مختلف وقتوں میں سینٹرل انفارمیشن سروسز کے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ لکھنؤ میں پی آئی بی یونٹ کے سربراہ کی حیثیت سے سبکدوش ہونے سے قبل انھوں نے دہلی میں دوردرشن کے نیشنل چینل میں نیوز ایڈیٹر کی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ مرکزی حکومت کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ صحافت سے عملی طور پر وابستہ رہے اور لکھنؤ میں روزنامہ ''صحافت'' کی ادارتی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ صحافت سے دیرینہ وابستگی کا ہی نتیجہ تھا کہ انھوں نے انگریزی کی ایک مشہور کتاب کا اردو میں ''رابطۂ عامہ'' کے نام سے ترجمہ بھی کیا تھا۔ انھیں سنسکرت زبان سے بھی ایک خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے کالی داس کی مشہور کتابوں 'مالویکا اگنی متر' اور ''روپ سنگھار'' کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

اردو میں عرفان صدیقی کی انفرادی شناخت کا بنیادی وسیلہ غزل ہے۔ انھوں نے غزل کی بے جان ہوتی ہوئی صنف میں نئی روح پھونکنے کی کامیاب کوشش کی۔ لفظیات کی سطح پر ان کی غزل کلاسیکی شعور سے مزین دکھائی دیتی ہے، جب کہ موضوعات کی سطح پر ان کی شاعری میں موجود عہد کی دھڑکنوں کو آسانی کے ساتھ سنا جاسکتا ہے۔ کینوس، شب درمیاں، سات سماوات اور عشق نامہ ان کے چار شعری مجموعے ہیں، جنھوں نے غزل کا وقار موجودہ عہد میں قائم رکھا۔ حال ہی میں پاکستان سے ان کی کلیات ''دریا'' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ گزشتہ سال غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شاعری کے لیے مایہ ناز ''غالب ایوارڈ'' سے انھیں نوازا گیا تھا۔

اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں عرفان صدیقی کا کلام بہت بعد میں اشاعت کی منزلوں سے گزرا، لیکن جس تیزی کے ساتھ ان کے شیدائیوں کا حلقہ وسیع ہوا، اس سے اردو دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ خود کی شناخت کا مثبت پہلو ان کی شاعری میں ایک الگ ہی جادو جگاتا

ہے۔علی گڑھ سے کوئی باقاعدہ تعلق نہ ہونے کے باوجود عرفان صدیقی یہاں کی فضا اور ماحول سے ایک خاص انسیت محسوس کرتے تھے۔ وہ بہت گرمجوشی کے ساتھ یہاں کی ادبی محفلوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے اور خوب خوب پسند کیے جاتے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عرفان صدیقی برصغیر کے ممتاز اور اہم غزل گو شاعروں میں سے ایک تھے۔ خوشگوار حیرت ان کے لہجے کی پہچان تھی جسے پختگی کی منزلوں سے گزارنے میں انھوں نے بہت محنت کی۔ جب ان کا اولین مجموعۂ کلام ''کینوس'' شائع ہوا تبھی غزل کے شیدائیوں کو یہ اندازہ ہوگیا کہ غزل کے منظر نامے پر ایک منفرد اور توانا آواز ابھری ہے۔'' شب درمیاں'' کی اشاعت سے اس خیال کو مزید تقویت ملی اور جب ''سات سماوات'' منظر عام پر آیا تو عرفان صدیقی بحیثیت شاعر لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے لگے تھے۔'' سات سماوات'' میں ان کی شاعری کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں جن کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم خود بھی تطہیر کے عمل سے گزرتے ہیں۔ 'عشق نامہ'' کے ذریعے عرفان صدیقی نے جذبۂ محبت کو معنویت کی متعدد جہتوں سے آشکار کیا ہے۔ آج نہ جانے کتنے ہی شعراء ان کی تقلید کے لیے مجبور ہیں اور اس کی بنیادی وجہ ہے کہ ان کی شاعری، کلاسیکی شعور اور عصری حسیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔

موجودہ عہد کی غزلوں کے ساتھ، غزل کے کلاسیکی سرمائے کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ لفظیات کی سطح پر دونوں عہد کی غزلوں میں نمایاں فرق ہے، لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ فرق عرفان صدیقی کے یہاں ختم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ فارسی تراکیب کے ساتھ ان کے اشعار میں فارسی حسیت سے وابستہ تلازمات ایک خاص لطف پیدا کرتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فارسی تراکیب اور نسبتاً مشکل الفاظ کو عام فہم الفاظ کے ساتھ اس خوبصورتی سے پرویا ہے کہ شاعری کی بھیڑ میں ان کی غزل دور سے ہی صاف پہچانی جاتی ہے۔

موجودہ عہد میں اس نوع کی انفرادیت گنے چنے لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ واقعاتِ کربلا اور داستانوی شعور کو عرفان صدیقی نے اپنی شاعری میں مختلف سطحوں پر پیش کیا ہے، لیکن غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ کربلا، ان کی شاعری میں صرف مذہبی حوالوں کے طور پر استعمال نہیں ہوتا، بلکہ اپنی تہذیب، ثقافت اور شاندار ماضی کے نوحے کے طور پر اجاگر ہوتا ہے۔ اسی طرح داستانی شعور، ان کی شاعری میں عصری تناظر اور حسیت کا ناگزیر حصہ بن جاتا ہے، جس کی بنا پر ان کی شاعری تہہ در تہہ گہرائیوں کو سمیٹتی چلی جاتی ہے اور مطالعے کے دوران ہماری فہم کا امتحان بھی لیتی ہے، جب تک ہم سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کے لیے مجبور نہیں ہوں گے، عرفان صدیقی کی شاعری کو بہتر طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ رجزیہ آہنگ ان کے اسلوب کو انفردیت بخشتا ہے اور غزل کے قدرے محدود موضوعات کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ وہ شعر کہنے کے دوران اپنی ذات کو بنیادی حوالہ بناتے ہیں۔ ان معنوں میں ان کی ذات، زندگی کے مخصوص نقطۂ نظر کا اشاریہ بن جاتی ہے۔

میرا یہ مختصر مضمون عرفان صدیقی کے تیسرے مجموعۂ کلام ''سات سماوات'' کے سات منتخب اشعار پر مبنی ہے۔ میرے نزدیک یہ اشعار قوسِ قزح کے سات رنگوں کے مماثل ہیں اور ہر رنگ اپنے آپ میں انوکھا ہے۔ یہ تو ایک الگ مسئلہ ہے کہ عرفان صدیقی کی شاعری کا مجموعی رنگ ان اشعار کے ذریعے سامنے آپاتا ہے یا نہیں۔ لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ ساتوں اشعار کے متن سے گزرتے ہوئے ممکنہ مفاہیم تک رسائی حاصل کی جائے۔ ''سات سماوات'' کے ان اشعار میں جذبات و احساسات کی نیرنگیوں کو واضح طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اگر میں فرض نہ کرلوں کہ سن رہا ہے کوئی
تو پھر مرا سخنِ بے زباں کہاں جائے

شمعِ تنہا کی طرح ، صبح کے تارے جیسے
شہر میں ایک ہی دو ہوں گے ہمارے جیسے

تونے مٹی سے الجھنے کا نتیجہ دیکھا
ڈال دی میرے بدن نے تری تلوار پہ خاک

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک
مسندِ خاک پہ بیٹھا ہوں برابر اپنے

غبارِ شب کے پیچھے روشنی ہے لوگ کہتے ہیں
اگر یوں ہے تو یہ منظر دوبارہ دیکھتا ہوں میں

تونے کیا سوچ کے اس شاخ پہ وارا تھا مجھے
دیکھ میں پیرہن برگ بدل کر آیا

وادیٔ ہو میں پہنچتا ہوں بیک جست خیال
دشتِ افلاک میری وحشتِ جاں سے کم ہے

مثالیں تو اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن فی الوقت میں انھیں سات رنگوں کے حوالے سے عرفان صدیقی کی دھنک رنگ شاعری کا مختصر جائزہ پیش کرنا چاہوں گا۔

''سات سماوات'' کا پہلا رنگ شعروسخن کے انفرادی کرب اور ناقدریٔ فن کی اذیت کو ظاہر کرتا ہے۔ سخن کے بے نوا ہونے کا شدید احساس شاعر کے ذہن پر حاوی ہے، لیکن اس المیے کو اپنے وجدان اور شعور کا حصہ بنانا اسے کسی طرح منظور نہیں۔ اس کا فن بے زباں نہیں، لیکن ناقدریٔ فن کے باعث اسے یہ گمان ہو رہا ہے کہ اس کے سخن میں پوشیدہ مخصوص نوعیت کی کشش، ترنم اور آہنگ کا جادو سرد پڑنے لگا ہے۔ چہار سمت، ناقدروں کا جشن انبوہ اور یہ منظر شاعر کو مضطرب کرنے کے لیے کافی ہے، لیکن اس کا اضطراب، ذہنی انتشار کی سرحدوں میں

داخل نہیں ہوتا۔ ذہنی اذیتوں کے باوجود شاعر اپنے حواس مجتمع کرتا ہے اور یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس کے سخن سے کوئی نہ کوئی لطف اندوز ضرور ہو رہا ہے۔ بنیادی طور پر وہ مخاطب تو اپنے سے ہے، لیکن تسکین قلب کے لیے تصور کے دامن میں پناہ لینا نہ صرف وہ گوارہ کرتا ہے، بلکہ ذہنی طور پر، اپنے آپ کو تلخ حقائق سے لمحاتی فرار کے لیے تیار بھی کر لیتا ہے۔ فن کے قدر شناسوں کا زوال اس شعر میں بڑی فنکاری کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے اور بحیثیت قاری ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کے لیے مجبور بھی کرتا ہے۔

دوسرا رنگ داخلی اضطراب کے سہارے اپنے انفرادی وجود کا اعلانیہ ہے۔ یہ کسی بھی ایسے حساس شخص کا تجربہ ہو سکتا ہے جو زندگی کو اپنی شرطوں پر جینے کا خواہش مند ہے۔ عرفان صدیقی کے یہاں شاعرانہ تعلّی، خود کی شناخت کے مثبت پہلوؤں سے وابستہ دکھائی دیتی ہے۔ ان معنوں میں ان کا انفرادی احساس، قاری کو اپنا تجربہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ عرفان صدیقی، زندگی کے متعلق کوئی حتمی نظریہ پیش نہیں کرتے، بلکہ عمومی صورتِ حال کے متضاد رویوں کو اشاروں میں بیان کر دیتے ہیں اور بہت کچھ قاری کی صواب دید پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ شمع تنہا کی مناسبت، صبح کے تارے سے قائم کرتے ہیں اور پھر ان دونوں کے حوالے سے اپنی انفرادیت کا جواز پیش کرتے ہیں۔ اس مثال میں قدرت کی کاری گری یعنی تارے اور انسان کی مساعی، یعنی شمع، ایک ہی نقطے پر مرتکز دکھائی دیتی ہے، جس کے ذریعے شاعر نے اپنی ذات کی موجودگی کا جواز پیش کیا ہے۔ پہلے مصرعے میں شاعر نے انھیں استعاروں کو تکمیلِ ذات کے مثبت پہلوؤں سے وابستہ کیا ہے، جس کی بنا پر اس کی شخصیت لاکھوں میں ایک دکھائی دیتی ہے۔ اس نوع کی فنکاری عرفان صدیقی کے اشعار میں جا بجا دکھائی دیتی ہے، جس کی ابتدا زندگی کے متضاد رویوں سے ہوتی ہے، لیکن اس کا اختتام معنویت کی مختلف جہتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تیسرا رنگ ضمیر کی بامعنی آواز سے عبارت ہے۔ سانحۂ کربلا کا پس منظر بھی اس شعر میں اجاگر ہوتا ہے۔ حساس شخص کا ضمیر ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور قدم قدم پر اپنی موجودگی کا ثبوت پیش کرنے میں بے حد فعال بھی دکھائی دیتا ہے۔ عرفان صدیقی نے تیسرے شعر میں اسی کیفیت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصرعۂ اولیٰ میں اپنی ذات کو وہ مٹی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن مصرعۂ ثانی میں اسی معمولی شے کو جب وہ رعب اور دبدبے کا متبادل بنا کر پیش کرتے ہیں تو ان کے اظہار میں ایک انفرادی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ مٹی سے الجھنے کا نتیجہ، تلوار پر خاک ڈالنے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ یہاں مٹی اور تلوار، بالترتیب سماج کے نچلے اور اعلیٰ طبقے، اور مظلوم و ظالم کا استعارہ ہے، اور شاعر نے باطل کے خلاف حق کا احتجاج ظاہر کیا ہے۔ خنجر کا خون میں تر بتر ہونا ہی قاتل کی سرخروئی کے لیے کافی نہیں۔ اس قسم کا حقیقی عنصر تو مظلوم کے دل میں خوف و دہشت کے فطری جذبے سے نمایاں ہوتا ہے، لیکن اگر حالات اس کے برعکس ہیں تو قاتل کو گویا اپنے مقصد میں کامیابی نہیں مل پاتی۔ ویسے بھی حق و باطل کی معرکہ آرائیوں میں بالآخر شکست باطل کی ہی ہوتی ہے۔ عرفان صدیقی کے اس شعر میں مظلوم طبقے کا رعب، زندگی کے ایک نئے حوصلے کا اشاریہ ہے، جو کسی بھی طرح حالات کے جبر سے نجات چاہتا ہے۔

چوتھا رنگ، شاعر کے تیکھے اور بے باک لہجے کا غماز ہے جس کے تحت انانیت کی متعدد جہتیں آشکار ہوتی ہیں، لیکن انانیت کے اس لہجے میں دوسروں کی تحقیر اور خود کی بے جا توقیر کا جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ بلکہ ہر حال میں زندگی سے مسرت کا آخری قطرہ نچوڑنے کی خواہش زیریں لہروں کی طرح موجود ہے۔ سانحۂ کربلا کا پس منظر ذہن میں رکھتے ہوئے اس چوتھے شعر کی قرأت کریں تو محسوسات کے بعض اچھوتے پہلو بھی سامنے آتے ہیں، اور مسندِ خاک پر انفرادی شان کے ساتھ جلوہ افروز ہونے والے سلطان امام حسین کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ شعر میں متن پر غور کرنے کے بعد دوسرے مفہوم کی جانب بھی رسائی ہوتی

ہے۔ کچھ نہ ملنے پر بھی شاعر، حالات کی ستم ظریفی کا شکوہ نہیں کرتا اور زندگی میں قدم قدم پر تشنگی کے باوجود طمانیت کے جذبوں سے سرشار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے اپنے اندر غضب کی توانائی اور قوت کا احساس ہوتا ہے جو زندگی کے محاذ پر نئے عزم کے ساتھ ڈٹے رہنے کی تحریک دیتا ہے۔ اپنی دیگر ترکیبوں کی طرح، عرفان صدیقی نے ''مسندِ خاک'' کی ترکیب غالباً اردو غزل میں پہلی مرتبہ استعمال کی ہے۔ یوں بھی ہر جینوئن شاعر، بنے بنائے راستوں پر نہیں چلتا اور ایسی ڈگر کا انتخاب کرتا ہے، جو کارواں کے نقوش سے محروم ہو۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مصرعے میں عرفان صدیقی نے اپنی یکتائی کا دعویٰ کیا ہے، جب کہ دوسرے مصرعے میں خود اپنی ذات کو خود کے مقابل پیش کرتے ہوئے اپنے دعوے کی تردید کی ہے، لیکن شعر کے متن پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ ایسا سوچنا مناسب نہیں۔ پہلے مصرعے میں شاعر اپنے آپ کو خود اپنی ذات میں شریک کرتا ہے اور دوسرے مصرعے میں اسی جواز کے ذریعے اپنی یکتائی ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا عرفان صدیقی کا یہ شعر، بہ یک وقت ان کے مزاج کی بوریا نشینی اور کج کلاہی دونوں کو نمایاں کرتا ہے۔

پانچواں رنگ، خود کے محاسبے سے متعلق ہے۔ عرفان صدیقی کے اس شعر میں ''غبارِ شب'' کی ترکیب کلیدی حیثیت رکھتی ہے، اور پھر اس کی مناسبت سے روشنی کا بیان ہے۔ ''غبار شب'' سے شاعر کی مراد رات کی گرد، دھول، رات کا رنج اور ملال کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر ہم ''غبار شب'' سے رات کی گرد اور دھول مراد لیتے ہیں تو ذہن، ستم کی سیاہ رات کی جانب مبذول ہو جاتا ہے اور پھر اس حوالے سے روشنی کا بیان، حالات کے جبر سے نجات کی با معنی کوشش کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اگر ''غبار شب'' کو رات کے دکھ، غصہ، غم اور افسوس سے تعبیر کیا جائے تو پھر روشنی کا ذکر ان کیفیات کو مختلف معنوں میں پیش کرتا ہے۔ اس تناظر میں شب کی سیاہی، حسی پیکر میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر مذکورہ جذبات اس کی داخلی کیفیات کا حصہ

بن جاتے ہیں اور روشنی ایک ہمراز کی طرح دکھ درد میں شریک ہوتے ہوئے زندگی کی تاریک راہوں میں رہبری کے فرائض انجام دیتی ہے۔عرفان صدیقی نے پہلے مصرعے میں لوگوں کی رائے کو مخصوص مفروضے کی بنیاد بنایا ہے، لیکن اس رائے میں لاشعوری طور پر ان کی اندرونی آواز بھی شامل ہے۔یعنی دنیاوی رشتوں سے وہ پوری طرح لاتعلق نہیں ہیں اور ہر مرحلے میں وہ کھلی ہوئی آنکھوں سے اپنے اطراف کا جائزہ بھی لینا چاہتے ہیں۔انسانی نفسیات کی پیچیدہ گرہوں کو کھولنے کی کوشش بھی شاعر کے عمل سے ظاہر ہورہی ہے۔غبارِ شب ہی کے پیچھے روشنی کی موجودگی سے چوں کہ امکانات کی متعدد شمعیں، ذہن و دل میں جگمگانے لگی ہیں، لہٰذا اپنا وسوسہ دور کرنے کے لیے وہ مضطرب دکھائی دینے لگا ہے۔دوسرے مصرعے میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ بصارت کے پہلے مرحلے میں خوفناک سیاہی کا سامنا ہو چکا ہے، لیکن لاشعوری طور پر چوں کہ وہ روشنی کی فتح کا خواہش مند ہے، لہٰذا فطری طور پر وہ اپنی بصارت کا محاسبہ کرنا چاہتا ہے اور اسی بنا پر دیکھے ہوئے منظر کو دوبارہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔بعض اوقات زندگی کے نظریے میں تھوڑی سی تبدیلی ہماری سوچ اور فکر کے دائرے میں انقلاب پیدا کردیتی ہے اور زندگی کو ہم نئے سیاق وسباق میں دیکھنے لگتے ہیں، جو کہ ایک مثبت رویہ ہے۔ شعر میں اس نکتے کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔

چھٹا رنگ، احتجاج اور مزاحمت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔عرفان صدیقی اس رویے کے خلاف سخت آواز بلند کرتے ہیں جو انسان سے اس کے جینے کا بنیادی حق چھیننا چاہتی ہے۔سر جھکا کر ظلم اور ناانصافی کو برداشت کرنا انھیں کسی طرح قبول نہیں۔ان کا لہو قاتل کے سینے میں نمو کرنے کو بے تاب دکھائی دیتا ہے۔ان کے اندر بغاوت کا چشمہ پتھروں سے ابلنا چاہتا ہے۔اس شعر کا خالق ہر حال میں حزن و ہزیمت کے اندھیروں سے پناہ اور کسی بھی طرح اپنے ہاتھوں میں لفظ کا نیزہ روشن رکھنا چاہتا ہے۔قدم قدم پر دنیا آغوشِ ہوس کو کشادہ رکھتی

ہے، لیکن وہ اس حلقۂ کوتاہ میں شامل ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ عرفان صدیقی، مصلحت کے تمام تر تقاضوں سے بالاتر دکھائی دیتے ہیں۔ اس شعر میں تخلیق کار کا ضمیر اپنے مہربان سے یہ سوال کرنے میں نہیں جھجکتا کہ آخر کس بنا پر اسے مخصوص شاخ سے وابستہ کیا گیا تھا۔ استفسار کے اس رویے میں بالواسطہ طور پر کسی دوسری شاخ سے وابستگی کا تصور پوشیدہ ہے جس کی تکمیل نہ ہونے پر وہ اپنا احتجاج پیرہن برگ بدل کر ظاہر کرتا ہے۔ مخصوص شاخ سے وابستگی کے باوجود پتوں کی پوشاک تبدیل کرنے کا بیان پورے نظام سے بغاوت کا اشاریہ ہے جسے عرفان صدیقی نے غزل کے آہنگ میں فنکاری کے ساتھ برتا ہے۔

سات سماوات کا ساتواں اور آخری رنگ جنوں کی جلوہ سامانیوں اور نیرنگیوں کو گویائی عطا کرتا ہے۔ عرفان صدیقی نے اس شعر میں ''وادیٔ ہو'' کی انوکھی ترکیب استعمال کی ہے۔ اس کے علاوہ دشتِ افلاک اور وحشتِ جاں کے تلازمے ان کے انفرادی تجربے کو وسعت بخش رہے ہیں۔ عرفان صدیقی نے اس شعر میں ''وادیٔ ہو'' کی ترکیب کو لغوی مفاہیم کے بجائے کنایے کے طور پر برتا ہے اور ان معنوں میں ''وادیٔ ہو'' سے خوف اور ڈر کی گزرگاہ کا گمان گزرتا ہے۔ دشتِ افلاک سے شاعر نے آسمان کا صحرا یا جنگل مراد لیا ہے، جب کہ وحشتِ جاں وجود کی دیوانگی اور گھبراہٹ سے عبارت ہے۔ شاعر، دشتِ افلاک کو اپنی وحشتِ جاں سے کم گردانتا ہے جس کی بنا پر اسے وادیٔ ہو میں پہنچ کر ہی سکون حاصل ہوتا ہے۔ شعر کے متن پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ شدتِ تاثیر کے لیے ''وادیٔ ہو'' کے علاوہ کوئی اور ترکیب کارگر ثابت نہیں ہو پاتی، کیوں کہ ویسی صورت میں وحشتِ جاں کی شدت کا صحیح اندازہ ممکن نہ تھا۔ دشتِ افلاک کا سلسلہ بھی لامتناہی ہوتا ہے، لیکن شاعر نے یہاں دشتِ افلاک کے مقابلے میں 'وادیٔ ہو'' کو زیادہ وسیع تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وادیٔ ہو'' تک رسائی، خیال کی صرف ایک جست سے ہی ہو جاتی ہے، جو وحشتِ جاں کے لیے گوشۂ عافیت ہے۔ عرفان صدیقی کی

شاعری میں وحشت کی متعدد جہتیں دیکھنے کو ملتی ہیں، لیکن اس شعر میں وحشت کی نیرنگیاں عروج پر دکھائی دیتی ہیں۔

''سات سماوات'' کے مندرجہ بالا سات رنگوں میں زندگی، اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ موجودہ صورتِ حال سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے۔ تقریباً ہر شعر میں عرفان صدیقی نے قابلِ ذکر شعری ترکیبوں کو برتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان تراکیب میں کلاسیکی شعریات کا شعور پورے دبدبے کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، جن سے عصری حسیت نئے تناظر میں جلوہ کشا ہوتی ہے اور آگہی کے منظرنامے روشن ہونے لگتے ہیں۔

عرفان صدیقی آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی شاعری ہمیشہ ہی احساسات کو جھنجھوڑتی رہے گی۔ انھوں نے موجودہ عہد میں غزل کو اس کا کھویا ہوا وقار عطا کیا۔ اپنی قلندرانہ شان، تمکنت اور شانِ بے نیازی کے باعث زندگی کو قدرے مختلف زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی غزلوں کے ذریعے مروجہ مفاہیم کی توسیع کا کارنامہ بہت خوبصورتی کے ساتھ انجام دیا۔ اپنے بے باک لہجے اور اچھوتے خیالات کی بنا پر انھوں نے اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی، جس کی بنا پر انھیں نئے کلاسک کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

(2004)

☆☆☆

''ہوائے دشت ماریہ'' کی چند مذہبی تلمیحات

.............سید علیم اشرف جائسی (حیدر آباد)

میرا موضوع ہے عرفان صدیقی کے مجموعہ کلام ''ہوائے دشت ماریہ کی چند مذہبی تلمیحات''، مذہبی کی قید محض اتفاقی ہے کیونکہ یہ مجموعہ اپنے موضوع ، مواد اور پیشکش کے اعتبار سے غیر مذہبی تلمیحات کے لئے زیادہ گنجائش نہیں رکھتا ہے۔

عرفان صدیقی کو شاعری کے ساتھ ساتھ محبت رسول و آل رسول بھی وراثت میں ملی۔ ولائے اہل بیت ان کی گھٹی کے اجزائے ترکیبی کا حصہ تھا۔ مارہرہ کے روحانی فیضان سے معمور و مخمور اور بدایوں کی علمی و ادبی فضا نے عرفان کے نخل حب وولا کو مزید سرسبز و شاداب کیا۔ وہ اپنے گھر اور ماحول کے اخلاق و اقدار کے وارث ہی نہیں تھے بلکہ اس کے امین و محافظ بھی تھے اور معلم و ناشر بھی۔ ان کی شاعری کا حسن و کمال اس کے موضوعات کے بجائے ان کی پیش کش میں پوشیدہ ہے اور ان کے لئے استعمال کی جانے والی مہذب زبان اور پر شکوہ لہجے میں پوشیدہ ہے جسے سنتے ہی بقول شخصے کسی متاع گم گشتہ کی بازیابی کا احساس ہوتا ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''ہوائے دشت ماریہ''(۱) نہ صرف اسلامی تہذیب و ثقافت سے شاعر کی گہری شناسائی کی دلیل ہے بلکہ زبان و بیان پر بھی شاعر کے غیر معمولی قدرت و تصرف کا آئینہ دار ہے۔ اس میں استعمال شدہ خوبصورت تشبہات معنی آفرین استعارے اور کثیر الابعاد تلمیحات کے ساتھ ساتھ لفظوں کا شوکت و جلال اور معانی کی گہرائی و گیرائی عربی شاعری

کا مزا دیتے ہیں۔

عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں یہاں اصل موضوع کو شروع کرنے سے پہلے اس سے راست طور پر کم متعلق لیکن بے حد اہم امور کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

نجم الغنی رامپوری نے صنعت تلمیح کا بیان کرتے ہوئے ضمناً یہ بھی لکھا ہے کہ عرب اس صنعت کو سرقات شعریہ میں شمار کرتے ہیں اور اسے علم بدیع کی ایک معنوی صنعت کے طور پر نہیں جانتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے عربی علمائے بلاغت جیسے صاحب تلخیص المفتاح خطیب قزوینی 739ھ اور صاحب مختصر المعانی علامہ تفتازانی متوفی 791ھ وغیرہ کی تنقید بھی کی ہے۔ (۲) نجم الغنی صاحب کے اس بیان کا یہ اثر ہوا کہ مشہور ہوگیا کہ یہ صنعت فارسی سے اردو میں آئی ہے (۳) اور عربی میں موجود نہیں ہے۔ جبکہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے یہ صنعت نہ صرف عربی میں بلکہ دنیا کی ہر زبان میں پائی جاتی ہے اور ہمیشہ پائی گئی ہے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ کسی زبان میں اسے بطور صنعت نہ جانا جاتا ہو یا اس کے لئے کوئی مستعمل اصطلاح نہ ہو۔ مثلاً عربی میں آٹھویں صدی ہجری تک تلمیح کو بطور صنعت نہیں جانا جاتا تھا لیکن نویں صدی ہجری کے آغاز میں ہی جب سید شریف جرجانی متوفی 816ھ نے جب اپنی شہرہ آفاق کتاب ''التعریفات'' تصنیف کی تو صنعت تلمیح کا اس میں ذکر کیا ہے۔ (۴) اور اس وقت سے لیکر بیسویں صدی عیسوی میں لکھی جانے والی سید محمود ہاشمی کی کتاب جواہر البلاغۃ تک ہر کتاب میں تلمیح کا بطور صنعت ذکر ہے۔ دراصل رامپوری صاحب کو یہ غلط فہمی بلاغت کی ان قدیم عربی کتابوں پر اعتماد کرنے کے سبب ہوئی جن میں یہ صنعت کو کجا خود علم بدیع بھی ذکر نہیں۔ اس وقت تک صرف بیان اور معانی ہی بلاغت کے علوم کے طور پر جانے جاتے تھے۔ (۵)

عربی میں اس لفظ کا لغوی معنی ہے۔''ابصار الشئ بنظر خفیف'' یا''
اختلاس النظر الی شئی '' (٦) غیاث اللغہ کے مطابق فارسی میں اس کا معنی ہے۔
نگاہ سبک کردن بچیزے' اقرب الموارد کے مطابق اس کا معنی ہے۔اشارہ کردن بچیزے' بعض
لغت کے مطابق بگوشہ چشم اشارہ کردن۔اور یہ سب معنی آپس میں قریب اور ایک ہی فلک میں
گردش کر رہے ہیں۔

لفظ تلمیح کے لغوی معنی کی طرح اس کا اصطلاحی معنی بھی عربی فارسی اور اردو میں تقریباً
ایک ہی ہے۔قزوینی کے تلخیص المفتاح میں تلمیح کی تعریف یوں کی ہے۔'' واما التلمیح فھو
ان یشار الی قصہ أو شعر من غیر ذکرہ ''یعنی کسی قصے یا شعر کے ذکر کے بغیر اس کی
طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ بعینہ یہی تعریف سید شریف جرجانی نے بھی کی ہے۔
تفتازانی نے قصہ اور شعر کے ساتھ ضرب المثل کا اضافہ کیا ہے۔معاصر ادیب ڈاکٹر رامیل بدیع
یعقوب نے تفتازانی کی تعریف کی ہے البتہ اسے معنوی صنعت کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ (٧)
شمس الدین فقیر حدائق البلاغت میں لکھتے ہیں کہ'' کلام شعر باشد بر واقعہ از وقائع مشہورہ یا
اشارت نمایند بر چیزے کہ در کتب متداولہ مذکور یا نزد ارباب صنعتے از صناعت مشہور باشد''(٨)
فارسی ویکی پیڈیا (دانشنامہ آزاد) میں ہے کہ'' از جملہ صنائع معنوی بدیع است کہ دارن نویسندہ یا
گویندہ در ضمن نوشتار یا گفتار خودش بہ آیہ' حدیث' داستان' یا مثل معروفی اشارہ داشتہ باشد'' (٩)
نجم الغنی رامپوری تلمیح کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' شاعر اپنے کلام میں کسی مسئلہ مشہور یا
کسی قصے یا مثل شائع یا اصطلاح نجوم کو یا کسی ایسی بات کی طرف اشارہ کرے جس کے بغیر معلوم
ہوئے اور بے سمجھے اس کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آئے۔''(١٠) معاصرین میں ابو
الفیض سحر نے ان الفاظ میں تلمیح کی تعریف کی ہے۔''کسی مشہور تاریخی واقعے' قصے یا مسئلے کی
طرف اشارہ کرنا''(١١)

ان تعریفات کا تجزیہ کرنے پر چند اہم امور سامنے آتے ہیں، عربی میں تلمیح صرف قصہ، شعر اور مثل تک محدود تھی لیکن فارسی اردو میں اس میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوگئی جب کہ اس صنعت کی حقیقت ماہیت پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تلمیح کے لئے داستان قصے یا واقعے کا ہونا ضروری ہے، البتہ قصہ کا تاریخی ہونا ضروری نہیں ہے۔ وہ اساطیری، دیومالائی یا فرضی بھی ہوسکتا ہے۔ یونہی اگر کوئی مثل، اصطلاح، شعر آیت یا حدیث اپنے پس منظر میں کوئی واقعہ رکھتے ہیں تو ان کے ذریعے بھی تلمیح ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ہر وہ ادب پارہ جس میں کوئی اصطلاح آیت یا حدیث وارد ہو وہ ضروری نہیں کہ تلمیحی ہو۔

علاوہ ازیں تلمیح کا لغوی معنی ہو یا اصطلاحی معنی ہو سب کا اتفاق ہے کہ تلمیح اشارے کا نام ہے اور تصریح اور وضاحت کی ضد ہے، لہٰذا اگر کسی ادب پارے میں کوئی واقعہ صراحت سے مذکور ہو تو اسے تلمیح نہیں کہیں گے۔ اردو بلاغت اور ادب کی کتابوں میں ایسی بہت سی مثالیں در آئی ہیں جو حقیقتاً تلمیح نہیں ہے۔ مثلاً نجم الغنی نے اس شعر کو تلمیح کے طور پر پیش کیا ہے،

اس کی مدد سے فوج ابابیل نے کیا
لشکر تباہ کعبے پہ اصحاب فیل کا (۱۲)

یہاں نہ لغۃً تلمیح ہے مانہ اصطلاحاً بلکہ صراحت کے ساتھ پورا واقعہ موجود ہے لہٰذا یہ بیان واقعہ ہے تلمیح نہیں ہے۔ یونہی نجم الغنی نے نجوم وطب کے اصطلاحات کی جو مثالیں دی ہیں ان میں سے بھی کئی تلمیح بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ (۱۳)

تلمیح کا استعمال نظم ونثر دونوں میں ہوسکتا ہے لہٰذا شمس الدین فقیر اور نجم الغنی خان وغیرہ کا اسے شعر کے ساتھ مقید کرنا درست نہیں ہے۔

یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے کہ جس لفظ یا جن الفاظ سے تلمیح کی جاتی ہے خود ان پر تلمیح کا اطلاق درست نہیں ہے بلکہ وہ وسائل تلمیح ہیں لہٰذا پروفیسر شمیم حنفی صاحب کا ایک

مقالہ میں اور محمود نیازی کا اپنی کتاب ''تلمیحات غالب'' میں لفظ اور الفاظ کو تلمیح قرار دینا میری ناقص رائے میں درست نہیں ہے الا یہ کہ یہ اطلاق محض تفہیم اور تقریب ذہن کے لئے ہو۔ (۱۴)

تلمیح کی بلاغی اہمیت وافادیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ یہ ایک اہم معنوی صنعت ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں داستان اور حکایتیں ہوتی ہیں جن میں سے کچھ اس طرح زبان زد خاص و عام ہو جاتی ہیں کہ ایک معمولی سا اشارہ بھی قاری اور سامع کے ذہن کو ان کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ تلمیحات سے کلام میں ایجاز واختصار پیدا ہوتا ہے اور اس کی اثر انگیزی اور معنی آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے ذریعہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کی ترسیل ہو سکتی ہے۔ تلمیح کا استعمال شاعری پر قدرت اور تاریخ وتہذیب کی معرفت کی دلیل ہے۔ اور کسی بھی زبان میں تلمیحات کی کثرت اس کے مذہبی' تاریخ اور تہذیبی طور پر متمول اور غنی ہونے کی علامت ہوتی ہے۔

عرفان صدیقی کے مجموعہ کلام ہوائے دشت ماریہ کا بنیادی ومحوری موضوع مدح اہل بیت ہے لیکن کسی عام مدح خواں یا ثنا گر کی طرح نہیں بلکہ ایسے تخلیقی استعارات کی صورت میں جن میں فکر و معنی کا ایک جہاں پوشدہ ہے۔ عرفان کی مدح سرائی ایسی مدح سرائی ہے جس کا مقصد ممدوح کے مصائب پر نوحہ گری کے بجائے اس کی عظمت و آفاقیت کا اثبات ہو۔ ایسی مدح سرائی جو ماضی میں گم رکھنے کے بجائے بہتر مستقبل کی تشکیل میں معاون ہو۔ ایسی مدح سرائی جو بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ ماضی پرستی کے بجائے ماضی کی باز آفرینی کی کوشش سے عبارت ہے۔ (۱۵) اہل بیت کے لئے ان کی مدح سرائی کسی مادی منفعت کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اس ولا و محبت کا تقاضہ ہے جسے وہ دین سمجھتے ہیں اور اپنے عقیدے کی ضرورت مانتے ہیں اور ایک حقیقی والہ وشیدا کی طرح اپنی محبت وولا کو اس خدا کا عطیہ اور فضل سمجھتے ہیں جو ہر شئی پر قادر ہے۔

دل میں مرے یہ جوش ولا ہے خدا کی دین
حیرت نہ کر صدف میں سمندر کو دیکھ کر

اوران کی یہ محبت کوئی عارضی ووقتی چیز نہیں ہے بلکہ:

گھٹی میں ہے ولا کا وہ نشہ پڑا ہوا
ٹھوکر پہ مارتا ہوں خزانہ پڑا ہوا

ظاہر ہے کہ جونشہ گھٹی میں ملا ہووہ بھلا کب اتر سکتا ہے۔

عرفان صدیقی نے لفظ ولا اوراس کے دوسرے مشتقات جیسے مولا اور ولایت وغیرہ کوتلمیح کے لئے استعمال کیا ہے اوراس تلمیح کی غرض سے ہی انہوں نے اپنے اس محبت نامے میں لفظ محبت کے بجائے ولا کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ یہ لفظ ایک طرف تو محبت سے زیادہ وسیع وعمیق معنی پر مشتمل ہے اور دوسرے تلمیح کا افادہ بھی کرتا ہے۔ایسی تلمیح جوان کی محبت علی کا باعث بھی ہےاوراسکی دلیل بھی۔

طلسم شب میری آنکھوں کا دشمن تھا سو مولا نے
لہو میں اک چراغ اسم اعظم رکھ دیا دیکھو

مولا صراط روز جزا سے گزر ہی جائے
کہتا ہوا یہ تیرا ثنا گر علی علی

ہاں اہل زر کے پاس خزانے تو ہیں بہت
مولا کا یہ فقیر ضرورت کہاں سے لائے

ان تمام اشعار میں غدیرخم کے واقعے کی جانب تلمیح ہے امام مسلمؒ ونسائی زیدابن ارقم سے روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپس ہوئے تو غدیرخم کے پاس نزول فرمایا۔اور وہاں آپ نے اپنے اصحاب کومخاطب کرتے ہوئے فرمایا:”

ان الله مولای وانا ولی کل مومن" ثم أخذ بید علی رضی الله عنه فقال: من کنت ولیه فھذا ولیه اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ "(١٦) اللہ میرا مولا ہے اور میں ہر مومن کا مولا ہوں پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: میں جس کا مولا ہوں یہ بھی اس کا مولی ہے۔ اے اللہ جو علی سے محبت وولا رکھے تو بھی اس سے محبت وولا رکھ اور جو علی سے عداوت کرے تو بھی اس سے عداوت فرما۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔(١٧) اور امام نسائی نے اپنی کتاب " حضائص امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ" میں دس سے زائد مختلف طرق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان روایت کیا ہے کہ " من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ "(١٨) میں جس کا مولا ہوں علی اس کے مولا ہیں) احسن جائسی فرماتے ہیں۔

عبث در معنی من کنت مولا می روی ہر سو
علی مولی بایں معنی کہ پیغمبر بود مولی

عرفان صدیقی نے شعوری طور پر محبت اور محبوب کے بجائے ولا اور مولی کا استعمال کیا ہے کیونکہ یہ مادہ قربت اور مودت کے لئے بھی آتا ہے۔ عرفان صدیقی کی یہ مولائیت کتاب وسنت کے ان کے عرفان کا نتیجہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔" قل لا أسئلم علیه اجراً الا المودة فی القربی" (١٩) (کہہ دیجئے کہ میں تم سے اجر رسالت نہیں چاہتا ہوں سوا اس کے کہ میرے قرابت داروں سے محبت کرو) اور اس ضمن میں وارد بے شمار صحیح احادیث میں سے صرف ایک کا متن پیش کررہا ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" احبوا اللہ لما یغذو کم من نعمه و أحبونی لحب الله و احبوا اھل بیتی لحبی "(٢٠) (اللہ سے محبت کرو کہ وہ اپنی نعمتوں میں سے تمہیں کھلاتا ہے۔ اور اللہ کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب میری

اہل بیت سے محبت کرو)

عرفان صدیقی ان نفوس قدسیہ کو رب العزت کا انتخاب سمجھتے ہیں لہٰذا انہیں لا ثانی و بے نظیر قرار دیتے ہیں۔

سب دین ہے خدا کی سو ہر دودمان شوق
چادر کہاں سے لائے ولایت کہاں سے لائے

اس خوبصورت شعر میں واقعہ کسا کی جانب تلمیح ہے۔ امام احمد اور امام ترمذی نے حضرت ام سلمی رضی اللہ عنہا سے تخریج کیا ہے کہ جب آیت تطہیر نازل ہوئی تو" أدار النبی صلی الله علیه سلم کسائه علی علی و فاطمة و الحسن و الحسین ، فقال اللهم هو لاء اهل بیتی فاذهب عنهم الرجس و طهر هم تطهیر اً "(۲۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر کو حضرت علی سیدہ فاطمہ اور امام حسن و حسین پر ڈالا اور دعا کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے رجس کو دور فرما اور انہیں خوب پاک کر دے اس واقعہ اور حدیث کو ذہن میں رکھیں اور پھر اس شعر کو ملاحظہ فرمائیں۔

سب دین ہے خدا کی سو ہر دو دمان شوق
چادر کہاں سے لائے ولایت کہاں سے لائے

اور اگر ان کی صدیقی نسبت کو پیش نظر رکھیں تو یہ شعر قند مکرر کا مزا دے گا۔

رجعت شمس کے واقعے کو اکثر شعرا نے نظم کیا ہے خواہ تلمیح کے طور پر خواہ بیان واقعہ کے طور پر لیکن عرفان صدیقی نے ماضی کے اس واقعہ کو حال سے مربوط کر کے ایک عجب ندرت پیدا کر دی ہے۔

وہی ہیں مرجع لفظ و بیاں علی سے کہو — جو دل میں ہے وہ دل آزردگاں علی سے کہو
بدل چکا ہے یہی آفتاب سمت سفر — سو حال گردش سیارگاں علی سے کہو

گردش سیارگاں کا شکوہ باعث رجعت شمس سے کرنے کا تصور کتنا لطیف ہے یہ اہل زبان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ رجعت شمس کا یہ واقعہ فضائل ومناقب علی کی اکثر کتابوں میں موجود ہے جس کے اعادے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ابن کثیر الدمشقی 774ھ 1373ء نے البدایہ و النہایہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (۲۲) اس کا مطلع بھی ایک عالمانہ تلمیح پر مشتمل ہے اگر یہ شعر عرفان صدیقی کا نہ ہوتا تو شاید ''مرجع لفظ و بیاں'' کو ایک شاعرانہ تعبیر سے زیادہ نہ سمجھتا لیکن عرفان صدیقی صرف ایک شاعر نہیں تھے بلکہ اسلامی تاریخ وثقافت کے باب میں ایک عالمانہ شان بھی رکھتے ہیں لہٰذا یہاں کسی کا سرسری طور پر گزرنا ممکن نہیں ہے۔ حضرت علی لفظ قرآن کے مبلغ بھی تھے اور اس کے معنی کے مفسر و مؤول بھی تھے یعنی انہیں قرآن کے لفظ و معنی دونوں کی مرجعیت حاصل تھی اور یہ صرف خوش عقیدگی نہیں بلکہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کی ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں تشریف لائے اور آپ کی نعل شریف کا پٹہ ٹوٹا ہوا تھا آپ نے اسے مرمت کے لئے حضرت علی کی طرف بڑھا دیا۔ اور فرمایا'' **ان منکم رجلا یقاتل الناس علی تاویل القرآن کما قاتلتھم علی تنزیلہ**' (تم میں سے ایک ایسا شخص ہے جو قرآن کی تاویل اور اس کے معنی کی تعیین کے لئے لوگوں سے اس طرح قتال کرے گا جس طرح مجھے اس کے نزول پر لوگوں سے کرنا پڑا) یہ سن کر ایک صحابی کھڑے ہوئے اور کہا: کیا یہ وہ شخص میں ہوں گا آپ نے فرمایا نہیں ایک اور شخص کھڑے ہوئے اور عرض کیا کیا وہ شخص میں ہوگا؟ آپ نے فرمایا نہیں'' **بل انہ خاصف النعل** ''(۲۳) (بلکہ وہ میرے جوتے کی مرمت کرنے والا ہے) یہ روایت بدر سے لیکر نہروان تک کی پوری تاریخ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

علی کی مرجعیت لفظ و بیان میں سورہ برأت کے نزول اور اسے مکہ روانہ کرنے کی طرف بھی تلمیح ہوسکتی ہے جس کے لئے رسول خدا نے بحکم خدا شیر خدا کا انتخاب کیا تھا اور فرمایا

تھا۔" علی منی و انا منه فلا یودی عنی الا انا و علی "(۲۴) (علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں اور میں یا علی ہی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں)۔ درالمنثور کی ایک روایت ہے کہ حضرت علی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی سے بھی قرآن کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جب کہ صحابہ میں سے تقریباً سبھی نے ان سے قرآن کے بارے میں سوال کیا ہے۔ کبھی قرآنی لفظ کی توضیح کے بارے میں سوال کیا گیا کبھی اس کے معنی کی تشریح کے بارے میں پوچھا گیا۔ ع

وہی ہیں مرجع لفظ و بیاں علی سے کہو

فاتح خیبر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک ایسا لقب ہے جو اپنی شہرت وقبولیت کے اعتبار سے ان کا علم بن چکا ہے۔ لیکن اس سے اس کی تلمیحی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ لفظ "فاتح خیبر" سنتے ہی ذہن میں اس شب انتظار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں ہر صحابی اپنی آنکھوں میں یہ خواب سجائے نیم خوابیدگی اور نیم بیداری میں رات گزار رہا تھا کہ شاید اسے ہی علم فتح وظفر ملنے کی سرخروئی حاصل ہو۔ امام بخاری، امام مسلم اور امام احمد نے تخریج کیا ہے کہ معرکہ خیبر سے ایک شب پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " لأعطين هذه الراية غدا رجلا يفتح الله عليه ،يحب الله و رسوله و يحبه الله و رسوله "(۲۵) (میں کل یہ علم اس شخص کو دونگا جس کو اللہ فتح ونصرت عطا فرمائیگا جو اللہ ورسول سے محبت کرتا ہے اور جس سے اللہ ورسول بھی محبت فرماتے ہیں)۔ دوسرے دن حضرت علی کو علم دیا گیا اور آپ نے خیبر فتح فرمایا۔

یہ سب ولائے فاتح خیبر کا فیض ہے
ہم سر جھکا کے صاحب افسر بھی ہو گئے

پابستگان پہ بام و درشمس جہات کھول

اے باب علم فاتح خیبر علی علی

جن حضرات کے نزدیک کسی واقعے سے خالی آیات واحادیث کی طرف بھی تلمیح ہوسکتی ہے۔ان کے نزدیک باب علم ایک خوبصورت تلمیحی استعار ہوگا،اس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشہور قول کی طرف اشارہ ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خودکو شہرعلم اور علی کواس کا دروازہ قرار دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ جو مدینہ آنا چاہتا ہے وہ دروازے کے ذریعہ اس تک پہنچے۔جلال الدین سیوطی نے حضرت ابن عباس سے تخریج کی ہے کہ'' انا مدینة العلم و علی بابها فمن أراده المدینة فلیاتها من بابها ''(۲۶) یہی وجہ ہے کہ تمام اولیاء اللہ نے شہرعلم تک پہنچنے کے لئے باب علم کا ہی راستہ اپنایا چنانچہ تصوف کے تمام سلسلے حضرت علی سے ہوکرہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتے ہیں۔بقول عرفان

مردان حرکا قافلہ سالار کون ہے

خاصان رب کا کون ہے رہبر علی علی

اس منقبت کا مطلع بھی کئی تلمیحات پر مشتمل ہے۔

شان خدا روان پیمبر علی علی

حق کا ولی نبی کا برادر علی علی

روان پیغمبر یا نفس پیمبر میں واقعہ مباہلہ کی طرف تلمیح ہے۔آیت مباہلہ میں بزبان نبی علی کو (انفسنا) میں شامل کیا گیا ہے یعنی اس آیت میں علی کو نفس نبی قرار دیا گیا ہے۔امام نسائی خصائص میں یہ روایت نقل کرتے ہیں۔'' لینتهین بنو ربیعة او لا بعثن علیهم رجلا کنفسی ینفذ فهیم امری'' (۲۷)(بنو ربیعہ باز آجائیں ورنہ میں انکے خلاف ایک ایسے شخص کوروانہ کرونگا جو میرے اپنے نفس جیسا ہے)،یعنی حضرت علی۔''نبی کا برادر'' میں بھی

واقعہ مواخاۃ کی تلمیح ہے۔ محض نسبی اخوت کا ذکر عرفان جیسے شاعر کے شایان شان نہیں۔ امام ترمذی نے اپنی سنن میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے درمیان اخوت و بھائی چارگی قائم فرمایا اور ہر ایک کو کسی کا بھائی ٹھہرایا تو حضرت علی اشکبار آنکھوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا یارسول اللہ آپ نے اپنے تمام صحابہ کے درمیان مواخاۃ فرمایا، لیکن مجھے کسی کا بھائی نہیں بنایا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''انت اخی فی الدنیا و الآخرہ''[۲۸] (تم تو دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو)۔ اس واقعے کو سننے کے بعد ایک بار پھر اس شعر کی قراءت کریں۔

شان خدا روان پیمبر علی علی
حق کا ولی نبی کا برادر علی علی

شہ مرداں حضرت علی کا مشہور لقب ہے جسے سنتے ہی ان کی شجاعت و بہادری کے قصے ذہن میں اُبھرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ مقولہ ''**لا فتی الا علی لا سیف الا ذو الفقار**'' ہر مسلمان کا ورد زبان ہے۔ صاحب روح البیان نے لکھا ہے کہ جب جنگ خندق میں حضرت علی نے عمرو بن ود کو قتل کر کے تکبیر بلند کی تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مقولہ ارشاد فرمایا[۲۹] عرفان صدیقی لکھتے ہیں۔

شہ مرداں کے در کی گوشہ گیری کا تصدق ہے
کہ میں نے توڑ کر یہ حلقہ رم رکھ دیا دیکھو

نافذ ہوا وہی شہ مرداں کا فیصلہ
دشمن کے دستخط سے محضر بھی ہو گئے

ہوائے دشت ماریہ کی مذہبی تلمیحات میں جن الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے ان میں حضرت علی کی کنیت بوتراب (مٹی کے باپ، گرد آلودہ) سر فہرست ہے۔ اس تلمیحی لفظ کو عرفان نے نہایت

خوبصورت اور معنی خیز شعروں میں نظم کیا ہے۔ ابوتراب صرف حضرت علی کی کنیت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے وجود پذیر ہونے کے پس پشت ایک انتہائی سادہ لیکن دلنشین واقعہ ہے۔ امام مسلم اپنی صحیح میں حضرت سہل سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی کو اپنے ناموں میں سے ابوتراب سے زیادہ کوئی نام پسند نہیں تھا اگر کوئی آپ کو اس نام سے پکارتا تو بہت خوش ہوتے تھے۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ ہے کہ ایک بار اللہ کے رسول حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لائے اور حضرت علی کے بارے میں سوال کیا تو حضرت فاطمہ نے بتایا کہ وہ کسی بات پر ناخوش ہو کر باہر نکل گئے ہیں اللہ کے رسول انہیں تلاش کرتے ہوئے مسجد آئے تو دیکھا کہ وہ مسجد کے ننگے فرش پر اس طرح سو رہے ہیں کہ ان کی پشت پر غبار کا اثر آ گیا ہے۔ اللہ کے رسول ان کے قریب آ کر بیٹھے اور ان کے جسم سے غبار جھاڑتے ہوئے بڑی شفقت و محبت سے فرمانے لگے۔ "قم یا ابا تراب، قم یا ابا تراب" (۳۰) (اے ابوتراب اٹھیے اے ابوتراب اٹھیے) اس حکایت کے بعد عرفان صدیقی کو سنیے۔

سرمہ ہے جب سے خاک در بوتراب کی
آنکھوں میں ہے قبالہ منظر لکھا ہوا

سنا ہے گرد راہ بوتراب آنے کو ہے سر پر
سو میں نے خاک پر تاج کئے و جم رکھ دیا دیکھو

عرفان صدیقی نے ثنائے علی میں ذوالفقار اور مشکل کشا وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔ زبان کے عام رویے کے مطابق یہ سب تلمیحی اشعار ہیں۔

باطل تمام حق سے الگ ہو کے جا پڑا
کیا دست ذوالفقار تھا سچا پڑا ہوا

کھلا آشفتہ جانوں پر علم مشکل کشائی کا
ہوائے ظلم نے پیروں پہ پرچم رکھ دیا دیکھو

نصرت کی ہو چکے ہیں سزاوار ذو الفقار
میرے زمین کے مرحب و عنتر علی علی

ہوائے دشت ماریہ میں مناقب علی مرتضی کے بعد سب سے اہم موضوع واقعہ کربلا کا بیان ہے۔عرفان صدیقی نے ان واقعات کے بیان میں تصریح و تلمیح دونوں کا سہارا لیا ہے۔ مختلف استعارات، تشبیہات اور علامات کے سہارے کربلا کے وقائع کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میں اختصار کے پیش نظر صرف چند تلمیحات پر اکتفا کرتا ہوں۔مشہور روایت ہے کہ جب امام حسین کو شہید کرنے کے بعد ان کے سر کو دمشق لایا گیا، آپ کا سر مبارک ایک ایسی جگہ سے گزرا جہاں ایک شخص قرآن کی یہ آیت تلاوت کر رہا تھا۔"أم حسبت ان اصحاب الکھف و الرقیم کانوا من آیتنا عجبا "(کیا تمھیں پتہ ہے کہ اصحاب کہف و رقیم میری عجیب نشانیوں میں سے تھے تو سر حسین سے یہ آواز آئی کہ "ان قتلی و حملی اعجب من ذلک" (میرا قتل کیا جانا اور میرے سر کو یوں اٹھانا اصحاب کہف و رقیم سے زیادہ عجیب ہے) اس روایت کو ابن عساکر نے تضعیف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (۳۱) بعض روایتوں کے مطابق سر امام سے تلاوت قرآن بھی سنی گئی۔ان واقعات کو ذہن میں رکھے اور ان کی جانب تلمیح پر مشتمل عرفان صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار سے حظ اٹھائیے۔

سنو کہ بول رہا ہے وہ سر اتارا ہوا
ہمارا مرنا بھی جینے کا استعارہ ہوا

نوک سناں پہ مصحف ناطق ہے سر بلند
اونچے علم تو سب سے زیادہ ہمارے ہیں

نیزے سے ہے بلند صدائے کلام حق
کیا اوج پر ہے مصحف اطہر لکھا ہوا

سر کی ہوائے دشت نے گلبانگ لاالہ
اوج سناں پہ مصحفِ اطہر کو دیکھ کر
ابھرتے ڈوبتے منظر میں کس کی روشنیاں
کلام حق سرِنیزہ سنانے والا کون

ہوائے دشت ماریہ میں بہت سے ایسے اشعار ہیں جو عام غزلوں میں ہوتے تو شاید انہیں تلمیح قرار دینا مشکل ہوتا لیکن اس مجموعے میں ہونے کے سبب ان کی تلمیحی حیثیت واضح اور متعین ہے۔ حضرت حر کی طرف یہ استعارتی تلمیح ملاحظہ فرمائیں۔

یہ کون راستہ رو کے ہوئے کھڑا تھا ابھی
اور اب یہ راہ کے پتھر ہٹانے والا کون

اس نوع کی چند اور خوبصورت تلمیحات ملاحظہ فرمائیں:

برگ گل سے کون سا خطرہ کمانداروں کو تھا
پھول کی گردن میں کیوں تیغ جفا مارا گیا
ہوائے کوفہ نامہرباں کو حیرت ہے
کہ لوگ خیمہ صبر و رضا میں زندہ ہیں
تم ہی صدیوں سے یہ نہریں بند کرتے آئے ہو
مجھ کو لگتی ہے تمہاری شکل پہچانی ہوئی
میرے بازوئے بریدہ کا کنایہ تو سمجھ
دیکھ تجھ کو میری بیعت نہیں ملنے والی

ہوائے دشت ماریہ میں ایسی استعارتی اور علامتی تلمیحات کا ایک سلسلہ ہے۔ بہت سارے اشعار میں حضرت علی اکبر حضرت عباس اور حضرت حر کی جانثاری وفداکاری کی جانب

تلمیحات ملتی ہیں لیکن اس مجموعے کا تشخص و امتیاز یہ ہے کہ قاری کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ مرثیہ پڑھ رہا ہے، کسی مجلس میں بیٹھا ہے یا چودہ سو برس پرانی تاریخ کا مطالعہ کر رہا ہے بلکہ وہ خود کو کربلائے عصر ہی میں محسوس کرتا ہے جو کربلائے حسین سے حرارت و حیات حاصل کر رہا ہے اور یہی عرفان صدیقی مرحوم کے فن کا کمال ہے۔ آخر میں ان کے ایک دعائیہ شعر پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں جس میں امام زین العابدین کی بیماری و اسیری کی طرف تلمیح بھی ہے آپ بھی آمین کہیں۔

اے مالک کل سید سجاد کا صدقہ
یہ بند گراں کھول کہ بیمار ہیں ہم بھی

....

حوالہ جات:

۱۔ مطبوعہ کراچی، ادارہ تمدن اسلام، نمبر مورخ

۲۔ بحر الفصاحت، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2006، 1464:2

۳۔ دیکھیے: ظہیر رحمتی، غزل کی تنقید کی اصطلاحات، نئی دہلی، اے پی آفسیٹ پریس، 2005، 187

۴۔ دیکھیے: سید شریف جرجانی، التعریفات، بار اول، بیروت، عالم الکتب 1987، 95

۵۔ دیکھیے: عبد القاہر جرجانی کی اسرار البلاغہ اور سکاکی کی مفتاح العلوم وغیرہ

۶۔ دیکھیے: المعجم الوسیط، مادہ لفظ کے تحت

۷۔ موسوعۃ علوم اللغۃ العربیۃ، بار اول، بیروت، دار الکتب العلمیہ، 2006، 4: 655

۸۔ منقول از ظہیر رحمتی، غزل کی تنقید کی اصطلاحات، مصدر سابق 188

۹۔ جلال الدین، فنون بلاغت و صناعات ادبی، بار سوم، تہران، انتشارات توس، جلد دوم

۱۰۔ بحرالفصاحت، مصدر سابق، 2 :1464

۱۱۔ درس بلاغت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، بار چہارم، نئی دہلی، 2002، 47

۱۲۔ بحرالفصاحت، مصدر سابق 2 :14

۱۳۔ نفس مصدر صفحات:

۱۴۔ پروفیسر شمیم حنفی، "تلمیحات شعر و ادب در کتاب، تلمیحات، مرتب: مظہر احمد، نئی دہلی، ایم آر پبلیکیشنز، 13

۱۵۔ بحوالہ مقدمہ ہوائے دشت ماریہ، از ہمایوں ظفر زیدی، مصدر سابق 56

۱۶۔ امام مسلم، الجامع الصحیح، بیروت دارالکتب العلمیہ، 1992، حدیث رقم 8054، امام نسائی، خصائص امیرالمومنین علی بن ابی طالب، باراول، بیروت، دار ابن حزم، ص ر 53, 54

۱۷۔ دیکھیں نسائی خصائص امیر المومنین علی ابن ابی طالب، مصدر سابق، ص:54

۱۸۔ نفس مصدر صفحات: 53 -64

۱۹۔ شوریٰ:23

۲۰۔ سنن ترمذی، بیروت، داراحیاء التراث العربی، 5 :664 کتاب المناقب، باب مناقب آل البیت

۲۱۔ نفس مصدر، 5:351

۲۲۔ البدایۃ والنہایہ، بیروت، مکتبہ المعارف، غیر مؤرخ، 80 :3

۲۳۔ دیکھئے: امام نسائی خصائص امیر المومنین علی ابن علی طالب، مصدر سابق، ۹۶

۲۴۔ نفس مصدر، عن حبشی بن الجنادۃ، ۵۰

۲۵۔ امام بخاری الجامع الصحیح، بیروت، داراحیاء التراث العربی، غیر مورخ، 6:212، حدیث رقم: 2875

۲۶۔ جلال الدین سیوطی، جامع المسانید والمراسیل، بیروت، دارالفکر، 1994، 16: 258

۲۷۔ امام نسائی، الخصائص، مصدر سابق، ۴۹

۲۸۔ سنن الترمذی، بیروت، دارالکتب العلمیہ، 1994، 10:168

۲۹۔ اسماعیل حقی برسوی، تفسیر روح البیان، بیروت، دار الکتب العلمیہ

۳۰۔ صحیح امام مسلم، مصدر سابق (بیروت، دار لکتب العلمیہ ۱۹۹۲) حدیث رقم 6182، امام بخاری نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے، البتہ ان کے یہاں قم یا اباتراب'' کے بجائے ''اجلس یا اباتراب'' (اے ابوتراب بیٹھو) آیا ہے۔ دیکھیے مصدر سابق حدیث رقم: 3621، 7:433

۳۱۔ عبدالرؤف مناوی، فیض القدیر، مصر، مکتبہ التجاریہ الکبریٰ، بار اول، 1356، 205:1

(2014)

ہنر میں زندہ ہیں عرفان صدیقی

.................معین شاداب (دہلی)

عرفان صدیقی کی شہرت اور مقبولیت کسی 'اشتہار' کی رہین منت نہیں ہے اور نہ ہی انھیں عرفان صدیقی بنانے میں کسی ناقد کا کوئی عمل دخل ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ اطلاعات ونشریات کے شعبے سے ضرور وابستہ رہے لیکن سیلف پبلسٹی کی جدید تکنیک سے وہ قطعی ناواقف تھے۔ خودنمائی میں وہ یقین ہی نہیں رکھتے تھے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ بات ہنر سے نہیں عرض ہنر سے بنتی ہے:

تم بتاتے تو سمجھتی اسے دنیا عرفانؔ
فائدہ عرض ہنر میں تھا ہنر میں کیا تھا

لیکن ان کی بے نیازی انھیں خودتشہیری کے حربوں اور ہتھکنڈوں کے استعمال سے باز رکھتی ہوگی۔ وہ اپنی شان بے نیازی سے سمجھوتہ کر بھی کیسے سکتے تھے کہ یہی تو کسی کھرے شاعر کی پہچان ہوتی ہے۔

عرفان صدیقی جیسے فن کار کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں ہر مکتب و مسلک اور ہر طبقے کے لوگ پسند کرتے تھے۔ ہر ادبی نظریے میں یکساں مقبول تھے۔ مقبولیت کی بنیاد صرف اور صرف ان کی شاعری ہے۔ ان کی مقبولیت کا دائرہ محبوبیت تک پہنچتا ہے۔ وہ بے شمار لوگوں کے آئیڈیل شاعر بن گئے تھے۔ اور شہرت، مقبولیت اور محبوبیت کے اس مقام پر وہ 'عرض ہنر'

کرکےنہیں بلکہ 'ہنر' سے پہنچے تھے۔

مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں بار بار یہ احساس کیوں دلایا گیا کہ ان کی شہرت کچھ دیر سے ہوئی یا انھیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حق دار تھے۔ ان کی مقبولیت کا عالم تو یہ تھا کہ سرحدوں کے پار آباد دنیا کے مختلف ممالک میں انھیں ہمارے ملک کا نمائندہ تسلیم کیا جاتا۔ وہ ہندوستان کی شان ہی نہیں بلکہ آبرو تھے۔ اچھی اور سچی شاعری کے دلدادگان میں وہ 'برانڈ ایمبسڈر' کی حیثیت رکھتے تھے۔

عرفان صدیقی کو اس بات کا احساس بھی دلایا گیا کہ انھوں نے کم لکھا ہے۔ حالانکہ چار شعری مجموعے، ایک دو کتابیں کسی شاعر کا مرتبہ طے کرنے یا کم از کم اس کا محاکمہ کرنے کے لیے کم تو نہیں ہوتے اور وہ بھی ایسے شاعر کے جو طرح دار بھی ہو۔ بعد میں ان کا کلیات بھی شائع ہوا۔ عرفان صدیقی اپنے قارئین اور سامعین کے دلوں میں پوری طرح گھر کر چکے تھے۔ نہ ان کی شہرت میں کمی تھی اور نہ انھوں نے اتنا کم لکھا کہ اس کا تذکرہ ہی نہ ہو۔ عرفان صدیقی پر لکھا بھی گیا اور ان پر بات بھی ہوئی۔ البتہ یہ سچ ہوسکتا ہے کہ بڑے تنقید نگاروں نے ان پر قلم نہ اٹھایا ہو یا پھر ان پر دیانت اور خلوص کے ساتھ نہ لکھا گیا ہو۔ ہمارے یہاں ایک رجحان زور پکڑ گیا ہے کہ کسی فن پارے یا کسی قلم کار سے متاثر ہو کر لکھنے میں لوگوں کو تکلف ہوتا ہے۔ اگر آپ کا مجموعہ کلام نہ آئے تو بھی لوگوں کو نہ لکھنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ خواہ آپ کتنے بھی اچھے شعر کیوں نہ کہہ رہے ہوں، آپ پر اس وقت تک قلم نہیں اٹھایا جائے گا جب تک آپ ناقدین ادب کی منت سماجت نہ کریں یا ان کی رائے کے حصول کے لیے درخواست نہ گزاریں۔

ماہنامہ 'نیا دور' [لکھنؤ] کے عرفان صدیقی نمبر (شمارہ اکتوبر-اکتوبر 2010) میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مضمون 'عرفان صدیقی کی غزل' میں بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری کے عرفان کے بعد میں انھوں نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ 'کیا ہم

لوگوں نے عرفان صدیقی کے ساتھ انصاف نہیں کیا؟'

شمس الرحمٰن فاروقی اعتراف کرتے ہیں۔ ''میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ عرفان صدیقی کے کلام کا ہزار قائل ہونے کے باوجود میں ان پر کبھی کوئی مضمون نہ لکھ سکا۔ ایک تبصرہ میں نے ضرور لکھا اور وہ تبصرہ خاصا مفصل تھا لیکن تبصرہ تو ایک ہی کتاب پر ہوتا ہے پوری شاعری کا حوالہ تبصرہ میں ممکن نہیں۔ کیا وجہ تھی کہ انھیں اور ان کے کلام کو بے حد چاہنے کے باوجود میں نے ان پر کچھ سیر حاصل لکھا نہیں...''

شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ بیان بے حد اہم ہے اور فکر کی دعوت دیتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے اسی مضمون میں عرفان صدیقی سے کیے گئے ایک انٹرویو میں نیر مسعود کے ایک سوال اور اس کے جواب کا بھی حوالہ دیا ہے۔ نیر مسعود کا سوال تھا ''عرفان صاحب آپ کے سلسلے میں بات ہوتی ہے تو ہم لوگوں کو قائم چاند پوری کا خیال آتا ہے جو میرؔ اور سوداؔ کا ہم پلّہ شاعر تھا، لیکن اسے وہ شہرت نہ مل سکی۔ آپ سے بھی جو لوگ واقف ہیں وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ سے بہتر شاعر ہندوستان، پاکستان میں موجود نہیں ہے۔ آپ سے ہم کو یہی شکایت ہے کہ آپ عرض ہنر نہیں کر رہے ہیں۔ آپ کے دو مجموعے 'کینوس' اور 'شب درمیاں' چھپے لیکن تقسیم ٹھیک سے نہیں ہوئی تو پہلے یہ بتایئے کہ یہ بے نیازی کیوں؟'' اس سوال کے جواب میں عرفان صدیقی نے کہا تھا کہ کبھی کبھی انھیں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے تعارف میں بہت بڑا ہاتھ شاید اس کی شاعری کے 'وولیوم' کا بھی ہوتا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ 'پی آر' کے تقاضے کیا ہوتے ہیں مگر یہ کہ کچھ طبیعت ادھر نہیں آتی۔

اپنے حق میں 'رابطہ عامہ' کے لیے عرفان صدیقی کو اپنے مزاج سے جنگ لڑنی پڑتی اور پھر وہ اگر دن رات اسی میں لگے رہتے تو پھر وہ کارنامے کون انجام دیتا جو عرفان صدیقی کی شناخت کا حوالہ بنے۔ انھیں اپنی منصبی ذمہ داریاں بھی تو احسن طریقے سے نبھانی تھیں۔

حکومت ہند کی مرکزی اطلاعاتی سروس جیسے اہم ادارے میں انھوں نے اہم مدارج طے کیے۔ وہ اگر اپنی شاعری کو پروجیکٹ کرنے میں لگے رہتے تو کیا اپنے فرائض منصبی کے ساتھ انصاف کر پاتے؟ کیا پھر وہ کالی داس کی نظم 'رِتو سمہارم' کا اردو میں منظوم ترجمہ اس شان کے ساتھ کر پاتے۔ کالی داس کے ڈرامے 'مالویکا اگنی متر' کا براہ راست سنسکرت سے اردو میں منظوم اور منثور ترجمہ بھی تو انہیں کا حصہ تھا۔ مراقش کے ادیب محمد شکری کے سوانحی ناول کا اردو ترجمہ عرفان صدیقی کے ہنر کی مثال ہے۔ انھوں نے ادب، صحافت اور ثقافت پر متعدد مضامین قلم بند کیے اور ریڈیو، ٹی وی کے لیے فیچر نگاری بھی ان کی مصروفیت کا حصہ بنی رہی۔

عرفان صدیقی کو جتنا پڑھا اور سمجھا گیا ہے یا ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اور اس حوالے سے جو رائے قائم ہوتی ہے، اس کی روشنی میں اگر بات کی جائے تو عرفان صدیقی جدید اردو غزل کے معماروں میں شامل ہیں۔ وہ نئی غزل کی آبرو بن گیے ہیں۔ موضوع اور اظہار کی سطح پر اردو غزل کو نیا چہرہ دینے کا جو سلسلہ مجاز، فیض، جذبی، مجروح، جان نثار اختر، مخدوم محی الدین، ناصر کاظمی اور ابن انشاء وغیرہ سے شروع ہوتا ہے، وہ زیب غوری اور بانی سے ہوتے ہوئے عرفان صدیقی تک پہنچتا ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری پر بات کرنے کے لیے ناسخ و آتش کے لہجے اور انیس و دبیر کے آہنگ سے واقفیت ضروری سمجھی گئی ہے۔ متقدمین سے استفادے کو سمجھ دار اور بیدار چشم شعرا کی خصوصیت مانا جاتا ہے۔ اپنے پیش رو اساتذہ فن سے فیض اٹھاتے ہوئے موضوع کو وسعت اور اظہار کو ندرت بخش کر ہی کسی طرز کو پایا جا سکتا ہے۔ عرفان صدیقی نے اس نکتہ پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو تازہ کار بنائے رکھا۔ اپنے عصر کی سچائیوں سے باخبری کے ساتھ ساتھ اساطیر، تاریخ، تہذیب اور ثقافت سے واقفیت ان کے کلام کو آفاقیت عطا کرتی ہے۔ مزاج کی درویشی اور طبیعت کی تمکنت ان کی شاعری کو قلندری سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ عشق کا صحت منداور باوقار تصور، غزل کو عرفان صدیقی کی دین

ہے۔عرفان صدیقی کی غزلوں میں ان کا عصر اس طرح بولتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی آواز بن گئے ہیں۔

فکر کی سنجیدگی، لہجے کا وقار، زبان کا انفراد، اسلوب کی تازہ کاری، کلام کا رچاؤ، احساس کی شدت، اشعار کی تہہ داری، جذبات کی وارفتگی، اظہار کا بانکپن، ذہن کا اختراع، ابہام سے پاک رمزیت، روشن علامتیں، خوش رنگ تشبیہات، جدید ترلفظیات، خود کلامی کی لذّت، تحیّر آمیز شعری فضا۔۔۔ اور، اور بھی بہت کچھ۔۔۔۔۔ جس سے ان کا تخلیقی شناخت نامہ وجود پذیر ہوتا ہے۔

کسی شاعر کے یہاں بیک وقت اتنی خوبیاں اسے اپنے عہد کا بڑا شاعر بنانے کے لیے بہت ہیں۔عرفان صدیقی کی شاعری کی ایک اور بڑی اور امتیازی خوبی کربلا کا موضوع ہے۔ جو اپنے آپ میں ایک مکمل باب ہے۔انھوں نے تخلیقی استعارہ کے طور پر سانحۂ کربلا کو جس انداز سے استعمال کیا ہے وہ مثالی ہے۔کربلا کے استعارے سے انھوں نے بقول شخصے احتجاج کے ساتھ ساتھ جبر کے حالات میں زندگی کرنے کا کام لیا ہے جہاں ان کا ذاتی احساس خارجی دنیا کی آواز بن کر ابھرتا ہے۔بطور استعارہ کربلا کے استعمال کے سلسلے میں اکثر ان کا نام افتخار عارف اور منیر نیازی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔یہاں شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ خیال بھی قابل ذکر ہے کہ 'عرفان صدیقی کو اس بات سے بھی نقصان ہوا کہ کچھ لوگوں نے انھیں افتخار عارف کے مقابلے میں قائم کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ دونوں نے کربلا کے استعارے کو بہت خوبی سے برتا ہے۔اس قصے کو آگے بڑھانے کے لیے ہمیں وقار ناصری کا یہ قول بھی دیکھنا ہوگا کہ 'کربلا کے استعارے سے تخلیق عرفان حاصل کرنا تو انھوں نے اس وقت شروع کر دیا تھا جب افتخار عارف کا آوازہ بھی نہ تھا لیکن لوگوں نے بر بنائے مصلحت یا کسی اور وجہ سے اس حقیقت سے چشم پوشی کی۔اس بات کا انھیں ملال بھی تھا مگر انھوں نے کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔۔۔'

ان دونوں بیانات کی روشنی میں یہ تو کہنا ہی پڑے گا جوڑ گھٹا میں کہیں نہ کہیں کوئی چوک تو ضرور ہوئی ہے۔ اور اس سوال کو نئے سرے سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال اور بھی ہیں۔۔۔۔۔۔

عرفان صدیقی کو 'شب خون' میں خوب جگہ ملی، لیکن جدید شعری رویوں کے علم برداروں نے انھیں اپنی صف میں جگہ نہیں دی۔ ان کی شاعری میں لوگوں کو تازگی کا احساس ہوا لیکن نئی شاعری پر لکھی گئی بہت سی کتابوں میں ان کا تذکرہ تک نہیں ہے۔۔۔۔۔

اس کے باوجود عرفان صدیقی کی شاعری چیخ چیخ کر، پورے دبدبے اور طنطنے کے ساتھ اپنے وجود کا احساس کرا رہی ہے۔ ان کے لہجے کا اتباع ہو رہا ہے۔ وہ عرضِ ہنر کیے بغیر زندہ ہیں۔ ان کا ہنر ان کے لیے آبِ حیات بن گیا ہے۔ کیا عرفان صدیقی کو اب بھی کسی سند کی ضرورت ہے؟

(2015)

خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

.................جاوید رحمانی (نئی دہلی)

عرفان صدیقی جدید غزل گویوں میں منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی آواز دور سے پہچانی جا سکتی ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک ان کی شاعری میں کربلا کو عصری معنویت عطا کرنے کا میلان بڑی اہمیت رکھتا ہے تو کچھ لوگ ان کی شاعری کو عشق کی تفسیر سمجھتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں رویے ان کی شاعری میں بہت واضح ہیں۔ کربلا اور واقعات کربلا کو عصری معنویت عطا کرنے کے میلان کے سلسلے میں انھوں نے خود بھی کہا ہے:

''جب سے میں نے لکھنا شروع کیا ہے، مجھے یہ موضوع بہت اہم لگا ہے... مظلوم کے ردعمل کے سلسلے میں نیر صاحب ایقان کا حصہ جو بات بن چکی ہے وہ یہ ہے کہ مزاحمت کسی نہ کسی سطح پر ضروری ہے وہ مزاحمت عمل سے بھی ہو سکتی ہے اور وہ مزاحمت محض خیال اور عقیدہ سے بھی ہو سکتی ہے''۔

جدید غزل گویوں میں افتخار عارف اور عرفان صدیقی نے اگرچہ خصوصیت کے ساتھ کربلا کے تاریخی واقعے کو عصری معنویت عطا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں کچھ بہت خوبصورت اشعار دیے ہیں، لیکن یہ اردو غزل کو محمد علی جوہر کا فیضان ہے۔ محمد علی جوہر کے بعد کئی غزل گویوں نے اس میدان میں قدم رکھا جن میں سید سلیمان ندوی، جمیل مظہری، شکیب جلالی، شہرت بخاری، افتخار عارف اور عرفان صدیقی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

عرفان صدیقی کی عشقیہ شاعری بھی عشق کی تفسیر محض نہیں اوراس میں یکسانیت بھی نہیں۔ یہ عشق کی ہی طرح رنگارنگ ہے اوراپنی تہہ درتہہ کیفیات کی بناپر تعبیر کی کثرت کا تقاضا کرتی ہے، انھوں نے کہاہے:

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتاہے استعارہ کوئی

اسی خیال کوشجاع خاور نے بھی اپنے مخصوص انداز میں شعر کا پیرایہ عطا کیاہے، ان کا شعر ہے:

کیا ہوگئی حالت مرے انداز بیاں کی
اک اس کا سراپا ہے کہ بس میں نہیں آتا

عرفان صدیقی اور شجاع خاور کا بنیادی مسئلہ ان اشعار میں ایک ہی ہے کہ معشوق کی بوقلموں شخصیت دائرۂ اظہار میں نہیں آتی اوراس کی وجہ معشوق کی بوقلمونی ہی نہیں بلکہ اظہار کی نارسائی بھی ہے۔ مگراس مسئلے کا بیان دونوں کے یہاں جن مختلف اسالیب میں ہواہے، وہ ان دونوں کی مختلف شخصیات کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ عرفان صدیقی استعارے کی تلاش میں سرگرداں ضرور ہیں، مگراپنے انداز بیان کی متانت کا پاس اس حدتک رکھتے ہیں کہ اس کی تبدیلی انھیں گوارہ نہیں اوراظہار کی نارسی سے ہار بھی نہیں مانتے۔ اظہار کی نارسی کے احساس کی سطح پر ان کے شعری مملکت کی سرحدیں غالب سے جاملتی ہیں۔ ہماری کلاسیکی شاعری میں غالب ہی وہ شاعر ہیں جنھوں نے اس مضمون کوبکثرت باندھاہے:

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کورسا باندھتے ہیں

یہاں یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عرفان صدیقی مصحفی کے بہت قائل تھے جس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یوں کیاہے، وہ کہتے ہیں: ''مصحفی کا دھارا بن سکتا

تھا اگر میر نہ ہوتے۔ میر کا وجود خارج کر دیجیے آپ اردو شاعری سے تو مصحفی کا دھارا بہت بڑا دھارا بنتا ہے۔ لیکن ایسا تو ہے نہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ میر کا چربہ ہوں''۔

اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں: ''غالب کے ذہن کی پیچیدگی، زبردست پیچیدہ ذہن، عجیب وغریب! لیکن میر کہیں کہیں مجھے لگتا ہے کہ اس سے زیادہ پیچیدہ ذہن کا شاعر ہے۔ سمجھ میں اب تک نہیں آتا کہ.... اگر گروہ ہو سکتے ہیں شاعری میں تو میں میر کے گروہ کا شاعر ہوں یا غالب کے''۔

عرفان صدیقی کی عشقیہ شاعری انھیں مصحفی سے زیادہ قریب پہنچا دیتی ہے جو اگرچہ ہیں میر ہی کے سلسلے کے شاعر، مگر میر کا چربہ محض نہیں ہیں۔ مصحفی کے سلسلے میں شمس الحق عثمانی نے لکھا ہے: ''مصحفی خود کو جن گزشتگان کی یادگار کہتے ہیں ان میں ظاہر ہے کہ نمایاں ترین شعرا: میر تقی میر، خواجہ میر درد اور سودا ہیں۔ ان ہی کے طرز شعر نے بقول مجنوں صاحب پورے دور کو خالص تغزل یعنی داخلیت (Subjectivism) کا دور بنا دیا تھا۔ مذکورہ داخلیت کا ازلی سرنامہ عشق ہے جو ہزار شیوہ ہے۔''

اسی بت ہزار شیوہ کی جلوہ گری قدم قدم پر عرفان صدیقی کی شاعری میں ملتی ہے اور اس کے بیان میں وہ اپنے تخلیقی لہجہ کا اس حد تک خیال رکھتے ہیں کہ گجرات کے فسادات پر انھوں نے جو غزل کہی اس میں بھی برہنہ گفتاری کا شکار نہیں ہوئے۔ حالانکہ ایسے انسانیت سوز المیے پر کسی بھی فنکار کا برہنہ گفتاری سے پرہیز کر پانا اتنا آسان نہیں تھا۔ ان کی وہ مشہور غزل ہے:

حق فتحیاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا
تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا

ان کو بیان پر جو حیرت انگیز قدرت حاصل تھی اس کا اظہار انہی لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

ہم لفظ سے مضمون اٹھالاتے ہیں جیسے
مٹی سے کوئی گوہر یک دانہ اٹھالے

عشق ان کے ہاں ایک بنیادی قدر ہے۔ وہ میر کی ہی طرح اس جہان رنگ و بو کے تمام اجزا کو عشق کے نور سے روشن دیکھتے ہیں۔ میر نے کہا تھا:

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق
حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق
عشق سے جا کوئی نہیں خالی
دل سے لے عرش تک بھرا ہے عشق

جس طرح میر کی دنیا میں عشق کی حکم رانی ہے اسی طرح عرفان صدیقی کی شاعری بھی اسی عشق کے واسطے سے دنیا کو دیکھتی ہے۔ عشق ان کا وظیفۂ حیات ہے اور ان کی نظر میں گرفت ثابت و سیار میں جو کچھ ہے وہ اسی جذبے کے تابع ہے۔ کربلا کے واقعات سے ان کے خصوصی شغف کی تہہ میں بھی یہی جذبۂ عشق کارفرما ہے۔ وہ شہدائے کربلا کی قربانیوں کو بھی اپنے مقصد سے ان کے عشق کے تناظر میں ہی دیکھتے ہیں اور حق و باطل کے تصادم کا سب سے طاقت ور استعارہ تصور کرتے ہیں:

اور کچھ دامن دل کشادہ کرو، دوستو، شکر نعمت زیادہ کرو
پیڑ، دریا، ہوا، روشنی، عورتیں، خوشبوئیں سب خدا کے خزانوں میں ہیں

غرض کہ ثابت و سیار کے درمیان کچھ بھی نہیں جو ان کے عشق کی جولان گاہ سے باہر ہو:

تیرے تن کے بہت رنگ ہیں جان من، اور نہاں دل کے نیرنگ خانوں میں ہیں
لامسہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ، باصرہ سب مرے رازدانوں میں ہیں

ہم سے وہ جان سخن ربط نوا چاہتی ہے
چاند ہے اور چراغوں سے ضیا چاہتی ہے
ہم نے ان لفظوں کے پیچھے ہی چھپایا ہے تجھے
اورانھیں سے تیری تصویر بنا چاہتی ہے

اور وہ لفظوں کی اس کارستانی پر شرمندہ نہیں ہوتے بلکہ یہ کہتے ہیں:

ایک ہی رنگ ترے اسم دلآویز کا رنگ
اور میرے ورق سادہ میں کیا رکھا ہے
کھلا کہ تیرا ہی پیکر مثال صورت سنگ
چھپا ہوا تھا مری شاعری میں پہلے سے
کہاں سے آتے ہیں یہ گھر اجالتے ہوئے لفظ
چھپا ہے کیا مری مٹی میں ماہ پارہ کوئی
گماں نہ کر کہ ہوا ختم کار دل زدگاں
عجب نہیں کہ ہو اس راکھ میں شرارہ کوئی

اور کار دل زدگاں کے ختم نہ ہونے کا یہ بلیغ اظہار بھی ملاحظہ فرمائیں:

آخر شب ہوئی آغاز کہانی اپنی
ہم نے پایا بھی تو اک عمر گنوا کر اس کو

یا یہ شعر:

شہاب چہرہ کوئی گم شدہ ستارہ کوئی
ہوا طلوع افق پر مرے دوبارہ کوئی

وہ بدن اور تقاضائے بدن کے اظہار پر شرمندہ نہیں ہوتے اگرچہ اسی کے اظہار کو سب کچھ سمجھتے

ہوں ایسا بھی نہیں:

روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

بدن میں جیسے لہوتازیانہ ہوگیا ہے
اسے گلے سے لگائے زمانہ ہوگیا ہے

مرے بدن سے پھر آئی گئے دنوں کی مہک
اگر چہ موسم برگ وثمر چلا بھی گیا

سیر بھی جسم کے صحرا کی خوش آتی ہے مگر
دیر تک خاک اڑانا بھی نہیں چاہتا ہے

وہ جاگنا مری خاک بدن میں نغموں کا
کسی کی انگلیوں کا نے نواز ہوجانا

بدن کے دونوں کناروں سے جل رہا ہوں میں
کہ چھورہا ہوں تجھے اور پگھل رہا ہوں میں

خیال میں ترا کھلنا مثال بند قبا
مگر گرفت میں آنا تو راز ہوجانا

ان تمام اشعار سے ظاہر ہے کہ ان کا عشق بدن کی تہذیب سے عاری نہیں اور ان لطیف احساسات اور ہوسناکی کے درمیان جو باریک سا فرق ہے اس کو وہ ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔اسی لیے ان اشعار میں ابتذال کا شائبہ تک نہیں۔ان کا عشق بدنیت سے گریزاں نہیں اور خوف زدہ بھی نہیں:

ایک دن اس لمس کے اسرار کھلنا جسم پر
ایک شب اس خاک میں برق وشرر کا جاگنا

ان تمام اشعار کی اساس جس تجربے پر رکھی گئی ہے،اس کے بیان میں بالعموم شعرا رکاکت وابتذال

کے الزام سے دوچار ہوتے رہے ہیں، مگر عرفان صدیقی اس تجربے کے شائستہ بیان پر حیرت انگیز قدرت رکھتے ہیں اوران کی شاعری کا غالب میلان استعارہ سازی کی طرف ہے۔اسی وصف خاص نے ان کی عشقیہ شاعری کو وہ فکری دبازت عطا کی ہے کہ وہ اکہری اور عارضی نہیں بلکہ زندگی کی طرح وسیع ،تہہ در تہہ اور بوقلموں ہوگئی ہے۔ان اشعار کا اردو غزل میں موجود معاملہ بندی کی روایت سے کوئی علاقہ نہیں۔مشرقی شعریات میں استعارے کو بہت اہمیت حاصل ہے اور ہمیشہ سے رہی ہے ۔ہمارے زمانے میں جولوگ استعارے کے سلسلے میں محمد حسن عسکری کا ''انشائیہ'' پڑھ کر حالی اور شبلی کو بزعم خود استعارے کی اہمیت کا سبق پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں ان کو یہ پتا ہی نہیں کہ استعارے کی اہمیت مغربی نظریہ سازوں پر ہم سے روشن ہوئی ہے۔ابن معتز نے ،جس کو علم بدیع کا مدون اول تسلیم کیا جاتا ہے،اپنی کتاب ''البدیع'' 274ھ مطابق 887ء میں اس جدید مکتب فکر کی ،جس کی تشریح وتوضیح کے لیے وہ یہ کتاب لکھ رہا تھا، تین بنیادوں کا ذکر کیا تھا جن میں پہلی یہ تھی کہ استعارہ شعر کی بنیاد ہے۔مغربی نظریہ سازوں نے تو بہت بعد میں یہ سبق ہمارے ہی نظریہ سازوں سے پڑھا۔مگر ہمارے کچھ نوجوان محمد حسن عسکری، سلیم احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی کی انگلی پکڑ کر ان مغربی نظریہ سازوں کے حوالے سے حالی اور شبلی کو یہ سبق پڑھانا چاہتے ہیں یہ جانے بغیر کہ حالی، محمد حسین آزاد اور شبلی کی رگوں میں خون کی طرح ابن معتز ،ابن سلام، جاحظ،قدامہ بن جعفر اور عبدالقاہر جرجانی کے نظریات دوڑ رہے تھے! عرفان صدیقی کی شاعری کا استعارہ سازی کی طرف میلان یہ بتاتا ہے کہ وہ مشرقی شعریات سے گہری اور عالمانہ واقفیت رکھتے تھے۔

عرفان صدیقی کا عشق عجز کے احساس سے عاری ہے:

دل اگر لہر میں آئے تو اڑا کر لے جائے
عشق میں شکوہ بے بال وپری آخر کیوں

ان کے عشق میں کہیں کہیں تو مجازی اور حقیقی کی تقسیم بہت واضح ہے مگر کہیں کہیں یہ تقسیم اس حد

تک غیر واضح ہے کہ ان کے اشعار کو حقیقی اور مجازی کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

ان کو متضاد کیفیات و اشیا نیز الفاظ کے تقابل سے بھی بہت شغف ہے اور اس کی مدد سے ان کے اشعار قاری کے ذہن کو دیر تک اور دور تک متحرک رکھتے ہیں۔ ان سے کبھی تو کسی ایسی فضا کی تعمیر میں مدد لیتے ہیں جو ان دونوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی حالات کی ستم ظریفی کا اظہار مقصود ہوتا ہے:

الٹ گیا ہے ہر اک سلسلہ نشانے پر
چراغ گھات میں ہے اور ہوا نشانے پر

چراغ کا استعاراتی استعمال ان کی شاعری میں بہت ہوا ہے اور بہت خوبصورت اور بامعنی ڈھنگ سے۔ متذکرہ بالا شعر میں چراغ گھات میں ہے اور ہوا نشانے پر سے حالات کی ستم ظریفی کا جو نقشہ سامنے آتا ہے اس سے پورے نظام کی ابتری کا تصور کتنی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ عرفان صدیقی متضاد کیفیات و اشیا نیز الفاظ کے تقابل سے اکثر قول محال کی کیفیت بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ رویہ فراق کی شاعری میں بھی بہت واضح ہے۔

آج تک ان کی خدائی سے ہے انکار مجھے
میں تو اک عمر سے کافر ہوں صنم جانتے ہیں

اس شعر میں کافری کو سرمایۂ افتخار بتانے کو کچھ لوگوں نے اردو شاعری میں عرفان صدیقی کا اضافہ بتایا ہے، جو غلط ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی تو اردو اور فارسی کی ادبی روایت سے گہری واقفیت رکھتے تھے مگر ان کے ناقدین اس وصف سے محروم ہیں۔ اپنی کافری کا فخریہ اثبات اردو اور فارسی شاعری میں نیا نہیں۔ اس کا سلسلہ امیر خسرو کے 'کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست' تک پہنچتا ہے اور سودا کے یہاں بھی 'ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی'

کی شکل میں یہ رویہ بہت واضح ہے۔عرفان صدیقی نے اس شعر میں کوئی مابعد الطبیعاتی فلسفہ بیان کیا بھی نہیں ہے بلکہ خود ساختہ خداؤں کی اطاعت سے انکار کیا ہے جو اردو شاعری میں بہت عام ہے۔اس شعر کی ساری لطافت صنم جانتے ہیں کہ ٹکڑے میں پوشیدہ ہے جو خدائی اور کافر کی رعایت سے آیا ہے:

وہ حبس ہے کہ دعا کر رہے ہیں سارے چراغ
اب اس طرف کوئی موج ہوا نکل آئے

خواب میں بھی میری زنجیر سفر کا جاگنا
آنکھ کا کیا لگنا کہ اک سودائے سر کا جاگنا

وہ مزاحمت میں بہت یقین رکھتے ہیں۔یہ مزاحمت خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو:

ایک چہکار نے سناٹے کا توڑا پندار
ایک نو برگ ہنسا دشت کی ویرانی پر

دشت کی ویرانی کے پندار کو دیکھیے اور کسی نو برگ کی چہکار کو دیکھیے۔بظاہر دونوں میں کیا مقابلہ! مگر عرفان صدیقی اس چہکار میں دشت کی ویرانی سے نبرد آزما ہونے اور اس پر فتح پانے کا حوصلہ اور طاقت دیکھتے ہیں اور ایسا اس لیے ہے کہ انھوں نے ازمنۂ وسطی کی مسلم تہذیب اور اس کے کرداروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اسی کے ساتھ ہندوستانی تہذیب اور ہند اسلامی تہذیب اور اس کے نمائندے بھی ان کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔اس شعر میں ایک نو برگ کے ہنسنے کو جس طرح سناٹے کے پندار سے برسر پیکار دکھایا گیا ہے اس سے ذہن فوراً ٹیگور کے اس خیال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کے ہر نومولود بچہ اپنے ساتھ آسمان سے یہ بشارت لے کر آتا ہے کہ اس دنیا کا بنانے والا اب تک ہم سے مایوس نہیں ہوا ہے۔

انھوں نے اردو اور فارسی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور سنسکرت شعریات کا بھی اور اسی لیے

ان کے یہاں اپنی ادبی روایت کا احترام بہت ہے۔ انھوں نے عشق کو بھی ایک تہذیبی قدر کے طور پر قبول کیا اور اس کے تمام مطالبات سے عہدہ برآ بھی ہوئے اسی لیے وہ کہہ سکتے تھے کہ:

کہا تھا تم نے کہ لاتا ہے کون عشق کی تاب
سو ہم جواب تمھارے سوال ہی کے تو ہیں

ان کا رشتہ اپنے ماضی سے بہت گہرا ہے اور مستقبل سے بھی بہت امیدیں وابستہ رکھتے ہیں ۔انھیں عہد حاضر کا خرابہ پریشان بہت کرتا ہے مگر اس پریشانی میں بھی ناامیدی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے:

ایسی بے رنگ بھی شاید نہ ہو کل کی دنیا
پھول سے بچوں کے چہروں سے پتا لگتا ہے

ان کو سیاہ رات کی یورش کا گہرا احساس ہے مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں:

بجھیں چراغ مگر دل رہے سدا روشن
سیاہ رات کو خطرہ اسی کمال سے ہے

اور اس کمال کی بھرپور نمائندگی شہدائے کربلا کے کردار سے اور جذبوں سے اور قربانیوں سے ہوتی ہے۔اسی لیے وہ کردار، وہ جذبے اور وہ قربانیاں انھیں بار بار اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں:

سنو کہ بول رہا ہے یہ سر اتارا ہوا
ہمارا مرنا بھی جینے کا استعارہ ہوا

یہ استعارہ عرفان صدیقی کی شاعری کی جان ہے اور اس سے حق و باطل کے معرکے میں انسان کے کردار، اس کے فکری زاویوں اور رویوں کو اجالتے بہت سے استعارے نکلے ہیں۔

(2015)

☆☆☆

جدید غزل کا مثالی لہجہ

عمیر منظر (لکھنؤ)

جدید غزل کے اہم شعرا میں ایک نام عرفان صدیقی کا ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر غزل کی روایت کا احیا کرنے والوں میں عرفان صدیقی عمر کے اعتبار سے چھوٹے ہیں مگر زبان و بیان کے اعتبار سے انھیں برتری حاصل ہے۔ بانی، ظفر اقبال، احمد مشتاق زیب غوری اور شہر یار کی شاعری کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ان کی غزل گوئی سے حاصل جدید غزل کے امتیازات کا معتد بہ حصہ عرفان صدیقی کے کلام میں ملے گا۔ ہمارے بیشتر نقادوں نے بانی کی خوش کلامی اور لہجے کی خوش سلیقگی کی داد دی ہے۔ ظفر اقبال کی ''بے راہ روی'' احمد مشتاق کی ''کم گوئی'' اور زیب غوری کی ''پراسراریت'' سب کو معلوم ہے۔ اسے ان کی تخلیقی ہنر مندی بھی کہا جا سکتا ہے اور ان کے قارئین کے لیے عذاب و عنایت کا لمحہ بھی۔

عرفان صدیقی کی غزل نے کچھ تاخیر سے سہی مگر اپنے لیے جو جگہ بنائی ہے وہ اب تک برقرار ہے اس میں عرفان کی جادو بیانی اور کہنے کا وہ ہنر جسے بانی کی خوش سلیقگی کہا گیا ہے، کی اگلی منزل قرار دیا جا سکتا ہے۔ عرفان صدیقی کئی سطحوں پر ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ ان کا منفرد انداز بیان:

غزل تو خیر ہر اہل سخن کا جادو ہے
مگر یہ نوک پلک میرے فن کا جادو ہے

غزل کی صنف ایسی ہے کہ اگر کسی نے ایک شعر بھی اچھا کہہ دیا تو لوگ اسے فراموش نہیں کرتے ۔ایسی بے شمار مثالیں ہمارے یہاں موجود ہیں ۔آوارہ گرد اشعار کا سلسلہ بھی اسی کا مظہر ہے ۔البتہ وہ شعرا جو اپنے کلام کے انتخاب کے سبب نہیں بلکہ پورے کلام کی وجہ سے جانے جاتے ہیں عرفان صدیقی کا شمار انھیں شعرا میں کیا جاتا ہے ۔انھوں نے مذہبی استعاروں اور تلمیحات کے منفرد اور نادر استعمال سے بھی اپنے تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کیا ۔عرفان صدیقی کے کلام کو اکثر ہم کربلا کے تناظر میں دیکھتے ہیں لیکن اگر تاریخ کا حوالہ ختم کر دیا جائے تب بھی عرفان صاحب کا شعر اپنی جگہ قائم رہتا ہے ۔دراصل ان تلمیحات واستعارات سے انھوں نے شعر کو مزید پرقوت بنایا ہے۔

یہ ایک صف بھی نہیں ہے وہ ایک لشکر ہے
یہاں تو معرکہ ہوگا مقابلہ کیسا

تجھے بھی یاد ہے اے آسماں کہ پچھلے برس
مری زمین پہ گزرا ہے سانحہ کیسا

صدائے شام سر آبجو ہے کتنی دیر
یہ بازگشت بھی اے دشت ہو ہے کتنی دیر

ان اشعار کی قرآت واقعہ کربلا کے تناظر میں کی جاسکتی ۔لیکن اگر اس کو عام شعری تصورات کے پیش نظر تجزیہ وتنقید کے سان پر رکھیں تب بھی یہ اشعار کھرے اتریں گے ۔پہلے شعر سے تو معرکہ اور مقابلہ کی تعریف متعین کی جاسکتی ہے ۔عرفان صدیقی کے بارے میں جو بات عام طور پر کہی جاتی ہے وہ ان کا فنی امتیاز ہے جو انھیں خاص تخلیقی ہنرمندی کا منصب عطا کرتا ہے ۔وہ صرف الفاظ ہی منتخب نہیں کرتے بلکہ خیال کی وادی کے فاصلے بھی خاص اہتمام سے طے کرتے ہیں اور ان کا یہی اہتمام انھیں منفرد بناتا ہے ۔یہ نوک پلک جسے عرفان صدیقی نے

اپنے فن کا جادو کہا ہے محض شاعرانہ تعلّی نہیں ہے۔

عرفان صدیقی کے فن کا ایک دلآویز خا ئہ وہ بھی ہے جہاں فن کار عہد حاضر بلکہ حالات کے تناظر میں شاعری کرتا ہے۔ لیکن یہاں بھی انھوں نے اپنے فن کا وقار اور غزل کی فنی گرفت پر قابو رکھا ہے۔ اسے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ گجرات نسل کشی پر جب ان کی غزل ماہ نامہ شب خون میں شائع ہوئی تو اندازہ ہوا کہ یہ پورا سانحہ ان پر کس طرح گزرا ہے۔ اہل گجرات کے زخم کی طرح عرفان صدیقی نے بھی اسے محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اپنے وجود کا حصہ بنالیا۔ البتہ جب اظہار کا موقع آیا تو اس طرح شعر کہے کہ اردو شاعری کے لیے وجہ امتیاز بن گئے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ گجرات نسل کشی کے تناظر میں بہت سے شعر کہے گئے لیکن عرفان صدیقی کی غزل حاصل کہی جا سکتی ہے۔

حق فتح یاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا
تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا

جب حشر اسی زمیں پہ اٹھائے گئے تو پھر
برپا یہیں پہ روز جزا کیوں نہیں ہوا

وہ شعلہ ساز بھی اسی بستی کے لوگ تھے
ان کی گلی میں رقص ہوا کیوں نہیں ہوا

آخر اسی خرابے میں زندہ ہیں اور سب
یوں خاک کوئی میرے سوا کیوں نہیں ہوا

کیا جذب عشق مجھ سے زیادہ تھا غیر میں
اس کا حبیب اس سے جدا کیوں نہیں ہوا

کرتا رہا میں تیرے لیے دوستوں سے جنگ
تو میرے دشمنوں سے خفا کیوں نہیں ہوا

جو کچھ ہوا وہ کیسے ہوا جانتا ہوں میں
جو کچھ نہیں ہوا وہ بتا کیوں نہیں ہوا

یہ ایک مسلسل غزل ہے جو انشائیہ پیرایہ میں کہی گئی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ایک مضمون ''شاعری کا ابتدائی سبق'' میں انشا کو خبر سے بہتر قرار دیا ہے۔ یہ غزل ہمیں غالب کی اس غزل کی بھی یاد دلاتی ہے (ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے) سوالات اس سے کیے جا رہے جو دنیا کے معاملات کا ذمہ دار ہے یعنی خداوند قدوس۔ فنکار صورت حال پر سوال کرتا ہے کہ حق کیوں فتحیاب نہیں ہوا جبکہ تیری نصرت حق کے ساتھ ہے۔ رقیب کا حبیب اس سے جدا نہیں ہوا آخر ہمارے جذب عشق میں کیا کمی تھی۔ جن لوگوں کے ذہنوں میں گجرات کی نسل کشی تازہ تھی اور وہ بھی جو اس واقعہ کو خاص نہیں جانتے تھے ان کے لیے بھی غزل کی معنویت کسی دشواری کا سبب نہیں بنتی۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ کے اہم حادثات پر تخلیقی ہنر مندی کے جو نمایاں نقوش ثبت کیے گئے ہیں اس غزل کا شمار بھی اسی میں ہوتا ہے۔ گجرات پر پروفیسر اصغر وجاہت نے ایک افسانہ ''شاہ عالم کیمپ کی روحیں'' تحریر کیا تھا اس تناظر میں وہ بھی ایک بہت اہم فن پارہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ہند پر جو اہم تحریریں منظر عام پر آئی تھیں اس کے بعد یہی سانحہ ہے جس پر اس قدر فنی اور فکری ہنر مندی کے ساتھ کوئی تخلیقی فن پارہ وجود میں آیا ہے۔

حالات حاضرہ اور روزمرہ کے حادثات و واقعات سے عرفان صدیقی بے نیاز نہیں رہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اس طرح کے واقعات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ اور ان کی شہرت کی ایک اہم وجہ بھی یہی ہے۔ اسی سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ شہر پھونکنے والے کسی کے دوست نہیں
کسے خیال کہ تیرا مکان بیچ میں ہے

اچانک دوستو میرے وطن میں کچھ نہیں ہوتا
یہاں ہوتا ہے ہر اکؑ حادثہ آہستہ آہستہ

خرد کے پاس فرسودہ دلیلوں کے سوا کیا تھا
پرانے شہر میں ٹوٹی فصیلوں کے سوا کیا تھا

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچئے آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

اس قسم کے مزید اشعار عرفان صدیقی کے یہاں مل جائیں گے۔ان اشعار میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ بہت عام ہیں مگر ان کے کہنے کا جو اسلوب ہے وہ خاص بات ہے اور اسی نے ان اشعار کو انفرادیت عطا کی ہے۔''شہر پھونکنے والے کسی کے دوست نہیں'' برصغیر کا عام المیہ ہے۔ ہندستان میں تو آزادی کے بعد سے اب تک کا ایک طویل سلسلہ ہے اور اس میں لوگوں نے نئے نئے ہنر آزمائے ہیں۔ نیز یہ کہ یہاں اچانک کچھ نہیں ہوتا بلکہ ہر حادثہ آہستہ آہستہ ہوتا ہے یعنی اس کے پس پشت منصوبہ بند کوشش شامل ہوتی ہے۔مختلف سطحوں سے یہ بات سامنے آچکی ہے اس طرح کے عناصر ایک منظم سوچ اور منصوبہ بند کوشش کے تحت تخریبی کارروائیاں انجام دیتے ہیں ۔افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس سے بظاہر کسی فرقے کا نقصان تو ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ چیز ملک کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔اور اسی کا زیاں ہوتا ہے۔عرفان صدیقی کو حالات و واقعات کا ادراک ایک فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ صحافت سے ان کی وابستگی کے سبب بھی تھا۔ان اشعار کے ساتھ اگر عرفان صدیقی کے اس اداریے پر نظر ڈال لی جائے تو انھوں نے ۱۵، دسمبر ۲۰۰۲ کے روزنامہ صحافت (لکھنؤ ایڈیشن) میں تحریر کیا تھا۔اسی دن گجرات اسمبلی انتخابات کے نتائج کا اعلان کیا گیا تھا۔عرفان صدیقی لکھتے ہیں: ان نتائج نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب نفرت انگیزی اقلیت دشمنی، کھلے ہوئے

مظالم کو جائز قرار دینے اور انسانی قدروں کی پامالی پر پوری طرح پردہ ڈال کر اکثریتی فرقہ میں نسلی غرور اور فرقہ وارانہ نفرت کے منفی جذبات بھڑکا دیے جائیں تو ترقی و امن و اتحاد جیسے سارے معاملات پس پشت پڑ جاتے ہیں... گجرات میں بدی اور شر پسندی کا سہارا لے کر حاصل کی ہوئی یہ کامیابی فی الحال ایک مورچہ ہے جو ان طاقتوں نے جیتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا پورے ملک میں انھیں منفی بنیادوں پر سیاسی جنگ جیتی جائے گی وی ایچ پی اور دوسری جارح پریوار اور تنظیموں کے لیڈر کھل کر کہتے رہے ہیں کہ گجرات کا تجربہ کامیاب ہوا ہے اور یہی تجربہ ملک میں دوسری جگہوں پر اور آنے والے عام انتخابات میں بھی دہرایا جائے گا ۔گجرات میں تجربے کا مطلب ریاست میں بے بس مسلم اقلیت کے قتل عام کے پس منظر سے سمجھنا مشکل نہیں ہے تو گڑیا جیسے لوگ کہتے ہیں کہ ان کا اگلا پڑاو دلی ہے۔(اداریہ روزنامہ صحافت۔لکھنؤ ایڈیشن ۱۵،دسمبر ۲۰۰۲ء)

اداریے کی ان سطروں اور اشعار سے حالات کی سفاکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اداریے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی کے یہاں حالات و واقعات کے تجزیے کی صلاحت اور حالات حاضرہ کے اندر جھانک کر مستقبل کا پتہ دینے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔آج اگر وہ زندہ ہوتے تو ضرور اس اداریے کو نکالا جاتا۔شعر میں تو خیر گنجائش ہوتی ہے مگر اخباری صفحات کہاں اس کے متحمل ہوتے ہیں مگر عرفان صدیقی کا معاملہ مختلف ہے۔اداریہ اور شعر دونوں ان کے غور وفکر اور حالات پر گہری دسترس کے عکاس ہیں۔

عرفان صدیقی کی شاعری مسلسل غور وفکر اور ریاض سے عبارت ہے۔ان کے شعری مرکبات اور لفظوں کا فنکارانہ استعمال اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ بہت آسانی سے شعر کہنے کے قائل نہیں تھے ان پر خاصا غور وفکر کرتے تھے۔سید عقیل حیدر نے عرفان صدیقی کے مطلع کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:ان کے مشہور مطلع کا ایک ثانی مصرعہ" کہ نیند شرط نہیں خواب

دیکھنے کے لیے'' انھوں نے یوں ہی روانی میں ایک دن کہہ کر کسی کاغذ پر تحریر کرلیا تھا لیکن مطلع کے لیے انھوں نے مصرعہ اولی قریب چھ ماہ بعد کئی کوششوں کے بعد لگانے میں کامیابی حاصل کی ۔اس دن انھوں نے فرط مسرت سے جھومتے ہوئے میری بہن (بھنو) سے بہت اچھی چائے کی فرمائش کی اور فیملی کے ساتھ مطلع ذیل کو celebrate کیا۔

اٹھو یہ منظر شب تاب دیکھنے کے لیے
کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لیے

آج کون سا ایسا شاعر ہے جو دوسرا مصرعہ لگانے میں اتنا وقت اور اپنے آپ کو اس حد تک کھپا سکتا ہے۔(نیا دور اکتوبر نومبر ۲۰۱۰ ص:۶۳_۶۴)

جدید شعرا میں عرفان صدیقی سب سے کم عمر تھے اور احمد مشتاق، ظفر اقبال کے مقابلے میں شہرت بھی کم تھی مگر انھوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا وہ سلیقے سے انھیں اندازہ تھا کہ ہنر کی دنیا میں عرض ہنر کی اہمیت زیادہ ہوگئی ہے جو ہر شخص نہیں کر سکتا اور عرفان صدیقی جیسے لوگ تو قطعی نہیں کر سکتے ۔ان کا مشہور شعر ہے:

تم بتاتے تو سمجھتی اسے دنیا عرفان
فائدہ عرض ہنر میں تھا ہنر میں کیا تھا

شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک مضمون میں لکھا ہے: ان کے اشعار کی تہ داری ان کی لفظیات کا داستانی لیکن گہرا داخلی رنگ، ان کے تجربۂ عشق اور تجربۂ حیات کا دبدبہ اور طنطنہ یہ ایسی باتیں نہیں جن پر لفاظی اور انشاپردازی اور زور بیانی کے ذریعہ قابو پایا جاسکے ۔ (نیا دور اکتوبر نومبر ۲۰۱۰ ص:۸_۹)

عرفان صدیقی کو سمجھنے اور پڑھنے میں کل بھی یہ مشکل تھی اور آج بھی ہے ۔البتہ گزشتہ چند برسوں سے ان کی فنکارانہ صلاحیت کا از سر نو غور وفکر کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اس

سے ان کی ادبی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا، وہ انھیں کا حصہ تھا۔ انھوں نے حالات حاضرہ کو ایک ادیب کے ساتھ ساتھ ایک صحافی کی آنکھ سے بھی دیکھا۔ اور جو کچھ محسوس کیا شاعری کے پیرائے میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ انھوں نے نہ صرف شاعری میں اپنی الگ شناخت بنائی، بلکہ بطور صحافی بھی ان کا ایک اہم مقام ہے۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ عام طور سے ادیب و شاعر کو ان کی زندگی میں بہت کم سراہا جاتا ہے، جب کی وہ اس کے حقدار ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ عرفان صدیقی کے ساتھ بھی ہوا۔ جب کہ ان کی شاعری اس عہد کی نمائندہ شاعری ہے اور وہ متعدد جہات سے ہمیں مطالعہ پر مجبور کرتی ہے۔ بڑا فنکار وہی ہوتا ہے، جس کا فن پارہ دیر تک قاری کے ذہن میں باقی رہے۔ کچھ ایسا ہی کچھ عرفان صدیقی کو پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ فن کے ساتھ ساتھ تاریخی اعتبار سے بھی ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تا کہ عرفان صدیقی کے فن اور فکری ارتقا کو اس تناظر میں پرکھا اور سمجھا جا سکے۔

(2015)

عرفان صدیقی کی غزل میں کلاسیکی رنگ

.................بسمل عارفی (دہلی)

عظیم کلاسیکی روایات سے استفادہ آج بھی غزل کے لئے ناگزیر ہے جس میں حسن کا حوالہ اور جذبۂ عشق کی کیفیات کو معراج کا درجہ حاصل ہے۔ اب جبکہ غزل کی دنیا کافی وسیع اور بدل چکی ہے اور اس کے دائرۂ کار سے باہر کے تصور کئے جانے والے مضامین بھی بہ حسن و خوبی جگہ پا رہے ہیں پھر بھی غزل اپنی عظیم کلاسیکی روایات سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکی ہے اور ہو بھی نہیں سکتی۔ اول تا آخر غزل کے سرمائے کا مطالعہ کیا جائے تو سیکڑوں نادر اشعار ایسے نکل آئیں گے جو روایت کی بطن سے نکلے ہیں۔ کلاسیکی رنگ کی غزلوں میں جہاں حسن و عشق کے قصے بیان ہوتے ہیں، وہیں وصال و ہجر کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ جمالیات اور اس کی رنگینئ شباب کے ساتھ بدن اور وہ تمام عضو جو کسی حد تک اپنی طرف راغب و متوجہ کرتے ہیں، ان کا ذکر بار بار اور تفصیل سے آتا ہے۔ اس سے تلذذ کے ساتھ دلی اطمینان اور بعض اوقات روحانی سکون بھی حاصل ہوتا ہے۔ شاعر اسی دنیا کا انسان ہے تو وہ باتیں بھی اس دنیا اور دنیا میں رہنے والوں کی کرے گا۔ جذبات کی وجہ سے ترجیحات بدل جاتی ہیں اور شاید اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ شاعری دل کی زبان ہے۔ وہ جو محسوس کرتا ہے لفظوں کے سہارے قارئین و سامعین کے حوالے کر دیتا ہے۔ جذبات کی ترجمانی میں الفاظ کا بڑا دخل ہے الفاظ مناسب و موزوں نہ لا سکیں تو جذبات کی گرمی بھی کوئی کمال نہیں دکھا پاتی۔

جدید غزل گوئی کا دور جو ۱۹۵۵ کے بعد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں جدیدیت کے فروغ کی وجہ سے بغاوت لازمی سمجھی جاتی ہے، اس دور میں بھی دو ایک شعرا کو چھوڑ دیں تو باقی شعرا روایت سے دامن نہیں بچا سکے اور کلاسیکی روایات کے عمدہ اشعار ان کے یہاں موجود ہیں۔ ہاں طرز اظہار بدلا ہوا ضرور محسوس ہوگا اور کیوں نہ ہو جب جدید غزل کی بنیاد مستحکم ہو رہی ہو۔ میر تقی میر سے فیض احمد فیض تک اور ان کے بعد بھی محبت کی شاعری ہو رہی ہے اور اشعار نکل کر آ رہے ہیں تو ظاہر ہے کوئی نہ کوئی ایسی قوت ہے جو ایسی شاعری کروا رہی ہے اور جسے عوام بھی قبولیت کی سند سے نواز رہے ہیں۔ کلاسیکی غزل کے حوالے سے عرفان صدیقی کی غزلوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں۔ ''انہوں نے کلاسیکی غزل کا ایک نیا تصور قائم کیا اور ان کی غزل کو جو بے مثال قبولیت اور شہرت ملی، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری کی دوسری صنفوں کے برعکس غزل کی صنف انسانی صورت حال اور زبان و مکان کے تمام تغیرات کی پرچھائیاں سمیٹنے کے بعد بھی اپنے ورثے سے دستبردار نہ ہوگی۔ نئی غزل کا ایک قدم اپنی روایت کے سمٹتے پھیلے دائرے میں نہایت مضبوطی سے جما رہے گا۔ عرفان صاحب کی غزل میں حال اور مستقبل کے ادراک کے علاوہ اپنے ماضی کا احساس ایک دائمی قدر کے طور پر موجود ہے۔''

مذکورہ اقتباس میں پروفیسر شمیم حنفی نے عرفان صدیقی کی کلاسیکی غزلوں کے حوالے سے جس تصور کی بات کی ہے، وہ ان کے یہاں ابتدا ہی سے موجود ہے اور جو فن ''عشق نامہ'' میں کمال کو پہنچا ہے اس کی جڑیں ان کے سابقہ مجموعوں میں بھی موجود ہے۔

بھلا یہ عمر کوئی کاروبار شوق کی ہے
بس اک تلافیٔ مافات کرتا رہتا ہوں
عجب نہیں کسی کوشش میں کامراں ہو جاؤں
محبتوں کی شروعات کرتا رہتا ہوں

اس اقرار و اظہار کے باوجود کہ اب عمر کسی طرح کے کاروبار شوق کی نہیں رہی پھر بھی کسی کی تلاش میں شاعر کا سرگرداں رہنا ایک ایسی رغبت ظاہر کرتا ہے جو دل کے کسی کونے میں گھر کر چکی ہے اور یہ دبی دبی سی خواہش کبھی کبھی سر ابھارتی ہے اور پھر شاعر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر سے کاروبار شوق کی تمنا میں نکل پڑتا ہے۔ دوسرے شعر میں مزید وضاحت کے ساتھ وہی پہلو نمایاں ہوا ہے۔ اگر کوئی خواہش دبی نہیں ہے تو پھر یہ کوشش بے جا کا کیا مطلب اور محبتوں کی شروعات کیوں؟

مجھے کچھ شوق نظارہ بھی ہے پھولوں کے چہرے کا
مگر کچھ پھول چہرے میری نگرانی بھی کرتے ہیں
تو مجھے کتنے ہی چہروں میں نظر آتا ہے
کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا
تو مرے عشق کی دنیائے زیاں کا سچ ہے
کیوں کسی اور کو افسانہ سناؤں تیرا

ان اشعار میں معاملہ بندی مزید وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ پہلے شعر میں پھول جیسے چہروں کو دیکھنا اور دیکھتے رہنا ساتھ ہی یہ خدشہ بھی کہ کچھ پھول جیسے چہرے ان کی نگرانی بھی کرتے ہیں۔ غالباً عشق کی پہلی منزل کی روداد معلوم ہوتی ہے۔ جہاں عاشق کی نگاہ اپنے معشوق کی تلاش تو کرتی ہے مگر یہ بھی سوچتی ہے کہ اس کی اس حرکت پر کسی اور کی نگاہ بھی تو نہیں۔ دوسرے شعر میں عشق اپنے عروج پر نظر آتا ہے جب عاشق کو تمام صورتوں میں اپنے محبوب کی صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ سوچ کر پریشان ہوتا ہے کہ آخر وہ اسے کس نام سے پکارے۔ اس شعر کو حقیقی معنوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جب مالک حقیقی چہار طرف اپنے بندوں اور اپنے تخلیق کردہ ذرے ذرے سے نمایاں ہو تو پھر اسے کس نام سے پکارا جائے۔ آخری اور تیسرے

شعر میں متکلم اپنی عشق کی دنیا کی خبر گیری کرتا ہے، جہاں اسے نقصان کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا لیکن مگر پھر بھی وہ اپنے محبوب کی شرمندگی کا احساس کرتے ہوئے، اس افسانے کو اپنے ہی تک رکھنے کا پابند ہے کہ اس افسانہ یا اس راز کے افشا ہونے سے کسی کی رسوائی ہو سکتی ہے۔

میر تقی میر سے فیض احمد فیض اور اس کے بعد جدید تر غزل گو شعرا کی کلاسیکی غزلوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہر عہد کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی عہد کی نمائندگی کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور جن کی شاعری بھی کہیں منفرد نظر آتی ہے اس میں خیال، وسعت فکر اور جذبے کی روانی کے ساتھ الفاظ کا انتخاب بھی ضروری ہے مگر عرفان صدیقی کے یہاں معاملہ کچھ مختلف نظر آتا ہے۔ عرفان صدیقی کی غزلوں میں فارسی کے الفاظ اردو کے ساتھ اس اپنائیت کے ساتھ اشعار میں ڈھل گئے ہیں کہ اردو کے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے بسمل ہیں سو ہم دیکھتے ہیں اس کی طرف
وہ شہ چارہ گراں کس کی طرف دیکھتا ہے

ذرا سے لمس شرر نے عجب کمال کیا
میں سوچتا تھا مرے خار و خس میں کچھ بھی نہیں

تو ادھر کس کو ڈبونے کے لئے آئی تھی
دیکھ اے موج بلا خیز کنارہ ہے کہ ہم

عرفان صدیقی کی غزلوں میں جمالیات کی عکاسی اپنے پیش رو شعرا سے یوں مختلف ہے کہ موضوع کی یکسانیت کے باوجود الفاظ کی بدولت خیال کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

چھت پہ مہتاب نکلتا ہوا سرگوشی کا
اور پازیب کی جھنکار سے زینہ روشن

عبارتیں جو ستاروں پہ ہم کو لکھنا تھیں
تری جبین ستارہ نُما پہ لکھیں گے

سخت ہے مرحلۂ رزق یہ ہم جانتے ہیں
پر اسے معرکۂ عشق سے کم جانتے ہیں

پہلے شعر کے معرعہ اولیٰ میں لفظ ''سرگوشی'' نے شعر کو آفاقیت عطا کر دی ہے، کوئی عام شاعر یہ شعر کہتا تو ''سرگوشی'' کے بجائے ''خاموشی'' استعمال کرتا اور شعر سطحی نہ سہی مگر عام فہم ہو کر رہ جاتا۔ چھت پہ سرگوشی کا مہتاب نکلنے اور اس کے پازیب کی جھنکار سے زینہ کا روشن ہونا شاعر کے الفاظ برتنے کی قدرت پر دال ہے۔ پازیب کی جھنکار کی وجہ سے جو نسوانیت پیدا ہوئی ہے۔ اس نے پہلے مصرعہ سے مل کر بڑی گہرائی پیدا کر دی ہے۔ عرفان صدیقی کا یہ کمال جا بجا ان کے دوسرے شعروں میں بھی نظر آتا ہے۔ دوسرے شعر میں محبوب کی جبیں کو ''ستارہ نُما'' کہنا بھی ان ہی کا حق ہے اور اس کے بعد یہ خواہش کہ جو عبارت ہمیں ستاروں میں لکھنا تھیں وہ اس جبیں پر لکھیں گے، محبت کی ایک روشن مثال پیش کرتی ہے۔ محبوب کی جبیں کسی ستارہ سے کم تو نہیں بلکہ عاشق کے نزدیک اس ستارہ کی قیمت و اہمیت محبوب کی جبیں سے کم ہی ہے۔ تیسرے شعر میں عشق کی اس آخری منزل پر گفتگو ہو رہی ہے جو ہر عاشق کی زندگی کا آخری مقصد ہوتا ہے۔ یہاں متکلم اس پر آشوب زمانہ کی تنگ نظری کا قصہ بیان کئے بغیر ہی باور کراتا ہے کہ مرحلہ رزق دشوار ضرور ہے اور یہ کسی معرکہ سر کر لینے سے کم نہیں مگر معرکۂ عشق سے معرکۂ رزق کو کم دشوار سمجھنا عشق میں حائل دشواریوں پر سے پردہ اٹھانا ہے۔ کلاسیکی روایات کی جو شمع ''سات سماوات'' میں روشن ہوئی اس کی لو ''عشق نامہ'' میں اتنی تیز ہو گئی کہ سارا جہاں منور ہو گیا اور اس مجموعہ نے ایک ایسی روایت قائم کر دی جو سابقہ روایات کی توسیع کہلائی۔ ان کی غزلیں روایت سے جڑی ہونے کے باوجود ایک ایسا بانکپن رکھتی ہیں جو کلاسیکی ادب کے پورے

سرمائے کے بغور مطالعہ کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے"عشق نامہ"میں عشق کا تجربہ مزید وسعت کے ساتھ نظر آتا ہے جسے ان کی نمائندہ لفظیات نے اور گہرا کر دیا ہے اور اس تخلیقی استعمال نے اسے انفرادیت عطا کر دی ہے جسے ہم اپنی سہولت کے لئے اور ان کے فن کی بلندی کی قدر و منزلت کے لئے نو کلاسیکیت کا نام بھی دے سکتے ہیں۔"عشق نامہ"پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر انیس اشفاق لکھتے ہیں۔"عشق نامہ"میں ہم عشق کی ایک نئی دنیا سے متعارف ہوتے ہیں جہاں عشق کی جمالیات اپنے نئے رنگوں میں نظر آتی ہے۔اس شاعری کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشق کے موضوع کے اظہار میں عرفان صدیقی نے اپنے تمام تخلیقی سرچشموں کو تلاش کر لیا ہے۔اداسی اور محرومی کے عالم میں اس شاعری کی قرأت سے ہم حزن وملال کی فضا سے آزاد محسوس کرنے لگتے ہیں جو عشق کے ہاتھوں اٹھانا پڑتی ہے۔"عشق نامہ"کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے معاملات عشق کی شراکت کے معاملے میں عرفان صدیقی نے مکان میر کا ایک نیا دریچہ کھول دیا ہے جہاں بیٹھ کر ہم زیادہ تازگی اور زیادہ فرحت محسوس کرتے ہیں۔"

پروفیسر انیس اشفاق نے مذکورہ اقتباس میں"عشق نامہ" کی شاعری کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے اگرچہ یہ خصوصیات ان کے سابقہ مجموعوں میں بھی موجود تھیں مگر وسیع تناظر میں"عشق نامہ"ہی میں سامنے آئی ہیں اور واقعی جس فرحت کا احساس کراتی ہیں اسکی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔"عشق نامہ"میں عشق کے ہر پہلو پر اظہار خیال اور اشعار موجود ہیں یعنی عشق کی ابتدا سے اس کے آخری مرحلے تک جہاں پہنچ کر عشق، عشق نہیں رہتا خدا ہو جاتا ہے۔عشق کے ان تمام پہلوؤں پر اپنی گفتگو اور حوالے کے طور اشعار پیش کرنے سے قبل پروفیسر نیر مسعود کا اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے"عشق نامہ"کے حوالے سے لکھا ہے۔"ان شعروں میں (عشق نامہ کے شعروں میں) عشق کے بہت سے روپ نظر آتے ہیں اور ہر روپ کے اظہار میں عرفان صدیقی کا مخصوص انداز بیان نظر آتا ہے جس کی

وجہ سے واردات عشق کی شاعری میں ''عشق نامہ'' کو انفرادیت حاصل ہے''۔

پروفیسر نیز مسعود کی اس رائے کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ وہ عرفان صدیقی کے دوستوں اور ان کے مزاج شناسوں میں تھے، انہوں نے ان کے ساتھ کئی اچھی محفلیں جن میں شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی اور اسلم محمود بھی شامل رہے ہیں گزاری ہیں۔ عشقیہ غزلوں کی طرف عرفان صدیقی کو مائل کرنے والے بھی یہی لوگ ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پروفیسر نیر مسعود ''عشق نامہ'' کی اشاعت سے قبل ہی ان کی اس شاعری سے لطف اندوز ہو چکے تھے اور اپنی مثبت رائے پیش کر دی تھی۔ انھوں نے اس اقتباس میں ''عشق نامہ'' کی وہ بات کہہ دی ہے جو ''عشق نامہ'' کی اصل ہے یعنی اس میں عشق کے بہت سے روپ نظر آتے ہیں۔ آیئے اس عشق کے مختلف پہلوؤں پر اشعار کے حوالہ کے ساتھ گفتگو کریں۔ عشق کی پہلی منزل کے اشعار دیکھیں۔

ہم تعارف ہی سے دیوانے ہوئے جاتے ہیں
اور ابھی مرحلۂ کار وفا رکھا ہے

تیرے وصال سے کچھ کم نہیں امید وصال
سو ہم ہلاک ہوئے ہیں خوشی میں پہلے سے

ہوا گلاب کو چھو کر گزرتی رہتی ہے
سو میں بھی اتنا گنہ گار رہنا چاہتا ہوں

یہ تینوں اشعار عشق کی پہلی ہی منزل کے کہے جائیں گے جب متکلم کا تعارف اپنے محبوب سے ہوتا ہے اور وہ اسی تعارف کی سرشاری میں گم ہو جاتا ہے جبکہ ابھی س کے کئی پیچ و خم کا اندازہ نہیں ہوتا جو ابھی آنے والے ہیں۔ اس شعر میں متکلم کی سادگی دیکھتے بنتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے دنیا کی خبر ہی نہیں۔ دوسرے شعر میں وہی منزل ہے مگر سفر دو قدم بڑھ

چکا ہے۔ متکلم کو محبوب بے پروانے وصال کی امید دلا دی ہے اور اس امید میں وہ اتنا خوش ہے جیسے اسے وصل میسر ہو چکا ہو اور اسی خوشی میں وہ بے خود ہے۔ تیسرے شعر میں جو وصال کی امید دکھائی دیتی ہے وہ معدوم ہونے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اب وصال میسر نہ ہو پھر بے چارگی میں متکلم اپنے محبوب سے شکایت کا انداز اپناتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرح ہوا گلاب کو چھو کر گزر جاتی ہے بس اسی طرح میں بھی تمہیں چھونا چاہتا ہوں اور اگر یہ گناہ ہے تو اتنا گنہگار رہنا چاہتا ہوں۔ عشق کی بیتابی متکلم سے یہاں یہ کہلوانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ اسے چھونا گناہ سہی مگر چھونا، اس کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ اس شعر میں جذبے کی روانی تھوڑی مدھم ضرور ہے مگر چنگاری بالکل بجھی نہیں ہے۔ کچھ اشعار اور دیکھیں۔

کیا کیا طور اسے آتے ہیں دل کو شکیبا رکھنے کے
لغزش پہ ناراض نہ ہو اور خواہش نا منظور کرے

تم تو سچے ہو مگر دل کا بھروسہ کچھ نہیں
بجھ نہ جائے یہ چراغ انتظار اگلے برس

ہم کو تو دلبر خوب ملا پر اپنی اپنی قسمت ہے
پھر بھی جو کوئی رنج اٹھانا چاہے عشق ضرور کرے

کہا تھا تم نے کہ لاتا ہے کون عشق کی تاب
سو ہم جواب تمہارے سوال ہی کے تو ہیں

ان چاروں اشعار میں عشق کی بے تابی اور شکوہ کا انداز موجود ہے۔ پہلے شعر میں متکلم اپنے محبوب کے انداز کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے صبر و تحمل سے کام لینے پر آمادہ کرنے کے کیسے کیسے طریقے معلوم ہیں۔ ایک انداز تو اس کا یہی نرالہ ہے کی لغزش پہ ناراض نہ ہو اگر اس کے عاشق کا ہاتھ، ہاتھ ہی سہی اس کے جسم کے کسی حصہ سے مس ہو جاتا

ہے تو وہ بظاہر ناراض نہیں ہوتا۔ یہاں ناراض نا ہونا دو باتیں ظاہر کرتا ہے۔ایک تو یہ کہ اسے اتنی چھوٹ دے رکھی ہے اور بیتاب دل کے لیے اتنی راحت کا سامان لازمی ہے اور دوسری یہ کہ اگر اسے اتنی بھی چھوٹ نہ دی جائے تو وہ خود ہی ناراض ہوکر چلا جائے گا اور پھر اسے بھی تو اس لغزش سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔دوسری بات یہ کہ جب وہ لغزش پر ناراض بھی نہیں ہوتا تو پھر خواہش کیوں نا منظور کر دیتا ہے۔اس شعر میں محبوب کے انداز کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے۔دوسرے شعر میں بڑی سادگی سے متکلم اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہوے کہتا ہے کہ تم تو سچے ہو اور تمہارے وعدے پر مجھے کامل یقین بھی ہے کہ تم وعدہ وفا کروگے مگر اس بیماریٔ دل کا کوئی بھروسہ نہیں۔کہیں یہ انتظار کرتے کرتے بجھ نہ جائے۔ یہاں دل کے لیے چراغ کہ تشبیہ بڑی معنی خیز ہے جو ''اگلے برس'' کے ٹکڑے کے ساتھ مزید پر معنی ہوگئی ہے۔تیسرے شعر میں شاعر نے بڑی عمدہ فضابندی کی ہے کہ ہم کو تو جو محبوب ملا ہے، وہ خوب ہے مگر یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے کہ کسے کب، کون اور کیسا مل جائے پھر بھی جو رنج والم اٹھانا چاہے عشق ضرور کرے، اس ٹکڑے سے اتنی وضاحت تو ہوجاتی ہے کہ عشق میں رنج اٹھانا ہی پڑتا ہے۔اسی شعر میں شاعر نے بڑی خوبصورتی سے اپنی اپنی قسمت کا ٹکڑا پیش کر کے یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا کہ متکلم کو جو محبوب ملا ہے وہ کیسا ہے اور اس سے مل کر وہ مایوسی و رنج کے عالم میں ہے یا فرحت کے لمحات گزار رہا ہے۔اس ٹکڑے کی وجہ سے اس سچائی پر پردہ ڈال دیا گیا ہے اور جس کی وجہ سے شعر بلند ہوگیا ہے۔یہاں شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے محبت کرنے والوں کو انجام کی فکر یاد دلا کر خبردار بھی کیا ہے اور چاہت کی اس منزل کی طرف بڑھنے والوں کیلئے حوصلہ افزائی کا راستہ بھی کھلا رکھا ہے۔چوتھے شعر کی ابتدا ہی سوالیہ ہے۔''کہا تھا تم نے'' اس ٹکرے نے سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔عشق کی تاب کے یہاں معنی یہاں گرمی، حرارت اور پیچ وخم لیے جاسکتے ہیں اور ان تینوں معنوں ہی پر اکتفا کیا جائے

تو عشق کی تاب لانے کا حوصلہ ہر کس و ناکس میں نہیں ہو سکتا، عشق کی تاب میں جلنا کسی عام آدمی کے جگر کی بات نہیں یہ کارنامہ تو وہی انجام دے سکتا ہے جو زمانہ کے سرد و گرم سے اوپر اٹھ چکا ہو یا پھر جس کے سر میں سودا ہو۔ کیونکہ آگ اندر اندر تو سلگاتی ہے مگر باہر سے کچھ نظر نہیں آتا اور جلن کی تکلیف کسی سے بیان کرنے سے بھی وہ قاصر رہتا ہے، دوسرے مصرع میں بے بسی کی طرف اشارہ ہے۔ عرفان صدیقی کلاسیکی روایت کا بھرپور ادراک رکھتے تھے جو انہیں غزل کی تہہ داری برقرار رکھنے اور تہذیب و ثقافت سے جڑے رہنے میں معاونت کرتی تھی۔ انھوں نے کلاسیکی روایات کا بھرپور مطالعہ بھی کیا تھا اور جس کی وجہ سے انہیں بڑی آسانی کے ساتھ خوش آہنگی بھی ہاتھ آ گئی۔ عرفان صدیقی کے یہاں جو ہمواری دیکھنے کو ملتی ہے اور واردات عشق کی ترجمانی کرتے وقت جو دھیمہ لہجہ وہ استعمال کرتے ہیں، وہ ان کی کامیابی کی پہلی شرط ہے۔

امیدواروں پہ کھلتا نہیں وہ باب وصال
اور اس کے شہر سے کرتا نہیں کنارہ کوئی

بیس اکیس برس پیچھے ہمیں کب تک ملتے رہنا ہے
دیکھو اب کی بار ملو تو دل کی بات بتا دینا

کیا جھلکتا ہے یہ جاناں تری خاموشی میں
حرف اقرار تو کہتا بھی نہیں تو ہم سے

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ عرفان صدیقی نے اپنی غزلوں میں عمومی لہجہ جو اختیار کیا ہے وہ سادہ ہے، یہاں سادہ کا مطلب سپاٹ نہیں، انہوں نے جس سادگی اور اپنائیت سے واردات عشق کی ترجمانی کی ہے اور عاشق و معشوق کے اسرار و رموز بیان کئے ہیں وہ بعض اوقات ہمدردانہ لہجہ اختیار کر گیا ہے۔ پہلے اور تیسرے شعر میں وہی سادگی اور ہمدردی دکھائی

دیتی ہے۔ معشوق سے وصال کی تمنا لیے امیدواروں کی ایک لمبی قطار موجود ہے اور کسی کے نام سے بھی معاملہ کھل نہیں رہا ہے اور انتظار میں لوگ اس شہر سے جاتے بھی نہیں کہ کب کس کے نام قرعہ نکل آئے۔ تیسرے شعر میں ''خاموشی'' نے شعر کو عام فہم ہونے سے بچالیا ہے اور اس ایک لفظ نے وہ معنویت پیدا کردی ہے جو کسی دوسرے لفظ کی بدولت نہیں حاصل کی جاسکتی تھی ۔تبھی تو کہا جاتا ہے کہ عرفان صدیقی کے پاس لفظ شناسی کا جو ہنر تھا وہ کم سے کم ان کے ہم عصروں میں کسی اور کے پاس نہیں تھا۔اشعار دیکھیں

عشق میں ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے لیکن
کم سے کم معرکہ جاں میں نہ ہاریں گے تجھے

ہم نے کیا کیا تجھے چاہا ہے انہیں کیا معلوم
لوگ ابھی کل سے ترے چاہنے والے ہوئے ہیں

پہلے شعر میں عاشق کا دعویٰ دیکھیں، عشق میں جرات وجواں مردی کا دعویٰ کرنے والوں کی کمی نہیں۔ محبوب کی خاطر ستارہ توڑ لانے کی بات تو عام ہو چکی ہے۔ ہر کس وناکس اس ناممکن امر پر آمادہ نظر آتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ستارہ توڑ لانے کی نوبت نہیں آتی اور اس کا محبوب اس کی سادگی پر مسکرادیتا ہے اور جذبے کی گرمی کو محسوس کرتے ہوئے اسے اپنے حسن کا جلوہ بھی دکھادیتا ہے مگر اس شعر میں عاشق نے جو دعویٰ کیا ہے وہ محض ستارہ توڑنے کا نہیں بلکہ اپنی جان عزیز پر کھیل جانے کا ہے۔لیکن اس کی معصومیت تو دیکھیے، وہ کہتا ہے کہ عشق میں ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے لیکن اگر معرکہ جاں سے گزر کر بھی تمہیں پانا ہو تو اس میں بھی قدم پیچھے نہیں ہوں گے۔اس شعر میں 'کم سے کم' کے ٹکڑے نے وہ معنویت پیدا کردی ہے جو عرفان صدیقی کا خاصہ ہے، میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ عرفان صدیقی اپنے بیشتر اشعار میں دو یا تین لفظوں کا ایک ایسا ٹکڑا بطور اہتمام پیش کرتے ہیں جو شعر کی معنویت بڑھادیتی ہے۔ یہاں

بھی ''کم سے کم'' کا ٹکڑا معنی کے پر کھول دیتا ہے یعنی عاشق کے لیے جان کی بازی بھی کم سے کم ہے اور وہ اس معرکہ جاں سے گزر کر بھی اپنے محبوب کو حاصل کر سکتا ہے۔ دوسرے شعر میں عشق کی ایک ایسی ہی منزل کو پیش کیا گیا ہے اور اس کے مصرعہ اولی میں بھی ایک اسی طرح کا ٹکڑا ''ہم نے کیا کیا'' ملاحظہ کریں۔ اس کیا کیا نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ حالانکہ اس شعر میں سارے الفاظ سادہ اور عام بول چال کے ہیں مگر اس کیا کیا، نے جو فضا بندی کی ہے، وہ بہت ہی قابل ستائش ہے۔ متکلم اپنے مخاطب سے کہتا ہے کہ ہم نے کیا کیا تجھے چاہا ہے انہیں یعنی دنیا اور دنیا والوں کو کیا معلوم، یہ دنیا اور دنیا والے تو ابھی کل سے تیرے چاہنے والے بنے ہیں۔ مصرعہ ثانی میں ''کل سے'' کا استعمال بھی قارئین کو ماضی کی طرف لے جاتا ہے یعنی متکلم ایک عرصہ سے اپنے محبوب کو چاہ رہا ہے اور یہ دنیا کل سے اپنی چاہت کا اظہار کر کے اس پر بر تری چاہ رہی ہے۔ کیا عشق میں یونہی برتری حاصل ہو جاتی ہے اور محبوب کا نیاز اور وصل حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں عاشق نے پورے معاملے کو پر اسرار بنا رکھا ہے کہ وہ اپنے محبوب کو ''کیا کیا'' چاہ رہا ہے، یہاں ''کیا کیا'' کی وضاحت نہیں کی گئی ہے اور اس ''کیا کیا'' کے معنی یہاں بہت کچھ یا سب کچھ لیا جا سکتا ہے۔ اب اس شعر میں جذبے کی حرارت کو محسوس کریں تو شعر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

عرفان صدیقی نے ''عشق نامہ'' میں جن کلاسیکی روایات و جمالیات کی عکاسی شعروں کے حوالے سے کی ہے، وہ انہیں کئی حیثیتوں سے منفرد کرتی ہے۔ انہوں نے کلاسیکی روایات کی جو اپنے یہاں بنیاد رکھی ہے جسے کچھ لوگ نو کلاسیکیت کا نام بھی دے رہے ہیں، ان میں خیال کے ساتھ لفظوں کی بڑی اہمیت ہے۔ عرفان صدیقی کے یہاں نئی لفظیات نہ کے برابر ہیں۔ انہوں نے روایتی الفاظ کو اس فنکارہ حسن کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ بے روح الفاظ میں بھی جان ڈال دی ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب شاعر الفاظ کے تخلیقی استعمال کے ہنر

سے واقف ہواور یہ فن اگر اسے آتا ہے تو پرانے الفاظ بھی نئے ہو جاتے ہیں۔ ان کے کچھ مخصوص الفاظ دیکھیں جو ان کی غزلوں میں بار بار اور الگ الگ معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ بظاہر یہ سارے الفاظ وہ ہیں جو جدید غزل گو شعرا کے یہاں نہ کہ برابر ہیں لیکن مگر عرفان صدیقی نے ان لفظوں کو اپنے یہاں برت کر پھر سے انہیں زندہ کر دیا ہے۔ ان کے کچھ مخصوص الفاظ وتراکیب ملاحظہ کریں۔

گمشدگاں، کشتگاں، دل زدگاں، شاخ شجر، موج خوں، لہو، نوک نیزہ، تیر، تیغ، سپر، ابدال، سلوک، ارزانی، نواح، قریہ، حرف زن، نگارندہ، مصاف دار، نسیم رسی، طرفہ، معمورہ، کوچہ گرد، اخی، منعم، رہوار، مملکت، خاک، ناقہ، برگ وثمر، شاخ تعلق، طلسمات، انجمن، صحرا، حجاب، پیرہن، وحشی، خیمہ، طناب، بدن، جسم، مشک، خوشبو، صدا، گلزار، قیامت، دیوار ودر، زوال، سرخ، ہرن، روح، بیاباں، ارزاں، افسردگاں، جنون، مژگاں، کشکول، لشکر، محشر، مٹی، فغاں، پیادگاں، کج کلاہ، نیزہ، غزال، آزردگاں، خیمۂ شب، فانوس، ناقہ سوار، شاخ تعلق کی بہار، دیدہ تر، شہر طلسمات، چراغ انجمن، بدر منیر، وعدۂ فردا، گم گشتہ، شام زوال، نخل مراد، شمشاد قداں، خوش آثار، پیمانۂ لب، سر آشوب، کاسۂ لب، دست غائبانہ، مسافت ہجر، طلوع سحر، شام زمستاں، دشت غزالاں، شاہ بانوئے شہر، فضائے شعری، خوش نظری، شوریدہ سری، دشت ہجراں، سیارہ شکار، منصب دار، ستارہ جبیں، چشم اعتبار، آئینۂ سکوت، ستارہ ادا، ستارۂ شام، چشم غزل، شام زوال، معجزہ گر، خاک بے نمو، لوح جہاں، ستارہ بدن، تیغ جفا، نوحہ گر، حدیث دل، کوزۂ خاک، دست وگریباں، ستارۂ ہجر، خش وخاشاک، درد نہاں، نامۂ جاں، دست کمال، سیم وزر، بندۂ خاک نشاں، اندیشۂ جاں، ستم گراں وغیرہ

یہ کچھ مخصوص لفظیات اور ترکیبیں ہیں۔ جو عرفان صدیقی کی غزلوں میں جابجا نظر آتے ہیں اور انہی لفظوں اور ترکیبوں نے عرفان صدیقی کی شعری کائنات کو روشن کر رکھا ہے۔ ان

میں کچھ الفاظ تو ایسے ہیں جواب اردو شاعری میں استعمال ہی نہیں ہوتے اور کچھ الفاظ وہ ہیں جو کم استعمال ہوتے ہیں۔ جہاں تک ترکیبوں کی بات ہے تو ان میں کچھ ترکیبیں اردو شاعری میں پہلے سے آرہی ہیں مگر کچھ ترکیبیں عرفان صدیقی نے خود بنائی ہیں اور انہی کا استعمال ان کے یہاں زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ شاعری اور خصوصاً غزل میں الفاظ کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے، بڑی سی بڑی بات اور خیال کو دو مصروں میں کہہ دینا معمولی ہنر کا کام نہیں، اس لئے کہا جاتا ہے کہ غزل کے شاعر کو الفاظ پر قدرت حاصل نہ ہو تو اچھا خیال بھی موزوں الفاظ کی قلت کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ عرفان صدیقی کو خیال کی ادائیگی کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش نہیں کرنی پڑتی ہے۔ ان کے اشعار گواہ ہیں کہ خیال کی ادائیگی میں انہیں کسی لفظی کسرت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مظہر امام عرفان صدیقی کی کلاسیکی رنگ کی غزلوں کے تعلق سے لکھتے ہیں۔ ''عرفان صدیقی کی نازک خیالی، ان کے ڈکشن کی نفاست، ان کے شعور حیات کی رعنائی اور ان کے تصور عشق کی تہذیب ان کے اشعار سے چھلک پڑتی ہے۔........ان کی تازہ غزلیں (عشق نامہ) وصال و ہجر کو نئی خصوصیت عطا کرتی ہیں۔ ان کی یہ شاعری رنگ عام کی عشقیہ شاعری نہیں ہے۔ انہوں نے عشق کو ایک مابعد الطبیعاتی جہت دی ہے۔ عشق نے انہیں ایک نئی سرشاری بخشی ہے اور ان کا تخلیقی ابال اسی جذبے کا عطیہ ہے۔''

مظہر امام نے مذکورہ اقتباس میں عرفان صدیقی کی شاعری کے جس گوشے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ عشق نامہ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اشعار دیکھیں۔

تجھی پہ ختم ہے جاناں مرے زوال کی رات
تو اب طلوع بھی ہو جا کہ ڈھل رہا ہوں میں

وہ خوش بدن ہے نوید بہار میرے لئے
میں اس کو چھولوں تو سب کچھ نیا نیا ہو جائے

اپنے کس کام میں لائے گا بتاتا بھی نہیں

ہم کو اوروں پہ گنوانا بھی نہیں چاہتا ہے

جب سے جانا ہے کہ میں جان سمجھتا ہوں اسے

وہ ہرن چھوڑ کے جانا بھی نہیں چاہتا ہے

دل کا کیا ٹھیک ہے آنا ہے تو آجا کہ ابھی

ہم یہ گرتی ہوئی دیوار سنبھالے ہوئے ہیں

کوئے قاتل کی روایت ہی بدل دی میں نے

ورنہ دستور یہاں لوٹ کر آنے کا نہیں

کب سے مژگاں نہیں کھولے مرے ہشیاروں نے

کتنی آسانی سے طوفان کو ٹالے ہوئے ہیں

کہیں وحشت نہیں دیکھی تری آنکھوں جیسی

یہ ہرن کون سے صحراؤں کے پالے ہوئے ہیں

جیسے فانوس کسی شمع کو حلقہ میں لیے

پیار کی باہوں میں اک چاند سا چہرہ روشن

لئے پھرتی تھی کسی شہر فراموشی میں

رات پھر کھیل رہی تھی تری خوشبو ہم سے

دیکھ لیتا ہے تو کھلتے چلے جاتے ہیں گلاب

میری مٹی کو خوش آثار کیا ہے اس نے

شہروں سے نکل کر ترے دیوانے کہاں جائیں

کم پڑنے لگے دشت غزالاں کے لئے بھی

کھیل یہ ہے کہ کسے کون سوا چاہتا ہے
جیت جاؤ گے تو جاں نذر گذاریں گے تجھے

ہوا کی طرح نہ دیکھی مری خزاں کی بہار
کھلا کے پھول مرا خوش نظر چلا بھی گیا

جان ہم کار محبت کا صلہ چاہتے ہیں
دل سادہ کوئی مزدور ہے اجرت کیسی

عجب ہے میرے ستارہ ادا کی ہم سفری
وہ ساتھ ہو تو بیاباں میں رتجگا ہو جائے

عرفان صدیقی کے یہاں کلاسیکی روایات کے امین مذکورہ اشعار میں عشق کے وہ تمام پہلو سمٹ آتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''سات سماوات'' اور اس سے قبل کے مجموعوں میں جو محبت کی چنگاری راکھ کے ڈھیر میں چھپی تھی وہ ''عشق نامہ'' میں اپنی پوری جولانی کے ساتھ دہک رہی ہے اور جس کی روشنی سے کلاسیکی ادب کی وہ روایت جو کبھی میرؔ سے چل کر فیض احمد فیض تک آئی تھی، ان کے یہاں مجموعی صفات کے ساتھ موجود ہے۔

عرفان صدیقی کی غزلوں میں بطور خاص کلاسیکی روایات و جمالیات اور پیکر تراشی والے اشعار میں جلنے اور پگھلنے کی بات بار بار دہرائی گئی ہے اور یہ دونوں صورتوں میں ہوتا ہے جب محبوب کا نیاز حاصل ہو تو بھی اور نہ ہو تو بھی مگر پہلی صورت میں زیادہ امکان روشن رہتا ہے کیونکہ جلنے اور پگھلنے کی نوبت تبھی آتی ہے جب محبوب کا نیاز حاصل ہو، گفتگو کے مواقع ملیں۔ اشعار دیکھیں۔

محبت میں ہوس کا سا مزہ ملنا کہاں ممکن
وہ صرف اک روشنی ہے جس میں جلنا چاہتا ہوں میں

بدن کے دونوں کناروں سے جل رہا ہوں میں
کہ چھو رہا ہوں تجھے اور پگھل رہا ہوں میں
جان وتن عشق میں جل جائیں گے جل جانے دو
ہم اسی آگ سے گھر اپنا اجالے ہوئے ہیں

عرفان صدیقی کے ان شعروں کو پڑھتے ہی جگر مرادآبادی کا وہ شعر یاد آجاتا ہے جسے عشق کے تعارف کے طور پر ہمیشہ پیش کیا گیا اور کیا جاسکتا ہے۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

عرفان صدیقی کے یہاں عشق کی معنویت کچھ اسی طرح وسیع ہوئی ہے۔اور انہوں نے عشق کو ایک نیا مفہوم دینے کی کوشش کی ہے۔عرفان صدیقی کی غزلوں میں جب بدن کے حوالے آتے ہیں اور عشق اپنی آخری منزل میں پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے تو بھی وہ جنسی تلذذ نہیں آپاتا، جو دوسرے شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدن کا ذکر کرتے ہوئے بھی وہ ایک ایسی پاکیزگی شعروں کے اوپر ڈھال دیتے ہیں جو ان شعروں کو نفسانی خواہشات سے الگ کر دیتی ہے۔ان کے یہاں ''لہو'' ایک نئے معنی میں استعمال ہوا ہے، عام طور پر شعراء لہو یا خون کا استعمال ایسے شعروں میں نہیں کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ عرفان صدیقی کو لفظ شناس کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے لفظوں کے انتخاب کے ساتھ بعض اشعار میں ان کے معنی بھی بدل دئے ہیں۔

بدن میں جیسے لہو تازیانہ ہوگیا ہے
اسے گلے سے لگائے زمانہ ہو گیا ہے
یہ کون میرے بدن میں طلوع ہونے لگا
ابھی لہو کو ملا بھی نہیں اشارۂ شام

دیکھتے ہیں تو لہو جیسے رگیں توڑتا ہے
ہم تو مرجائیں گے سینے سے لگا کر اس کو

اپنے لہو کے شور سے تنگ آچکا ہوں میں
کس نے اسے بدن میں نظر بند کر دیا

عرفان صدیقی نے ''عشق نامہ'' کی غزلوں میں بدن کو استعارہ کے طور پر خوب استعمال کیا ہے مگر کہیں بھی لذت پرستی دکھائی نہیں دیتی جیسے دوسرے جدید شعراء مثلاً ظفر اقبال، عادل منصوری، محمد علوی، ساقی فاروقی، سلیم احمد، بشیر بدر اور چند دوسرے شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں۔ ''......وہ بدن کے استعارہ سے خوب کام لیتے ہیں اور مجاز سے حقیقت تک کا سفر بحسن وخوبی طے کرتے ہیں مگر مسوقیت اور لذت پرستی کی کوئی بھی پرچھائیں نہیں پڑتی۔ انسانی پیکر بہرحال خالِ خدا کی نفاست تخلیق کا مظہر ہے، اس لئے ہر عہد میں مرکز توجہ رہا ہے۔ عرفان صدیقی کی نگاہ سطحی نہیں بلکہ وہ گہرائیوں میں اترتی ہے اور اس طرح کے اشعار سامنے آتے ہیں۔،،

ڈاکٹر سید عبدالباری عرفان صدیقی کا دفاع کرتے ہیں اور میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ ان کے یہاں وہ لذت شعر پڑھنے کے بعد نہیں ملتی جو ان کے پیش رو اور ہم عصر شعراء کے یہاں ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ بدن کے اشعار کو انہوں نے کئی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

عشق کیا کار ہوس بھی کوئی آسان نہیں
خیر سے پہلے اسی کام کے قابل ہوجاؤ

بدن کی ریت پر اب تک اسی وعدے کا سایا ہے
وہ آئیں گے تو تیرے دشت کو گلزار کر دیں گے

کل بگولے کی طرح اس کا بدن رقص میں تھا
کس قدر خوش تھی مری خاک، پریشانی پر

وہ جاگنا مری خاک بدن میں نغموں کا
کسی کی انگلیوں کا نے نواز ہوجانا

کب سے پتھر ہوں بیابان فراموشی میں
میرے ساحر مجھے چھولے کہ بدن ہو جاؤں

حیراں ہوں کہ پھر اس نے نہ کی صبر کی تاکید
بازو جو مرا بازوئے دلدار میں آیا

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

میں تیری منزل جاں تک پہنچ تو سکتا ہوں
مگر یہ راہ بدن کی طرف سے آتی ہے

روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

اس طرح عرفان صدیقی کی غزلیں اپنی کلاسیکی روایات، جمالیات اور بدن کے ڈائمنشن کے ساتھ عروج کو پہنچتی ہیں۔عرفان صدیقی کی مجموعی طور پر کلاسیکی رنگ کی غزلوں کے لیے آخری بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے کلاسیکی ادب کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور اپنے پیش روشعرا سے الگ ایک ایسی راہ نکالی ہے جس کے وہ تنہا مسافر ہیں۔ان کے ہم عصر یا ان کے بعد آنے والی نسل نے بھی اس طرف کوچ کی تیاری تو کیا آمادگی بھی ظاہر نہیں کی۔ان غزلوں میں حیات وکائنات دونوں روشن ہیں اور دونوں پہلوؤں پر انہوں نے مشاہدے اور

تجربے کے بعد الفاظ کو شعریت عطا کی ہے اور ایسی شعریت جو فی زمانہ کہیں اور نظر نہیں آتی۔ عرفان صدیقی کی شاعری کے رموز کو سمجھنے کے لیے اس کی گہرائی میں اترنے کی ضرورت ہوگی اور تبھی وہ راز پائے جا سکتے ہیں، سطحی مطالعہ یا اوپر اوپر تیرنے والے کو گوہر نکالنے میں یقیناً مایوسی ہوگی۔ کیونکہ جنوں جب تک نہ آئے عشق کے مفہوم واضح نہیں ہو پاتے ہے۔

دشت سے دور بھی کیا رنگ دکھاتا ہے جنوں
دیکھنا ہے تو کسی شہر میں داخل ہو جاؤ

(2014)

تخلیقی قدروں کا پاسدار۔ عرفان صدیقی

.................سید احتشام الدین (در بھنگہ)

عرفان صدیقی کے اب تک چار مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ''کینوس''، ''شبِ درمیاں''، ''سات سماوات'' اور ''عشق نامہ''۔ اس کے علاوہ عرفان صدیقی نے سنسکرت سے ''رت سنگھار'' اور ''مالویکا اگنی سترٓ'' کا اردو میں منظوم ترجمہ کر کے اپنے مطالعہ، سوچ اور زبان و بیان کے ابلاغ و ترسیل پر دسترس کا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو (سنسکرت) مشرقی شعریات اور ہند ایرانی تہذیب سے کتنا لگاؤ ہے۔

''سات سماوات'' میں دیباچہ کے طور پر ''نہج البلاغت کے خطبہ کا یہ حصہ بڑا ہی با معنی اور کثیر الجہات ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: ''......نیچے ہوا دور تک پھیلی ہوئی تھی اور اوپر پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ انہوں نے پانی کو یوں متھا جیسے دہی کے مشکیزے کو متھا جاتا ہے اور اسے ڈھکیلتی ہوئی تیزی سے چلی، جس طرح خلا میں چلتی ہے، اور پانی کے اول کو آخر پر اور ساکن کو متحرک پر پلٹانے لگی، یہاں تک کہ اس متلاطم پانی کی سطح بلند ہو گئی اور وہ تہہ بہ تہہ ہو کر کف دینے لگا۔ اللہ نے وہ کف کھلی ہوا اور بسیط فضا کی طرف اٹھایا اور اس سے سات سماوات بنائے'' (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

''سات سماوات'' کی تخلیق کے سلسلے میں علیؑ نے جس عمل کو دکھایا ہے اسے پڑھ کر ذہن میں سمندر کا تصور ابھرتا ہے۔ جہاں ہوا داخل ہو کر تہ و بالا (Tide) کر کے جھاگ بنا رہا

ہے اور اسی جھاگ یا کف سے سات سماوات بنائے گئے۔ کف نکالنے کے لئے پانی کو دہی کے مشکیزے کی صورت کے برتن میں رکھ کر متھا گیا۔ تو کیا سمندر کو دل میں رکھ کر متھا گیا؟ کیوں کہ دل کی شکل مشکیزے جیسی ہی ہوتی ہے جس کی وسعت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ صاحبِ دل جانتے ہیں ؎

یہی ویرانہ بچا تھا تو خدا نے آخر
رکھ دیئے دل میں مرے سات سمندر اپنے

اس قسم کی بات وہی کرسکتا ہے جس کے دل تک اللہ کی بات پہنچ چکی ہو۔ **نَارُاللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِی تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ۔**

ہندی متھ کے مطابق دیوتاؤں اور راکھشسوں نے مل کر سمندر متھا تھا۔ اس منتھن سے امرت ملا، زندگی ملی یا آسمان یا وہ خدا جس کے پیغمبر آ آ کر ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی کی بشارت دیتے رہے۔ خیر یہ تو غیر متعلق قسم سی بات نکل پڑی ہے لیکن سوال وہیں کا وہیں ہے۔ آخر دل کیا ہے؟ آسمان کیوں کر بنا؟ سمندر کو کہاں رکھا گیا؟ یہاں یہ بتانا مشکل ہے، کون صفت اسماء ہیں، اور کون خود قادرِ مطلق۔ یہ بات تو ہم جانتے ہیں جہاں ''پیدائش، قیام (بالتغیر) فنا قلب علم، عدم ادراک، محسوسیت وغیرہ اوصاف کا ذکر ہو وہاں قادرِ مطلق کا ذکر نہیں ہوسکتا''۔ کٹھ اُپنیشد میں برہم آنند وتی لکھتے ہیں: ''اس یا اس آتما سے آکاش پیدا ہوا، آکاش سے وایو، وایو سے اگنی، اگنی سے جل، جل سے پرتھوی، پرتھوی سے اوشدھیاں، اوشدھیاں سے اَنّ، اَنّ سے برج (نطفہ)''

یہ ایک سلسلہ ہے اور یہ سلسلہ کیا ہے؟ وہ ایک عارف ہی بتا سکتا ہے کیوں کہ وہ اپنی ذات میں ذاتِ مطلق کا، اپنی صفات میں صفاتِ حق کا اور اپنے افعال میں افعالِ خالق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے جس نے اپنے ذات کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

عرفان صدیقی محرمِ ذات کی طرح کہہ رہے ہیں ؎

زیرِ افلاک ستاروں کا سفر جاری ہے
اب کے نکلیں گے ہم اے شام زوال اور کہیں

خود کو چراغِ راہ گذر جانتا ہوں
لیکن چراغِ راہ گذر بھی اسی کا ہے

نبض عالم میں رواں تیری حرارت ہی تو ہے
کہ یہ عالم ترے ہونے کی بدولت ہی تو ہے

پیش کرتا ہے یہی داورِ محشر کے حضور
میرا سرمایہ ترے نام سے نسبت ہی تو ہے

خاک تھا اپنا بدن اور بکھرنا تھا اسے
ہاں مگر اس خاک میں کچھ گنج زر جیسا بھی تھا

اسی کا خانۂ ویراں، اسی کا طاقِ ابد
میں اک چراغ ہوں، چاہے جہاں جلائے مجھے

ہم سب آئینہ در آئینہ در آئینہ ہیں
کیا خبر کون کہاں کس کی طرف دیکھتا ہے

اس شعر میں آئینہ خود بینی کو ظاہر کر رہا ہے جب کہ عام طور پر شعراء کا خیال یہی ہے کہ آئینہ میں جو تصویر ابھرتی ہے وہ موہوم ہوتی ہے۔ جب تک آئینہ دیکھ رہے ہیں، اس میں خود کو اور قریب کے مناظر کو پاتے ہیں لیکن جوں ہی آپ ہٹے یا آپ کا زاویۂ نظر بدلا کہ سارا منظر ختم ہو گیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں خود سے ماورا کچھ نظر نہیں آتا۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ: ''ہستی موہوم انساں کی اپنی ہستی ہے اور ہستی واقعی ماسوائے ذات یعنی اللہ ہے''

عرفان صدیقی نے مندرجہ بالا شعر میں اپنی ذات کا مشاہدہ کر کے خود بینی کا اعلان کیا ہے تو دوسری طرف باطنی اور بیرونی اسرار کا انکشاف بھی کیا ہے، اور سمجھنا چاہا ہے کہ کون کہاں کس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ یہاں یہ خود بینی کے ساتھ ماسوائے ذات یعنی مشاہدۂ حقیقی کا عرفان حاصل کرلیا ہے، اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں ؎

آپ کیا نقدِ دوعالم سے خریدیں گے اسے
یہ تو دیوانے کا سر ہے سرِ پندار پہ خاک

اسی پندار کے احساس کی وجہ سے انہیں دنیا کوتاہ، تنگ اور کم مایہ نظر آتی ہے ؎

دنیا نے تو آغوش ہوس کی تھی کشادہ
کچھ میں ہی نہ اس حلقۂ کوتاہ میں آیا
خیر دنیا مری وحشت کے لئے تنگ سہی
اور یہ عرصۂ باطن میں بیابان جو ہے

لطف الرحمٰن نے کہا تھا ؎

جب تک بِکا نہ تھا تو کوئی پوچھتا نہ تھا
تم نے خرید کر مجھے انمول کردیا

اسی انمول بننے کی خواہش، عرفان صدیقی کو بازار لے آئی ہے۔ یہاں اس صارفی نظام میں خرید فروخت جاری ہے۔ دنیا نے انہیں بہت خریدنا چاہا بہت بڑھ چڑھ کر دام لگایا، لیکن عرفان صدیقی کسی قیمت پر نہیں بِکا۔ لیکن پھر بھی اسے کسی خریدار کا انتظار ہے جو اسے خرید کر انمول کردے۔ عرفان صدیقی کے یہاں ایک عجیب کیفیت ہے، اعتماد، امید، تذبذب کے ملے جلے جذبے کے باوجود قیمت گھٹانے پر آمادہ نہیں۔ بازار میں جب آ ہی گیا ہے تو اسے نظر والے کے آنے کی موہوم سی تلاش بھی ہے ؎

بازار میں آئے ہیں تو کیا مول گھٹائیں
شاید کوئی اپنا بھی خریدار نکل آئے

اورنہیں تو پھر یہ اس وقت ممکن ہے، جب بلایا جائے گا۔ **یا اولیاء اللہ ھلموا الیٰ اللہ** (اے خدا کے چاہنے والو چلو اپنے محبوب کی طرف) یہاں پر دنیاوی تعلقات اور اس سے ملے انعام واکرام سے انکار، غیر حق کی طرف قطع تعلق ہے اور دوسری طرف حق تعالیٰ کی معرفت کو پانا اور اس کی طرف متوجہ رہنا ہے۔

عرفان صدیقی اپنے تاریخی اور تہذیبی روایت کے ساتھ پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی واقعات کی کڑوی سچائی کو بڑی چابکدستی کے ساتھ تلمیحات واشارات میں بیان کردیتے ہیں ؎

یوسفِ شہر تجھے تیرے قبیلے والے دام لگ جائے تو بازار بھی کر سکتے ہیں

روشنی میں لوگ اعلانِ وفاداری کریں
شمع گل ہوتے ہی سب چلنے کی تیاری کریں

کیا یہ آج کے دور کی سچائی نہیں ہے۔ تھوڑے سے فائدہ کے لئے ہر دور میں لوگوں نے اپنے عزیزوں کو بیچ دیا ہے۔ دوسرے شعر میں واقعہ کربلا کی تلخ حقیقت ہے اور روز کا مشاہدہ بھی لیکن یہاں تاریخی حقیقت کس قدر فنکاری کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھل کر ان کے تجربے میں آئی ہے۔ عصری تجربہ روایتوں سے کس قدر جڑا ہوا ہے۔ بے یقینی کی کوکھ ہی سے ذہنی انتشار پیدا ہوتا ہے۔ واقعہ کربلا کی اشاریت ذہن کو تھوڑی دیر کے لئے گرفت میں لے لیتی ہے۔ آخر اشرف المخلوقات کے کردار کا یہ کون سا رخ ہے۔ یہاں عرفان صدیقی کے طریقِ اظہار اور واقعہ کربلا کے Assimilation کا طریقہ جداگانہ ہوگیا ہے۔ اس میں نہ تو تفاخر ہے اور نہ ہی مذہبی نور کے ہالے سے مزین چکا چوند کردینے

والی روشنی۔ بس یہاں ایک کیفیت پیدا ہوگئی ہے یعنی جب مخلوقِ آدم پر سے اعتبار اور ا
اٹھ جائے تو روح کی تنہائی کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ
کے بے مراد ہونے کے باوجود دوسرے کو بامراد، روشن، شادماں، سرسبز و شاداب اور سرفر
دیکھ کر اپنے ہونے کا یقین بڑھتا ہے۔ اس قسم کا طرزِ اظہار عام نہیں ہے۔ آپ خود ملاح
فرمائیں نئی غزل میں اشاریت کتنی بدلی ہوئی ہے محرومی، محزونی کے بجائے ایک طرح
تکمیلِ ذات کے احساس سے دوچار نظر آتی ہے۔ سانحۂ کربلا کی تلخ حقیقت جمالیاتی فکر و فر
میں ڈھل کر Monologue کی کیفیت اختیار کرلی ہے۔ یعنی دل کی خواہش ایسی تمنا میں
ڈھل چکی ہے جو روایت پر مبنی ہے اور وہ اپنا سر دے کر اس بے یقینی کے دور میں یقین حاصل
کرنا چاہتے ہیں ۔

کوئی نیزہ سر فرازی دے تو کچھ آئے یقیں
خشک ٹہنی پر بھی آتے ہیں ثمر سنتا ہوں میں

مسافر دیکھ لیں شاید خلا کے اس جزیرے کو
ذرا اونچا اٹھے سر کوئی نیزے پہ لہرائے (سہیل احمد)

دے دینا اسے اٹھتے ہوئے سر کی دعائیں
ہو جائے اگر خنجرِ بے باک سے ملنا

مندرجہ بالا اشعار میں کسی قسم کا Internal یا External Depression کا احساس
نہیں جھلک رہا ہے۔ بلکہ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ اپنے مچلتے باطن کی خواہش کی تکمیل کر
رہے ہوں اور جب باطن کی تکمیل ہو جاتی ہے تو اس صورت میں مرنے اور جینے کا استعارہ بدل
جاتا ہے۔ ظلم و استبداد سے خوفزدہ ہونے کے بجائے ظالم کے آگے سینہ سپر اور سرخرو ہونے کا
جذبہ ایک توانا صورت اختیار کر لیتی ہے، تو ظلم و جبر کرنے والا خود تھرا جاتا ہے۔ ایسی صورتحال

اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب ہمت Concrete Shape اختیار کرلیں ۔

سنو کہ بول رہا ہے وہ سر اتارا ہوا
ہمارا مرنا بھی جینے کا استعارہ ہوا
دل سکۂ زر تھا کہیں مقتل میں ہوا گم
اک کاسۂ سر نذر شہنشاہ میں آیا

عصرِ نو کی ذہنی، فکری اور تخلیقی قوتِ اظہار کے تضاد کو اعجاز اعظمی نے اپنے شعر میں ڈھالا ہے جو ایک معمہ بن کر بھی اپنے جذبے اور قوتِ اظہار پر صحت مند لگام لگائے ہے ۔

دل میں شعلوں کی لپک ہے، لب پہ پھولوں کی ہنسی
اک معمہ بن گیا ہے عصرِ نو کا آدمی

عرفان صدیقی نے اپنے تجربے کے لحاظ سے روایتوں سے کس قدر ہٹ کر جمالیاتی احساس و فکر کو تخلیقی طور پر شعری پیکر میں ڈھالا ہے ملاحظہ فرمائیں ۔

نہ موجِ خوں پہ، نہ تیغِ جفا پہ لکھیں گے
اب ایک سخن ترے رنگِ حنا پہ لکھیں گے
ترا ہی ذکر کریں گے لبِ سکوت سے ہم
ترا ہی نام بیاضِ صدا پہ لکھیں گے
بیاں کریں گے نہ کوئی سبب اداسی کا
جو کچھ بھی لکھیں گے آب وہوا پہ لکھیں گے

آج کل ہیرو ورشپ کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ ایک آدمی بیک وقت انسان ہے اور شیطان بھی۔ ایک ہی سانس میں وہ انسانی فلاح اور اعلیٰ قدروں کی بات کرتا ہے، تو دوسری طرف اپنے فائدہ اور اقتدار قائم رکھنے کے لئے کسی بھی سطح تک جا سکتا ہے۔ زندگی کو غیر رسمی

اور حقیقی انسانی رشتے کے طور پر سمجھنے کی وجہ کر تضادات آ گئے ہیں۔ آج ہر شخص اپنی ذہنی سطح پر جینا چاہتا ہے۔ باپ ماں اور رشتۂ ازدواج میں بھی افتراق کی صورت نمایاں ہے۔ اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے یا کارزارِ حیات میں شادماں و کامراں کہلانے کے لئے کوئی بھی کسی پر اتہام تراش سکتا ہے۔ ایسے لوگ جن کی بات عوام کی پونجی ہوتی ہے، انہیں بھی مکرنے اور کچھ سے کچھ کہنے میں عار نہیں ہے۔

عرفان صدیقی کی شاعری میں بھی تضادات آئے ہیں۔ لیکن یہ تخلیقی تضاد ایک جمالیاتی اعلیٰ قدروں کی پاسداری کی آواز کی صورت میں ابھری ہے۔ انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ یہ تاریخی ادبی سرمایہ بھی بن سکتی ہے جو کئی نسل کے ذہن کی آواز ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں خلیل ماموں رقم طراز ہیں: ''عرفان صدیقی کی شاعری میں ''تضادات'' گھل مل کر ایک نقطۂ اتصال یا نقطۂ انجماد بن جاتے ہیں''

عرفان صدیقی کا تضاد اس دانشور کا نہیں ہے یعنی جس کی بنیاد شک پر ہو اور نہ ہی ایسے ادیب کی ہے جو نئی اور انوکھی بے ادبیوں پر جدید اور جدید تر ادب کی تعمیر کرتا ہے اور نہ ہی خود کو ایسا پڑھا لکھا فرد ظاہر کرنا چاہتا ہے جو ایمان کو جہالت اور کفر کو تہذیب اور ادب کی بنیاد قرار دے۔ یہاں اس تضاد میں ایک ایسا چیلنج اور خود نفسی ہے جس میں غالب مغلوب اور متعجب ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں خیال اور آواز نے ایک طاقت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ Positive Points، Negative Points پر یورش کر رہا ہے اور عقل حیرت زدہ ہے کہ کیا یہ عجیب و غریب صورت بھی ممکن ہو سکتی ہے۔

وہ حبس ہے کہ دعا کر رہے ہیں سارے چراغ
اب اس طرف کوئی موجِ ہوا نکل آئے

آج تک ان کی خدائی سے ہے انکار مجھے
میں تو اک عمر سے کافر؛ ہوں صنم جانتے ہیں

زندہ رہنا تھا سو جان نذرِ اجل کر آئے
میں عجب عقدۂ دشوار کو حل کر آیا

الٹ گیا ہے ہر اک سلسلہ نشانے پر
چراغ گھاٹ میں ہے اور ہوا نشانے پر

پیاس نے آبِ رواں کردیا موجِ شراب
یہ تماشا دیکھ کر دریا کو حیرانی ہوئی

یہ ہوس ہو کہ محبت ہو، مگر چہرے پر
اک نیا رنگ اسی آگ میں جل کر آیا

آج کے لوگ ایسے دور میں سانس لے رہے ہیں جہاں مروت، آدمیت اور انسانیت پچھلے موسم کی باتیں بن کر رہ گئی ہیں۔ جبر و استبداد کا بول بالا ہے، ہر شخص گھات میں ہے، مروت کی جگہ بے مروتی، طوطا چشمی نمایاں ہے۔ دوست دشمن کا فرق مٹ چکا ہے۔ دوسرے شاعروں نے اس دور کو کیسے محسوس کیا ہے اور اپنی شاعری میں کس طور پر برتا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

وہ میرا ہو کے بھی شامل ہے قاتلوں میں مرے
اس انکشاف نے تقسیم کردیا ہے مجھے

نہ دوستوں کی طرح ہیں نہ دشمنوں کی طرح
یہ کون لوگ صفِ دوستاں میں آنے لگے

عشرت ظفر اور اکبر حمیدی کے شعروں کی روشنی میں آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ عرفان

صدیقی کے احتجاج میں بھی کتنا احترامِ آدم ہے۔ عرفان صدیقی جس متضاد جذبے کی خواہش کررہے ہیں اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے زندگی کی تکمیل اب اسی طور پر ممکن ہوسکتی ہے۔

دل کی بے رنگی سے بہتر تھی لہو کی ایک بوند
وہ بھی اک سرمایہ تھا اے چشمِ تر جیسا بھی تھا

جی دکھایا ترے لہجے نے تو معلوم ہوا
کس طرح لفظ کو تلوار بھی کر سکتے ہیں

جب ہمیں بے مول ہاتھ آنے لگیں سچائیاں
کیا ضرورت ہے کہ خوابوں کی خریداری کریں

عذابِ جاں ہے عزیز و خیال مصرع تر
سو ہم غزل نہیں لکھتے عذاب ٹالتے ہیں

غزل میں اس کو ستم گر کہا تو روٹھ گیا
چلو یہ حرفِ ملامت لگا ٹھکانے پر

دیکھیں کب ہوں عشق میں کندن
راکھ تو کردی کایا ہم نے

سوائے خاک مری دسترس میں کچھ بھی نہیں
کہ فرق حاصلِ عشق وہوس میں کچھ بھی نہیں

تمنا کا نتیجہ اپنے سر لینا نہیں اچھا
ذرا ٹھہرو عزیزو، استخارہ دیکھتا ہوں میں

عجب حریف تھا میرے ہی ساتھ ڈوب گیا
مرے سفینے کو غرقاب دیکھنے کے لئے

عرفان صدیقی نے ترقی پسندوں کی طرح صاف، شفاف Transparent اور متعین زبان کا استعمال نہیں کیا ہے اور نہ ہی جدیدیوں کی طرح جذبات واحساسات کے لطیف ترارتعاشات کے تلازمات، استعارے کے تفاعل کی نئی راہیں نکالی ہیں اور نہ یہ مابعد جدید کی طرح نئی فکر وآگہی سے آزادنہ تخلیقی معاملہ کر کے کھلا ڈسکورس کیا ہے۔عرفان صدیقی نے لفظ کو اس کے روایتی اور متعینہ منطقوں سے منسوب لفظیات کو اپنے تخلیقی تجربے کے حوالے سے برتا ہے اور اس میں اپنے مخصوص مزاج کے تحت مختلف راہ نکالی ہے اور فن کو فنکاری کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچایا ہے۔عرفان صدیقی کے یہاں برہنہ گفتاری نہیں ملتی۔ کیوں کہ انہوں نے روزمرہ کی زندگی سے غیر شعری زبان منتخب نہیں کیا ہے اور نہ ہی اپنے اظہار کے لئے مخصوص نوع کی Specific اور ذاتی زبان تخلیق کی ہے۔ان کے یہاں نئی بناوٹی شعری کرتب بازی نہیں ملتی۔ یہ بات نئے فیشن زدہ مابعد جدیدیوں کو عرفان صدیقی کے مطالعہ کے سلسلے میں بُری طرح کھٹکتی ہے۔یہ حقیقت ہے ان کا کوئی منفرد Metalingual اسلوب نہیں ہے ۔ اگر یہ کچھ اور زیادہ حساسیت اور عصری آگہی کے ساتھ اپنے اطراف کے اشیاء وواقعات سے منسوب لفظیات اپنے تخلیقی تجربے کے حوالے سے برتتے تو ان کا منفرد Metalingual اسلوب بن سکتا تھا۔لیکن اس کے باوجود موضوعاتی وسعت اور علمی، ادبی، اخلاقی، تاریخی، عمرانی اور مابعد الطبیعاتی پس منظر کی وجہ کر ان کے اشعار بلا جھجھک مابعد جدیدیوں کے ساتھ رکھے جاسکتے ہیں۔

بجھیں چراغ مگر دل رہے سدا روشن
سیاہ رات کو خطرہ اسی کمال سے ہے

گوشہ نشیں ہیں انجمن آرا نہیں ہیں ہم
لیکن یہ معجزہ ہے کہ تنہا نہیں ہیں ہم

سنا ہے گاؤں کے پیپل کے پاس اک پتھر
بہت دنوں سے مرا انتظار کرتا ہے

دل نے ہزیمتوں کو اٹھایا ہے اس طرح
لگتا نہیں ہے کچھ یہ بجز کوچۂ ملال

زمانے تجھ سے یہ کہنا ہے مر چکے ہم لوگ
اب اپنی لاش ترے بازوؤں میں دھر جائیں

ایسے حالات ہی نہ تھے پہلے
شیشہ جاں کو نذر بال کیا

گرد سی ہے ہر تعلق پہ جمی
تھی کبھی رشتوں میں دلداری بہت

وعدہ اس کا ہوگیا برسوں پرانا پھر بھی کیوں
ہے اسی کا منتظر ، اک بے شکن بستر ابھی

عداوتوں کے طریقے بدل گئے شاید
عدو بھی ملتے ہیں اب ہم سے آشنا کی طرح

وہ چہرہ ہر طرف کھلتے ہوئے پھولوں کا موسم ہے
وہ پیکر موسموں کو رنگ خوشبو بانٹنے والا

گردشِ دوراں مجھے تجھ سے شکایت کیوں ہو
درمیاں اپنے کبھی فاصلہ ہونا تھا ہوا

لٹا انا کا ہی دامن نہ فن ہی خاک ہوا
عجیب شان سے راحت ہوا چلی مجھ میں

ہم کو پسند آگیا ساحل کا مشورہ
کشتی کی لکڑیاں تھے شجر ہو کے رہ گئے

تم نہیں جانتے ان دل کے طلبگاروں کو
اور کچھ دیر جو رک جاتے تو سر لے لیتے

اب کوئی قصہ نہ چھیڑو پھر کبھی کرناحساب
زندگی نے ہم سے کیا چھینا ہے کیا رہنے دیا

امیدیں توڑ دے ساری اور اس دنیا سے رخصت ہو
یہی وہ کفر ہے جو ہجر کا مارا نہیں کرتا

سب اپنے تمناؤں کے نرغے میں گھرے ہیں
ان میں سے کسی سے بھی بغاوت نہیں ہوگی

آگے بھی کئی جان ہے لیکن دلِ ناداں
پہلے تو تجھے زلفِ پیچاک سے لے آؤں

اپنی وحشت کے سوا اذن واجازت پہ نہ جاؤ
دار پر جاؤ مگر اوروں کی دعوت پر نہ جاؤ

تم سے ملے تو خود سے زیادہ
تم کو اکیلا پایا ہم نے

ایسے آشوب میں دل دینے کی فرصت کس کو
ہیں بہت لذتِ آزار سے شرمندہ ہم

کوئی حرفِ دعا میرے لئے پتوار بن جائے
بچالے ٹوٹنے سے چشمِ تر ایسا نہیں ہوگا

عرفان صدیقی کے یہاں تخلیقی فطانت کی کمی نہیں۔ یہ شعری روایت کو تخلیقی طور پر برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ احساس کی مناسبت سے لفظ کو موزوں ترین تعبیرات کے مختلف ابعاد سے روشناس کراتے ہیں۔ زندگی کے معاملات و مسائل کو داخلی حوالوں سے پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں یہاں آپ کو تخیل و احساس کی پوری دنیا نظر آئے گی، جس میں تخلیقی قدروں کی پاسداری نمایاں ہے ؎

مرے خوابوں کے دریا خشک ہو جائیں
نہیں اے چشم تر ایسا نہیں تھا

لاؤ اس حرفِ دعا کا بادباں لیتا چلوں
سخت ہوتا ہے سمندر کا سفر سنتا ہوں میں

اور اک ہی جست میں دیوار سے ٹکرائے گا سر
قید پھر قید ہے زنجیر کی وسعت پہ نہ جاؤ

یاقوت لب تو کارِ محبت کا ہے صلہ
اجرت ہوئی حضور یہ سوغات نہیں ہوئی

پاؤں میں خاک کی زنجیر پڑی ہے کب سے
ہم کہ اس چلتے ہیں نقشِ کفِ پا چلتا ہے

ابھرتا آتا ہے پانی میں عکس ویرانی
کہ ہر پرندوطن کو پلٹتا جاتا ہے

جاگتی راتوں میں لہراتے ہوئے حمد کے گیت
طاقِ مسجد میں کسی دل کی تمنا روشن

یہ اس کا دل ہے کہ گم گشتگاں کی بستی ہے
کہاں چھپا ہوں کہ وہ بھی نہ ڈھونڈ پائے مجھے

شاعری چاہے براہِ راست کی جارہی ہو یا بالواسطہ، شاعری ہی ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ ہر شاعرانہ تجربہ اپنے خالق کی تخلیقی قوتِ استعداد کی وجہ کر اہم اور غیر اہم مرتبہ کا حامل ہوتا ہے۔فن پارے کی تشریح اور مطالعہ کل کی حیثیت سے ہونی چاہئے نہ کہ خانہ بند طریقے سے۔ آج شاعری اور تنقید میں بہت ساری باتیں نئے قالب بدل کے سامنے آرہی ہیں۔ جسے بہت پہلے کلاسیکی شاعر اور ادیبوں نے چھیڑا تھا جو ہماری بے توجہی کا شکار ہو کر رہ گئیں۔ان میں سے بہت ساری باتیں نئے نام کے ساتھ قالب بدل کر پیش کی جارہی ہیں۔اس سلسلے میں وبلبک ویرن رقم طراز ہیں:''آج کلاسیکی بلاغت، شعریات اور اوزان وبحور کی تنقیح بھی ہورہی ہے اور مزید اس طرح ہونی چاہئے کہ انہیں جدید اصطلاحات میں بیان کیا جاسکے''۔

عرفان صدیقی کا تعلق کلاسیکی ادب سے بہت گہرا ہے۔ان کے پاس وجدان، جذبات اور اعتقادات کی کمی نہیں، یہ فن پارے کے خارجی حسن اور فنی نزاکت کو اس کے داخلی تار و پود، خیال یا تجربے سے جدا نہیں کرسکتے۔

☆☆☆

عرفانِ جمال کا شاعر: عرفان صدیقی

.................رشید اشرف خان

عرفان صدیقی کے پہلے شعری مجموعہ ''کینوس'' میں عموماً غزلوں کی تعداد زیادہ ہے کیوں کہ غزل گوئی عرفان کی پہلی پسند تھی۔ لیکن اس مجموعے میں چند نظمیں بھی شامل ہیں جو بطور خاص غور وفکر کی متقاضی ہیں۔ وہ نظم جس میں ''سفر کی زنجیر'' کی سرخی قائم کی گئی ہے، خصوصی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس پوری نظم میں عرفان صدیقی نے اپنا تہذیبی اور ادبی پس منظر پیش کیا ہے اور اپنے وطن بدایوں کی عظمت و رفعت کو بیان کیا ہے۔ اس نظم کو مجموعہ کلام کینوس کا ابتدائیہ قرار دیا گیا ہے۔ نظم کا آغاز غالب کے ایک شعر سے ہوتا ہے:

''شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ ، غیر از نگہہ دیدۂ تصویر نہیں''
جلتی دوپہر میں پیڑی کا پُر اسرار درخت
جس سے لپٹا ہوا ، گزری ہوئی صدیوں کا طلسم
پہلوئے خاک میں آسودہ کوئی مرد شہید
طاق میں رات کے افسردہ چراغوں کا دھواں
یہ گلی گنج شہیداں کی طرف جاتی ہے
مصحفی نے جو کہا ہے تمھیں معلوم نہیں

سرمۂ چشم ہے یہ خاک تو خسرو کے لیے
ہم اسی مٹی سے اگنے کے لیے آئے ہیں

اس نظم کو پڑھ کر جہاں ایک طرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی نے استعارہ بدوش نظم اور تلمیح آمیز مصرعوں کی صورت میں اپنے وطن اور اپنے اسلاف کا تذکرہ کیا ہے وہیں ان کے شعور جمالیات نے بھی اپنی کارفرمائی شروع کر دی ہے۔ کیوں کہ ہیگل (Hegel) جمالیات کے لفظ کو فنون لطیفہ کے فلسفے کے مفہوم میں استعمال کرنے پر اصرار کرتا ہے چنانچہ نظم مذکور کے اشعار میں حسب ذیل مصرعے اسی احساس جمال کے آئینہ دار ہیں:

میں کہاں جا کے رکوں گا ؟ مجھے معلوم نہیں
حسن کب تجزیۂ ذات میں ڈھل پائے گا
ظلمتیں ، روشنیاں ، سلسلۂ شام وسحر
سب تماشا ہے تو تقریب تماشا کیا ہے؟
حلقہ در حلقہ پُر اسرار سفر کی زنجیر
دیکھتے جاؤ کہ تم نے ابھی دیکھا کیا ہے

ان اشعار میں شاعر نے علامتوں اور اشاریوں کے سہارے اپنے احساس جمال کی بڑی کامیاب ترجمانی کی ہے۔ آخر مصوری بھی تو ایک فن لطیف ہی ہے جو رنگوں کی شکل میں جنت نگاہ بن جایا کرتا ہے اور شاعرانہ مصوری ایسے ہی رنگین خیالات کو محاکات یا شاعرانہ مصوری کا لباس پہنا دیتے ہیں۔ یہی شعور جمال کی ایک پُرکشش فن کاری ہے۔

''کینوس'' بظاہر شاعر کے ابتدائی کلام کا مجموعہ ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شروع ہی سے عرفان کا شعور جمال کافی بالغ اور پُر جوش تھا۔ عموماً ہمارے شعرا کے یہاں حسن پرستی تو ہوتا ہے مگر شعور جمال نہیں، جب کہ حسن پرستی، شعور جمال کا صرف ایک جزو یا element ہے نہ

کہ کل۔ کینوس میں شامل غزلوں کی چند مثالیں دیکھیے:

کہیں کسی کے بدن سے، بدن نہ چھو جائے
اس احتیاط میں خواہش کا ڈھنگ سا کچھ ہے

چلو زمیں نہ سہی آسمان ہی ہوگا
محبتوں میں بہر حال تنگ سا کچھ ہے

ان دو اشعار میں شاعر نے نفسیات انسانی کی ہلکی سی جھلک دکھلائی ہے۔ پہلے شعر میں وہ کہنا چاہتا ہے کہ میرا جذبۂ شوق اور شعور جمال دونوں ہی بیک وقت مجھ پر حاوی ہیں یعنی میں صرف Beauty is to See, Not to Touch والے فارمولے پر عمل کرنا چاہتا ہوں اور اسی جذبے کے ساتھ میں بوسہ بہ پیام کے بجائے لب بہ لب والی ملاقات کا خواہاں ہوں۔

کینوس میں بعض غزلیں ایسی بھی ملتی ہیں جو یقیناً پردیس میں کہی گئی ہیں۔ وطن سے دوری، شدید احساس غریب الوطنی، تنہائی اور بیتے ہوئے دنوں کی چبھتی یادیں، ان باتوں نے شاعر کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچا رکھی ہے:

بڑھا کے ربط وفا اجنبی پرندوں سے
وہ ہنس اپنے وطن کو پلٹ گیا آخر

دنیا کا دستور ہے کہ وہ ظاہری واقعات وحوادث، خوش آیند باتوں اور امید افزا ماحول کا فوری طور پر اثر لیتی ہے لیکن شاعر وہ بھی جمالیاتی ذوق رکھنے والا عرفان صدیقی جیسا شاعر واقعات وحوادث کی بنیاد، خوش آیند باتوں اور امید افزا ماحول کی اصل حقیقت کو جانتا ہے تب کہیں اس مواد کو موضوع گفتگو بناتا ہے۔ سانحۂ کربلا کو گزرے ہوئے چودہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا لیکن عرفان کی نگاہوں میں وہ آج بھی تازہ ہے۔ صرف سانحہ نہیں بلکہ اس کی جزئیات بھی موجود ہے۔ شاید اسی لیے انھوں نے کہا تھا:

تم، جو کچھ چاہو، وہ تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا تھا؟

جمالیاتی نقطۂ نظر سے عرفان صدیقی کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت اس نکتے کو یاد رکھنا چاہیے کہ جمالیات کا حقیقی ظہور اس وقت ہوا جب فنون لطیفہ یعنی فن تعمیر، فن موسیقی، فن شاعری، فن رقاصی، فن سنگ تراشی اور فن مصوری وغیرہ کا ارتقا ہو چکا تھا۔

مذکورہ بالا تمام فنون کے آغاز میں فن کار کا احساس جمال حسن پرستی بڑی حد تک زیریں لہر کی طرح شعور میں وجود تھا لیکن پختہ جمالیاتی شعور تکمیل فن کے بعد ہی جلوہ گر ہوا۔ اجنتا ایلورا اور تاج محل کا مجرد مشاہدہ جمالیات نہیں بلکہ ان عمارتوں کو دیکھ کر جو مسرت حاصل ہوتی ہے دراصل وہی مطالعۂ جمالیات ہے۔

اس تمہید اور وضاحت کے بعد ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عرفان صدیقی کی شاعری میں جمالیاتی رنگ کہاں کہاں اور کیسے کیسے رونما ہوا ہے۔ اس عنصر نے ان کے کلام میں کس کس طرح تازگی، جدت، انفرادیت اور اثر انگیزی کے جوہر پیدا کر دیے ہیں؟ کبھی اپنی بے چین روح اور مضطرب جوان دل کی نفسیاتی کیفیت کو پیش کرتے کرتے اپنے احساس جمال کو درد تنہائی کا مداوا بنایا ہے۔ مثلاً:

بند کمرے میں پراگندہ خیالوں کی گھٹن
اور دروازے پہ اک آوازِ پا جیسے ، ہوا
پانیوں میں ڈوبتی جیسے رُتوں کی کشتیاں
ساحلوں پر چیختی کوئی صدا ، جیسے ہوا
کتنا خالی ہے یہ دامن، جس طرح دامانِ دشت
کچھ نہ کچھ تو دے اسے میرے خدا ، جیسے ہوا

محولۂ بالا اشعار میں بند کمرہ، پراگندہ خیالوں کی گھٹن، دروازہ، رتوں کشتیاں، چیختی صدا، دامن اور دشت وغیرہ ایسے الفاظ وتراکیب کا برجستہ وبرمحل استعمال اور ''ہوا'' جیسی غیر مرئی شے سے ردیف کا کام لینا اگر عرفان کی جمالیاتی تخلیق کا نادرونایاب رنگ سخنوری نہیں تو پھر کیا ہے۔ غور کیجیے کہ شاعر کا اپنے رب کو یہ مشورہ دینا کہ دامانِ دشت کو کسی اور چیز سے بھرنا نہیں چاہتا تو کم از کم ہوا جیسی ہلکی پھلکی چیز سے ہی بھردے۔ بظاہر یہ مشورہ کتنا مضحکہ خیز لیکن بہ باطن کس درجہ اہم شاعرانہ مشورہ ہے جو بغیر ایک لطیف تصورِ جمال کے سوچا ہی نہیں جاسکتا۔

عرفان صدیقی کی شاعری کا دوسرا دوران کے دوسرے مجموعہ کلام ''شب درمیاں'' سے شروع ہوتا ہے جو ۱۹۸۴ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس مجموعے میں سب سے پہلی چیز جو ہمارے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ ایسے اشعار ہیں جو افتتاحیہ کی سرخی کے تحت کہے گئے ہیں۔ آغاز یوں ہوتا ہے:

مجھ کو لکھنا اگر آجائے تو کیا کیا لکھوں
کبھی اپنا کبھی دنیا کا سراپا لکھوں

گویا شاعر کو کچھ انہونی یا اچھوتی بات کہنے کا خواہش مند ہے لیکن وہ بڑے پس وپیش اور تذبذب میں ہے کہ آخر لکھے تو کیا لکھے۔ قلم اٹھانے کے بعد بھی اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آپ بیتی لکھے یا جگ بیتی؟ اس کو اس تلخ حقیقت کا بخوبی اعتراف ہے کہ:

جو مرا دکھ ہے وہ، ہر شخص کا دکھ لگتا ہے
میں کسے غیر کہوں اور کسے اپنا لکھوں؟

بہ الفاظ دیگر شاعر غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کو بھی اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتا ہے۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی شاعر اپنی ذات کی طرف سے نظریں ہٹا کر کائنات کا جائزہ لینے لگتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ کائنات تو اپنی ذات سے بڑھ کر سیکڑوں اور ہزاروں نئے موضوعات کا خزانہ

ہے۔وہ کسی منشور یا Prism کی طرح اپنی فکر کی جمالیاتی خوردبین یا ذرہ بین (Microscope) کو گھماتا ہے تو رنگ برنگے جلوے اس کی نگاہ احساس کے سامنے آتے ہیں مثلاً:

ریت پر دھوپ، کوئی عکس تو دکھلائے کہ میں
ایک بوسہ سر پیشانیِ صحرا لکھوں

بوسہ کسی چیز یا انسان کے جسم پر لیا جاتا ہے یا ہوا میں اڑایا جاتا ہے لیکن اس شعر کو پڑھ کر ہمارے علم میں یہ اضافہ بھی ہوا کہ بوسہ سر پیشانیِ صحرا کا بھی لیا جاسکتا ہے۔ یقیناً یہ ایک بالکل نیا اور عجوبائی بیان ہے جو شاعر کے ذہن کی خالص جمالیاتی سوچ سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعر کو ہر اس چیز میں جمالیاتی حسن نظر آتا ہے جو اس کے خیالات کو شعر کہنے پر اکساتی ہے خواہ وہ مناظر فطرت ہوں، پرندے ہوں یا ماضی کی حسین یادیں ہوں۔ ''شب درمیان'' کے اشعار دیکھیے:

چڑیوں ، پھولوں ، مہتابوں کا
مرا منظر نامہ خوابوں کا
یہی بستی میرے پُرکھوں کی
یہی رستہ ہے سیلابوں کا

اگر عرفان صدیقی اپنی غزل کے مطلع میں محض چڑیوں، پھولوں اور مہتابوں کا ذکر بھی کر دیتے تو غزل میں کافی رعنائی پیدا ہو جاتی لیکن ان چیزوں کو خوابوں کا منظر نامہ کہہ دینے سے شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا اسی طرح پُرکھوں کی بستی اور سیلابوں کا تذکرہ لاجواب ہے۔

شعور جمال کا ایک انعام چشم بصیرت کا کھل جانا یعنی قبل از وقت آنے والے یا وقوع پذیر حالات کی آہٹ مل جانا بھی ہے۔ جس طرح گھوڑا میلوں دور سے سانپ کے وجود کو محسوس کر کے اپنے پاؤں پٹخنے لگتا ہے یا آلۂ زلزلہ شناسی زلزلہ آنے سے پہلے اس کے وقت اور محل

وقوع سے ہمیں آگاہ کر دیتا ہے وہی حالت اس شاعر کی ہے جسے اللہ نے غیر معمولی شعور جمال ودیعت فرمایا ہو۔ عرفان صدیقی کے حسب ذیل اشعار اس حقیقت کے ترجمان ہیں:

اگلے دن کیا ہونے والا تھا، یہ اب تک یاد ہے
انتظار صبح میں وہ سارے گھر کا جاگنا
آخری امید کا مہتاب جل بجھنے کے بعد
میرا سوجانا، مرے دیوار و در کا جاگنا

مذکورہ بالا اشعار میں انتظار صبح اور مرے دیوار ودر کا جاگنا اسی دور اندیشی اور پیش بینی کی طرف اشارا کرتے ہیں جس کا ایک صحت منداور مثالی احساس جمال شاعر سے مطالبہ کرتا ہے۔ دیگر بہت سے اجزائے شعور جمال کی طرح آزادیٔ فکر ونظر اور تلاش ہم سفر بھی اس کی تکمیل میں از بس ضروری بلکہ لازمی ہے۔ ''شب درمیان'' کی پانچ اشعار پر مشتمل ایک غزل جو عرفان صدیقی نے اپنے دیرینہ حبیب مرحوم شہریار کے نام معنون کی ہے، ہمارے دعوے کی انتہائی خوبصورت دلیل کہی جاسکتی ہے:

دلوں سے درد کا احساس گھٹتا جاتا ہے
یہ کشتگاں کا قبیلہ، سمٹتا جاتا ہے
کھلے پروں پہ فضا تنگ ہوتی جاتی ہے
اور آسمان زمینوں میں بٹتا جاتا ہے
ہزار قرب کے امکان بڑھتے جاتے ہیں
مگر وہ ہجر کا رستہ جو کٹتا جاتا ہے

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعر کے ساتھ ساتھ پہلے بہت سے ایسے ہم خیال اور ہم جذبہ شعرا تھے جنھوں نے مبتلائے درد عشق میں اپنی جانیں دے دیں اور جانباز صرف گنتی کے رہ گئے۔ جغرافیائی تقسیم نے ہمیں اپنے ہم نواؤں سے دور کر دیا۔ سچ پوچھو تو مستقل ہجرت

وجدائی نے ہمیں ان تکالیف کا عادی بنادیا ہے۔ دردفرقت میں ہمیں لذت ملنے لگی۔اب اگر کوئی ہم سے پرانے احباب کے ساتھ مل بیٹھنے پر اکساتا ہے تو ہمیں وحشت سی ہونے لگتی ہے یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو ہمیں شعور جمال نے عطا کی ہے۔ گویا اب ہم غالبؔ کے اس شعر کو سمجھے ہیں کہ:

عشرت قطرہ ہے ، دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا

اطالوی مفکر کُروچے (Bendetto Croce) نے (جو اٹلی میں نیپلز کے پاس ایک قریہ میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوا) فلسفۂ جمالیات کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ اظہاریت اس کے یہاں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس اظہاریت (Expressionalism) کو کُروچے کے جمالیات کی اساس سمجھنا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھنا یہ چاہیے کہ شاعر یا ادیب کے اظہارفن کا انداز کیسا ہے۔

اس قول کی روشنی میں جب ہم عرفان صدیقی کے کلام پر عمومی نقطۂ نظر سے اور شب درمیان کی غزلوں پر خصوصی زاویۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کے یہاں اظہار جذبات وخیالات پر مکمل گرفت موجود ہے۔ اس گرفت کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ وہ اظہار کے بیشتر وسائل سے کام لیتے ہیں اور لفظ و معنی کے انتہائی دلکش ادغام سے اپنی ایک ایسی غیر معمولی شعری کائنات کے خالق بن جاتے ہیں جو ان کے وضع کردہ اصولوں کے منفرد معیار کو قائم رکھ سکے۔ ہم بڑی حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری خود اپنے ہی وضع کردہ اصولوں کے سانچوں میں اتنی مہارت کے ساتھ ڈھلی ہے کہ وہ ہمارے سامنے فکری میلانات ورجحانات کے رنگ برنگے مرقعے پیش کردینے پر قادر ہے۔ نمونے کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

عقدۂ جاں بھی رمزِ جفر ہے ، جتنا جتنا غور کیا
جو بھی جواب تھا میرا پنہاں، میرے حرف سوال میں تھا

تیغ ستم کے گرد ہمارے خالی ہاتھ حمائل تھے
اب کے برس بھی ایک کرشمہ ،اپنے دست کمال میں تھا

علم جفر کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ چند نمایاں سوال کیے جاتے ہیں جن کا جواب پوشیدہ طور پر ملتا ہے۔ شاعر اپنے عقدۂ جاں یعنی زندگی کے بارے میں کچھ جاننے کا خواہش مند ہے۔ جواب غیب سے ملتا ہے لیکن چند علامتوں کے ذریعہ۔ مختصر یہ کہ شاعر جو جاننا چاہتا ہے اس کا جواب بھی اتنا ہی نا معلوم ہے جتنا مبہم کہ اس کا سوال تھا۔ یہ ایک معمہ ہے۔ شاعر کے نزدیک معمہ بنانا اور پہیلیاں بجھا کر سننے والے کو حیرت واستعجاب میں مبتلا کر دینا بھی اس کے شعور جمال کی تشنگی کو مٹا دیتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں اشعار اپنے اپنے رنگ میں اسی قبیل کے فن پارے ہیں۔

عرفان صدیقی کی شاعری کا تیسرا دور اپنی تمام تر خصوصیات وامتیازات کے ساتھ ان کے تیسرے مجموعۂ کلام ''سات سمٰوات''میں جلوہ فگن ہے جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ سات سمٰوات کا مطالعہ کرتے وقت قاری کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ اپنے مقام پر عجیب وغریب ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے تمثال گری (Visualisation) کے جس ہنر کے ساتھ کینوس اور شب درمیان میں شامل سخنوری کے جوہر دکھائے تھے وہ ان کی مسلسل جمالیاتی ریاضت کے نتیجہ میں نقطۂ کمال تک پہنچ گئے ہیں اور اس تیسرے مجموعے سات سمٰوات سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنا وہ رنگ بالآخر پا ہی لیا ہے جس کا وہ متلاشی تھا۔ یہ مجموعہ اپنے قاری پر یہ راز افشا کرتا ہے کہ اب شاعر نے ساتوں آسمانوں میں بکھری ہوئی ساری آفاقیت کو اپنے شعور جمال کی مدد سے شعری استعارہ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ خاک، ہوا،

چاند، سورج، ستارے، شفق، قوسِ قزح، بادل، برق وباراں، شبنم اور کہکشاں غرض کہ تمام اجرام فلکی کے حوالے بار باران کے اشعار میں ملتے ہیں اور ہر بار نئے مفاہیم کی طرف اشارا کرتے ہیں:

یاد آتی ہوئی خوشبو کی طرح زندہ ہم
کسی گزرے ہوئے موسم کے نمایندہ ہم
اڑ گئے آنکھ سے سب لمحۂ موجود کے رنگ
ہوگئے نقش گر رفتہ و آیندہ ہم
اس اندھیرے میں کہ پل بھر کا چمکنا بھی محال
رات بھر زندہ و رخشندہ و تابندہ ہم

ان اشعار میں 'خوشبو کی طرح زندگی' تشبیہ کی ندرت کا اشاریہ ہے۔ 'گزرے ہوئے موسم' خوشگوار ماضی ہے۔ دوسرا شعر اس حقیقت کا غماز ہے کہ فی الحال ہم دنیا میں مشہور و معروف نہ سہی لیکن ہمارا ماضی بے حد شاندار اور مستقبل ہمارے نرالے ذوق کا آئینہ ہے۔ ہم مایوسی میں بھی رجائیت، حوصلہ مندی اور امید پیدا کر لیتے ہیں یہی ہماری زندگی اور پر جوش و با مقصد فعالیت اور سرگرمیوں کا راز سر بستہ ہے جس سے ہماری موجودہ نسل قطعاً ناواقف ہے۔

موجودہ زمانے کے بد مذاق ماحول اور تہذیبی وتمدنی زوال کا تقاضہ تو یہ تھا کہ عرفان صدیقی کی شاعری فانی کی غزل یا میر انیس کا مرثیہ بن جاتی لیکن ان کی جمال آشنا فکر نے یہاں بھی ایک نئے انداز کی شان دکھائی ہے۔ نئی تشبیہات، جدید ترین علامات واستعارات، خود ساختہ الفاظ اور تازہ بہ تازہ شعری اصطلاحات کے نئے طرز احساس نے ان کی شاعری کو جو اچھوتا آہنگ بخشا اس میں میر وغالب کی شعری روایت بھی موجود ہے اور وہ روایت بھی جو شاعری کے نئے اور پائیدار معیار بھی قائم کرتی ہے۔

اب عرفان جمال کا شاعر، عرفان صدیقی کے آخری شعری شاہکار "عشق نامہ" جو ۱۹۹۷ء

میں چھپا تھا عرفان کی شاعری کے تعلق سے ان کے ایک قریبی دوست سید عقیل حیدر لکھتے ہیں کہ:

''عرفان صدیقی، دوسرے شاعروں کی طرح کسی غزل کو ایک نشست میں مکمل کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ ایک ایک شعر پر کئی کئی گھنٹے اور کئی کئی دن تک غور کرتے۔ مثال کے طور پر ان کے مشہور مطلع کا ثانی مصرعہ'' کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لیے'' انھوں نے یوں ہی روانی میں ایک دن کہہ کر کسی کاغذ پر تحریر کر لیا تھا لیکن مطلع کے لیے انھوں نے مصرعۂ اولیٰ قریب چھ ماہ کی کوششوں کے بعد لگانے میں کامیابی حاصل کی'' (ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ عرفان صدیقی نمبر اکتوبر۔نومبر ۲۰۱۰ء ص ۶۳)

مطلع اس طرح سے ہے:

اٹھو ، یہ منظر شب تاب دیکھنے کے لیے
کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لیے

مذکورہ غزل کا پہلا شعر جسے بیت الغزل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی غزل کے دوسرے شعر میں مضمون کی ندرت بے ساختہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ حریف یا رقیب کا ذکر تو اکثر شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن عرفان کے اس شعر میں کہ ایک ایسا شخص جو اپنے حریف کی موت کو دیکھنے کے لیے خود اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ایسی نظیر شاید ہی کسی شعرا کے یہاں نظر آئے:

عجب حریف تھا ، میرے ہی ساتھ ڈوب گیا
مرے سفینے کو غرقاب دیکھنے کے لیے

''عشق نامہ'' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عرفان نے سراپاے محبوب کی تجسیم (Personification) کے بجائے ، جمال محبوب کے نقش کو کافی گہرائی عطا کی ہے اور اس مقصد کے حصول کی خاطر انھوں نے بجائے پیار کی تجسیم نہ کرتے ہوئے محبوب کے سراپا کو اس کے عمل سے مربوط کر دیا یہ ان کی غیر معمولی ہنر مندی ہی کہی جائے گی مثلاً ''ستارہ ادا'' کی

ترکیب وضع کر کے اسے محبوب کے ساتھ تواتر کے ساتھ استعمال کرنا جس میں حسن، فاصلہ اور فنا پذیری کی صفت بھی شامل ہے:

عجب ہے میرے ستارہ ادا کی ہم سفری
وہ ساتھ ہو تو بیاباں میں رت جگا ہوجائے

عشق نامہ کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے محبوب کے لیے بانوئے شہر کی خوبصورت ترکیب وضع کی ہے:

ناقۂ حسن کی ہم رکابی کہاں؟ خیمۂ ناز میں باریابی کہاں؟
ہم تو اے بانوئے کشورِ دلبری پاسداروں میں ہیں، ساربانوں میں ہیں

مختصر یہ کہ ''عشق نامہ'' عرفان صدیقی کے دیگر تمام شعری مجموعوں سے بہ اعتبار کیفیت وکمیت مختلف ہے اور اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مرحوم نے کلاسیکی شعری روایات کو جدید ترین آہنگ شاعری کے امتزاج سے ایک نئی شعری ''بوطیقا'' مرتب کردی ہے جو صدیوں تک اس عظیم اور طبع زاد شاعر کی یاد دلاتی رہے گی۔

عرفان صدیقی مرحوم کی شاعرانہ فتوحات ذکر کرتے ہوئے ہم ان کے مجموعہ کلام ''ہوائے دشت ماریہ'' کو یکسر فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ مجموعہ منقبتوں، سلاموں اور نوحوں پر مشتمل ہے جسے ادارۂ تمدن اسلام (کراچی پاکستان) نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا تھا۔ یہ ایک وقیع تر مجموعہ ہے کیونکہ اس میں تاثر، عقیدت، سبق آموزی اور شعریت سبھی کچھ بہ یک وقت اکٹھا ہو گئے ہیں۔ پاکیزگیِ جذبات، حق گوئی اور ظلم وستم کے خلاف مہذب احتجاج کی حیثیت سے یہ مجموعہ ہمیں ایک بالکل نئے عرفان صدیقی سے متعارف کراتا ہے۔ بے شک ہوائے دشت ماریہ میں سرکار دوعالم صلعم، ان کے اہل بیت علی الخصوص مسلمانوں کے خلیفۂ چہارم حضرت علی کے چھوٹے فرزند حضرت امام

حسین اوران خانوادے پر کربلائے معلیٰ میں ہونے والے مظالم کا پُر درد تذکرہ ہے لیکن اس تذکرہ میں بھی عرفان صدیقی کی فکرِ نو نے ہزاروں نئے گوشے پیدا کیے ہیں جو انھیں کا حصہ تھے:

دلِ سوزاں پہ جیسے دستِ شبنم رکھ دیا دیکھو
علیؑ کے نام نے زخموں پہ مرہم رکھ دیا دیکھو
گلوئے خشک میں سوکھی پڑی ہے پیاس کی نہر
خبر نہیں کہ ہے پانی کا ذائقہ کیسا
یہ لوگ دستِ جفا سے کسے پکارتے ہیں
یہ بازگشت سناتی ہے مرثیہ کیسا

مذکورہ اشعار کی پوری نظم میں اگرچہ واضح طور پر سانحۂ کربلا کی جملہ جزئیات بالترتیب بیان نہیں کی گئی ہے پھر بھی چیدہ چیدہ اشعار میں بڑا فنکارانہ ربط پایا جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو بے ربطی میں ربط بھی تذکرۂ جمال کا ایک انداز ہے۔ ہر شعر میں یا تو سوالیہ طرز ہے یا علامت استفہام کی کیفیت موجود ہے۔ استعاروں کے تسلسل میں بھی اشعار کو معنی آفریں بنادیا ہے۔ علم بیان کی اصطلاح میں اسے خوش فضائی کہا جاسکتا ہے۔

عرفان صدیقی کے تعلق سے ایک سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے احباب اور شناساؤں کی روایت کے مطابق نہ تو انھیں اخبار ورسائل میں اپنا کلام چھپوانے کا شوق تھا نہ مشاعروں میں کلام سنانے کا۔ ان کی بیشتر غزلوں میں مقطع کہنے کا التزام بھی نہ تھا۔ وہ تو ایک قلندر صفت انسان تھے۔ بلاشبہ ان میں احساس خودداری اور حفظ مراتب بہت تھا۔ ہوائے دشت ماریہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں شامل ایک نظم (جو عرفان کی مشہور ترین نظموں میں شمار ہوتی ہے) ان کے تخلص سے شروع ہوتی ہے:

دست تہی میں، گوہر نصرت کہاں سے لائے؟
عرفان! تم یہ درد کی دولت کہاں سے لائے؟
پانی نہ پائیں ساقیِ کوثر کے اہلِ بیت
موج فرات اشک ندامت کہاں سے لائے؟

مذکورہ بالا سلام کے سلسلے میں ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی نے ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا ہے۔ اس وقعہ کو یہاں بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ نیّر مسعود لکھتے ہیں: ''مجھے اردو کے صاحب دل، مذہبی شاعر مرحوم وفاؔ ملک پوری یاد آرہے ہیں۔ وہ عرفان صدیقی سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ میں نے انھیں یہ سلام سنایا:

عرفان! تم یہ درد کی دولت کہاں سے لائے؟

پورا سلام مرصع ہے لیکن وفاؔ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ میں نے سلام ختم کر کے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا، چپکے چپکے رو رہے ہیں۔ کہنے لگے: صاحب میں نے پورا سلام سنا ہی نہیں۔ میں تو اس کے ایک ہی شعر میں کھو کر رہ گیا:

پانی نہ پائیں ساقیِ کوثر کے اہلِ بیت
موج فرات اشک ندامت کہاں سے لائے؟

عرفان صدیقی بہت جلد مذہبی شاعروں کی صف اول میں آ گئے'' (مضمون: عرفان صدیقی، کینسر، آخری ملاقاتیں۔ مشمولہ نیا دور لکھنؤ اکتوبر۔ نومبر ۲۰۱۰ ص ۸۸)

اس مضمون میں ہماری بنیادی Theme یہ تھی کہ عرفان صدیقی کی شاعری کی بنیاد جمال عاشقی پر ہے یعنی وہ زندگی کے جس شعبہ کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں اس میں فن جمالیات Aesthetics Art کی کارفرمائی کے جلووں سے ضرور کام لیتے ہیں۔ ابن آدم کی سب سے بڑی دولت کا نام احساس جمال ہے اور یہ احساس جمال کسی بھی شکل میں ظاہر ہوسکتا

ہے کیوں کہ اظہاریت ہی اس کا کامیاب ترین وسیلہ ہے۔ عرفان صدیقی نے اس وسیلے سے اپنی مٹھی بھر شاعری سے جمال عاشقی کا مرقع چغتائی تیار کر دیا ہے۔

بجھ رہی ہیں میری شمعیں ، سو رہے ہیں میرے لوگ
ہو رہی ہے صبح ، قصہ مختصر کرتا ہوں میں

☆☆☆

طلسماتی جہان معنی کا شاعر: عرفان صدیقی

.........محمد زاہد الحق (حیدر آباد)

بیسویں صدی کے نصف آخر یعنی جدیدیت کے دورِ عروج میں جن شعرا نے اپنے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے ہر خاص و عام کو اپنی جانب متوجہ کیا ان میں احمد مشتاق، بشیر بدر، ندا فاضلی، شہریار، ظفر اقبال، افتخار عارف کے ساتھ ساتھ عرفان صدیقی کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ عرفان صدیقی کے کلام کو کبھی احمد مشتاق تو کبھی افتخار عارف کے کلام کے سامنے رکھا جاتا اور خوب خوب بحثیں ہوتیں۔ انھی مباحث نے اردو کے عام قارئین کو عرفان صدیقی کی شاعری کے متعلق ایک نئے زاویے سے سوچنے اور ان کی شاعری پر از سر نو غور کرنے کا موقع دیا۔ اسی دوران ہمیں بڑی شدت سے یہ بات محسوس ہوئی کہ عرفان صدیقی اپنی شاعری اور اس میں مستعمل لفظیات سے ایک نیا شعری نظام تیار کر رہے تھے جو بعد میں ان کا نقطۂ امتیاز ٹھہرا۔ اس پس منظر کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ان کو بیداری یا awakening کا شاعر بھی کہا گیا۔ اسی زمانے کا ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

اٹھو یہ منظر شب تاب دیکھنے کے لیے
کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لیے

اور اسی غزل میں انھوں نے وہ شعر بھی کہا جو اپنی مثال آپ ہے۔ رقیب، دشمن، دشمنی اور حریف کے حوالے سے اردو شاعری میں بہت سے اشعار موجود ہیں مگر عرفان صدیقی نے اپنے اس

شعر میں جذبۂ رقابت کی جس انتہا کو پیش کیا ہے اس کی دوسری مثال کہیں اور نظر نہیں آتی۔

عجب حریف تھا میرے ہی ساتھ ڈوب گیا
مرے سفینے کو غرقاب دیکھنے کے لیے

عرفان صدیقی کا شمار جدید شاعروں میں ہوتا ہے، تاہم روایت کی پاسداری ان کے یہاں جھلکتی ہے۔ اگر ہم اردو شاعری کی کلاسیکی روایت، جس کی بنیاد عشق پر رکھی گئی ہے، کے عناصر کو تلاش کریں تو ہمیں بڑی آسانی سے ان کے یہاں یہ عشقیہ لوازمات مل جاتے ہیں۔ عشق جو گناہ آدم کا سبب بنا، وہی کائنات کی تعمیر کا ضامن بھی ہوا۔ عشق کی تاثیر اپنی جگہ مسلم ہے اور ہر زمانے میں اس کا سکہ چلتا رہا ہے۔ عرفان صدیقی کے پاس جو عشقیہ عناصر پائے جاتے ہیں وہ قدرت کا عطیہ ہیں اور ان کا خمیر اردو کی کلاسیکی عشقیہ روایت سے اٹھا ہے، لیکن ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ اس پیرائے میں بھی عرفان صدیقی کا اسلوب کلاسیکیت یا ترقی پسندی و جدیدیت سے مستعار معلوم نہیں ہوتا بلکہ اختراعی معلوم ہوتا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں ایسے اشعار وافر تعداد میں موجود ہیں جن کے ذریعہ عشقیہ اقدار پر افسوس کیا گیا ہے۔ اس کی بازیافت کی کوشش کی گئی ہے اور اسی کوشش نے ان کے یہاں منفرد احساس کو جگہ دی ہے:

وہ یہاں ایک نئے گھر کی بنا ڈالے گا
خانۂ درد کو مسمار کیا ہے اس نے

پہلے ایسا تو نہ تھا ذائقۂ ہجر و وصال
اس تعلق میں یہ کیا چیز ملا دی گئی ہے

اتنی امید نہ آتے ہوئے برسوں سے لگاؤ
حال بھی تو کسی ماضی ہی کا مستقبل ہے

ہمارے داغ چھپائیں روایتیں کب تک
لباس بھی تو پرانا تھا پھٹ گیا

آخر عرفان صدیقی کا ذہن روایتی تھا، لیکن اس کی تربیت ترقی پسندی کے زیر اثر ہو رہی تھی۔ لہٰذا جب ذہنی بلوغ انتہا کو پہنچا تو عرفان صدیقی نے خود کو جدیدیت کی لہروں میں بہتا پایا اور ایسے عالم میں جب احساس کو لفظوں کا جامہ پہنانے کا وقت آیا تو انھیں کلاسیکیت و ترقی پسندی کا دامن تنگ نظر آنے لگا، لیکن اس مقام پر بھی انھوں نے کلاسیکیت سے انحراف نہیں کیا اور نہ ہی ترقی پسندی سے منھ موڑا۔ انھوں نے ان کے مابین اعتدال کا راستہ نکالا اور اس بات کا خیال رکھا کہ جدید و قدیم دونوں کے حسن کو شاعری میں محفوظ کر دیا جائے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ غزل نئی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ عرفان صدیقی بھی قدامت پرستی کے حصار سے نکل آئے:

کون ہم خانہ خرابوں کو کرے گا برباد
جو اس آشوب میں غارت ہے سلامت ہے وہی

اب تری گرمئ گفتار سے یاد آتا ہے
ہم نفس ہم بھی کبھی شعلہ زباں تھے کتنے

شکستہ پیرہنوں میں رنگ سا کچھ ہے
ہمارے ساتھ ابھی نام و ننگ سا کچھ ہے

نبضِ عالم میں رواں تیری حرارت ہی تو ہے
کہ یہ عالم تیرے ہونے کی بدولت ہی تو ہے

عرفان صدیقی کے یہاں روایتی عشقیہ مضامین کے علاوہ ہجر و وصال کا کرب، تشکیل کے مراحل اور زندگی کے نشیب و فراز نے کربلا کے استعارے کو بھی وجود بخشا

ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ عرفان صدیقی جدید شاعر تھے لیکن جدیدیت کے بینر تلے جس طرح کی شاعری کی جارہی تھی عرفان صدیقی کی شاعری اس سے مختلف نظر آتی ہے۔دنیا کی بے ثباتی، تشخص کی بازیافت، بے چینی، ذات میں گم ہونے کا احساس اور زندہ رہنے کی کسک نے جدید شاعروں کوایسے موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا تھا جہاں ہر چیز نئی تھی اور انھیں اپنی دنیا کو خود ہی بنانا اور خود سنوارنا بھی تھا۔اس احساس نے اس کا رشتہ سب سے پہلے قاری سے منقطع کیا اور تشخص کی بازیافت نے پرانی روایتوں کو ترک کر کے نئی ترکیبوں، نئی علامتوں اور نئے لہجے میں بات کرنے کا احساس پیدا کیا۔لیکن ہر شاعر اس زمرے میں آئے، ایسا نہیں تھا۔

عرفان صدیقی نے روایت کو نئے زاویے سے دیکھا اور میر اور غالب کے ذریعہ رکھی گئی بنیاد پر ہی اپنی عمارت کی اینٹ رکھی ۔ انھوں نے کبھی ماضی کو فراموش نہیں کیا، البتہ پرانے شاہراہ پر نئے گل بوٹے کھلانے کی کوشش ضرور کی ہے۔علامتوں، استعاروں اور ترکیبوں کا استعمال اپنے پیش رووں سے منفرد ہوتے ہوئے بھی منفرد نہیں تھا۔ چراغ، سفر، پتھر، ستارۂ شب، عذاب رفتہ، بے نوا پتے، شاخ بے شجر، ستارۂ ہجر وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو معنی کی کئی طلسماتی جہتوں کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں:

طلوع ہونے کو ہے پھر کوئی ستارۂ غیب
وہ دیکھ پردۂ افلاک ہٹتا جاتا ہے

رختِ سفر اٹھا گیا کون سرائے خواب سے
رات پھر اس نواح میں گریۂ جاں بہت ہوا

ساری آوازوں کا انجام ہے چپ ہو جانا
نعرۂ ہو ہے تو کیا، شورِ سلاسل ہے تو کیا

ایک میں ہوں کہ اِس آشوبِ نوا میں چپ ہوں
ورنہ دنیا میری زخموں کی زبان بولتی ہے

درج بالا اشعار میں جتنی علامتیں، تراکیب اور استعارے استعمال ہوئے ہیں وہ سب کے سب شاعر کے منشا پر عمل کرتے ہوئے ہمارے ذہن کو اس جانب منتقل کر دیتے ہیں جدھر شاعر منتقل کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو محض چند مثالیں ہیں جب کہ ان کے مجموعے میں اس نوع کے اشعار کی کمی نہیں ہے جو ان کی اس خوبی کی نشاندہی کریں۔

عرفان صدیقی کی شاعری کا ایک اہم وصف کربلا کا استعارہ ہے جو انھیں ان کے معاصرین کے درمیان ممتاز کرتا ہے۔ حالاں کہ ان کے زمانے میں دوسرے شعرا نے بھی کربلا بطور استعارہ استعمال کیا ہے، تاہم جو پائداری عرفان صدیقی کے یہاں نظر آتی ہے وہ دوسروں کے یہاں ناپید ہے۔ کربلا میں جس طرح واقعات پیش آئے اس سے ہم اچھی طرح واقف ہیں، لیکن اس کے پس منظر میں عصر حاضر کا جائزہ لینا قابل تعریف ہے۔ عرفان صدیقی نے کربلا کے استعارہ کے ذریعہ آشوب جہاں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس حقیقت کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے کہ آج کے انسانوں کی زندگی کسی کربلا سے کم نہیں ہے۔ ایک وہ زمانہ جب حق و باطل نے اپنے ہونے کا ثبوت دیا اور اس بات کو ثابت کر دیا کہ

خبرداری کہ تاریخ حسینؓ و شمر چہ گوید
صدائے حق نہ ماندنیست از ہنگامۂ باطل

(سالک لکھنوی)

ٹھیک اسی طرح آج کا انسان بھی حرف انکار کی علامت بن چکا ہے اور کوفۂ نامہرباں کا سراغ دے رہا ہے۔ زندگی کی اس تگ ودو میں وہ اس مقام پر آپہنچا ہے جہاں ایمانداری، بے بسی، حق گوئی، کمزوری اور مجبوری و پریشانی سے گھرے لوگوں کا خیمہ ہے تو دوسری طرف ان

سے فائدہ اٹھانے والے جعلی، ظالم اور جابر لوگوں کا ہجوم ہے اور وہی مقتل ہے جہاں ان کے درمیان لڑائی ہونے والی ہے۔ کربلا کے تعلق سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اپنے بھولے ہوئے منظر کی طرف لوٹ چلو
گم شدہ تیرو! کسی سر کی طرف لوٹ چلو

ادھر تیر چلنے کو تھے بیقرار
ادھر سارے مشکیزے بھرنے کو تھے

تو وہ شب بھر کی رونق چند خیموں کی بدولت
اب اس میدان میں سنسان ٹیلوں کے سوا کیا تھا

بڑھتے ہوئے دشمن جیسی دوپہر
نیزوں جیسی تیز نوکیلی دھوپ

پھر اک عجیب تماشا رہے گا صدیوں تک
یہ کار زارِ کمان و گلو ہے کتنی دیر

اعلیٰ تخیل، عمدہ خیالات کو وجود بخشتا ہے اور عمدہ خیال کو کاغذ پر اتارنے کے لیے بہترین لفظیات کے انتخاب کی ضرورت پڑتی ہے۔ شاعر و ادیب اس وقت تک کسی بھی خیال کو عمدہ پیرائے میں بیان نہیں کر سکتے جب تک وہ اپنے مواد کی خاطر بہترین الفاظ کا انتخاب نہ کر لیں۔ حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں اس خوبی کو تفحص الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ عرفان صدیقی کا کلام لفظیات کے عمدہ انتخاب سے مزین ہے۔ ہر شاعر کا اپنا لہجہ ہوا کرتا ہے اور لہجے کی انفرادیت شاعر کے منفرد ہونے کی دلیل پیش کرتی ہے۔ عرفان صدیقی کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس بات کو آسانی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ لفظیات کے باب میں عرفان صدیقی نے اپنے کمالات کے جوہر دکھائے ہیں اور بطور نمونہ اپنے کلام کو ہمارے سامنے اس

طرح سے پیش کیا ہے کہ لفظوں کا در و بست معنوی سطح پر نئے نئے مفاہیم کے در وا کرتا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ کریں:

روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

کہیں کسی کے بدن سے بدن نہ چھو جائے
اس احتیاط میں خواہش کا ڈھنگ سا کچھ ہے

اداس خشک لبوں پر لرز رہا ہوگا
وہ ایک بوسہ جو اب تک مری جبیں پہ نہیں

جسم کو جسم سے ملنے نہیں دیتی کمبخت
اب تکلف کی یہ دیوار گرا کر دیکھیں

عرفان صدیقی نے اپنی شاعری میں قدیم و جدید یعنی کلاسیکیت سے جدیدیت تک کی بھرپور پاسداری کی ہے۔ انھوں نے نہ تو مکمل طور پر روایت سے بغاوت کی ہے اور نہ ہی جدیدیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ ذیل کے دو شعر دیکھیں جس میں انھوں نے روایتی لب و لہجے کی پاسداری بھی کی ہے اور جدید طرز سخن کو بھی بخوبی اپنایا ہے۔ اس میں اردو شاعری کا روایتی مزاج بھی سانسیں لیتا ہوا نظر آتا ہے تو دوسری طرف چراغ کے حوالے سے ایک نیا زاویہ نظر بھی موجود ہے:

ہوشیاری دل نادان بہت کرتا ہے
رنج کم سہتا ہے اعلان بہت کرتا ہے

رات سے جیت تو سکتا نہیں لیکن یہ چراغ
کم سے کم رات کا نقصان بہت کرتا ہے

عرفان صدیقی نے اپنے اشعار کے ذریعہ نہ صرف وقت اور سماج بلکہ سیاسی جبر کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ تقسیم ملک اور سرحدوں کے مضامین کو اس زمانے کے بیشتر شعرا نے قلمبند کیا ہے۔ آیئے پہلے پروفیسر اعزاز افضل کا یہ قطعہ دیکھیں:

ہزاروں سرحدوں کی بیڑیاں قدموں سے لپٹی ہیں
ہمارے پاؤں کو بھی پر بنا دیتا تو اچھا تھا
پرندوں نے کبھی روکا نہیں رستہ پرندوں کا
خدا دنیا کو چڑیا گھر بنا دیتا تو اچھا تھا

اب دیکھیے اسی نوع کے مضمون کو اپنے منفرد لب و لہجے میں عرفان صدیقی نے کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے:

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچیے آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

ان کے اشعار میں کہیں کہیں ایسے لطیف اشارے بھی موجود ہیں جن سے جسم و جان یا گوشت پوست کے ڈھانچے کی طرف کچھ مخاطبت کا پہلو نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس مخاطبت میں ایک خاص قسم کی جنسی لپک بھی موجود ہے۔ اسی نوع کی شاعری کو لذتیت یا Eroticism کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ دو ایک مثالیں آپ بھی دیکھتے چلیں:

کبھی شراب کبھی انگبیں کبھی زہراب
وصال کیا ہے کسی کے بدن کا جادو ہے
روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

کھلتے ہی نہیں لمس پہ اس جسم کے اسرار
سیاح عجب شہر طلسماتؔ میں گم ہے

جسم کو جسم سے ملنے نہیں دیتی کمبخت
اب تکلف کی یہ دیوار گرا کر دیکھیں

مذکورہ بالا اشعار پر غور کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہر شعر میں عشق کی کیفیت بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔استعاروں نے عشق کے رنگ کو الگ الگ ڈھنگ سے باندھا ہے۔لفظوں کے دروبست نے اشعار کو معنیاتی سطح پر بلند کر دیا ہے۔استاد محترم پروفیسر ابوالکلام قاسمی اسی حوالے سے لکھتے ہیں:"ان کی اب تک کی غزلوں پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ اندازہ لگانے میں دقت نہیں ہوتی کہ شاعر نے غزل کی فارسی اور اردو روایت میں شامل ان تمام سرچشموں سے استفادہ کیا ہے جن کے ایجاز اور جامعیت نے غزل کو محض دو مصرعوں میں رمزیت، ارتکاز اور سلیقۂ اظہار کو سمیٹ لیا ہے"۔(شاعری کی تنقید -ابوالکلام قاسمی،ص- 201)

گویا عرفان صدیقی کی شاعری کا باریکی سے مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس بات کو مان لیتے ہیں کہ ان کی شاعری نہ صرف اپنے رنگ، ڈھنگ اور آہنگ کے اعتبار سے ایک منفرد قسم کی شاعری ہے بلکہ ان کی شاعری اپنے جلو میں ایک الگ طلسماتی جہان معنی اور نگار خانۂ رنگا رنگ رکھتی ہے۔ان کی شاعرانہ آواز نے اپنے زمانے میں ہر خاص و عام کو اپنی جانب متوجہ کیا اور آئندہ بھی عرفان صدیقی کی شاعری کی طرف لوگ راغب ہوتے رہیں گے۔

(2015)

عرفان صدیقی کی شاعری

حسین عیاض (دہلی) ....

تخلیقی متن کے مطالعے اور اس کی تعین قدر کے سلسلے میں تنقید کی تمام تر حصولیابیوں کے باوجود ایک سچائی یہ بھی ہے کہ نقادوں کے ذرا غیر ذمے دارانہ رویے سے نسبتاً بہت اچھے اور پر قوت متن پیچھے چلے گئے ہیں۔ اس کی مثالیں ہماری ادبی تاریخ میں جگہ جگہ مل جائیں گی۔ لیکن یہ صورتحال بہت دیر تک قائم نہیں رہتی۔ اچھا متن دیر سے ہی سہی اپنے بال و پر نکالتا ہے اور اپنے قاری پیدا کرتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ تمام غیر ادبی اور غیر تنقیدی لاحقے ختم ہونے لگتے ہیں۔ عرفان صدیقی کے شعری متن کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ نئی غزل کی مختلف جہتوں پر جتنی کثرت سے لکھا گیا ہے وہ حیرت میں ڈالتا ہے لیکن اس سے زیادہ حیران کن امر یہ ہے کہ عرفان صدیقی نئی غزل کے بیشتر تنقیدی کلامیوں سے خارج ہیں۔ اس صورتحال کو پیدا کرنے میں ایک سطح پر خود عرفان صدیقی کی طبیعت کا بھی دخل رہا ہے۔ ان کا مزاج اشتہار بازی اور ''عرض ہنر'' سے بہت دور تھا۔ خود عرفان صدیقی کو اس بات کا احساس تھا۔

تم بتاتے تو سمجھتی تمہیں دنیا عرفان
فائدہ عرضِ ہنر میں تھا ہنر میں کیا تھا

لیکن وہ اپنے بیشتر معاصرین سے اس معنی میں زیادہ ثروت مند ٹھہرے کہ بعد کہ شعراء نے تخلیقی سطح پر ان میں زیادہ دلچسپی لی، آج کا شعری منظر نامہ تو اور چونکانے والا ہے۔ اس وقت ہونے

والی اچھے شاعری پر عرفان صدیقی کے جتنے گہرے اثرات نظر آتے ہیں اسے عرفان صدیقی کے شعری متن کی قوت اور اس کے نمو سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تنقید ادب میں بہت کچھ کرتی ہے لیکن سب کچھ نہیں کرتی۔ ایک حد آتی ہے کہ صرف متن رہ جاتا ہے اور آگے کا سفر وہ خود طے کرتا ہے۔ عرفان صدیقی کے شعری متن نے یہ سفر پوری کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے۔ عرفان صدیقی کے پانچ شعری مجموعے شائع ہوئے 'کینوس' 'شب درمیان' 'سات سماوات' 'عشق نامہ' اور 'ہوائے دشت ماریہ' نام ہی عرفان صدیقی کے مختلف ذہنی رویہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ عرفان صدیقی کی شاعری کے بارے میں قطعی طور پر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ان کے تخلیقی فشار کو تنقیدی اصطلاحوں سے نشان زد کرنا بھی مشکل ہے۔ اس میں زندگی، جذبے اور احساس کے اتنے رنگ روپ اور ڈائمنشن ہیں اور اس لطافت کے ساتھ شاعری کا حصہ بنے ہیں کہ قاری کے گرفت میں آتے ہیں اور چھوٹ جاتے ہیں۔ یہی وہ جہتیں ہیں جس کی طرف شمس الرحمان فاروقی نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "عرفان صدیقی کے کلام کا ہزار قائل ہونے کے باوجود میں ان پر کبھی کوئی مضمون نہ لکھ سکا.... عرفان صدیقی کے بارے میں لکھنا بہت مشکل کام تھا اور اب بھی مشکل ہے۔ ان کے اشعار کی تہہ داری اور ان کی لفظیات کا داستانی لیکن گہرا داخلی رنگ اور ان کے تجربۂ عشق اور تجربۂ حیات کا دبدبہ اور طنطنہ یہ ایسی باتیں نہیں جن پر لفاظی اور انشا پردازی اور زور بیان کے ذریعے قابو پایا جا سکے" (عرفان صدیقی کی غزل)

عرفان صدیقی پر نہ لکھے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے جس کی طرف اشارہ فاروقی کے اس اقتباس میں ملتا ہے۔ دراصل ہمارے یہاں جدید غزل پر جو گفتگو ہوئی ہے اس میں چند نقطے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے بیشتر کا حوالہ موضوعاتی ہے اور کسی بھی فن پارے کا موضوعاتی مطالعہ کسی نہ کسی سطح پر خانہ بندی تک لے جاتا ہے۔ عرفان صدیقی کے شعری فکر کے سروکار بالکل نہ صحیح پھر بھی بڑی حد تک مختلف تھے۔ ان کے یہاں جدید فکریاتی

مباحث اس طور پر شاعری کا حصہ نہیں بنے تھے جس طرح جدید غزل کے دوسرے شعرا کے یہاں ان کی صورت نظر آتی ہے، عشق کا ایک شدید احساس عرفان صدیقی کی فکری جہت کو ایک توازن تک لے جاتا ہے۔ نہ ہی انہوں نے زبان کی سطح پر کوئی ''انقلابی'' رول ادا کرنے کی کوشش کی ،ان کا لفظیاتی نظام بے پناہ جدت کے باوجود گہرا کلاسیکی رچاؤ بھی رکھتا ہے۔ جدید غزل کی تنقید کے یہ دونوں حوالے عرفان صدیقی کے یہاں بہت دھیمے ہیں ،ان کے شعری متن کے سیاق میں یہ مسائل مرکزی حوالہ نہیں بنتے اس لئے جدید تنقیدی کلامیے میں عرفان صدیقی کو نظر انداز کرنے کی وجہ بہت سامنے کی ہے۔ لیکن آج یہ سب باتیں بہت اہم نہیں رہی ہیں، ہر زمانے میں تخلیقی متن سے وابستگی کی بنیادیں بھی ایک سی نہیں رہتی، آج کا قاری اور ساتھ ہی تخلیقی ذہن بھی عرفان صدیقی کی طرف بار بار پلٹتا ہے اور ان کی پوری شعری فضا کو اپنی اور اپنے زمانے کی حسیت سے زیادہ قریب پاتا ہے تو اس کا مطلب جدید غزل کے ایک وقیع سرمائے سے روگردانی نہیں ہے، جدید غزل کی تمام فکری اور لسانی انتہا پسندیوں کو چھوڑنے کے بعد جو کچھ بچتا ہے اس سب کا رشتہ خود عرفان صدیقی کے شعری طریق کار سے قائم ہو جاتا ہے۔ عرفان صدیقی نے اپنے عہد کی انسانی صورتحال کو نسبتاً زیادہ بڑے سیاق میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی پوری شاعری ایک غیر مشروط ذہن کی علامیہ ہے۔ نئی غزل کی تمام فکری سروکار کی جھلک بھی عرفان صدیقی کے یہاں ملتی ہے لیکن اپنے زمانے کو وقت کی بندشوں سے آزاد ہو کر دیکھنے کا رویہ بھی ان کے شعری امتیاز کا مظہر ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری میں کربلا کے شعری استعارے کی معنویت بھی اسی سیاق میں قائم ہونی چاہیے۔ یہ اشعار دیکھیے:

پھر ایک عجیب تماشہ رہے گا صدیوں تک
یہ کاروبارِ کمان وگلو ہے کتنی دیر

یہ کس نے دستِ بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں نخلِ دعا نکل آئے

سروں کے پھول سرِ نوکِ نیزہ ہنستے رہے
یہ فصل سوکھی ٹہنیوں پہ پھلتی رہی

تو نے مٹی سے الجھنے کا نتیجہ دیکھا
ڈال دی میرے بدن نے تری تلوار پہ خاک

ہوائے کوفۂ نامہرباں کو حیرت ہے
کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں

یا مرا وہم ہے یہ نغمۂ موج گزراں
یا کوئی نہر ہے اس کوہ گراں کے پیچھے

ایک رنگ آخری منظر کی دھنک میں کم ہے
موجِ خوں اٹھ کے ذرا عرصۂ شمشیر میں آ

لہو میں غرق ہمارے بدن کو سہل نہ جان
یہ آفتاب ہے اور ڈوب کر نکلتا ہے

جو بھی چاہو وہ تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا ہے

خدا سے آخری رشتہ بھی کٹ نہ جائے کہیں
کہ اب کے ہے دستِ دعا نشانے پر

یہ اشعار عرفان صدیقی کے معاصرین کی تخلیقی حسیت سے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہیں اور نہ ہی انہیں کسی ادبی تحریک اور میلان کے حوالے سے کوئی نام دیا جا سکتا

ہے۔عرفان صدیقی کی یہ لفظیات بھی ان کے تجربے اور ایک ازلی کشمکش کے ادراک کو نئے تناظر کے ساتھ سامنے لاتی ہیں۔عرفان صدیقی کے مطالعے بلکہ یہ کہا جائے کہ ان تمام شعری متون کے مطالعے میں جن میں کربلا کا استعارہ مرکزی اہمیت رکھتا ہے ایک غیرادبی رویہ بہت حاوی رہا ہے، کہ ان کی معنویت کو کربلا تک ہی محدود کر کے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی بہت سے لوگ افتخار عارف کا نام لینے سے بچتے ہیں۔عرفان صدیقی کے باب میں بھی کربلا کا ذکر اتنی کثرت سے کیا گیا ہے کہ اس سے آگے ذہن نہیں جاتا ۔عرفان صدیقی کی اس شعری جہت کو اس مخصوص سیاق میں سمجھا ضرور جا سکتا ہے لیکن اسے یہیں تک محدود کر دینا ایک غیر ذمے دارانہ رویہ ہے۔پہلے شعر میں جس عجیب تماشے کا ذکر ہے اس کا مخصوص اظہار یہ اسے زمانی اور مکانی محدودیت سے باہر لے آتا ہے۔کاروبار کمان وگلو کو خیر وشر کی ازلی کشمکش کے استعارہ کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔کاروبار کمان وگلو کی ترکیب بھی معنی کی ایک نئی جہت کو سامنے لاتی ہے۔عرفان صدیقی نے نیر مسعود سے ایک گفتگو میں کہا تھا کہ وہ لفظوں کے امکانات اور ان کے آپسی رشتوں کو تلاش کرنے اور ان کے استعمال پر ہفتوں سوچتے ہیں بلا مبالغہ۔اس بات کا اندازہ عرفان صدیقی کی لفظیات اور ان کی ترکیبوں سے صاف طور پر ہوتا ہے۔ان کی ترکیبیں معنیاتی سطح پر بڑا کردار ادا کرتی ہیں اور صوتی اعتبار سے بھی ان میں ایک حسن اور جاذبیت ہوتی ہے۔کمان وگلو کے ساتھ کاروبار کی تمام رسومیات کو وابستہ کر کے اس عمل کی نوعیت کی طرف بھی اشارہ مقصود ہے۔دوسرے شعر کے معنی سے قطع نظر اس کے مخصوص اظہار سے جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اور ایک پیکر خلق ہوتا ہے وہ شاعر کے تخلیقی مزاج کو سامنے لاتا ہے۔عرفان صدیقی کی شاعری کی یہ خاص بات ہے کہ وہ خیال کو کوئی نہ کوئی صورت دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور خالص ذہنی اور حسی تجربے ان کے یہاں بصری پیکر اختیار کر لیتے ہیں ترکیب سازی اور لفظوں کے گچھے خلق

کرنے کا پورا نظام اسی جہت کو سامنے لاتا ہے۔ تیسرا شعر بھی اس رخ پر جاتا ہے۔ عرفان صدیقی کے یہاں اس طرح کے موضوعات سے خاصی دلچسپی کا اظہار ملتا ہے دراصل یہ ان کے مزاج، شخصیت اور تربیت کا حصہ ہیں۔ وہ ظلم اور جبر کے خلاف انسان کو قائم کرنا چاہتے ہیں ان کے یہاں صداقت اور سچ ایک لازوال حقیقت بن کر ابھرتے ہیں اور کربلا کا واقعہ ہر عہد کی اسی کشمکش کا استعارہ بن جاتا ہے۔ ان دونوں شعروں میں دست بریدہ اور سروں کے پھول کے اظہاریہ کو آدمی کی شخصیت اور اس کی خودی کے اثبات کے طور بھی دیکھا جانا چاہیے۔ یہیں سے عرفان صدیقی کے یہاں وہ پہلو بھی ابھرتا ہے جسے ہم تصوف سے جوڑ کر دیکھتے ہیں، انہوں نے نظریاتی سطح پر تو تصوف کو نہیں برتا نہ ہی اس طرح کے مباحث ان کے یہاں آئے ہیں جن کا ذکر عام طور پر تصوف کی شاعری کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ وہ تصوف کو عام انسانی صورتحال سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔

فقیر ہوں دل تکیہ نشیں ملا ہے مجھے
میاں کا صدقہ تاج و نگیں ملا ہے مجھے

میں بوریا اسی خاک پر کیا تھا بساط
سو یہ خریطہ زر بھی یہیں ملا ہے مجھے

زباں کو خوش نہیں آتا کسی کا آب و نمک
عجب تبرک نان جویں ملا ہے مجھے

پھر بار فقیروں کا اٹھانا میرے داتا
پہلے تو یہ کشکول فقیرا نہ اٹھالے

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک
مسند خاک پہ بیٹھا ہوں برابر اپنے

ان اشعار میں زیریں سطح پر احتجاج کے نشان بھی ملتے ہیں اور یہ احتجاج انسان کو اپنی ذات کے اثبات تک لے جاتا ہے۔ مذکورہ شعروں سے ایک متصوفانہ طبیعت اور قلندرانہ مزاج کی تصویر بھی بنتی ہے۔ ان میں عرفان صدیقی کے عہد کا آشوب بھی ہے اور ان کے بعد کی تمام تر غیر انسانی صورتحال کے خلاف قائم ہونے کی بنیادیں بھی۔ عرفان صدیقی کی شاعری لفظ ومعنی دونوں سطحوں پر ہمیں چونکاتی ہے۔ وہ سامنے کے موضوعات و مسائل کو بھی جس سطح پر جا کر سوچتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اور بھرپور ڈرامائیت کے ساتھ شعری پیکر عطا کرتے ہیں وہ ہمیں ایک نئے لسانی اور معنیاتی تجربے سے آشنا کراتا ہے۔ عرفان صدیقی کے شعری متن کی قرأت کا یہ ایک دلچسپ حوالہ ہے۔

عرفان صدیقی کا تخلیقی مزاج ان کی فکر پر حاوی نظر آتا ہے، ان کے یہاں باضابطہ کسی فکری نظام کی دریافت بھی مشکل ہے اور وہ عرفان صدیقی کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے خیر وشر کے معرکہ میں اپنا فرض تو نبھایا ہے لیکن یہ فرض انہیں کسی گہری فلسفیانہ سطح تک نہیں لے جاتا، یہاں بھی ان کے شعروں کا شدید جمالیاتی آہنگ اور تخلیقی وفور ایک دوسرے ہی ذائقے سے آشنا کراتا ہے۔ اس طرح کے مسائل عرفان صدیقی کے یہاں ہیں لیکن ان کی تہذیب اور تراش الگ قسم کی ہے۔

مرے خدا مجھے اس آگ سے نکال کہ تو
سمجھ میں آتا ہے ایقان میں نہیں آتا

مجرم ہوں اور خرابۂ جاں میں اماں نہیں
اب میں کہاں چھپوں کہ یہ گھر بھی اسی کا ہے

پتلیاں گرمیٔ بازار سے جل جاتی ہیں
آنکھ کی خیر میاں رونق بازار پہ خاک

یوں ہمیں روز نئی دربدری بخشتے ہیں
جیسے بیٹھے ہوں زمیں جیب میں ڈالے ہوئے لوگ

عرفان صدیقی کی شاعری کا سب سے بڑا مسئلہ عشق ہے۔ انھوں نے اپنے ایک مجموعے کا نام بھی 'عشق نامہ' رکھا ہے۔ اس کی ایک وجہ کلاسیکی شعری روایت سے گہرا تعلق بھی ہے اور ساتھ ہی وہ عشق کو ایک بڑی انسانی قوت اور سرگرمی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ عشق پوری طرح ماورائی بھی نہیں ہے لیکن اس طرح زمینی بھی نہیں کہ اس کا رشتہ ہوسنا کی سے قائم ہوتا ہو۔ یہ اشعار دیکھئے:

کہیں کسی کے بدن سے بدن نہ چھو جائے
اس احتیاط میں خواہش کا ڈھنگ سا کچھ ہے

امیدواروں پہ کھلتا نہیں وہ بابِ وصال
اور اس کے شہر سے کرتا نہیں کنارہ کوئی

سیر بھی جسم کے صحرا کی خوش آتی ہے مگر
دیر تک خاک اڑانا بھی نہیں چاہتا ہے

لپٹ بھی جاتا تھا اکثر وہ میرے سینے سے
اور ایک فاصلہ سا درمیاں بھی رکھتا تھا

ہوا گلاب کو چھو کر گزرتی رہتی ہے
سو میں بھی اتنا گنہگار رہنا چاہتا ہوں

تیرا سراپا یا میرا تماشا کوئی تو برج زوال میں تھا
رات چراغ ساعت ہجراں روشن طاق وصال میں تھا

روح میں کیسی تھکن ہے کوئی تدبیر کرو
شاید آسودہ سر بستر تن ہو جاؤں

کسی کے وعدۂ فردا کے برگ و بار کی خیر
یہ آگ ہجر کے بن کی طرف سے آتی ہے

کیا ہرن ہے کہ کبھی رم نہیں کرتا ہم سے
فاصلہ اپنا مگر کم نہیں کرتا ہم سے

جب قریب آیا تو ہم خود سے جدا ہونے لگے
وہ حجاب درمیانِ جان و تن لگنے لگا

مذکورہ تمام شعروں میں ہجر و وصال، بدن اور روح کے درمیان ایک قسم کی کشمکش کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کیفیت فراق کی شاعری میں بھی جگہ جگہ ملتی ہے، ان کے یہاں وصل محبوب سے ہمکنار ہونا نہیں ہے بلکہ لمحۂ وصال، ہی ابدی نا آسودگی کے احساس کو اور شدید کرتا ہے۔ عرفان صدیقی کے یہاں اس طرح کی اداسی تو نہیں ہے لیکن لمحۂ وصل اور لمحہ ہجر کے درمیان ایک چیز ہے جسے عشق کی تہذیب کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پہلے شعر میں جس احتیاط کا ذکر ہے اس کا وجود تبھی ممکن ہے جب اندر کسی کے بدن سے چھو جانے کی خواہش موجود ہو، 'ڈھنگ سا کچھ ہے' کا فقرہ بے نام سی لذتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری کی یہی وہ جہت ہے جسے تنقیدی سطح پر سمجھنا اور سمجھانا ممکن نہیں ،ان کے متن میں کہی گئی باتوں سے زیادہ ان کہی باتیں ہوتی ہیں، جس کی طرف اشارہ عرفان صدیقی نے ایک جگہ 'سخن بے زباں' کی ترکیب سے بھی کیا ہے۔ دوسرے شعر کا مضمون بہت پرانا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ عشق کے باب میں کوئی نئی بات لانا بہت مشکل ہے، اب شاعر کے لئے یہ بچتا ہے کہ وہ ان مضامین کو نئی لفظیات، نئی تراکیب اور تازہ ترحسیت کے ساتھ کس طور پر برتتا ہے۔ عرفان صدیقی کے اس شعر کا سارا حسن اس کے اظہار یہ میں ہے۔ 'بابِ وصال' کی ترکیب

اوراس کی مناسبت سے لفظ 'کھلنا' اس مضمون میں دلکشی اور نیا پن پیدا کرتا ہے۔ تیسرے شعر کی نوعیت بھی یہی ہے۔ جسم کے صحرا کی ترکیب سے عرفان صدیقی نے بہت کام لیا ہے اور ہر جگہ نئے امکانات روشن ہوئے ہیں۔ عشق کے متعلقات کے ذکر میں جسم اور بدن کے الفاظ ان کی شاعری میں کثرت سے ملتے ہیں۔ دراصل یہی وہ نقطہ ہے جوان کے عشق کو ارضی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ عرفان صدیقی کے یہاں بدن محبوب کا بدن ہے اور وہ اس کی تقدیس کے تمام پہلو تلاش کرتے ہیں۔

جسم سے روح تلک راہ نوردی کیلئے
ہو عنایت مرے ہونٹوں کو بھی پروانۂ لب

میں تری منزل جاں تک پہنچ تو سکتا ہوں
مگر یہ راہ بدن کی طرف سے آتی ہے

سیر بھی جسم کے صحرا کی خوش آتی ہے مگر
دیر تک خاک اڑانا بھی نہیں چاہتا ہے

وہ خوش بدن نوید بہار میرے لئے
میں اس کو چھولوں تو سب کچھ نیا نیا ہو جائے

کب سے پتھر ہوں بیابان فراموشی میں
میرے ساحر مجھے چھولے کہ بدن ہو جاؤں

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

کھلتے ہی نہیں لمس پہ اس جسم کے اسرار
سیاح عجب شہر طلسمات میں گم ہے

یہ تمام شعر کاروبار عشق میں بدن کے کردار کونشان زد کرتے ہیں۔ پہلے دونوں شعروں میں بدن

روح تک پہنچنے کے ایک ذریعے کے طور پر سامنے آتا ہے۔منزل جاں تک پہنچنے کی راہ کا بدن سے ہوکر گزرنا بدن کی تقدیس کی علامت ہے۔جسم سے روح تلک راہ نوردی کیلئے لبوں کا سہارا بھی اسی جہت کو روشن کرتا ہے۔آخری شعر میں جسم کی اسرار آمیز فضا اس پورے عمل کو ہوسناکی سے بہت بلند کردیتی ہے۔عرفان صدیقی محبوب کے جسم اور اس کے اعضا کی صرف تعریف ہی نہیں کرتے بلکہ ان سے ایک تعلق بنانا بھی چاہتے ہیں۔اس روش کو جدید غزل میں عشق کے بدلے ہوئے تصور کے طور بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ظفر اقبال کے یہاں یہ پہلو اور واضح انداز میں ابھرتا ہے۔عرفان صدیقی کا یہ شعر بھی دیکھیے۔

میں ڈوب گیا جب ترے پیکر میں تو ٹوٹا

یہ وہم کہ تو خود ہی مری ذات میں گم ہے

اس شعر سے دونوں کرداروں کے بیچ ایک فاصلے کا احساس ہوتا ہے۔گویا عاشق خود اپنے وجود کو الگ قائم رکھنا چاہتا ہے۔اسی خلا کو پر کرنے کیلئے اسے پروانۂ لب کی ضرورت ہے۔وحشت کا موضوع کلاسیکی شعری روایت کا حصہ رہا ہے۔جدید شعرا نے بھی اسے اپنے اپنے طور پر برتا ہے۔عرفان صدیقی وحشت کا رشتہ اپنے باطن سے قائم کر کے نیا افق روشن کرتے ہیں۔

خیر دنیا مری وحشت کیلئے تنگ سہی

اور یہ عرصۂ باطن میں بیاباں جو ہیں

ظاہر ہے باطن کے ان بیابانوں کا رشتہ عشق کی تاراجیوں سے قائم ہوتا ہے۔یہیں سے عرفان صدیقی کی شاعری میں درد کے ایک پورے باب کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔درد کو عرفان صدیقی نے ایک بڑی قدر کے طور پر برتا ہے۔یہ شعر دیکھیے۔

لشکر عشق نے جب سے خیمے کیے کچھ نہ کچھ روز سرحد بڑھا لی گئی

اور پھر ایک دن دل کی ساری زمیں درد کی مملکت میں ملا لی گئی

منصب درد سے دل نے تمہیں معزول کیا
تم سمجھتے تھے یہ جاگیر تمہارے لئے ہے

خانۂ درد ترے خاک بسر آگئے ہیں
اب تو پہچان کہ ہم شام کو گھر آگئے ہیں

اس ایک نام نے بخشا ہے جو خزانۂ درد
وہ ہم نے وقف کیا بحروبر کے نام تمام

میں تو ایک درد کا سرمایہ لئے بیٹھا ہوں
یہ مری جان کا آزار ہے میں کیا جانوں

درد کی مملکت، منصب درد، درد کا سرمایہ، خزانۂ درد یہ سب ترکیبیں اسی قدر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پہلے دوسرے اور تیسرے شعر سے جو ایک واقعہ اور منظر نامہ خلق ہوتا ہے اسے عرفان صدیقی کی تخلیقی ہنرمندی سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ ان اشعار کا ڈرامائی انداز اثر انگیزی میں اضافہ کرتا ہے۔ درد جدید شاعری کا بنیادی موضوع رہا ہے جو عشق کے ساتھ اور کئی صورتحال کا زائدہ ہے لیکن اس کا موضوع اور زبان کی سطح پر اتنا تخلیقی اور جمالیاتی اظہار بہت کم ہوا ہے۔ عرفان صدیقی کا کینوس اپنے کئی معاصرین کے مقابلے میں محدود ہے لیکن ان کے امتیاز کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ جو موضوعات بھی ان کے یہاں آئے ہیں وہ ان کی گرفت سے باہر نہیں رہتے۔ عرفان صدیقی کے یہاں بہت کم شعر ایسے ہیں جو کسی نہ کسی جہت سے ہمیں متوجہ نہ کرتے ہوں۔ جدید غزل کو عرفان صدیقی کی یہ بہت بڑی عطا ہے جس کے لئے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

(2015)

☆☆☆

عرفان احمد صدیقی اور رابطۂ عامہ

..................شاہ نواز فیاض (دہلی)

بیسویں صدی کے آخر میں ایک اہم شاعر کی حیثیت سے معروف ہونے والے عرفان صدیقی کی عام پہچان ایک شاعر کی ہی ہے، لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ حکومت کی انفارمیشن سروس سے وابستہ رہنے کی وجہ سے صحافت سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ان کی کتاب ''رابطۂ عامہ'' اس کا بیّن ثبوت ہے۔اس کتاب میں انھوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں رابطۂ عامہ کی تاریخ اور اس کے متعلق بہت سی معلومات یکجا کی ہیں۔اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم یہ کتاب ''رابطۂ عامہ'' مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی سے ۱۹۷۷ میں شائع ہوئی۔اِس کتاب میں عرفان صدیقی نے جس طرح سے چھوٹے چھوٹے پیرائے میں بات کی ہے اس سے ان کے ذہن اور صحافت کی باریک بینی سے واقفیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آج پوری دنیا میں رابطۂ عامہ ایک ایسے فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس کی افادیت اور علمی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔زندگی کا کوئی ایک ایسا گوشہ نہیں ملے گا جہاں رابطۂ عامہ کسی نہ کسی صورت میں نظر نہیں آتا ہے۔کتاب 'رابطۂ عامہ' ۱۹۷۷ میں منظر عام پر آئی۔تب سے اب تک صحافت اپنی ترقی کی کئی منزلیں طے کرتا ہوئی آج دنیا میں ایک ایسا ذریعہ بن گئی ہے جس کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تھی تو اس وقت رابطۂ عامہ کے اتنے وسائل موجود نہیں تھے جتنے کی اب۔سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ آخر اس

کتاب پر لکھنے کہ کیا ضرورت ہے؟ اور نئے تقاضوں کے پیش نظر یہ کتاب کس حد تک معاون ہے؟ اس کتاب کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بہت ساری ایسی چیزیں جو اس وقت جدید تقاضوں کو پورا کرتی رہی ہوں گی آج وہ قدیم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن ذرا غور کریں کہ 'رابطۂ عامہ' کی بنیادی اصطلاحیں، جس زمانے میں بھی اس تعلق سے لکھا جائے گا تو ان سب چیزوں کا ذکر اسی طرح سے ضروری ہے جس طرح سے اس وقت تھا۔ البتہ اس کا امکان زیادہ ہے کہ کچھ نئی اصطلاحوں کا ذکر بھی ہو۔ جو کہ وقت کی ضرورت بھی ہے۔ اسی طرح سے جب یہ کہا جائے گا کہ 'رابطۂ عامہ' کیا ہے؟ تو اس کا وہی جواب ہوگا جو اس وقت تھا۔ اسی طرح سے جب رابطۂ عامہ کے آغاز و ارتقاء کے متعلق لکھا جائے گا تو آج کے اس ترقی یافتہ زمانے تک پہنچنے کے لئے اس زمانے سے ہی گزرنا پڑے گا۔ اس تناظر میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب جتنی معاون اس وقت تھی اتنی نہ سہی پھر بھی اس کی افادیت سے یکسر انکار ممکن نہیں۔ ۱۹۷۷ کے آس پاس اس موضوع پر جدید فن کی حیثیت سے رابطۂ عامہ کے مبادیات کے تعارف پر اس طرح سے کوئی باقاعدہ تصنیف شاید ڈھونڈنے ہی سے ملے۔ اس دور کی صحافت اور آج کی صحافت کا موازنہ کیا جائے تو موجودہ دور اس اعتبار سے ایک سیلاب کے مانند ہے، جہاں طرح طرح کے وسائل موجود ہیں۔ کمپیوٹر کی مدد سے الیکٹرانک میڈیا بہت مضبوط ہو گیا ہے۔ لیکن آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ٹیلی ویژن کی دنیا بہت محدود تھی۔ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ کے اہم وسائل میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار اور سینما تھے۔ لیکن آج کے اس ترقی یافتہ زمانے میں عوامی ابلاغ کے کئی اہم وسائل ہیں، جس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ کتاب کل چودہ حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب رابطۂ عامہ کی بنیادی اصطلاحوں سے لیکر جدید سائنسی ترقیات اور وسائلِ ابلاغ تک محیط ہے۔

عرفان صدیقی نے 'رابطۂ عامہ' کو بہت آسان اور عام فہم زبان میں لکھا ہے، تا کہ

خاص و عام بغیر کسی دقت کے آسانی سے سمجھ لیں۔'رابطۂ عامہ کی بنیادی اصطلاحیں' کے تحت عرفان صدیقی نے چند اہم اور بنیادی اصطلاحوں کی وضاحت کی ہے۔اس ضمن میں گیارہ اصطلاحوں کی وضاحت بہت چھوٹے چھوٹے پیرائے میں مع مثال بیان کی گئی ہیں ۔اصطلاح کا اصل مقصد کسی علم یا فن کے کسی خاص مفہوم کو پڑھنے یا سننے والوں تک پہنچانا ہے۔چونکہ اصطلاح کی اصل روح اس کے اختصار میں مبہم ہے،اور اس کا عملی ثبوت عرفان صدیقی نے ان اصطلاحوں کے متعلق لکھتے ہوئے دیا ہے۔متعلق عوام (Relevant Public) کے تعلق سے انھوں نے لکھا ہے: ''رابطۂ عامہ کے شعبے میں 'عوام' یا 'پبلک' کی اصطلاح کا مفہوم سیاسیات کی اس اصطلاح کے مفہوم سے خاصا مختلف ہے۔کسی ادارے کے دائرہ کار میں آنے والے تمام افراد اس ادارے کے 'متعلق عوام' کہلاتے ہیں۔مثلاً روزمرہ کا کوئی سامان تیار کرنے والی کسی کمپنی کے حصے دار، ملازمین، صارفین وغیرہ سب اس کمپنی کے 'متعلق عوام' ہیں۔انہیں مخاطب گروہ (Audience) بھی کہا جاتا ہے۔'' (رابطۂ عامہ۔ عرفان صدیقی۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۹۷۷۔ص۔۷

درج بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگانا اور بھی آسان ہوگیا ہے کہ اصطلاح کی اصل روح اختصار میں پنہاں ہے۔یہ اقتباس اس کی واضح مثال ہے۔عرفان صدیقی نے اس کتاب کو لکھتے وقت اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ کوئی بھی حصہ بے ترتیب نہ ہونے پائے۔اس لئے اصطلاح میں یہ ضروری تھا کہ یہ جانا جائے کہ اصل میں رابطۂ عامہ کیا چیز ہے؟ اس کتاب کا دوسرا حصہ اسی موضوع (رابطۂ عامہ کیا ہے) پر ہے۔کیونکہ رابطۂ عامہ اور صحافت میں بہت فرق ہے۔جب کی یہ دونوں ایک ہی ماحول میں الگ الگ کام کرتے ہیں۔رابطۂ عامہ کی توجہ کا مرکز ادارہ اور اس کے عوام ہوتے ہیں،اور صحافت سماج کے تمام افراد سے تعلق رکھتا ہے۔صحافت کا فرض یہ ہے کہ وہ پوری عوام کی رائے کی عکاسی کرتا ہے اور رابطۂ عامہ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے

ادارے کی شخصیت کا تاثر اجاگر کرے۔عرفان صدیقی لکھتے ہیں: ''کبھی کبھی پبلسٹی اور صحافت کو بھی پبلک ریلیشنز سے خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔لفظ پبلسٹی کبھی تو رابطہ عامہ کی مجموعی سرگرمی کے ایک حصے کو ظاہر کرنے کے لئے بولا جاتا ہے اور کبھی اسے مکمل طور پر رابطۂ عامہ کا مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ رابطۂ عامہ اور پبلسٹی میں امتیاز کرنا سب سے زیادہ دشوار طے ہے اور ان میں جو بھی فرق کیا جائے گا وہ کتابی اور نظری نوعیت کا ہوگا۔''   ایضاً۔ص۔۱۷،۱۸

اس حصے کے بعد رابطۂ عامہ کے آغاز و ارتقا کے متعلق عرفان صدیقی نے بہت اختصار سے پوری تاریخ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ رابطۂ عامہ کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس متعلق ان کی یہی رائے ہے کہ رابطۂ عامہ اصطلاحی اعتبار سے جدید دور کی پیداوار ہے۔لیکن اس کا جو مفہوم ہے اس کا تصور تو بہت پرانا ہے کم از کم اتنا پرانا کہ جب سے ریاست یا حکومت کے اداروں کا وجود ہوا ہے۔عرفان صدیقی نے مختلف لوگوں کی رائے بھی لکھی ہے۔تا کہ اس تاریخ کا آئینہ ہماری نظروں کے سامنے آسکے۔تمام مثالوں کے بعد آخر میں انھوں نے اشوک کے عبارتی ستون کا ذکر کیا ہے۔اور اس طرح کی چیزیں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے مما لک میں بھی مل جائیں گی۔اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکومت اور عوام کے درمیان دوطرفہ ترسیل کے عمل کی ضرورت ریاست کے تصور کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہے۔اس حصہ کے بعد ''ترسیل کا عمل'' کے موضوع پر ترسیل کے خاص نکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ایک ترتیب سے عرفان صدیقی نے اس کے مشمولات کی فہرست بنائی ہے۔اس ترقی یافتہ زمانے میں وسائل ابلاغ کے بہت سے ذریعہ ہیں۔لیکن جس وقت یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت نہ تو ابلاغ کے اتنے وسائل تھے اور نہ ہی اس پایہ کی کتاب۔البتہ کچھ ضروری معلومات کے لیے کتابیں تھیں تو لیکن وہ بھی ناقص۔رابطۂ عامہ کا ایک اہم وسیلہ ترسیل زبان ہے۔کہیں بلا واسطہ تو کہیں بالواسطہ۔اس متعلق عرفان صدیقی نے ایک چارٹ بنایا ہے۔اور

اس کے متعلق تقریباً ان سارے ناموں کا ذکر کیا ہے جو اس ضمن میں آتے ہیں۔ زبانی ترسیل کے متعلق عرفان صدیقی کے یہ جملے ملاحظہ ہوں: ''زبانی ترسیل کا غالباً سب سے اہم موقع جو رابطۂ عامہ کے سلسلے میں درپیش ہوتا ہے وہ ہے پریس کانفرنس یا اخبار نویسوں سے ملاقات۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ پریس کانفرنس میں رابطۂ عامہ افسر کو اپنے ادارے کے سربراہ یا مدعوین یعنی اخبار نویسوں کے مقابلے میں ثانوی نوعیت کا کردار انجام دینا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان ملاقاتوں میں اس کی حیثیت ایک درمیانی آدمی کی ہوتی ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اس رابطے کے رول کی تمام نزاکتوں اور باریکیوں کو بخوبی ذہن میں رکھے۔'' (ایضاً۔ ص۔ ۳۱)

یہاں عرفان صدیقی نے اس ناظم پروگرام کا ذکر کیا ہے جو ٹی وی یا ریڈیو پر اینکر کا رول ادا کرتے ہیں۔ اگر اس پیراگراف کو موجودہ تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات کتنی حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ آج کے ٹی وی اینکر کی حیثیت ایک درمیانی آدمی کی ہی ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی یہ صاف لگتا ہے کہ ٹی وی اینکر کسی جماعت کی حمایت کے لئے پہلے ہی سے اپنے آپ کو تیار کر لیتا ہے۔ اسی لئے مخالف جماعت سے سوال بھی ایسے کیے جاتے ہیں جس سے الجھاؤ پیدا ہو جائے۔ اور اس الجھاؤ میں اینکر ایک کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ اور اس گروپ سے مباحثے کا جو نتیجہ اینکر اپنے ذہن میں پہلے ہی سے اخذ کر لیتا ہے، بالآخر وہی نتیجہ اس مباحثے میں سامنے آتا ہے۔ حالانکہ مناسب تو یہ ہے کہ جتنی بھی جماعت کے ممبر کو مدعو کیا جائے وہ سب یکساں طور پر ماہر ہوں۔ ورنہ عدم مساوات میں کمزور کو لاجواب ہی ہونا ہے۔ جیسا کہ آج کل چل رہا ہے۔ عرفان صدیقی نے اسی لئے کہا تھا کہ اس درمیانی شخص کو اپنے رول کی تمام نزاکتوں اور باریکیوں کو بخوبی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اور ایسا کرنے سے ہی غیر جانب دارانہ طور پر کسی بھی مباحثے کا اختتام اچھے طریقے سے ایک بامقصد طور پر ممکن ہے۔ اس پورے حصے میں انھیں کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔ زبان ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ کیونکہ

زبان سے ادا کیا ہوا لفظ اس وقت موثر ہوسکتا ہے جب وہ صاف طور پر سنا جا سکے اور اچھی طرح سمجھا جا سکے۔ حقیقت یہ کہ اگر ان دونوں میں ذرہ برابر بھی کمی رہ گئی تو بات پوری طرح عیاں نہیں ہو سکے گی۔ لہذا اس کا نتیجہ کچھ بہتر طریقے سے سامنے نہیں آ سکے گا۔

عرفان صدیقی نے ''صحافتی روابط'' کے تحت خبروں کے متعلق کئی اہم نکات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جس طرح سے خبروں کے تین ضروری حصے ہوتے ہیں (۱۔ دلچسپی ۲۔ اختصار ۳۔ وضاحت) اسی طرح سے عرفان صدیقی نے اس کتاب کو لکھتے وقت ان تینوں چیزوں کا بخوبی خیال کیا ہے۔ خبروں کی ترتیب و تیاری، صحافتی پوچھ تاچھ، ہینڈ آؤٹ، پریس کانفرنس، عام تقریبات کے لئے اخبار نویسوں سے متعلق انتظامات، صحافیوں کے دورے اور خصوصی مضمون جیسے اہم نکات کی طرف عرفان صدیقی نے ضروری معلومات اکٹھا کی ہیں۔ خبر اور خصوصی مضمون کے مابین جو فرق ہے عرفان صدیقی کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ''خبر اور خصوصی مضمون کا فرق یہ ہے کہ خبر کا موضوع فوری ہوگا اور ہنگامی نوعیت کا ہوگا۔ خبر کسی ایسے واقعے کے بارے میں ہوتی ہے جو یا تو ابھی ہو چکا ہے یا بس ہونے ہی والا ہے۔ خصوصی مضمون اس قسم کے مضمون کو کہتے ہیں جو اکثر اخباروں کے ادارتی نوٹ والے صفحے پر شائع ہوتا ہے۔ اور جس میں ہفت روزہ جرائد اور ماہانی رسالوں کے لئے خصوصی دل چسپی کا مواد ہوتا ہے۔ اس کا موضوع عموماً ایسا ہوتا ہے جو اس دن، اس ہفتے، اس مہینے یا اس موسم کی کسی خاص خبر سے متعلق ہوتا ہے۔'' (ایضاً۔ ص۔ ۴۶)

درج بالا اقتباس سے خبر اور خصوصی مضمون کا جو فرق ہے وہ تو واضح ہو گیا، لیکن مضمون خبر ہی کی ایک دوسری شکل ہے۔ البتہ خبر میں اختصار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اور خصوصی مضمون میں تفصیلی انداز میں تحریر کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس مضمون کو زیادہ مفید اور موثر بنانا ہو تو جس تعلق سے مضمون تحریر کیا گیا ہے اس کے متعلق کچھ تصاویر بھی دے دی

جائیں تو اس کی اہمیت اور بڑھ جائے گی۔ یہ بات تو عام ہے کہ ہر اخبار کے اپنے مخصوص قاری ہوتے ہیں اور ہر اخبار کی اپنی پالیسی ہوتی ہے کہ اپنے صفحات میں کس قسم کی چیز چھاپی جائے۔ اخبارات کے گہرے مطالعے سے ان کے مخصوص مزاج کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رابطۂ عامہ کا ایک خصوصی شعبہ۔ صنعتی روابط: اس عنوان کے تحت عرفان صدیقی نے صنعتی روابط کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ صنعتی روابط جیسا کہ عنوان سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کاروبار کے ایک بہتر تصور کو پیش کرتا ہے۔ آج کے اس مقابلہ جاتی دور میں جہاں کمپنیاں اپنے پروڈکٹ کو ٹی وی، اخبار یا ریڈیو کے ذریعہ ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کے لیے بہتر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس اشتہار کا خاص طور سے بچوں پر اثر ہوتا ہے۔ لیکن آج کے اس ترقی یافتہ زمانے میں سب سے زیادہ انسانیت پامال ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس وقت عرفان صدیقی لکھ رہے تھے اس وقت ان کے پیش نظر اسی وقت کا سماج تھا ۔ اور ان دنوں کمپٹیشن کے نام پر کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ بسا اوقات کچھ چیزوں کے لیے کچھ خاص کمپنیاں ہی تھیں۔ لیکن آج تو ایک چیز کو بنانے والی کئی کئی کمپنیاں ہیں۔ ایسے میں امراض کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے۔ موجودہ دور میں سو فیصد صحت مند شاید ہی کوئی ملے۔ صنعتی روابط کے متعلق عرفان صدیقی لکھتے ہیں: ''صنعتی روابط کا تصور جدید صنعتی انقلاب کی دین ہے۔ ہندوستان میں یہ انقلاب بیسویں صدی کے ساتھ ہی شروع ہوا جب ہمارے یہاں پہلے پہل کپڑے اور فولاد کے چند بڑے کارخانے قائم ہوئے۔ تحریک آزادی کے دوران اس شعبے میں سیاسی جماعتوں کا کردار خاصا فعال رہا کیوں کہ آزادی کی جدوجہد کو محنت کش طبقے نے بڑا فروغ دیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ آزادی سے قبل کے زمانے میں ہمارے ملک میں صنعتی روابط پر سیاسی تحریک اور سیاسی جماعتوں کا بڑا اثر رہا ہے۔'' (ایضاً۔ ص۔ ۴۸)

۱۹۷۵ سے آج تک بہت کچھ بدل چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں دائرۂ کار

محدود تھے۔لیکن آج کے اس ترقی یافتہ زمانے میں محدود سے لامحدود کی طرف گامزن ہے۔ کیونکہ سیاست اس طرح سے سارے کاروبار میں رچ بس گئی ہے کہ بسا اوقات یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کاروباری کام کے لیے کاروبار لازم ہے یا سیاست۔اشتہاری کمپنیاں اپنے اس کام کو متوازن اور موثر طریقے سے انجام دینے کی کوشش کرتی ہیں۔لیکن مادیت پرستی کے اس زمانے میں انسانیت بہرحال ثانوی درجے پر پہنچ گئی ہے۔

رابطۂ عامہ میں تحقیق کا عمل: رابطۂ عامہ ایک بہت ذمے داری کا کام ہے۔اور اسی لئے رابطۂ عامہ کا کارکن جب کسی اہم پیغام کو نشر کرتا ہے تو اس سے پہلے اس خبر کی جانچ پرکھ کرتا ہے۔تا کہ سماج میں کوئی غلط خبر نہ پہنچ جائے۔جیسے کہ آج کل کسی دنگے کو بھڑکانے میں لوگ مختلف ذرائع کا سہارا لے کر غلط خبر پھیلا دیتے ہیں۔اس کے بعد اس کا انجام کتنا سنگین برآمد ہوتا ہے وہ سب کی نظروں کے سامنے ہے۔رابطۂ عامہ کے جب کسی ذمہ دار کو کوئی کام سونپا جاتا ہے تو اس کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے فن کو اس منزل تک پہنچا دے، جہاں وہ انسانی علوم کے تسلیم شدہ اصولوں کے ذریعہ سے حقیقت اور اعداد وشمار کو پہنچا کر، ان سے حاصل ہونے والی جانکاری کو مرتب کر سکے۔اور اس کے بعد اس کا عملی طور پر متعلقہ تقاضوں کے مطابق اطلاق کر سکے۔رابطۂ عامہ کے کسی بھی شعبے میں کام کرنے والا کوئی شخص جب معلومات کی کھوج کے اس مرحلے پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی معلومات میں تحقیق ایک لازمی حصہ بن جاتی ہے۔عرفان صدیقی نے لکھا ہے: ''ادارے اور اس سے متعلق عوام کے درمیان پیغام رسانی کے اس دوطرفہ کار منصبی کو بہتر اور مکمل بنانے کی غرض سے رابطۂ عامہ کا کارکن تحقیق کی مختلف تکنیکیں استعمال کر سکتا ہے اور جب اور جس موقع پر اسے ضرورت ہو وہ ماہرین کی خدمات سے استفادہ بھی کر سکتا ہے۔لیکن اس کی اصل ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو بہتر طور پر انجام دینے کے لیے ضروری وسیلوں اور تکنیکوں سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو اور اسے یہ بھی اچھی طرح سے معلوم ہو کی

تحقیق کا کام ایک مسلسل محنت کا عمل ہے اور اچانک کوئی بحران آجانے پر یکا یک زیادہ جوش و خروش سے کام لینا تحقیق نہیں کہلاتا۔'' (ایضاً۔ص ۵۹۔۶۰)

درج بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رابطۂ عامہ کے حوالے سے عرفان صدیقی کس حد تک مثبت رائے رکھتے تھے۔اور ساتھ ہی ساتھ ان سارے باریک نکات سے واقف بھی تھے۔حقیقت یہ ہے کی ایک سچے اور ایماندار صحافی کی اصل پہچان انھیں اصولوں میں مضمر ہے۔عرفان صدیقی نے اس کتاب میں بہت ساری معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ موجودہ تناظر میں اگر اس کتاب کا جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ترقی کے اس دور میں پرانی چیزیں کتنی پیچھے چھوٹ گئی ہیں۔لیکن جو وسائل اس زمانے میں تھے آج کے اس دور میں بہت حد تک اس میں اضافہ ہوا ہے۔لیکن یہ اضافی چیزیں انھیں پرانی چیزوں پر منحصر ہیں۔ذرائع ابلاغ کے وسائل بہت بڑھ گئے ہیں۔لیکن ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبار اس زمانے میں بھی خبروں کے لئے اولیت کا درجہ رکھتے تھے اور موجودہ دور میں بھی انھیں وہی درجہ حاصل ہے۔کیونکہ عرفان صدیقی اپنی آنکھوں سے روز بروز ترقی ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔اور اس ترقی کو عرفان صدیقی کس زاویے سے دیکھ رہے تھے،انھیں کی زبانی ملاحظہ ہو:''اس سائنس اور ٹکنالوجیکل انقلاب کی بدولت ،روز بروز ایسے نئے نئے طریقے نکل رہے ہیں جن سے ترسیل کے شعبے میں انسان کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ان طریقوں کے ساتھ ساتھ ،انسان کی سماجی اور ثقافتی زندگی کے مختلف شعبے بھی وسعت پا رہے ہیں۔قصبوں اور دیہات کی ترقی اور ان میں شہری وسائل کی روز افزوں فراہمی، تعلیم اور معاشی بہبود کی سطح میں اضافہ اور انسان کی ثقافتی ضروریات اور فرصت کے اوقات میں اضافہ، یہ سب وہ عناصر ہیں جو ترسیل کے شعبے میں ترقی کے لئے بڑی سازگار فضا تیار کر رہے ہیں۔'' (ایضاً۔ص۔۹۸)

درج بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی نے ۵۵ سال پہلے جو لکھا تھا

اگراس تحریک کا آج کے سماج سے تجزیہ کیا جائے تو بات صد فیصد درست لگتی ہے۔ کیونکہ آج ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ نے پوری دنیا کے لوگوں کے سامنے لا کر رکھ دیا ہے۔ سماجی اور ثقافتی زندگی سے بھی لوگ ایک دوسرے سے واقف ہو رہے ہیں۔ قصبوں اور دیہاتوں کی ترقی اور ان شہری وسائل میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیم اور معاشیات میں بھی ترقی ہوئی ہے۔ گویا کہ یہ ایک ایسا ارتقائی مرحلہ ہے جو ہنوز جاری وساری ہے۔ نت نئے آلات کا وجود ہوتا جا رہا ہے اور اسی آلات پر ترقی کا پہیہ گھوم رہا ہے۔

عرفان صدیقی نے اس کتاب کو اس لئے لکھا تھا کہ اردو پڑھنے والوں کو جدید فن کی حیثیت سے مبادیاتِ رابطۂ عامہ کو متعارف کرایا جائے۔ تا کہ اس فن کے عملی پہلو لوگوں کے ذہن میں واضح ہو جائیں۔ ترقی کے اس دور میں جہاں ٹکنیکل ترقی نے لوگوں کے ذہنوں میں نئی نئی ایجاد کا خیال پیدا کیا، تو وہیں اس موضوع پر بہت ساری کتابیں بھی منظر عام پر آ گئی ہیں۔ لیکن جس نہج کے تحت یہ کتاب تصنیف کی گئی تھی میں سمجھتا ہوں کہ مصنف نے اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ کتاب کے مشمولات کو سامنے رکھ کر اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی کی اصل بنیاد انھیں محوروں پر ہے، جسے عرفان صدیقی نے بیان کیا ہے۔ یہ کتاب عرفان صدیقی کے تجربہ کی بنیاد ہے۔ کیونکہ کسی بھی فن کے نظری اور کتابی پہلو اس کے عملی خطوط کے مقابلے میں کچھ نہ کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن بنیادی اصولوں کی کارفرمائی بہر حال وہی رہتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ عرفان صدیقی کے اس کارنامے کو موجودہ تناظر میں دیکھا جائے، تا کہ اس کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکے۔

(2015)

عرفان صدیقی کی شعری معنویت

.................ساجد ذکی فہمی (دہلی)

غزلیہ شاعری کا سرمایہ ہمارے ادب میں کافی وقیع ہے۔ ابتدا سے لے کر اب تک غزلوں میں سیکڑوں طرح کے تجربے کیے گئے اور تقریباً ہر تجربہ میں غزل نے اپنی وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا۔ کسی نے اسے معرفت الٰہی کا ذریعہ بنایا تو کسی نے عشق مجازی کا، کسی نے اس میں فلسفیانہ رنگ کی آمیزش کی تو کسی نے حالات حاضرہ کو موضوع سخن بنایا۔ مختصر یہ کہ زمان و مکاں کی تبدیلی کے ساتھ معنوی اعتبار سے غزل بھی اپنی رنگت بدلتی رہی۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں اتنا عرصہ گزرنے اور اتنی تبدیلیوں کے روا ہونے کے باوجود آج بھی ہماری کلاسیکی غزلیں اسی آب و تاب کے ساتھ زندہ ہیں اور آئندہ بھی زندہ رہیں گی۔ کلاسیکی شاعری اور عرفان صدیقی کے حوالے سے میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عرفان صدیقی کی شاعری میں کلاسیکی رنگ پوری طرح جلوہ گر ہے اور اس پر وہ بجا طور پر فخر بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

ہم بیچنے کو لائے ہیں ماضی کے پیرہن
کہنہ روایتوں کے نگینے جڑے ہوئے

اسی کہنہ روایت یعنی اپنی تہذیب سے رشتہ استوار رکھنے کی وجہ سے ہی انھیں ابتدا میں نظر انداز بھی کیا گیا لیکن ان کی آواز، آواز بازگشت ثابت نہ ہوئی۔ انھیں اس کا یقین تھا کہ آج

نہیں تو آنے والے وقتوں میں ان کی شاعری ضرور قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔
جب ہی تو وہ کہتے ہیں۔

بازار میں آئیں ہیں تو کیوں مول گھٹائیں
شاید کوئی اپنا بھی خریدار نکل آئے

بہر حال ان کے تیسرے مجموعہ ''سات سماوات'' (۱۹۹۲ء) نے ان کے شہرت کے پر لگا دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شاعری اردو حلقوں میں مقبول سے مقبول تر ہوتی چلی گئی۔

عرفان صدیقی کی شاعری میں جو چیز نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ کربلائی شاعری ہے، یعنی ایسی شاعری جس کا تعلق کربلا کے واقعات سے ہو۔ یوں تو اردو شاعری میں کربلا کا ذکر ابتدا سے ہی موجود رہا ہے بلکہ ہمارے شعراء حضرات نے لفظ کربلا کو استعاراتی اور علامتی دونوں انداز میں احسن طریقے سے استعمال کیا ہے۔ لیکن عرفان صدیقی نے جس فنکاری کے ساتھ اس لفظ اور واقعہ کو اپنی شاعری میں سمویا ہے وہ دوسروں کے مقابلے انھیں ممتاز ومیز کرتی نظر آتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

اسیر کس نے کیا موج موج پانی کو — کنارے آب کے پہرہ لگا ہوا کیسا
وہ مہرباں اجازت تو دے رہا ہے مگر — اب آگئے ہیں تو مقتل سے لوٹنا کیسا
یہ ایک صف بھی نہیں، وہ ایک لشکر ہے — یہاں تو معرکہ ہوگا، مقابلہ کیسا
سنو کہ بول رہا ہے وہ سر اتارا ہوا — ہمارا مرنا بھی جینے کا استعارہ ہوا
ہوائے کوفۂ نامہرباں کو حیرت ہے — کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں
اے لہو میں تجھے مقتل سے کہاں لے جاؤں — اپنے منظر ہی میں ہر رنگ بھلا لگتا ہے
دولت سر ہوں سو ہر جیتنے والا لشکر — طشت میں رکھتا ہے نیزوں پہ سجاتا ہے مجھے

درج بالا میں پیش کیے گئے تمام اشعار ایسے ہیں جس میں معنویت کی فضا پوری طرح

برقرار ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ موزوں ہے، بلکہ ان لفظوں کو اس انداز سے ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ کربلا کا پورا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ایسی شاعری اسی وقت ممکن ہے جب شاعر اس منظر کو جس کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے پوری طرح اپنے اندر جذب کرلے۔

عرفان صدیقی کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے طویل بحروں میں بڑی مترنم غزلیں کہی ہیں جس کی جھلک جدید غزل گو شعرا کے یہاں گاہے گاہے نظر آتی ہے۔ان طویل بحور والی غزلوں میں انھوں نے ملک کی تقسیم، اپنے درد وغم، روزگار کے مسائل، عشق و محبت کی باتیں، سرشاری و بے کیفی، طنز کی کاٹ غرض کہ مختلف قسم کے موضوعات کو پرونے کی کوشش کی ہے۔مثال کے طور پر طویل بحر کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

تم ہمیں ایک دن دشت میں چھوڑ کر چل دیے تھے تمہیں کیا خبر یا اخی
کتنے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر نکلنے میں یہ بال و پر یا اخی

شب گزیدہ دیاروں کے ناقہ سواروں میں مہتاب چہرہ تمہارا نہ تھا
خاک میں مل گئے راہ تکتے ہوئے سب خمیدہ کمر بام و در یا اخی

ایک چڑیا کی آواز آتی رہی میرے بچوں کو مجھ سے چھڑایا گیا
میری بستی سے مجھ کو نکالا گیا میرے جنگل میں بستی بسا لی گئی

ختم ہوتا ہے اس رات کا ماجرا اب یہ کیا پوچھتے ہو کہ پھر کیا ہوا
پھر چراغوں کی آنکھیں بجھا دی گئیں پھر گلوں کی زباں کاٹ ڈالی گئی

درج بالا میں پیش کیے گئے اشعار میں سے بالخصوص پہلے دو شعر ایسے ہیں جس میں تقسیم کا کرب پوری طرح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تقسیم کے دوران عرفان صدیقی جسمانی اور ذہنی طور پر پوری طرح بالغ تو نہ ہوئے تھے لیکن نقل مکانی، روزگار کی پریشانی، قتل و غارت، عزیزوں کا خون وغیرہ نے ان کے قلب و ذہن کو بے حد متاثر کیا تھا۔جس کی جھلک ان کی

شاعری میں با آسانی تلاش کی جاسکتی ہے۔اپنوں سے بچھڑنے کا غم، ان کے انتظار میں راہ تکتے رہنے کا عمل یا پھر ان کی واپسی سے ناامید ہوکر خود کو صبر کی تلقین کرنا، کہ آنے والے وقت میں یہ سارے زخم آہستہ آہستہ بھر جائیں گے، ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔بعدازیں آخری دو اشعار کو طنزیہ شاعری کا بہترین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔بالخصوص یہ شعر ؎

ایک چڑیا کی آواز آتی رہی میرے بچوں کو مجھ سے چھڑایا گیا
میری بستی سے مجھ کو نکالا گیا میرے جنگل میں بستی بسا لی گئی

ظاہری طور پر اس شعر سے یہ مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جنگلوں کو کاٹ کر نئی بستیاں بسائی گئیں جس کی وجہ سے پرندے جو یہاں بسیرا کیے بیٹھے تھے اپنی بستی یعنی جنگل کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور اس طرح ان کا خاندان منتشر ہو گیا۔ یہاں طنز کی کاٹ تھوڑی مدھم محسوس ہوتی ہے۔لیکن اسی شعر کو جب ہم موجودہ دور کے پس منظر میں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں تو اس کی تیزی میں نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔مثال کے طور پر کسی بھی Metropolitan City کی جھگی جھونپڑیوں کا نقشہ ہمارے ذہن میں اگر محفوظ ہو تو شعر کے اس مفہوم تک با آسانی رسائی حاصل کی جاسکتی ہے کہ ان جھگی جھونپڑیوں میں بھی آدمیوں کا ایک جنگل موجود ہوتا ہے جو بہر حال ان کے لیے بستی ہے۔لیکن بعض اوقات معمولی معاوضہ دے کر یا بہ زور قوت انھیں اپنی رہائش چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔سیکڑوں خاندان کو منتشر اور انھیں دربدر بھٹکنے پر مجبور کرنے کے بعد وہاں ایک اپارٹمنٹ، کمپنی، فیکٹری یا سوپر مارکیٹ قائم کردی جاتی ہے۔اس طرح انسانیت کے سبق کو بالائے طاق رکھ کر اپنے لیے دولت کمانے یا امرا کی خاطر آرائش و آسائش کا انتظام کیا جاتا ہے۔

روزگار کے مسائل، نقل مکانی یا اجنبیت کا احساس وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو زندہ در گور کر دیتی ہیں۔عرفان صدیقی نے ان سارے منازل کو عبور کیا جس کی کسک آخری عمر

تک ان کے دل میں کچوکے لگاتی رہی اور وہ ماضی کو یاد کر کے آہ سرد بھرتے رہے۔ان کی پیدائش ۱۹۳۸ء کو بدایوں میں ہوئی لیکن تقسیم ملک کے بعد انھوں نے راولپنڈی (پاکستان) کو اپنا مسکن بنایا۔جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مٹی کی خوشبو ہمیشہ انھیں ستاتی رہی اور اس کا ذکر وہ بڑے پردرد انداز میں کرتے رہے۔ملاحظہ فرمائیں ؎

آج تک ہے اس کوچے میں نگاہیں آباد
صورتیں اچھی، چراغ اچھے، دریچہ اچھا
بدایوں تیری مٹی سے بچھڑ کر جی رہا ہوں میں
نہیں اے جان من، بار دگر ایسا نہیں ہوگا

اپنی مٹی سے جدائی کا غم تقریباً ہر بڑے شاعر کو ہوتا ہے، بلکہ وہ اس پر فخر کرتا ہے کہ میرا تعلق فلاں شہر یا فلاں ملک سے ہے۔اردو ادب کے صدہا شعراء نے اس کا ذکر مختلف انداز میں کیا ہے۔اگر ہم اردو شاعری کے ابتدائی دور کا ذکر کریں تو وہاں بھی اس کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے۔ملا وجہی کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں جس میں وہ اپنے آبائی وطن خراسان کی تعریف میں یوں گویا ہے ؎

من زہند آشکارا گشتم لیک
طبع پاک من از خراسان است

بہرحال تقسیم ملک کے خوں ریز واقعہ کے بعد بچ نکلنے والے افراد نے جب ہندوستان اور پاکستان کو اپنا مسکن بنایا تو کہیں نہ کہیں انھیں اس کا اطمینان تھا کہ اب نہ یہاں کوئی جنگیں لڑی جائیں گی نہ قتل وغارت کا معرکہ ہوگا۔

وہ سب اک بجھنے والے شعلۂ جاں کا تماشا تھا
دوبارہ وہی رقص شرر ایسا نہیں ہوگا

وہ ساری بستیاں وہ سارے چہرے خاک سے نکلے
یہ دنیا پھر سے ہو زیر و زبر ایسا نہیں ہوگا

لیکن افسوس یہ سارے قیاسات بے سود ثابت ہوئے۔ ہندو مسلم کا جھگڑا تو برسوں سے چلا آ رہا تھا۔ تقسیم کے بعد ہندو، ہندو اور مسلم، مسلم میں جھگڑے اور فسادات ہونے شروع ہو گئے۔ اسی پر عرفان صدیقی نے کہا تھا ؎

ہیولے رات بھر محراب و در میں پھرتے رہتے ہیں
میں سمجھا تھا کہ اپنے گھر میں ڈر ایسا نہیں ہوگا

اپنے ماضی سے عرفان صدیقی کو بے پناہ محبت تھی اور یہ فقط عرفان صدیقی پر ہی کیا موقوف ہر شخص کو اس کا ماضی عزیز ہوتا ہے، خواہ وہ شاعر ہو، فکشن نگار ہو یا عام انسان۔ کہنے کو تو دنیا روز افزوں ترقی کی طرف گامزن ہے لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کے اعتبار سے دنیا جس قدر ترقی کرتی جا رہی ہے ہم انسانیت کے شعبے مثلاً اخلاقیات، معاملات، معاشرت وغیرہ میں اسی قدر تنزلی کے شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ عرفان صدیقی کو اس کا شدید احساس تھا۔ اپنے اس احساس کو انھوں نے شاعری کا جامہ پہنایا اور مختلف زاویے اور انداز سے اسے بیان کرنے کی کوشش کی۔ درج ذیل میں ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو ان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں ؎

خرابہ تھا مگر ایسا نہیں تھا — عزیزو! میرا گھر ایسا نہیں تھا
اندھیرا تھا میری گلیوں میں لیکن — پس دیوار و در ایسا نہیں تھا
زمیں نامہرباں اتنی نہیں تھی — فلک حد نظر ایسا نہیں تھا
کوئی اونچا نہیں اڑتا تھا پھر بھی — کوئی بے بال و پر ایسا نہیں تھا

پچھلے صفحات میں اس کا تذکرہ گزر چکا ہے کہ عرفان صدیقی کی شاعری میں کلاسیکی

عناصر پوری طرح نمایاں ہے۔ لیکن کلاسیکی انداز کو جدید پیرہن کے ساتھ انھوں نے اس خوبصورتی سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے کہ کلاسیکیت اور جدیدیت دونوں کے امتزاج سے ایک نیا رنگ ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر عرفان صدیقی نے وؔلی کی زمین میں ایک غزل کہی لیکن جدید دور کے تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اشعار کو معنوی اعتبار سے کہیں سے کہیں پہنچادیا۔ آیئے پہلے وؔلی کے اشعار ملاحظہ فرمائیں تاکہ عرفان صدیقی کی شاعری اور مزاج کو سمجھنے میں پریشانی نہ ہو۔

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

وؔلی نے اسی ردیف میں مسلسل چار غزلیں کہی ہیں لیکن یہ تمام غزلیں عشقیہ جذبات سے لبریز ہیں۔ اب عرفان صدیقی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

تم اپنی مملکت میں جرم کردو زندگی، ورنہ
سبھی مانگیں گے اپنا خوں بہا آہستہ آہستہ

ہوا آخر وہ ہم سے ہم سخن، قدرے تکلف سے
چلی صحرا میں بھی ٹھنڈی ہوا آہستہ آہستہ

ہمیں دنیا جو دے گی ہم وہی لوٹائیں گے اس کو
گنہ بن جائے گی رسم وفا آہستہ آہستہ

اچانک دوستو میرے وطن میں کچھ نہیں ہوتا
یہاں ہوتا ہے ہر اک حادثہ آہستہ آہستہ

قارئین ان اشعار کو پڑھ کر خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس میں کلاسیکی رنگ بھی ہے اور جدید شاعری کی بو باس بھی، طنز کی کاٹ بھی ہے اور عشقیہ جذبات بھی، پیشن گوئی بھی ہے اور اسے سمجھانے کا اچھوتا انداز بھی۔

الغرض یہ کہ عرفان صدیقی کی شاعری میں تہذیبی روایت کے ساتھ جدیدیت کی طرف مراجعت دکھائی دیتی ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جدید رنگ میں انھوں نے اپنی تہذیبی روایت کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کربلا کا نوحہ ہو یا تقسیم کا کرب، اپنوں سے بچھڑنے کا غم ہو یا عشق و محبت کا ذکر ہر جگہ ان کے تجربے اور جذبات کی عکاسی بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کے یہاں شاعری معنوی اعتبار سے ایک نئے فضا میں سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ گرچہ ان کے کلام میں بعض اشعار ایسے ہیں جسے ہم بھرتی کے اشعار کہہ سکتے ہیں، لیکن ان سے عرفان صدیقی کی شخصیت یا شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کے شعرا کی اگر فہرست تیار کی جائے تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں عرفان صدیقی کا شمار صفِ اوّل کے شعرا میں کیا جائے گا۔

(2015)

☆☆☆

منفرد لب ولہجہ کا شاعر: عرفان صدیقی

..................عائشہ پروین (دہلی)

عرفان صدیقی کی شاعری تقریباً تیس برس کے عرصہ پر محیط ہے لیکن داخلی طور پر ان کی شاعری صدیوں پرانی تہذیب، انسانی اقدار اور جذبات کی مکمل عکاس ہے۔ ان کی شاعری میں جدیدیت کے عناصر کی جھلکیاں تو ضرور ملتی ہیں لیکن جدت پسندوں کی طرح ان کے یہاں شدت پسندی نہیں ملتی۔ اور نہ ہی ان کی شاعری وجودیت اور فردیت جیسے موضوعات کے پنجرے میں قید نظر آتی ہے۔ بلکہ ان کے کلام میں ہمیں زندگی کی نیرنگیاں دکھائی دیتی ہیں، کہیں خوشی تو کہیں دکھ اور کہیں غم وغصہ کا اظہار ملتا ہے تو کہیں خوشگوار فضا دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں روحانی فضا، تصوفانہ افکار اور عشق کی کارفرمائیاں بھی موجود ہیں۔ انھوں نے شاعری کے کلاسیکی انداز کو مسخ کیے بغیر اپنی شاعری میں انسانی زندگی کے ان جدید عناصر کو شامل کیا جو انسان کے حقیقی جذبات اور مسائل کے عکاس ہوں۔ انھوں نے اپنے رب کی عظمت اور شان میں نغمے گائے ہیں۔ اور اس کی شہادت وہ ذرہ ذرہ میں عیاں پاتے ہیں۔ کہتے ہیں:

دستِ عصائے معجزہ گر بھی اسی کا ہے
گہرے سمندروں کا سفر بھی اسی کا ہے
وہ خشک ٹہنیوں میں اگاتا ہے برگ وبار
موسم تمام اس کے شجر بھی اسی کا ہے

بس اپنا اپنا فرض ادا کر رہے ہیں لوگ
ورنہ سناں بھی اس کی ہے سر بھی اسی کا ہے

درج بالا آخری شعر ذو معنی طور پر لیا جا سکتا ہے۔ جس کے الفاظ 'اپنا اپنا فرض' اور 'سناں' واقعہ کربلا کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ یعنی انسان حق کی خاطر اپنی جانوں پر کھیل رہا ہے، جب کہ اس کا دوسرا مطلب نہایت واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ اور یہ ہے کہ خدا ہی ہمارا خالق ہے اور ہمیں اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

رسول آخر الزماں اور آلِ رسولؐ سے محبت تو عرفان صدیقی کی شاعری کا نمایاں وصف ہے، نعت کے شعر کہتے ہیں تو ان کے جذبات کی شدّت کا اظہار ایک ایک شعر سے ہوتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

سب لقب پاک ہیں سب نام ہیں نامی تیرے
روشنی لکھتی ہے اسمائے گرامی تیرے
میرے الفاظ فقط عجز بیاں کا اقرار
کعب و حسان ترے سعدیؔ و جامیؔ تیرے
اذن معبود کا مقصود بھی نصرت تیری
مصحف نور کے آیات بھی حامی تیرے

واقعۂ کربلا اور اس کے مناظر، واقعۂ کربلا کا اصل پیغام، اس کی روح، یہ سب کچھ عرفان صدیقی کے پیدا کردہ نئے تلازمات سے اور بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے ہندوستان میں بٹوارہ کے سبب پیدا شدہ حالات کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا تھا چنانچہ یہی درد اور انسانی جذبات کی تہہ در تہہ ہمیں ان کے اشعار میں جا بہ جا نظر آتی ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ واقعہ کربلا کے وسیع اور تاریخی استعارہ کو شاعر موصوف نے حقیقی زندگی سے آہنگ

کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کربلائی استعارہ اور تراکیب سے وہ ایک نئی دنیا پیدا کرتے ہیں اور اس سے وابستہ مسائل بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم اس تاریخی استعارہ سے نہ صرف تاریخ میں پیش آنے والے اندوہناک حاشہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں بلکہ اس میں عصری زندگی کی جھلکیاں بھی دیکھتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے لہو میں تجھے مقتل سے کہاں لے جاؤں
اپنے منظر ہی میں ہر رنگ بھلا لگتا ہے

دیکھئے کس صبح نصرت کی خبر سنتا ہوں میں
لشکروں کی آہٹیں تو رات بھر سنتا ہوں میں

ہوائے کوفۂ نا مہرباں کو حیرت ہے
کہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں

درج بالا اشعار میں 'لہو، مقتل، نصرت، لشکر، ہوائے کوفۂ نامہرباں اور صبر و رضا' بظاہر واقعۂ کربلا سے متعلق الفاظ معلوم ہوتے ہیں اور اس فضا کی کہانی بیان کرتے نظر آتے ہیں جو میدان کربلا اور شہدائے کربلا سے متعلق ہیں۔ لیکن ان لفظیات میں اتنی وسعت و گہرائی ہے کہ انھیں محض کسی واقعہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ الفاظ دنیاوی حالات کی تصویر کشی کرنے میں بھی ممد و معاون نظر آتے ہیں۔ عرفان صدیقی نے غزلیہ شاعری کو اس کے صحت مند دائرہ میں رکھ کر واقعۂ کربلا کے تلازمات سے عصری زندگی کے مسائل بڑی حد تک واضح کیے ہیں۔ اپنی شاعری میں واقعۂ کربلا کے تلازمات استعمال کرنے والوں میں عرفان صدیقی کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کی عمارت کی تعمیر کربلائی استعارہ پر کی ہے اور وہ بھی اس خوبی سے کہ یکسانیت اور تکرار کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے عرفان صدیقی کے کلام میں تنوع اور ندرت بیان پر بھی گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ان کے یہاں روحانیت اور

تصوف جیسے موضوعات کے علاوہ نئی زندگی سے متعلق مسائل بھی توجہ کا مرکز ہیں۔ عشق اور اس کی پیچیدگیوں سے متعلق ایک مضمون یوں باندھتے ہیں، شعر ملاحظہ ہو۔

سخت ہے مرحلۂ رزق بھی ہم جانتے ہیں
پر اسے معرکۂ عشق سے کم جانتے ہیں
جانتے سب ہیں کہ ہم رکھتے ہیں خم طرف کلاہ
اور کیوں رکھتے ہیں یہ اہل ستم جانتے ہیں

عرفان صدیقی نے جہاں اردو اور فارسی لفظیات سے اپنی شاعری میں شیرینی پیدا کی ہے وہیں ہندی لفظوں سے غزل کی فضا کو ایک نئی روشنی بخشی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کوئی چٹھی لکھو رنگ بھری کوئی مٹھی کھولو پھاگ بھری
کبھی دن بیتیں بیراگ بھرے کبھی رات آئے انوراگ بھری
جہاں خاک بچھونا رات ملے، مجھے چاند کی صورت ساتھ ملے
وہی دکھیارن وہی بنجارن وہی روپ متی وہی بھاگ بھری

درج بالا اشعار میں ہندی لفظوں کی خوبصورت ترتیب سے شاعر نے من موہک سماں پیدا کر دیا ہے۔ عشق میں مبتلا شخص کی مختلف کیفیات کو جس خوبصورتی سے بیان کیا ہے' قابل تعریف ہے۔ ان اشعار کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ متکلم اپنے محبوب کو بہت انوکھے ڈھنگ سے یاد کرتا ہے۔ کبھی 'بیراگ' تو کبھی 'انوراگ' اس کی یادوں میں اس طرح آتے ہیں کہ پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ ان اشعار سے محبوب کی ایک انوکھی چھب ہمارے سامنے آتی ہے جسے بیان کر کے متکلم اپنے محبوب کو یاد کرتا ہے۔ یہ الفاظ نہایت سادہ اور پر اثر معلوم ہوتے ہیں جیسے 'دکھیارن، بنجارن روپ متی، بھاگ بھری' وغیرہ۔ تمام انسانی جذبوں میں سے آزادی ایک قوی جذبہ ہے۔ جو تمام انسانیت کو عزیز ہے۔ چنانچہ شاعر بھی جو حساس دل کا مالک اور آزادی پسند کرتا ہے۔ وہ بھی آزادی کو

انسانیت کی بقا تسلیم کرتا ہے اور انسانوں کی بنائی ہوئی سرحدیں قبول نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک یہ دشمنی کی دیوار ہے جو انسانوں کا بٹوارہ کرتی ہے۔ اس معاملہ میں شاعر پرندہ کو انسان سے بہتر تصور کرتا ہے۔ چوں کہ انھوں نے اپنے لیے کسی دیوار کو حد نہیں متعین کیا ہے۔ بلکہ وہ دنیا میں کہیں بھی آنے جانے کے لیے انسانوں سے کہیں زیادہ آزاد ہیں۔ پرندے کی آزادی کی مثال دے کر شاعر انسانوں کے لیے ایک سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچیے آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

روایتی عشقیہ شاعری میں عاشق اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے آہیں بھرتا اور آنسو بہاتا ہے۔ اس میں صبر و برداشت کا مادہ اس قدر ہوتا ہے کہ وہ گھٹ گھٹ کر جیتا ہے اور معشوق کے ظلم و ستم کے آگے خود کو نچھاور کر دیتا ہے۔ اور آخر کار اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ عرفان صدیقی نے بھی خاصی تعداد میں عشقیہ اشعار کہے ہیں۔ لیکن یہاں وہ موضوع میں ذرا سی تبدیلی کر کے ایک نیا پہلو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

تری خاطر کئی سچائیوں سے کٹ گئے رشتے
محبت میں تو یہ ترک نسب ہوتا ہی رہتا ہے

زندگی کی حقیقت کو عیاں کرتا ہوا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

خدا رکھے تیری کھیتی ہری بھری، لیکن
تو اس پہ اتنا بھروسہ نہ کر یہ دریا ہے

عرفان صدیقی نے ہجرت کے کرب کو اپنی شاعری میں بہترین طریقہ سے برتا ہے اور شاعری کو ان تمام سچائیوں سے روبرو کرنے کا ذریعہ بنایا ہے جنھیں انسانوں سے واسطہ رہا ہے۔ وہ انسانی شکستہ حالی پر تاسف کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں:

زندہ رہنے کی خوشی کس لاش سے مل کر مناؤں
کس کھنڈر کو جا کے مژدہ دوں مرا گھر بچ گیا

رائگاں ہو گئے لمحے ترے پاس آنے کے
دکھ ابھی تازہ ہیں اوروں سے بچھڑ جانے کے

لفظ اور معانی کے نئے جہان کی تسخیر میں سرگرداں عرفان صدیقی جیسا منفرد شاعر، مغرب کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنی روشن خیالی کا مادہ ہندوستان کی تہذیبی فضا سے اخذ کرتا ہے۔

یہ درد ہی میرا چارہ ہے تجھے کیا معلوم
ہٹاؤ ہاتھ میں بیمار رہنا چاہتا ہوں

میں اپنی کھوئی ہوئی لوح کی تلاش میں ہوں
کوئی طلسم مجھے چارسو پکارتا ہے

شاعر موصوف کی شاعری میں داخلی کیفیات اور معنوں کے جہاں کے ساتھ ساتھ خارجی حالات کی منظر کشائی بھی کی ہے۔وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ شاعری اگر دنیا کو بدل نہیں سکتی تو کم از کم لوگوں کو سوچنے پر مجبور ضرور کرسکتی ہے۔اس مضمون سے متعلق ایک شعر ملاحظہ ہو:

رات کو جیت تو سکتا نہیں لیکن یہ چراغ
کم سے کم رات کا نقصان بہت کرتا ہے

عرفان صدیقی نے تنوع مضامین کی ندرت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔پامال اور روایتی مضامین خواہ وہ عشقیہ ہوں یا عصری موضوعات پر ہوں، وہ اپنا ایک رنگ برقرار رکھتے ہوئے ان معنوں اور فن کی ادائیگی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔عشقیہ مضمون سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آج تک معرکۂ صبر و ستم جاری ہے
کون جانے یہ تماشا اسے پیارا ہے کہ ہم

عاشقوں کے سر تسلیم کو تسلیم سے کام
اب یہ ابرو ہے کہ تلوار ہے میں کیا جانوں

صید کرتا ہے کسی اور کی مرضی سے مجھے
خود بھی صیاد گرفتار ہے میں کیا جانوں

عرفان صدیقی مضامین کہنہ کو نئے طرز میں ڈھالنے پر بے مثال قدرت رکھتے ہیں۔وہ کلاسیکی انداز بیان کو برقرار رکھتے ہوئے نئے مضامین باندھنے پر بھی قادر نظر آتے ہیں ۔سادہ اور سلیس زبان میں ادا کیا گیا یہ اشعار آج کے موضوعات سے کس قدر مطابقت رکھتے ہیں، ملاحظہ ہو:

ایک ضد تھی مرا پندار وفا کچھ بھی نہ تھا
ورنہ ٹوٹے ہوئے رشتوں میں بچا کچھ بھی نہ تھا

یاد آتا ہے کئی دوستیوں سے بھی سوا
اک تعلق جو تکلف کے سوا کچھ بھی نہ تھا

عرفان صدیقی کے کلام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری اور لفظیات کے پس پردہ ایک زمانہ موجود ہے جس کی نیرنگیوں کو سمجھے بغیر ان کی شاعری کو پورے طور سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ان کی شاعری میں موضوعات، انداز بیان، ظاہری و باطنی معنوں کی تہہ داریوں نے اردو شاعری کی فضا کو وسیع بنا دیا ہے۔

(2015)

عرفانیات

عرفان صدیقی کی شاعری، انٹرویو اور نثری تحریریں

آؤ ان پر سخن آباد کا در کھولتے ہیں
لفظ مرجاتے ہیں فرہنگ میں رہتے ہوئے بھی

ہر موزوں چیز شاعری نہیں ہوتی

(نیر مسعود اور محمد مسعود کی موصوف کے ساتھ ۱۹۹۱ء میں ریکارڈ کی گئی ریڈیو ٹاک)

نیر مسعود: عرفان صاحب، آپ کے سلسلہ میں بات ہوتی ہے تو ہم لوگوں کو قائم چاند پوری کا خیال آتا ہے جو میر اور سودا کا ہم پلّہ شاعر تھا لیکن اسے وہ شہرت نہ مل سکی۔ آپ سے بھی جو لوگ واقف ہیں وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ سے بہتر شاعر ہندوستان، پاکستان میں موجود نہیں ہے۔ آپ نے کہا بھی ہے۔

تم بتاتے تو سمجھتی اسے دنیا عرفانؔ
فائدہ عرضِ ہنر میں تھا ہنر میں کیا تھا

آپ سے ہم کو یہی شکایت ہے کہ آپ ''عرض ہنر'' نہیں کر رہے ہیں آپ کے دو مجموعے ''کینوس'' اور ''شب درمیاں'' چھپے لیکن تقسیم ٹھیک سے نہیں ہوئی تو پہلے یہ بتائیے کہ یہ بے نیازی کیوں۔

عرفان صدیقی: اس سوال کے دو حصے ہیں۔ میں ایک ساتھ دونوں کے سلسلے میں عرض کرتا ہوں۔ قائم سے جو مماثلت آپ حضرات نے اپنی محبت سے تلاش کی ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں عرض کرنا لیکن کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے تعارف میں بہت بڑا ہاتھ شاید اس کی شاعری کے volume کا بھی ہوتا ہے پھر میں چونکہ خود اس فیلڈ کا ہوں مجھے معلوم ہے کہ P.R. کے تقاضے کیا ہوتے ہیں مگر یہ کہ کچھ طبیعت ادھر نہیں آتی۔

نیــر مسعــود: ہاں نہیں آتی ہوگی۔ آپ کا مزاج ہی یہ ہے کہ اس صورتحال میں اور آپ کی شاعری میں ایک عجیب طرح کی مطابقت ہے۔ آپ کی شاعری میں ایک قسم کا استغناء ہے کہ اسے پڑھ کر بھی شبہ ہوتا ہے کہ اس کا کہنے والا ان چیزوں سے بے پرواہ ہے۔

محمد مسعود: جو دو مجموعے چھپے ہیں وہ بھی اتنی کم تعداد میں کہ بہت سارے ایسے لوگ جنھیں پڑھنا چاہیے ان تک نہیں پہنچ پائے ہیں۔

نیر مسعود: ہاں تو اس کو بھی عرفان صاحب ہی کی غلطی کہیں گے۔

مسعود: اور بہت سے ایسے لوگوں تک پہنچ گئے ہیں جنھیں نہیں پڑھنا چاہیے (ہنسی)

نیر مسعود: وہ تو مجبوری ہے۔ اسے چھوڑیے۔ عرفان صاحب طرح طرح کے۔

عرفان صدیقی: دیکھیے چھپنے کے بعد یہ شرط عائد کرنا بالکل......نہیں نہیں میں شرط نہیں عائد کر رہا ہوں۔

نیــر مسعــود: ......کے سوالات آپ کی شاعری سے پیدا ہوتے ہیں کہ اس کا کہنے والا کون آدمی ہے، کیسا ہے۔ اس کو ہم جانیں۔ اب یہ ہے کہ ہم لوگ جو آپ کے قریبی دوستوں میں ہیں۔ ہماری آپ سے اکثر ملاقات ہوتی ہے۔ کھل کر گفتگو ہوتی ہے۔ ہم بھی جب شاعر کی حیثیت سے آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کچھ عجیب نظر آتے ہیں۔ نہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس شخص نے کیا کیا پڑھا ہے نہ یہ کہ کیسی زندگی گذاری ہے۔ کچھ بھی اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بزرگ کون لوگ تھے کس قسم کے لوگ تھے مگر یہ کہ اس کو اپنے بزرگوں کا بھی بہت شدید احساس ہے۔ ہم آپ کے پس منظر کے بارے میں سب سے پہلے جاننا چاہتے ہیں۔ مثلاً اپنے مطالعہ ہی کو لے لیجیے تو آپ کا مطالعہ کس طرح کا رہا بچپن سے لے کر اب تک۔

عــرفــان صــدیقی: نیر صاحب اس سلسلہ میں......واقعی آپ نے بعض چیزیں ایسی اپنے سوال کے ذریعہ اٹھائی ہیں کہ خود میرا جی چاہتا ہے کہ میں کچھ کھل کر کہوں لیکن جیسا کہ ہم لوگ

اکثر بات چیت میں کہتے رہتے ہیں بہتر یہ ہے کہ لکھنے والے کو، اس کی ذات کو، اور اس ذات کے حوالے سے خارج میں جو صفات منعکس ہو رہے ہیں ان کو اس کے لکھے ہوئے لفظوں سے پہچانا جائے۔

اچھا، اس میں نیر صاحب کوئی شعوری کوشش اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی نہیں ہے۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے کہ یہ جان بوجھ کر کوشش کی ہو کہ کوئی Mystery کا یا اسرار کا پردہ اپنی شخصیت پر یا اپنی ٹوٹی پھوٹی شاعری جیسی بھی ہے اس پر ڈالا جائے ایسا کچھ نہیں ہے لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ خیال کہیں رہتا ہے کہ اگر میں اپنا انکشاف اپنی شاعری کے ذریعہ نہیں کرتا یا نہیں کر سکتا تو پھر کچھ اور کہنا فضول ہے۔

نیـر مسـعـود: نہیں وہ سوال جو میں پوچھ رہا تھا اس نقطۂ نظر سے نہیں تھا کہ گویا آپ کی شخصیت کی تفصیلات کو سمجھے بغیر ہم آپ کی شاعری کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ یا جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ آپ نے کتنا پڑھا ہے......

عرفان صدیقی: نہیں نہیں۔ یہ میرا مطلب بھی نہیں ہے۔

نیر مسعود: ایک تجسس یا ایک دلچسپی اپنے پسندیدہ شاعر سے ہوتی ہے۔ یہاں تک ہوتی ہے کہ وہ کپڑے کیا پہنتا ہے۔ مثلاً اسلامی کپڑے پہنتا تھا یا سوٹڈ بوٹڈ تھا۔ تو اس طرح بھی کہ اپنے بارے میں، ہم لوگوں کو جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ اس قدر قربت کے باوجود آپ نے از خود کبھی بتایا ہی نہیں اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو زیادہ تر اپنے ہی بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ آپ بالکل نہیں کرتے تو یہ تجسس ہم لوگوں کے دل میں ضرور ہے۔ خاص طور پر مطالعہ کے سلسلہ میں۔ کس طرح کی چیزیں آپ بچپن سے پڑھتے آئے۔ یا کون کون سے مصنف......

عرفان صدیقی: میں عرض کیے دیتا ہوں۔ اصل میں یہ چونکہ......

مسعود: تھوڑا سا بچپن کا بیک گراؤنڈ اور تعلیم کے حوالے سے بھی فرمائیے۔

عرفان صدیقی: ہاں میں عرض کرتا ہوں، دیکھیے ایک تو اس طرح کے سوالات کا بالکل فارمل (Formal) جواب ہوتا ہے۔ آپ لوگ سوال نہ کرتے کوئی اور کرتا تو میں جواب دیتا کہ صاحب اس سن میں پیدا ہوا فلاں فلاں سن میں، فلاں کیا۔ فلاں ڈگری وغیرہ

مسعود: نہیں ذہنی سفر خاندانی ماحول وغیرہ

عرفان صدیقی: ایسا ہے کہ بہت سی باتیں نیر صاحب شاعر کے لئے ممنوع ہوتی ہیں آپ اس سے اتفاق کریں گے اور دوسری اصناف بھی لکھنے والوں کے لئے شاید...... مثلاً یہ کہ اگر میں ناول نگار ہوتا تو میں بھی کوئی نیم سوانحی ناول لکھ لیتا اور میرے بارے میں سب کچھ آپ کو معلوم ہو جاتا وہ بھی معلوم ہو جاتا جو نہیں ہوا ہے۔ جو ہوا ہے وہ تو معلوم ہی ہو جاتا لیکن شاعری کے ساتھ مقطعوں کی تعلّی کی جانے دیجئے یا اور اشعار میں تعلّی کی جانے دیجئے کہ ہماری کلاسیکی شاعری بھی تعلّیٰ کا ایک خاص حصہ رہا ہے ورنہ شاعری کا مزاج Modesty کا مزاج ہے۔ صاحب میں تو یہی سمجھتا ہوں تو اب اس Modesty کے معنی بالکل اپنی ذات کی نفی کے نہیں ہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ شاعر کچھ اس کو اپنے منصب سے کچھ فروتر چیز سمجھتا ہے کہ اپنے آپ کو خود Project کرے۔ بڑے شاعر یا اہم شاعر یا اچھے شاعر نے نہیں کیا تو اب چونکہ یہ ہے کہ بھئی شاعری کر رہے ہو تو ان بڑوں کی پیروی کرو یہ بھی خیال رہے کہ یہ Modesty بھی قائم رہنی چاہیے پھر مزاج بھی اپنا کچھ اس طرح کا نہیں ہے کہ بہت زیادہ اپنے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو طبیعت اک دم بند ہو جاتی ہے۔

لیکن ہاں اتنا بتانا ضرور پڑے گا کہ ماضی میں کیا چیزیں خاص تھیں۔ بیک گراؤنڈ کچھ اس طرح کا رہا۔ جو عام طور پر یوپی کے شریف خاندانوں کا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب کا بہت چلن تھا۔ پورا ایک سلسلہ اور اگر اس پر فخر کرنے کی اجازت دیجئے تو میں فخر بھی کروں کہ بہت بڑا سلسلہ ہے یعنی رشتہ غالب سے ملتا ہے شاعری میں۔ وہ اس طرح سے میرے پردادا ازلا آلی

بدایونی وہ حالؔی کے شاگرد تھے۔حالؔی کے آپ کو معلوم ہے چند ہی شاگرد ہیں۔

نیر مسعود: اس میں قافیہ بھی وہی ہے استاد کا۔

عرفان صدیقی: جی ہاں حالؔی کے ہی قافیے پر رکھا ہے اور میرے والد نے براہ راست اپنے والد ......نانا بھی تھے......میرے دادا کے چچا بھی......تو ان سے استفادہ کیا۔میرے والد کا تخلص جب وہ غزل لکھتے تھے......بعد میں انھوں نے تو صرف نعت ہی لکھنا جاری رکھا غزل گوئی چھوڑ دی۔غزل گوئی میں ان کا تخلص ہلالؔی تھا تو گویا واسطہ یوں بنا کہ میرے والد۔میرے والد کے بعد زلالؔی، زلالی کے بعد حالؔی۔یہ بہت بڑا سلسلہ ہے اجازت دیں تو میں اس پر زبردست فخر کروں لیکن محض سلسلوں پر فخر کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ایک تو یہ صورت حال تھی۔میرے یہاں صاحب۔میرے خاندان میں شروع سے دو دھارے تھے۔ایک تھا مذہب کا اور ایک تھا ادب کا، پورے خاندان میں ایک مذہبی روایت تھی۔بڑے تسلسل کے ساتھ اور میرے جو اجداد تھے ان کا روزگار کا معاملہ بھی کچھ نہ کچھ اس مذہب کے حوالے سے تھا یعنی اوقاف کی تولیت جو تھی سارے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے دوران وہ میرے مورثوں کو دی گئی تھی۔ایک طرح سے آپ انھیں Custodian General کہہ لیجئے اس طرح کی صورت تھی اس پر میں نے کچھ کہا بھی ہے۔

کسی مورث کے لئے ہفت ہزاری منصب
اور تولیت اوقاف کا اعزاز کہیں

اور اس کا کلائمکس یہ ہے۔

آگے بڑھنے کے لئے بانڈ الگ کرنے ہیں
علم صدیوں سے وراثت ہے تمہارے گھر کی

اور ع

عہد رفتہ کی مہک بند ہے صندوقوں میں

تو یہ رہا صاحب۔ اب دونوں چیزیں ظاہر ہے کہ مجھے ایک طرح سے ورثہ میں ملیں۔صورت حال یہ تھی کہ پورے خاندان میں ...... بدایوں میرا وطن ہے۔ پورے خاندان میں نانہال اور دادیہال میں دونوں طرف شاعری ہی شاعری تھی۔ یا تصوف تھا، یا مذہب تھا۔ بس یہی چیزیں تھیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا ذہن کے اندر بلکہ پوری ذات کے خمیر میں وہ سب چیزیں کہیں ایسے جاکے پیوست ہوگئیں کہ اب چاہوں بھی تو اپنی ذات سے ان کو خارج نہیں کرسکتا۔اچھا تو اکتساب اپنا کیا رہا؟ بہت سی چیزیں رد کرنی پڑیں۔ بہت سی چیزیں غیر ضروری نظر آئیں۔لیکن یہ کہ ان کی چھاپ سے بھی بچ نہیں سکا۔تو یہ دونوں چیزیں رہیں اور ادب کا خاص طور پر اس لئے سلسلہ رہا کہ کچھ بہت اہم نام ماضی میں اور کچھ خاصے معروف نام حال کے بھی۔ میرے خاندان سے وابستہ رہے۔ ان کا تذکرہ بے سود ہے لیکن اگر آپ ضروری سمجھیں گے تو میں تذکرہ بھی کردوں گا۔

نیر مسعود، مسعود: جی نہیں تذکرہ ضروری نہیں۔

عرفان صدیقی: تذکرے کے سلسلہ میں صاحب یہ ہے کہ مثال کے طور پر میرے...... آپ کے علم میں ہوگا ہی کہ میرے دونوں مجموعوں میں کسی قسم کا کوئی تعارفی مضمون یا اور کوئی دیباچہ یا پیش لفظ وغیرہ نہیں ہے۔ ''کینوس'' کی ابتداء ہی ایک طویل نظم سے ہے ''سفر کی زنجیر'' تو سفر کی زنجیر اصل میں ...... بہت دلچسپ بات ہوئی نیر صاحب کہ ''سفر کی زنجیر'' کے بعد بریکٹ میں لکھا ہے ''ناتمام'' تو میرے اکثر احباب نے مجھ سے تقاضا کیا کہ بھئی یہ نظم ناتمام ہے۔اسے تمام کردو۔تو میں نے کہا بھائی یہ تو اسی وقت مکمل ہوگی جب میں مکمل ہوجاؤں گا۔ میں ختم ہوجاؤں گا۔تو یہ بھی مکمل ہوجائے گی۔تو وہ اصل میں سفر کی زنجیر جو ہے اس میں اشارے ایک شخص کے مختلف جذباتی، ذہنی شعوری مراحل کے ہیں کہ کن کن مرحلوں سے وہ

گذرا ہے۔ اس کی ذات کے خارج میں جو کچھ رونما ہوتا رہا اس کا اس کی ذات پر کیا اثر پڑتا رہا اور اس اثر کو وہ کس طرح سے آج عیاں کرتا ہے تو اس میں بہت زیادہ وضاحتیں نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود مجھے یہ محسوس ہوتا ہے۔ پتہ نہیں آپ لوگ کیا اس سلسلہ میں رائے قائم کرتے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ کچھ پہچان اس میں ہوتی ہے ایک ذہن کی اور یہی میرا مقصد تھا۔

مسعود: زمانہ بھی قائم ہوتا ہے اس میں

عرفان صدیقی: زمانہ قائم ہوتا ہے یقیناً

نیر مسعود: یہ کہ چونکہ میں آپ کا ہم عمر ہوں تو ہم کو تو وہ اپنی ہی چیز معلوم ہوتی ہے

عرفان صدیقی: تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ عرفان صدیقی کی زندگی یا اس کے شعور کی داستان اتنی نہیں ہے جتنی اس پورے دور میں پیدا ہونے والے اور پرورش پانے والے اور جوان ہونے والے اور جوان ہونے کے بعد ادھیڑ ہونے والے لوگوں کی بات......تو یہ لگتا ہے کہ یہ ہمارا گویا حق ہے کہ ہم اس حد تک اپنا تعارف کرا دیں اس سے آگے کا معاملہ یہ ہے کہ میں کیا سوچتا ہوں ان معاملات کے بارے میں، میرے جذبات یا دوسرے کے رد عمل کیا ہیں یہ میری شاعری سے ظاہر ہونا چاہیے اور بھی چیزیں میں نے لکھی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر میں نے شاعری کی ہے اور شاعری کے ہی حوالے سے اپنی پہچان جو کچھ بھی ہے ٹوٹی پھوٹی وہ قائم کرانا پسند کرتا ہوں۔ تو شاعری کے حوالے سے اگر ظاہر ہوتا ہے وہی مناسب ہوگا اور وہی بہتر ہوگا۔ یہ کوئی شعوری کوشش نہیں تھی لیکن اب یہ میرے پورے مزاج کا اور میری ذات کا گویا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ اس سانچے کو توڑنا ممکن نہیں ہوگا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

میرے بزرگوں نے کام بڑے کئے یہ اور بات ہے کہ سب لوگوں کو پتہ نہ چلا ہو۔ مثال کے طور پر جس زمانے میں حفیظ جالندھری نے ''شاہنامۂ اسلام'' لکھا اسی زمانے میں

میرے دادا عیش ضیائی صاحب نے ''شہنشاہ نامہ اسلام'' لکھا جس کی ۶ جلدیں ہیں۔ چھپ چکی ہیں نظامی پریس سے اور متعدد دیوان ...... میرے دادا شاد صاحب اکرام احمد صاحب شاد۔ وہ شاگرد تھے احسن مارہروی کے اور اس حوالے سے داغ اسکول کے آدمی تھے۔ ان کا بھی نظامی پریس سے انتخاب ''نغمات شاد'' کے نام سے بہت پہلے شائع ہوا تھا۔ میری پیدائش کے وقت ۱۹۴۰ء میں والد نے جیسا کہ میں نے عرض کیا غزل سے اپنا رشتہ توڑ کر بالکل نعت گوئی اور تاریخ اسلام کو نظم کرنے تک اپنے کو محدود کر لیا تھا یا اپنے کو وسیع تر کر لیا تھا ان کی بہت سی چیزیں ہیں کچھ چھپ چکی ہیں اور کچھ نہیں چھپی ہیں ''لمعات اسلامی'' کے نام سے انھوں نے اسلامی تاریخ کے کچھ بہت درخشاں واقعات کو منظوم کیا تھا۔ وہ ابھی چھپا نہیں ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اسے چھپواؤں۔ حال کے ناموں میں مثال کے طور پر محشر بدایونی میرے چچا ہیں۔ میرے والد کے حقیقی چچازاد بھائی۔ پھر دلاور فگار ہیں۔ میرے والد کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی۔ مطلب یہ کہ ایک ہی گھر کی میں بات کر رہا ہوں۔ ایک دادا پردادا ایک نانا پرنانا کی تو اس طرح سے نیر صاحب یہ رہا ہے معاملہ اور میرے والد کے چچازاد بھائی سبطین احمد ہیں۔ انھوں نے بہت کام اسلامی تاریخ پر کیا ہے۔ انگریزی اور اردو میں بھی۔ پاکستان میں ''سیرت النبی'' کی دو جلدیں انھوں نے انگریزی میں ترجمہ کیں۔ وہ وہاں چھپی ہیں۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ تو یہ مختلف دھارے نیر صاحب ...... یہ بھی صرف اس لئے کہنا پڑا کہ کچھ پدرم سلطان بود والی بات نہیں ہے لیکن یہ چونکہ آپ نے پوچھا ہے اس لئے بتایا۔

نیر مسعود: نہیں یہ بات ضروری بھی تھا۔

مسعود: اب کچھ اپنی والدہ کے بارے میں فرمائیے

عرفان صدیقی: والدہ کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔ میری والدہ...... اصل میں میری اپنی شخصیت پر میری والدہ کی بہت گہری چھاپ ہے صورتحال یوں ہے کہ جیسا اکثر گھروں میں

ہوتا ہے۔ میری والدہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اور میرے والد اپنے مزاج کے اعتبار سے خاصے مختلف یعنی ضدین جیسے تھے۔ ایک بے حد رقیق القلب اور نرم اور گداز یعنی میری والدہ۔ اور ایک بظاہر بہت سخت اور با اصول یعنی میرے والد۔ والد سے تو جو کچھ سیکھا بہت سیکھا...... البتہ اگر کہا جائے کہ جو کچھ ٹوٹے پھوٹے لفظ آتے ہیں وہ اپنے والد اور دادا کی وجہ سے آتے ہیں۔ مدرسہ اور کالج اور اسکول کا اتنا ہاتھ نہیں ہے۔ لیکن اندر جو کچھ ملا ہے شخصیت کو اس میں بہت زیادہ دین میری والدہ کی ہے۔ میری والدہ خود بھی شاعرہ تھیں اور با قاعدہ شعر کہتی تھیں اور بہت مطالعہ تھا ان کا بلکہ آپ کو حیرت ہوگی اگر میں یہ بتاؤں کہ میں نے اردو کی جتنی بھی بنیادی کتابیں پڑھی ہیں وہ سب اپنی والدہ کی وجہ سے پڑھی ہیں اس لئے کہ وہ منگواتی تھیں۔ وہ پڑھتی تھیں علاوہ ان چیزوں کو جو والد پڑھاتے تھے تو گویا پہلا تعارف جو کچھ ہوا اردو کے بنیادی ادب سے وہ اپنی والدہ کے حوالے سے۔ ان کی شخصیت کی کچھ چیزیں ملیں مثلاً بہت رقیق القلب تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نہیں صاحب بہت زیادہ وقت جو گذرا ہے کوئی بہت خوبی کی بات نہیں ہے لیکن یہ کہ یہ سب چیزیں اندر کہیں جذب ہیں۔ ایک اور پہلو جو اکثر آپ نے دیکھا ہوگا بار بار وہ شاعری کا ایک پہلو ہے میری لیکن ہے بہت اہم معاملہ۔ یعنی ''کربلا'' کے واقعہ نے جس طرح مجھے متاثر کیا ہے یہ بڑی دین ہے میری والدہ کی۔

نیر مسعود: تو تین روایتیں آپ کے پسِ پشت رہی ہیں۔ دینی اور مذہبی روایت ایک ادبی روایت اور ایک تصوف کی روایت۔ کربلا کا ذکر آپ نے کر ہی دیا۔ اب تو خیر با قاعدہ یہ ایک مضمون بن گیا ہے کربلا کا اور بہت دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں آپ کا نام بہت کم لیا جاتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب تو برہم ہو گئے اس بات پر کہ عرفان کا نام نہیں لیا جا رہا ہے آپ نے غالباً سب سے پہلے با قاعدہ اس کو شعری استعارہ بنا کر پیش کیا ہے تو یہ ہم لوگ پوچھنا بھی چاہ رہے تھے کہ اسے محض استعارہ گڑھنے کا شوق تو نہیں کہہ سکتے یہ استعارہ تو موجود تھا ہی

ہمارے یہاں۔ اگر جدت کا شوق ہوتا تو کوئی اور استعارہ اور علامتیں ڈھونڈتے۔ تو ایک علامت جو ہمارے یہاں کمزور طریقے پر موجود تھی آپ نے اس کو بالالتزام برتا اور بہت آگے بڑھادیا۔ اس وقت بھی اگرچہ ہمارے افتخار عارف کی بھی بہت شہرت ہے۔ میں اور انھوں نے بہت کچھ اچھے شعر کہے بھی لیکن تعداد میں بھی آپ کے شعر ان سے زیادہ اور تنوع میں بھی زیادہ ہیں تو کیا سبب تھا کہ آپ کو اس واقعہ کے علامات یا رموز اپنے خیالات کے اظہار کے لئے زیادہ سازگار معلوم ہوئے؟

عرفان صدیقی: عرض کرتا ہوں۔ یوں ہے نیر صاحب کہ مجھے زندگی کے وہ موضوعات جن کے بارے میں مجھے کچھ کہنا ضروری محسوس ہوا ان میں ایک بہت پیش پا افتادہ بات لگے گی، مگر ہے۔ میں اس میں کیا کرسکتا ہوں۔ ظلم اور بے انصافی اور جبر اور تشدد کے مقابلے میں آدمی کی خودی کا اثبات کیوں کر ممکن ہے۔

نیر مسعود: بہت عمدہ بات ہے۔

عرفان صدیقی: تو صاحب یہ سب چیزیں کہیں نہ کہیں میرے خمیر کا حصہ ہیں۔ اپنے آپ تو ایسا نہیں ہوگیا کہ یہ سب چیزیں اچانک مجھے اہم معلوم ہونے لگیں۔ ظاہر ہے کہ اندر سے میری نشو ونما اس قسم کی تھی کہ یہ چیزیں بہت اہم لگتی رہیں تو یہ موضوع مجھے بہت بنیادی موضوع لگتا ہے۔ نیر صاحب کہ آدمی کیا واقعی بے بس ہے۔ کیا ایسا ہے کہ آدمی ظلم کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟

تو کربلا کے سلسلہ میں یہ تھا کہ جیسے ''کینوس'' میں آپ دیکھیں۔ کہ......اب یہاں مطلب کی بنیاد واضح کردوں کہ ایک تو موضوع یہ ہے کہ یہ صرف ایک موضوع ایک پہلو ہے لیکن ایک موضوع یہ ہے کہ انسان انتہائی جبر اور انتہائی تشدد، انتہائی ظلم کے مقابلے میں اپنے آپ کو...... جسے قرآن ''صبر'' کہتا ہے ہم لوگ اس کو بہت محدود معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اپنی خودی کا اثبات کیوں کر کرسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی کہاں تک خود کو قائم رکھ سکتا

ہے۔ یہ موضوع مجھے صاحب بڑا اہم لگتا ہے بلکہ مجھے تو ساری دنیا میں اگر آپ سچ پوچھیے تو ہر طرف یہی چیز نظر آتی ہے اور اس میں زبان کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ لڑائی ازل سے جاری تھی اور ابد تک جاری رہے گی۔ میں نے لکھا بھی ہے۔

پھر ایک عجیب تماشہ رہے گا صدیوں تک
یہ کاروبار کمان گلو ہے کتنی دیر

یہ شعر جس غزل میں شامل ہے وہ دوسرے مجموعے ''شب درمیاں'' میں ہے ''کینوس'' کی شاعری میں سے شعر میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں۔

سروں کے پھول سر نوک نیزہ کھلتے رہے
یہ فصل سوکھی ہوئی ٹہنیوں پہ پھلتی رہی

یا یہ کہ

جو بھی تم چاہو وہ تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا تھا

تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب سے میں نے لکھنا شروع کیا ہے مجھے یہ موضوع بہت اہم لگا ہے اور اس کی جھلک آپ نے دیکھی۔

نیر مسعود: اچھا اب آپ کو خیال ہوگا کہ آصف فرخی نے انتظار حسین سے جو گفتگو کی تھی وہ بہت خوبصورت انداز میں شروع کی تھی کہ انھوں نے ایک دم پوچھ لیا کہ انتظار صاحب آپ کو دنیا کیسی لگتی ہے؟ جیسی کہ انتظار حسین کی عادت ہے کہ بظاہر وہ گھبرا گئے بوکھلا کر پوچھا ''بھئی کیا مطلب تو یہ جو آپ کے یہاں کربلا کی علامتیں ہیں۔ اس میں آپ نے جیسا بتایا کہ ظلم اور جبر کے خلاف اپنی شخصیت کا اثبات یہ کربلا بہت بڑا استعارہ ہے تو اب ہم سبھی ایک طرح سے محسوس کر رہے ہیں کہ ظلم اور جور کے ماحول میں گھرے ہوئے ہیں۔ شاعر ظاہر ہے کہ اس کو

زیادہ محسوس کرتا ہے اس لئے کہ زیادہ حساس ہوتا ہے تو مسئلہ یہ ہے کہ ہم ظلم و جور میں گھرے ہوئے تو ہیں لیکن ظلم و جور کرنے والے ہم کو نظر نہیں آ رہے ہیں ورنہ ان کے خلاف ہم مورچہ کھول دیتے تو آپ کو کیا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ جو Hostile دنیا آپ کے مقابلہ میں ہے اس کی Hostility کہاں ہے کس نوعیت کی ہے؟

عرفان صدیقی: یہ بہت معنی خیز بات آپ نے فرمائی ہے بالکل سچ ہے نیر صاحب کہ ہم اپنے ......ہم سے مراد ہے آدمی۔ وہ آدمی جو ظلم کی طاقتوں کے یا ناانصافی کی طاقتوں کے مقابلہ میں ڈٹا ہوا ہے اور شاعر اس کے ترجمان کی حیثیت سے ہے۔ ان طاقتوں کو پوری طرح identify نہیں کر پاتا ان کی شناخت بہت مشکل ہو گئی ہے کہ اب بالکل سفید و سیاہ کے خانوں کی طرح ظلم اور مظلومی بٹی ہوئی نہیں ہے۔

نیر مسعود: ہاں نہیں ہے۔

عرفان صدیقی: شاید شروع میں بھی یہ صورت تھی لیکن اس وقت یہ پہچان اس لئے آسان تھی کہ ظلم کے ذرائع معلوم تھے اور وہ بہت محدود تھے۔

مسعود: ظلم کرنے والی جو طاقتیں ہیں ان کو identify کرنے کا ایک سوال ہے۔ یعنی آدمی جو ظلم کے خلاف ڈٹا ہوا ہے۔ ظلم کا شکار ہے وہ پہچان نہیں پا رہا ہے کہ کون سی طاقتیں ہیں جو اس پر ظلم کر رہی ہیں، ظلم کی کتنی جہتیں ہیں۔

نیر مسعود: ہاں اصل مسئلہ تو یہی ہے۔ اگر اس کو پہچان لیا جائے تو اس سے لڑنا بھی آسان ہو جائے۔

مسعود: اور ظلم کی کتنی صورتیں ہیں بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں ڈاکٹر صاحب کہ آپ کو بظاہر نہیں لگے گا کہ ظلم ہو رہا ہے لیکن پس پردہ......

نیر مسعود: ہاں کاروبار بہت فنکارانہ ہو گیا ہے مظلوم کے پاس تو کوئی فن نہیں ہے۔

مسعود: جیسے میں اس سے ہٹ کر ذرا ایک بات کہوں۔ ایک مرتبہ آپ بھی کہہ رہے تھے کہ ایسے کئی لوگ ہیں ہمارے دانشوروں میں جو مثلاً یہ کہ باقاعدہ......

عرفان صدیقی: جی ہاں کچھ تو نامحسوس اور نا معلوم طور پر آلۂ کار بن جاتے ہیں یا شکار بن جاتے ہیں۔ تو میں نے یہ عرض کیا تھا کہ زمانہ اور زمانے کے معاملات اتنے پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ اب ظلم کو بہت آسانی کے ساتھ پہچانا نہیں جاسکتا بہت ظلم ایسے ہیں جو بظاہر بہت مہربانی اور عنایت نظر آتے ہیں لیکن ہیں اصل میں ظلم۔ تو اچھا اب یہاں شاعر کا۔ اگر آپ اجازت دیں تو کہوں کہ منصب...... ورنہ یہ کہ فرض ہے کہ وہ کوشش کرے کہ شناخت قائم ہو جائے کہ ظلم اصل میں ہے کیا اور اس ظلم کے مقابلہ میں مظلوم کا ردِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ مظلوم کے ردِ عمل کے سلسلہ میں نیر صاحب ایقان کا حصہ جو بات بن چکی ہے وہ یہ ہے مزاحمت کسی نہ کسی سطح پر ضروری ہے وہ مزاحمت عمل سے بھی ہوسکتی ہے اور وہ مزاحمت محض خیال اور عقیدہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ اگر ظلم کوئی شخص بہت آسانی سے...... اور بہت خاموشی سے۔ آسانی نہ کہیئے، بلکہ خاموشی سے سہ لیتا ہے تو وہ خود بھی ظالم ہے۔ وہ ظلم کا حصہ بن جاتا ہے۔ ایک شعر میں نے کہا تھا اس موضوع پر۔

بہت کچھ دوستو بسمل کے چپ رہنے سے ہوتا ہے
فقط اس خنجر دستِ جفا سے کچھ نہیں ہوتا

تو یہ بھی معاملہ ہے صاحب۔ لوگ ظلم کر رہے ہیں اور بعض لوگ ظلم سہ رہے ہیں۔ تو جو ظلم سہ رہے ہیں وہ بھی ایک مرحلے پر اتنے ہی قابل مذمت ہوسکتے ہیں جتنے ظلم کرنے والے۔ اس لئے کہ ظلم اگر آپ سہ رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ظلم کو پنپنے کا موقع دے رہے ہیں۔

تو دو چیزیں سامنے آئیں ایک تو شناخت قائم کرنا کہ ظلم اصل میں ہے کیا؟ بھیس بدل بدل کے آتا ہے تو اس کو identify کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ کام تو بہر حال کچھ نہ کچھ

ظاہر ہے کہ فنکاروں کے کرنے کا ہے۔ ادیبوں، شاعروں کے علاوہ جو دوسرے لوگ ہیں یہ کام کررہے ہیں ان کے یہاں اپنے اپنے مفادات بھی نظر آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ظلم کو identify کرنے کا دعویٰ تو بہت سے سیاستداں، بہت سے صوفی اور دوسرے لوگ کرتے ہیں ہی لیکن صحافیوں اور سیاستدانوں کے جو رویے ہیں ظاہر ہے کہ شاعر افسانہ نگار یا کسی اور ادیب کا رویہ نہیں ہوسکتا نہ ہونا چاہئے تو ہمارے ان کے approach میں بھی فرق ہے اور غالباً نتائج میں بھی فرق ہے۔

مسعود: سہل انگاری بھی ہے ایک طرح سے ان کے یہاں۔

عرفان صدیقی: صحافت میں تو خاص طور پر سیاہ کو سفید کو اور سفید کو سیاہ ثابت کرنے کی شعوری کوشش ہے اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں یعنی ایسی یلغار کردی ہے ذرائع ابلاغ نے کہ آدمی کو بالکل پہچاننے سے معذور کردیا ہے کہ سچ کیا ہے جھوٹ کیا ہے۔ ظلم کیا ہے اور مظلومی کیا ہے۔ انصاف کیا ہے بے انصافی کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ شاعر کا تو یہ رویہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تو ایک تو ظلم کی شناخت، بے انصافی کی شناخت اور دوسرے یہ کہ خود مظلوم کو اس چیز کا احساس دلانا کہ اگر تم ظلم کو خاموشی سے سہ لوگے تو تم بھی ظلم کے system کا ایک حصہ بن جاؤ گے۔ اس سلسلہ میں ایک موضوع ہے...... یہ موضوع اس لئے بہت اہم نظر آتا ہے نیر صاحب...... پھر بات تو انھیں اصطلاحوں میں کرنی پڑتی ہے کہ جنھیں سیاست داں کرتے یا سماج کے دوسرے ماہرین کرتے ہیں معاملہ ہے انسانیت کی existence کا اگر یہ خبر نہ ہو کہ کہیں روک لگنی چاہئے نا انصافی پر اور ظلم پر اور جبر پر تو پھر شاید انسانیت کا وجود ہی نظر بھی پڑ جائے تو کچھ اس اعتبار سے تو بڑا اہم موضوع مجھے لگتا ہے، صرف ایک موضوع لیکن ہے۔

نیر مسعود: اچھا اب تین عناصر قرار پائے تھے آپ کے پس منظر کے۔ ایک تو مذہب تھا جس کا حوالہ کربلا کے سلسلہ میں آیا اگرچہ اس میں گفتگو ابھی بہت باقی ہے اس لئے کہ آپ کے

یہاں علائم کی جو تعمیر ہوئی وہ گویا ظلم کے بالمقابل ہونے کی وجہ سے آپ کربلا کو اپنے سامنے رکھتے ہیں تو اس کے مذہبی پہلو سے فی الحال ہم سروکار نہیں رکھیں گے لیکن ایک چیز جو بین بین ہے ان دونوں کے یعنی تصوف۔ تصوف کو بھی ایک حد تک ظلم اور جور کے خلاف احتجاج کے طور پر لوگوں نے پیش کیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ بالکل سو فیصد تو صحیح نہیں ہے کسی حد تک صحیح ہے۔ آپ کے یہاں تصوف کا بہت گہرا اثر نظر آتا ہے لیکن وہ صوفی منش کا انداز نہیں ہے۔ نہ آپ کی شاعری کو صوفیانہ شاعری ہی کہیں گے لیکن تصوف کا ادراک اور شعور بہت زبردست آپ کے یہاں ہے اور اس کی اصطلاحات بھی آپ کے یہاں۔ ابدال وغیرہ۔ آتی ہیں۔ تو کس طرح تصوف نے آپ کو متاثر کیا؟ یعنی یوں تو آپ کے انداز میں تو ہے صوفی منشی اور بے نیازی۔ ایک طرح کی قناعت پسندی لیکن کلام میں تصوف جھلک رہا ہے اس کو بتایئے کہ آپ کس طرح متاثر ہوئے ہیں، اس تصوف سے۔

عرفان صدیقی: اس میں بھی نیر صاحب معاملہ یہ ہے کہ تصوف کی بھی دو، آپ نے خود بھی فرمایا، تصوف کی دو سطحیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو خالص نظریاتی یا academic سطح ہے کہ تصوف...... جو رشتہ ہے اس رشتے میں اخلاص کی تلاش کا نام تصوف ہے۔ رشتہ جو انسان اور خدا کے درمیان ہے ایک بات تو یہ ہے بنیادی۔ لیکن تصوف کا جو پہلو بہت زیادہ مجھے اہم لگتا ہے اور جس کی جھلک آپ نے جیسا کہ فرمایا آپ کو نظر آتی ہے اور آنی چاہئے اس لئے کہ ہے بھی کہ تصوف عام انسانی زندگی پر کس طرح سے اثر انداز ہوتا ہے۔ تصوف سے مراد یہ ہے کہ وہ appoach زندگی کے تئیں جو تصوف سکھاتا ہے وہ کہاں تک انسانی زندگی کے لئے اہم ہے. مجھے وہ approach اس لئے بامعنی نظر آتا ہے کہ اس کا رشتہ بھی ظلم کے خلاف احتجاج سے کہیں نہ کہیں جڑ جاتا ہے اس حد تک کہ تصوف بھی بعض جبر کے system جو ہیں ان کے خلاف ایک طرح کا احتجاج تھا۔ وہ جبر کے system خود مذہب کے مظاہر میں بھی قائم تھے۔

وہ جکڑ بندیاں، وہ سختیاں، وہ ظاہری معاملات پر اصرار۔ ان سب چیزوں سے ایک خاص طرح کی بغاوت کا نام تصوف ہے۔ عملی اعتبار سے اس سے بھی آگے بڑھ کر تصوف نے جو بنیادی تعلیم دی بلکہ صوفیا نے جو بنیادی تعلیم دی کہ بھئی انسانوں کا معاملہ جو ہے وہ یہ ہے کہ انسان اور انسان میں کوئی تفریق دوسری پہچانوں کی بنیاد پر نہیں قائم ہونی چاہیے انسان ہونے کے ناطے اور خدا کے بندے ہونے کے ناطے تمام انسان برابر ہیں۔ دو پہلو ہو گئے ایک تو یہ کہ جبر کے system کے خلاف اور اس گھٹن کے خلاف ایک خاص طرح کی آزادی کی فضا کی تلاش۔ یہ اور ایک یہ approach کہ انسان بڑی قابل قدر چیز ہے اور انسان کی اچھائیوں کی اور انسان کے وجود کی جو بنیادی خوبیاں ہیں ان کی تلاش بہت اہم چیز ہے۔ اس کی ایک جھلک آپ میری شاعری میں پائیے گا۔

مسعود: اچھا یہ جو کربلا کا ذکر ابھی آیا ہے۔ ظلم اور مظلومی کے حوالے سے جو پس منظر آپ نے اپنا گھریلو اور ذاتی بیان کیا۔ تو ظاہر ہے مسلمان گھرانوں میں تمام اسلامی جنگوں کا ذکر ہوتا ہے جہاد کا بھی ذکر ہوتا ہے تو ہمیں جگہ جگہ شاعری میں آپ کے یہاں کچھ جہاد کا بھی ایک سلسلہ نظر آتا ہے فتوحات کے معنوں میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ وہ ایک حرکت ہے جسے جنگ کہہ سکتے ہیں۔ ماضی کے حوالے بہت ہیں۔ تو سفر کی زنجیر کا جو زمانہ قائم ہوتا ہے تقریباً دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ ہے۔ اس میں جو سب سے بڑا واقعہ ہوا ہے ہمارے برصغیر میں ہندوستان کی تقسیم کا۔ تو ہمارے برصغیر کے لوگوں پر اس تقسیم کے جو اثرات پڑے ہیں خاص طور سے مسلمانوں پر، تہذیبی طور پر پوری ایک قوم متاثر ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا تہذیبی ماحول ختم ہو گیا تو تقسیم کے المیہ کے وقت آپ کا بالکل شروع کا زمانہ رہا ہوگا۔ اس زمانے کے معاملات کو جو آپ نے دیکھا، محسوس کیا۔ گھروں میں جو اس کا تذکرہ ہوا تو اس کی بھی ایک خاص تلخی ہمیں نظر آتی ہے کہ آپ کی شاعری میں آتی۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کچھ

بتائیں کہ اس کے کیا اثرات پڑے۔

عرفان صدیقی: میں عرض کرتا ہوں......اصل میں وہ تصوف کے سلسلہ میں ذرا سی بات عرض کرنا رہ گئی وہ پہلے کرلوں اس کے بعد آپ کے سوال کی طرف آؤں گا......تو نیر صاحب نے جو تصوف کا سلسلہ میں کہا۔ کہ تصوف کے کون سے پہلو۔ تو میں نے عرض کیا کہ ایک تو وہ پہلو ہے جو گویا جبری نظاموں کے خلاف بغاوت کا ہے اور دوسرا یہ کہ خود انسان کے اندر کی جو بنیادی اچھائیاں ہیں ان کے اثبات کا معاملہ ہے تو یہ دو پہلو ہیں۔ تصوف کا مگر ایک اور معاملہ یہ ہے کہ اصل میں ہمارے ہاں خصوصاً شاعری میں کہ ہم چیزوں کو اور کبھی کبھی بعض اصطلاحوں کو خاصی رسمی طور پر برت لیتے ہیں۔ تصوف کا معاملہ بنیادی طور پر حال کا معاملہ ہے حال کا معاملہ......تمام صوفیا نے کہا ہے کہ تصوف ایسی چیز نہیں ہے جسے آپ دوسروں کو سمجھا سکیں یا بیان کرسکیں۔ وہ تو ایک کیفیت ہے اور ایک واردات ہے۔ وہ اگر ہے تو ہے۔ نہیں تو نہیں ہے۔ نیر صاحب نے ایک لفظ کی طرف اشارہ کیا تھا ابدال تو سلوک کے رستے کے مختلف مدارج ہیں اور ان مدارج پر فائز لوگوں کے مختلف مراتب۔ ایک شعر ہے میرا:

ورنہ ہم ابدال بھلا کب ترک قناعت کرتے ہیں
ایک تقاضا رنج سفر کا خواہش مال و منال میں تھا

تو relate اس طرح سے کیا ہے کہ مطلب یہ نہیں ہے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ صاحب آج کے زمانے میں کوئی بڑے ابدال موجود ہیں۔ معاملہ صرف اتنا ہے کہ آج ابدال کی صف میں وہ بھی شامل ہے یقیناً جو اپنی approach کے اعتبار سے ترک قناعت نہ کرے۔ حالانکہ دوسرے مصرعہ میں بات میں نے کچھ اور کہنی چاہی ہے۔ میں نے تو صرف اتنا کہنا چاہا ہے کہ اصل بات خواہش مال و منال نہیں ہے۔ اصل بات ہے رنج سفر۔ رنج سفر اٹھانے کا معاملہ ہے۔ یہ اندر کی ایک image ہے اس کی وجہ سے اسے لوگ خواہش مال و منال سے تعبیر کرتے ہیں لیکن

ابدال کی جو میں نے علامت کے لئے استعمال کی ہے اس کا مفہوم صرف اتنا ہی ہے کہ ترک قناعت کیا ہے۔ ترک قناعت کو اس شعر میں میں نے اپنے طور پر interpret کیا ہے۔ عرض یہ ہے کہ تصوف کی دو اصطلاحیں جو آج مجھے relevant انسانی زندگی میں لگتی ہیں ان کو بھی اپنی شاعری میں برتتا ہوں۔

مسعود: تصوف سے بھی......قناعت اور صبر کا......

عرفان صدیقی: اصل میں قناعت اور تصوف صرف تصوف ہی نہیں میں تو تصوف کی بنیاد ہی نہیں سمجھتا۔ قناعت کو ایک خاص معنی میں قناعت جو ہے یعنی اسے آپ ترک ہوس کہیے کیونکہ ہوس جو ہے پھر اس کا رشتہ وہی ظلم سے جا کے جڑ جاتا ہے۔ ہوس پھر جن چیزوں پر آمادہ کرتی ہے وہ ناانصافیوں کو اور ظلموں کو جنم دیتی ہے۔

اچھا آپ نے مسعود صاحب تقسیم کے سلسلہ میں جو باتیں کہیں تو تقسیم تو صاحب اتنا بڑا المیہ ہے ہندوستان اور پاکستان کا، اور مجھے اب تک یہ لگتا ہے کہ تقسیم جتنا بڑا المیہ ہے اس اعتبار سے اور اس لحاظ سے ہمارے ادب میں اس کا عکس نہیں ملتا۔ میں اردو ادب کی بات کہہ رہا ہوں اور اردو ادب میں تقسیم جیسے بڑے المیہ کا کوئی اتنا گہرا با معنی اور اتنا اہم حوالہ نہیں ہے۔ لوگوں نے ذکر کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ فساد سے متعلق افسانے لکھے گئے ٹھیک ہے، لیکن اس پورے تہذیبی ڈھانچے کی شکست و ریخت کے کیا نتائج ہوئے۔ ان سب باتوں پر ابھی بہت کچھ لکھنا نیر صاحب باقی ہے اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ شاید اس اعتبار سے محض تقسیم کو کسی نے اپنا موضوع نہیں بنایا ہے۔ آپ قرۃ العین حیدر کا ذکر کیجئے لیکن انھوں نے تقسیم کے المیہ کے ایک خاص پہلو کی طرف توجہ رکھی ہے۔ یعنی تقسیم کا المیہ صرف طبقہ اشرافیہ کے لئے نہیں تھا یا کسی ایک خاص طبقے تک محدود نہیں تھا۔ وہ تو ایک اتنا بڑا معاملہ ہے کہ اس کی کچھ نہ کچھ چوٹ ان پر بھی پڑتی ہے جنھوں نے ترک وطن نہیں کیا۔ ان کا تو مسئلہ ہے ہی جو ترک وطن کر کے چلے گئے،

ترک وطن کر کے جو نہیں جا سکے کبھی کبھی ان کے مسائل زیادہ اہم نظر آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ نہ صرف ہندوستان کا مسئلہ تھا، نہ صرف پاکستان کا مسئلہ تھا، پورا انسانی سماج اس سے متاثر ہوا ہے۔ مجھ پر اس حد تک اس کا اثر پڑا ہے کہ مجھے چیزوں کے ٹوٹنے کا رنج نہیں ہے مجھے بحیثیت شاعر رنج اس بات کا ہے کہ کچھ نئی چیزیں ان کی جگہ بن نہیں پائیں۔ دیکھئے اقدار تو بہت subjective چیزیں ہیں اور بعض اقدار ایسی ہیں جنھیں آپ زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔

مسعود: افسوس زیاں کا نہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ کچھ نیا۔

عرفان صدیقی: ہاں کوئی نیا۔ زندہ اور فعال system وجود میں نہیں آیا۔ تہذیبی سطح پر چیزیں ٹوٹ گئیں۔ بہت اچھا ہوا صاحب بعض چیزوں سے میرا جذباتی لگاؤ تھا۔ یقیناً جو کچھ ٹوٹا ہے اس میں بہت سی چیزیں مجھے عزیز تھیں لیکن ان کی مرثیہ خوانی سے فائدہ نہیں ہے کہ ان کی بازیافت نہیں کی جا سکتی، ان کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ ہے کہ ان چیزوں کے ٹوٹنے کے بعد کچھ اور بنتا تو وہ بنتا ہوا مجھے ہندوستان پاکستان کہیں کچھ نظر نہیں آرہا ہے مثلاً یہ کہ تقسیم سے پہلے جو سماج کی کیفیت تھی اس میں بعض چیزیں معمولی طور پر اچھی مانی جاتی تھیں مثلاً یہ کہ دولت کی تلاش میں تمام حدوں کو توڑ دینا اور دولت کے حصول کے لئے تمام چیزوں کو بالائے طاق رکھ دینا بہت خراب بات سمجھی جاتی تھی اب یہ خراب بات نہیں سمجھی جاتی۔ یہ دونوں جگہ ہے۔ ہندوستان میں بھی، پاکستان میں بھی۔ تو رنج جو ہے مجھے وہ اس کا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی نیا Value System ابھی تک بن کر نہیں آیا۔ چھا اسے رنج بھی مت کہئے اس لئے کہ ایک سماجیات کے طالب علم کی حیثیت سے مجھے معلوم ہے کہ اقدار اور سماجی ڈھانچے ایک سال دو سال پچاس سال میں نہیں بنتے ہیں۔ بہت وقت لگتا ہے۔ تو المیہ میرا یہ ہے کہ میں ایک ایسے transitory دور میں زندہ ہوں کہ جس میں پرانی چیزیں ٹوٹ گئی ہیں نئی چیزیں واضح طور پر سامنے نہیں آئیں۔ میں اپنے کو ایک خاص طرح سے بے زمین پاتا ہوں۔

نیر مسعود: اچھا اب دو باتیں ذرا اور طرح کی..... ہم لوگ خاصے قاعدہ سے چل رہے ہیں (ہنسی)

عرفان صدیقی: نہیں نہیں، تھوڑی بے قاعدگی بھی نیر صاحب ضروری ہے تھوڑی بے ترتیبی۔

نیر مسعود: ہاں بے قاعدگی کی طرف آ رہے ہیں۔ ابھی تک تو ترتیب قائم ہے اب تیسری چیز ادبی روایت آپ کی رہ گئی۔ تو آپ کا رشتہ آپ کی ادبی روایت سے اس حد تک تو ہے کہ آپ کے اجداد کو بھی ادب سے شوق تھا۔ شعر لکھتے تھے، نثر لکھتے تھے، تصنیف و تالیف میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس حد تک تو آپ اسی روایت کی توسیع ہیں، روایت کا جز ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ زمانے کے فرق کی وجہ سے ان بزرگوں اور آپ میں کوئی مماثلت شاعری کی حد تک نہیں ہے اور نہ اس کی توقع کرنا چاہیے کہ صاحب آپ اس طرح کہیے جس طرح مرحوم زلالی صاحب کہہ رہے تھے یا آپ کے والد صاحب کہہ رہے تھے۔

عرفان صدیقی: جی درست

نیر مسعود: لیکن اس کے ساتھ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر سنجیدگی سے آپ کے اجداد شاعری کرتے تھے اور جو تنقیدی مذاق وغیرہ تھا، خاص طور پر کہ تکنیکی پہلوؤں پر پورا زور دیتے تھے تو آپ کے یہاں بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی ریاض کئے ہوئے شعر ہیں۔ ہر لفظ بہت ٹھونک بجا کر سوچ سمجھ کر استعمال کیا گیا ہے اور اب بدقسمتی ہے کہ ہم اسے خصوصیت کہنے پر مجبور ہیں لیکن پہلے زمانے میں یہ کوئی بہت بڑی خصوصیت نہیں تھی۔ شاعر ہوگا تو اس کے کلام میں پختگی اس لحاظ سے ہوگی ہی، سب لفظ رواں ہوں گے، کسی قسم کا جھول یا غیر فصیح لفظ نہیں آنے پائے گا۔ آپ کے یہاں جو خاص بات نظر آتی ہے وہ یہ کہ پہلے آپ لفظ کے اسرار کو سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد اس کو شعر میں لاتے ہیں۔ آپ کے یہاں جو شعروں میں الفاظ ایک دوسرے سے عجیب و غریب رشتے قائم کرتے نظر آتے ہیں وہ روایتی قسم کے رشتے نہیں ہیں مثلاً رعایت لفظی یا ابہام کا رشتہ ہے نہ صرف یہ کہ کسی مخصوص شعر کے لحاظ سے موزوں لفظ

ہوں گے بلکہ اس شعر کے دوسرے لفظوں کے لحاظ سے ہر لفظ کا استعمال ہوگا۔ اس لئے آپ کے یہاں بعض ایسے الفاظ بھی آجاتے ہیں جو اب کم استعمال ہو رہے ہیں مثلاً ارزانی کرنا یا آپ کے یہاں کسی شعر میں نواح کا لفظ ہے اقربہ کا لفظ ہے، اس طرح کے بہت سے الفاظ ہیں۔ تو یہ الفاظ جو آپ استعمال کر رہے ہیں ان کے لانے کے کیا سبب ہیں اور یہ کہ الفاظ کے انتخاب میں آپ کیا محنت کرتے ہیں۔

عرفان صدیقی: نیر صاحب یہ تو آپ نے بہت ضروری بات کہہ دی اس لئے کہ اگر آج کی گفتگو میں یہ بات نہ ہوتی تو مجھے یہ لگتا کہ بات ہی نہیں ہو پائی ہے اور مزے دار بات یہ ہے کہ جو کچھ مجھے کہنا چاہیے تھا تقریباً وہ سب آپ نے کہہ دیا ہے لیکن اب میں عرض کرتا ہوں۔ نیر صاحب جیسا کہ آپ جانتے ہیں لفظ بہت پر اسرار چیز ہے، بہت بڑی چیز بھی ہے۔ بڑی طاقتور چیز بھی ہے اور بڑی مقدس چیز بھی ہے تو لفظ کے اسرار، لفظ کی تقدیس اور لفظ کی گہرائیوں اور امکان کی تلاش...... یہ تو صاحب ہر فنکار کی بنیادی فریضہ ہونا چاہیے۔

دیکھئے واحد tool جو ہمارا اور سارے لکھنے والوں کا وہ لفظ ہی ہے اگر لفظ کو مائنس (minus) کر دیجئے تو ملارے کی طرح آپ بھی صفحہ سادہ کو سب سے اعلیٰ نظم کہتے رہیے لیکن صورت حال یہ ہے کہ ہم تو لفظوں کے وسیلے ہی سے اپنی بات کہتے ہیں جس طرح سے بھی کہتے ہیں۔ اگر لفظ سے ہماری صرف دور کی شناسائی ہے تو ظاہر کہ ہماری بات بھی اسی حد تک نامکمل یا ادھوری یا بے معنی یا کم معنی رہے گی جیسا کہ آپ نے کہا مجھے ہمیشہ لفظ کے اسرار نے haunt کیا ہے اور میں نے صاحب اگر ایک دعویٰ بھی کر سکتا ہوں جو پھر وہی modesty کے خلاف ہے، لیکن اتنا دعویٰ تو میں ضرور کروں گا کہ ایک ایک لفظ کے استعمال پر بھی ہفتوں سوچتا ہوں۔ ہفتوں بلا مبالغہ۔۔۔

نیر مسعود: نہیں، یہ دعویٰ تو آپ کی طرف سے ہم لوگ بھی کر سکتے ہیں۔

عرفان صدیقی: اچھا اور اس لئے سوچتا ہوں......اس لیے نہیں کہ یہ بہت بڑی چیز ہے اور لوگ ایسا نہیں کر سکتے لیکن میں اس لیے سوچتا ہوں کہ شاید میں جو کچھ بات کہنا چاہتا ہوں وہ اپنے تمام تلازمات اور تمام رموز کے ساتھ اس وقت تک ادا نہیں ہوگی جب تک اس لفظ کے جتنے امکان بھی اجاگر کر سکتا ہوں اجاگر کرلوں تو بہت اتھاہ قسم کی چیز ہے، لیکن جتنے بھی اس کے امکانات کو تلاش کر سکوں اور ان کو برت سکوں، اپنے مفہوم کو پہونچانے میں اس حد تک میں جاؤں اور اس کے لئے خاصی محنت ریاض اور کوشش کرنی پڑتی ہے۔ میں بالکل ان لوگوں میں نہیں ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ شاعری کوئی صاحب الہامی چیز ہے۔ ہوتی ہوگی، الہام خیال کی شکل میں ہوتا ہوگا۔ کوئی چیز آجاتی ہوگی لیکن شاعری خالص شعوری exercise ہے اور اگر آپ لفظ کے برتنے کے لئے شعور کی اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ نہیں لگتے تو وہ کام نہیں بنتا ہے اور شاعری میں تو بالکل نہیں بنتا ہے صاحب۔

مسعود: تو یہ لفظ سیکھنے کا سلسلہ عرفان صاحب آپ نے بچپن میں......ظاہر ہے کہ آپ ایسے گھر میں پلے، بڑھے جہاں لفظ کی حرمت کا بہت چلن تھا......لیکن جس زمانہ میں آپ الفاظ سیکھ رہے تھے۔ الفاظ کے معنی دریافت کر رہے تھے تو ابتدائی دنوں میں آپ نے کس طرح محنت کی ہوگی یہ ہم جاننا چاہتے ہیں۔

عرفان صدیقی: عرض کرتا ہوں۔ یہ بھی ایک ارتقائی عمل تھا پہلے لفظ کے معنی وہی سمجھ میں آتے تھے جو بزرگوں نے بتادیے یا لغات نے سمجھا دیے۔ لیکن پھر جیسے جیسے شعور ذرا سا بڑھا تو یہ لگا کہ نہیں اس لفظ میں اور بھی کچھ ہوگا تو اور کیا کیا ہوگا؟ تو صورت حال یہ ہے کہ صاحب لفظ کے امکانات محض لغات سے نہیں تلاش کیے جا سکتے۔ ایک لفظ لغت میں ہے اس کے پچاس connotations آپ کو لغت میں مل جائیں گے لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کے پانچ سو مفاہیم مختلف contexts میں ہوں تو جتنے contexts آپ لفظ کے حوالے سے دریافت کریں گے

اتنا ہی زیادہ گویا آپ کی لفظ کی تلاش بامعنی ہوجائے گی۔ یہ عمل لڑکپن کے بعد شروع ہوا۔ اس میں یہ بھی ہے کہ صاحب میرے بزرگوں نے بھی اس سلسلہ میں میری یقیناً تربیت کی لیکن اس کے بعد کا جو مرحلہ ہے وہ خالص میرا اپنا ذاتی کوششوں کا معاملہ ہے اور جن چیزوں کی طرف نیر صاحب نے اشارہ کیا۔ بعض لفظ ایسے...... مجھے لگا کہ بعض الفاظ کے امکانات کو سمجھے بغیر ہم نے انھیں تقریباً مسترد کردیا۔

نیر مسعود: ہاں یہ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔

عرفان صدیقی: اچھا ہوا یہ ہے ہمارے یہاں نیر صاحب۔ اردو میں خالص طور پر اساتذہ کی کوششوں کی میں بڑی قدر کرتا ہوں لیکن صاحب یہ کیا صورت حال ہے کہ زبان کو بڑھانے کے بجائے آپ زبان کا دائرہ تنگ کریں۔ متروکات کا بہت سا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آتا میں تو آج ''سو'' بھی استعمال کروں گا اور ''تلک'' بھی استعمال کروں گا۔ اس لئے کہ مجھے لگتا ہے کہ جہاں میں استعمال کروں گا وہاں میں اس کے بجائے ''تو'' یا ''تک'' استعمال نہیں کرسکتا۔ یہ ماننے میں مجھے بہت تامل ہے کہ کوئی لفظ متروک ہوجاتا ہے۔ ایک لفظ جب وجود میں آجاتا ہے تو پھر آپ اسے استعمال نہ کریں لیکن وہ اپنا وجود قائم رکھتا ہے۔ اس کا وجود قائم ہے، اب اس کو آپ اس کے contexts کی اگر تلاش کرسکیں اور اس کو پھر سے معنی دے سکیں تو یہ آپ کی اپنی قابل قدر......

نیر مسعود: اور اپنی طرف سے فیصلہ دے کے متروک کردینا۔

عرفان صدیقی: متروک کردینا...... یہ تو صاحب......

نیر مسعود: ...... یہ تو قتل ہے۔

عرفان صدیقی: قتل ہے صاحب۔ بالکل قتل ہے۔ مثال کے طور پر ''سو'' ہے۔

نیر مسعود: ہاں ''سو'' آپ کے یہاں آتا ہے بہت۔

عرفان صدیقی: اب صاحب مجھے کبھی کبھی یہ لگتا ہے کہ اگر یہ لفظ میں نہ استعمال کرتا تو بات ہی نہ کر پاتا۔ مثال کے طور پر ایک مطلع ہے میرا

ہوں مشت خاک مگر کوزہ گر کا میں بھی ہوں
سو منتظر اسی لمس ہنر کا میں بھی ہوں

یا جیسے کہ ''آمین'' اس کو آپ محض دعا کا اثبات سمجھیں یہ محض ایک پہلو ہے لیکن ''آمین'' کے اور کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔ میں اپنا شعر عرض کرتا ہوں۔

ہم بھی پتھر تم بھی پتھر سب پتھر ٹکراؤ
ہم بھی ٹوٹیں تم بھی ٹوٹو سب ٹوٹیں آمین

یا مثلاً اس شعر میں۔

کچھ دن پرند پرورش بال و پر کریں
بے صرفہ کیوں ہواؤں سے پیکار کرتے ہیں

بہت آسان تھا کہ ''بے صرفہ'' کی جگہ کچھ اور استعمال کرتا۔

نیر مسعود: ہاں ''بیکار'' سامنے کا لفظ تھا۔

عرفان صدیقی: لیکن توانائی کی رائگانی کے سلسلہ میں مجھے ''بے صرفہ'' میں جو امکانات نظر آرہے ہیں وہ مثال کے طور پر ''بیکار'' میں نہیں نظر آتے۔

مسعود: لیکن عرفان بھائی۔ یہ مزاج کی بات ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ محاورے کا استعمال، آپ کے یہاں وہ محاورے جو بہت مشہور ہیں ان کا استعمال نہیں ہے۔

عرفان صدیقی: نہیں محاوروں کا شوق مجھے نہیں ہے۔

مسعود: یہ میرے خیال سے آپ کے مزاج کا کچھ حصہ ہے۔

عرفان صدیقی: نہیں، محاوروں کے سلسلہ میں ایک تو معاملہ یہ ہے کہ خاصی جامد چیز ہے

محاورہ۔محاورہ معنی کی توسیع نہیں کرتا۔ایک معنی قائم ہو گئے ہیں۔بس تو شاعری میں تو صاحب، قائم شدہ معنوں پر قائم رہنا بڑا۔گڑبڑ معاملہ ہے۔ جہاں فقروں کی حیثیت سے آئے ہیں محاورے وہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن میں محاورے کو فی نفسہ شاعری کے لئے اچھی چیز نہیں مانتا۔خراب چیز ہے میرے نزدیک۔

مسعود: اچھا ترکیبیں بھی بہت ہیں آپ کے یہاں۔نئی سے نئی۔

نیر مسعود: ہاں اس پر یہ بات کرنا ہے کہ اس وقت بہت کم شاعر ہیں جو ترکیب صحیح طور پر استعمال کر رہے ہیں۔فیض ہمارے بہت بڑے ماہر تھے۔اس سلسلہ میں ظفر اقبال کے یہاں بھی ترکیبیں بے تکان استعمال ہوئی ہیں۔افتخار عارف کے یہاں بھی ترکیبیں اچھی استعمال ہوئی ہیں یعنی وہ ترکیب جو خوشگوار بھی معلوم ہو۔آپ کے یہاں ترکیب سازی ایسی ہے کہ فوری طور پر یہ معلوم بھی نہیں ہو پاتا کہ یہاں شاعر کوئی ترکیب استعمال کر گیا۔یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک فارسی ادب پر کافی عبور نہ ہو تو یہ آپ سے پوچھنا بھی چاہ رہا تھا۔تعلیم کے سلسلہ میں جو پوچھا تھا یہ سوال رہ گیا کہ یہ جو آپ کو ترکیب سازی کی مہارت حاصل ہوئی اس میں کوئی شعوری کوشش ہے۔آپ کا مطالعہ فارسی کا کیسا رہا ؟

عرفان صدیقی: نیر صاحب ترکیب کے معاملے میں ہے کہ فارسی مجھے ایک طرح سے گھر پر باضابطہ پڑھائی گئی جیسا کہ اور گھروں میں پڑھائی جاتی تھی۔ پہلے آج سے ۴۰۔۴۵ برس پہلے۔تو ایک تو یہ ہوا کہ کچھ مزاج کو مناسبت قائم ہو گئی فارسی سے اور میرے دادا مرحوم نے مجھے فارسی پڑھائی۔ والد نے بھی پڑھائی۔ کالج کی یا اسکول کی درسیات میں فارسی سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ بنیادی تعلیم فارسی کی اور اردو کی اپنے گھر میں ملی۔ اچھا پھر اس کو مطالعہ کے ذریعہ بھی کچھ کوشش کی کہ اس میں کچھ اضافہ کروں۔تو ترکیب کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا رشتہ پھر وہی لفظوں سے ملتا ہے کہ دو لفظوں کا آپس میں کیا رشتہ کیا ہے۔دو لفظ کس طرح سے مربوط ہیں

یعنی ایک تو ظاہر کی سطح پر جس میں بہت زیادہ مجھے دلچسپی نہیں رہتی لیکن معنوی سطح پر دونوں ایک طرح سے کتنے جڑے ہوئے ہیں یہ، اس تلاش میں رہتا ہوں۔ تو اس لئے آپ تراکیب جیسا کہ آپ نے فرمایا خاصی پائیں گے۔ اچھا اسی بات کو...... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ترکیب کو میں ہر شعر کے لئے لازمی نہیں سمجھتا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھے یہ شعر اس طرح سے کہنا چاہئے تو سانچا اپنے آپ اندر سے یہ ہوجاتا ہے کہ یہی اس کا فطری سانچا ہے اس کو اسی طرح سے قائم رکھا جائے۔ مثال کے طور پر:

ملال دولت بردہ پہ خاک ڈالتے ہیں

تو صاحب آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر میں ''ملال دولتِ بردہ'' نہ کہوں ایک شخص ہے اسے یہ احساس ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے یا جو لکھ رہا ہے یا جو سوچ رہا ہے دوسرے لوگ اس کی سوچ کو اس سے پہلے ناقص طریقے پر عام کیے دیتے ہیں تو آپ مجھ سے یہ فرمائیں گے کہ اگر میں ''دولت بردہ'' اس کو نہ کہوں تو کیا کہوں؟ مجھے یہ لگا کہ نہیں بھائی دولتِ بردہ ہی ہے اور یقیناً وہ دولت ہے۔ میں نے کہیں سے بہت جگر کاوی کے بعد کچھ چیز حاصل کی ہے بہت سوچنے کے بعد۔ اور اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس کو عام چلتی ہوئی چیز سمجھ کر لوگ لے اڑے اور ادھر ادھر پھیلانے لگے تو وہ دولت بردہ ہے میرے نزدیک اور ملال دولت بردہ۔ ظاہر ہے کہ اس کا ملال بھی فطری ہے۔ اچھا یہ بالکل بھی نہیں ہے کہ کوئی شعوری کوشش ہو کہ انوکھی ترکیبیں ہوں۔ انوکھی نہ ہوں لیکن کم سے کم اس شعر کے لئے لازمی اور انتہائی با معنی ہوں اور یہ اس وقت تک صاحب میرے خیال میں نہیں ہوسکتا جب تک کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، لفظوں کے ایک دوسرے سے تعلق اور رشتے کو پوری طرح دریافت نہ کرلیا جائے۔ پوری طرح تو ممکن نہیں ہے لیکن جہاں تک ممکن ہے۔ زیادہ سے زیادہ جہاں تک ممکن ہو دریافت کرلیا جائے۔

نیر مسعود: اسی مصرع میں مسعود صاحب۔ آپ ذرا دیکھئے کہ ''ملال دولتِ بردہ پہ خاک

ڈالتے ہیں'' اس میں تقریباً نامحسوس طریقے پر ایک محاورہ بھی موجود ہے۔

عرفان صدیقی: خاک ڈالنا۔ جی ہاں۔ میں نے عرض کیا۔

نیز مسعود: نامحسوس اس لئے کہ ''ملال دولتِ بردہ'' وہ اس قدر چھایا ہوا ہے......

عرفان صدیقی: بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔

نیر مسعود: یہ سب اسرار آپ کے یہاں یوں ہی نہیں ہے کہ بھئی ٹھیک ہے۔ خوش فکر شاعر ہیں تو ان کے یہاں آ گیا۔ لازمی جز ونظر آتا ہے۔ یہ چیز آپ کے یہاں خاص طور پر اہم معلوم ہوتی ہے۔

مسعود: ڈاکٹر صاحب یہ بات صحیح کہی کہ یہاں محاورہ لازمی جز بنتا ہے لیکن کچھ الفاظ ایسے آپ کے یہاں نئے سے نئے اور پرانے استعمال ہوئے شاعری میں کہ جن سے آپ کو کچھ خاصی شغف معلوم ہوتا ہے جیسے سر کی بلندی کے لیے ''کلاہ'' کا لفظ ہے۔ ایک عزت نفس کا بھی مفہوم اس میں ملتا ہے۔ مثلاً ایک شعر ہے آپ کا کہ ''میری پگڑی گر گئی......

عرفان صدیقی: لیکن میرا سر بچ گیا۔

مسعود: ایک نہیں ہے یا اسی طرح سے۔ ایک جگہ اور یہی لفظ استعمال ہوا ہے تو اس کا مطالعہ تو ہم معنوی سطح پر بھی کریں گے تو جو پورا پس منظر ہے آپ کی شاعری کا اس کے ساتھ آئے گا لیکن یہ جو ترکیبیں ہیں تو ہمارے دوسرے شعراء جیسے فیض کا آپ نے حوالہ دیا ہے یا مثلاً سراج اورنگ آبادی کے یہاں بہت ترکیبیں ہیں تو آپ نے کس شاعر سے یا کن شاعروں سے اثر قبول کیا ہے؟

عرفان صدیقی: اثر تو یقیناً ہوگا اس لئے کہ وہ سب میرے......اور شاعری کے اتنی عظیم انسانی روایت سے جس کا میں بہت چھوٹا سا بھی طالب علم یا متلاشی ہوں تو وہ سب میرا سرمایا ہے۔ اب میں تلاش یہ کرتا ہوں کہ صاحب یہ جو میرے جواہرات سامنے رکھے ہوئے ہیں یہ تو ہیں ہی معلوم نہیں کہ یہ میرے جواہرات ہیں لیکن ممکن ہے کہ یہ جو چھوٹا سا پتھر کا ٹکڑا بھی پڑا

ہے۔ میرے اجداد نے جو چھوڑا ہے، اسلاف نے جو چھوڑا ہے اس میں بھی کوئی خاص بات ہو۔ کوئی قیمت ہو تو اس کی بھی دریافت کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر لفظوں ہی کا معاملہ لیجئے ذرا سا ترکیب سے ہٹ جایئے، چاہیے تو ترکیب بھی سمجھیے۔ ایک شعر ہے میرا:

تمہیں رنج بہت تھا دشت کی بے امکانی کا

لو غیب سے پھر اک شکل ظہور پذیر ہوئی

اب میں شعر کی کسی قسم کی تفسیر یا تشریح نہیں کروں گا لیکن ایک بات ہے ''بے امکانی'' تو صاحب میں بے امکانی کے سوا کیا کہوں۔ یہ میں نہیں سمجھ پایا کیونکہ میں تو دشت کے امکانات ہی پر غور کر رہا ہوں تو مجھے لگا کہ بھئی بے امکانی ہی اس کے لئے ممکن لفظ ہے۔ عموماً اس طرح سے ہوتا ہے کہ جو ایک مفہوم ذہن میں ہوتا ہے یا مضمون ہوتا ہے۔ خیال ہوتا ہے تو اس کے لئے سانچا جو بھی سمجھ میں آیا موزوں کر دیا جائے۔

لیکن یہیں موزونی اور شاعری میں تھوڑا سا فرق ہو جاتا ہے۔ ہر موزوں چیز شاعری نہیں ہوتی میرے نزدیک اپنے کلاسیکی سرمائے کا جو بھی ٹوٹا پھوٹا میں نے مطالعہ کیا اس سے بے پناہ فائدہ پہونچا ہے۔ اچھا اس میں یہی نہیں کہ جو ہمارے معروف شعراء ہیں مثلاً ظاہر ہے کہ اگر میرؔ سے فیضیاب ہوا ہے کوئی تو یہ تو اس کی مجبوری ہے کہ میرؔ سے تو فیض یاب ہونا ہی ہے۔

لیکن میں تو صاحب...... اور سراجؔ بھی اتنے غیر معروف نہیں ہیں...... لیکن میں تو آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے تو شاہؔ نصیر اور ذوقؔ، یہ لوگ بھی بہت اہم شاعر نظر آتے ہیں اس لئے کہ ان سے ہم بہت کچھ چیزیں اور لفظ کا استعمال اور شعر میں کس طرح سے لفظوں کو برتا جائے، اس کو ان لوگوں سے ہم سیکھتے ہیں...... تو اتنی عظیم الشان روایت...... جو چیز بھی...... میں نے عرض کیا مجھے اگر پتھر کا ٹکڑا بھی پڑا ہوا کہیں نظر آئے تو میں نے اس کو بھی لینے کی کوشش کی ہے۔ تو ایک تو مجھے اس سلسلہ میں دو تین چیزوں سے فائدہ پہونچا ہے...... میں صاف کہوں

اور یہ بھی عرض کردوں کہ آج کل کے لکھنے والوں کو کیوں یہ فائدے نہیں پہونچ پاتے مثلاً یہ کہ فارسی اور تھوڑی سی عربی کی شدبد یعنی کہ عربی کی اس حد تک کہ ابتدائی چار چھ جماعتوں تک عربی کے ابتدائی اسباق پڑھے، قرآن کو باترجمہ پڑھا تو ایک مناسبت اس سے بھی قائم ہوگی۔ اچھا پھر یہ ہے کہ خود اردو لفظوں اور ان لفظوں کے اشتقاق کے سلسلہ پر غور کیجئے تو یہ چیزیں روشن ہوتی چلی جائیں گی۔ وہ خود آپ کے لئے مطالعہ کی ایک بنیادی چیز بن جائے گی تو اس سے بہت فائدہ پہونچا، فارسی کے مطالعہ سے اور عربی کی شدبد سے، خود اردو لفظوں کے تاریخی سلسلہ کی تلاش، ارتقا کی تلاش ان سے فائدہ بے حد پہونچا۔

پھر یہ کہ میرا ذہن مطالعہ کے سلسلہ میں تقریباً کباڑ خانہ رہا۔ سچ بات تو یہ ہے۔ یہ بھی پڑھ لو۔ یہ بھی دیکھ لو والا عالم۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرح طرح کی چیزیں اس کباڑ خانے میں جمع ہیں مگر کچھ ایسا Mysterious Process ہے کہ ہاتھ وہیں پڑتا ہے ذہن کے اس کباڑ خانے میں جہاں سے چیز نکالنی ہوتی ہے۔ نیر صاحب کا اتنا بڑا کتب خانہ ہے یہ جاتے ہیں تو بس وہیں سے کتاب نکال کے لے آتے ہیں تو کچھ یہی صورت ہے۔

مسعود: آپ نے باقاعدہ شعر کہنا کس عمر سے شروع کیا؟ کس کلاس میں آپ پڑھتے تھے۔

عرفان صدیقی: اچھا صاحب باقاعدگی کا یہ سلسلہ ہے کہ......

مسعود: نہیں میرا مطلب ہے باقاعدہ آپ نے شعر موزوں کرنا کب سے......

عرفان صدیقی: موزوں تو مجھے لگتا ہے صاحب کہ میں نے جب ہوش سنبھال کے غوں غوں کرنا سیکھا ہوگا تو کچھ نہ کچھ موزوں طور پر کہا ہوگا اور اگر چاہوں تو روایتیں گڑھ بھی سکتا ہوں کہ میری والدہ یہ فرماتی تھیں کہ جب تم تین سال کے تھے تو یوں کہتے تھے وغیرہ۔ لیکن ہے ایسا ضرور کچھ۔ اچھا شاعری باقاعدہ تقریباً باقاعدہ ۹/۱۰ برس کی عمر سے......یعنی شعر کہنا، ٹوٹے پھوٹے موزوں شعر موزوں کر لینا لفظوں کو جوڑ کے...... وہ اس عمر سے شروع ہوگیا تھا۔ اس

کے بعد شاعری کے چھپنے چھپانے کے حوالے سے...... اچھا۔ مشاعرے سے کچھ شروع سے الجھن سی رہتی لیکن مخصوص ادبی محبتیں اور شری نشستیں اتنی اچھی اور بامعنی لگتی تھیں تو ظاہر ہے کہ مشاعروں کے حوالے سے باقادگی کا ذکر کرنا بالکل بیکار ہوگا کیوں کہ مجھے کبھی اپیل نہیں کیا اس چیز نے۔ چھپنے چھپانے کے حوالے سے تو یہ ہے کہ سن انیس سو...... اچھا یہ حیرت انگیز بات ہے نیر صاحب۔ اگر چہ بہت معمولی بات ہے لیکن میرے لئے یہ حیرت انگیز ہے کہ میری پہلی کوشش نثر میں تھی اور میں اس وقت دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یعنی دسویں کا امتحان دے کے چھٹیوں میں...... ایک مضمون اپنی دانست میں بڑا اہم لکھا۔ ''پرتھوی راج راسو میں عربی فارسی الفاظ'' اور یہ صاحب غالباً ۱۹۵۴ء میں۔ جی ہاں ۱۹۵۴ء میں ہی ''آج کل'' کے کسی شمارے میں چھپا۔

مسعود: اچھا علم عروض تو آپ نے باقاعدہ سیکھا ہوگا۔

عرفان صدیقی: باقاعدگی کا یہ ہے کہ جیسا میں نے عرض کیا میرے دادا خود ایک ماہر عروضی تھے اور لوگ ان سے پوچھنے کے لئے آتے تھے تو گھر میں اس طرح کی کتابیں بہت سی تھیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے مجھے عروض پڑھائی ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہے بلکہ شاعری کے سلسلہ میں رویہ کچھ یہی تھا ہمارے گھر میں کہ جانتے تھے کہ یہ لازمی، جسے کہنا چاہیے ایک Necessary Evil ہے اور یہ اس تک بھی پہونچے گا، transmit ہوگا اولاد تک لیکن یہ کہ بہت زیادہ کچھ اس کی ہمت افزائی بھی نہیں ہوتی تھی کہ صاحب واہ واہ ہو رہی ہے، ہم اپنے دادا صاحب کو اپنی کہی ہوئی غزل سنا رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں تھا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے پاس جو کچھ مواد تھا، کتابیں تھیں وہ میں نے دیکھیں اور اس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن جب تھوڑا ساذہن اس کے قابل ہوا کہ کچھ تھوڑا بہت سمجھ سکوں تو کچھ چیزیں سمجھ میں آنے لگیں۔ جب تک وہ حیات رہے میں ان سے پوچھتا بھی رہا۔ اپنے والد سے بھی پوچھتا رہا۔ تو ایک طرح سے عروض کے سسٹم سے ایک

مناسبت قائم ہوئی اس کے بعد میں نے اس کو خود بھی، جیسے ایک شوق ہوتا ہے شوق کے طور پر میں نے اس کو سیکھنے کی بھی کوشش کی۔ تو اب یہ لگا کہ بہت زیادہ عروض پر اصرار جو ہے وہ کہیں نہ کہیں شاعری کی روح کو تھوڑا سا نقصان، تھوڑا کیا خاصا نقصان پہونچاتا ہے۔ اس لئے بہت اصرار اس پر میں نہیں کرتا لیکن شاعری کے ڈھانچے کے حسن کو قائم رکھنے کے لئے، شعر کا خارجی حسن جو ہوتا ہے، اس کو قائم رکھنے کے لئے وزن کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ تھوڑا بہت علم ہونا اس فن کا ضروری ہے۔

نیر مسعود: اچھا ایک۔ اب اس کو چاہے آخری سوال ہی سمجھیے سوال کیا ایک موضوع ہے اور آخری کا مطلب یہ نہیں کہ بس اب......

عرفان صدیقی: (ہنسی) ہاں دیر بھی بہت ہوگئی ہے۔

نیر مسعود: بات ہو رہی تھی کچھ ایسے لفظوں کی جو اب استعمال نہیں ہو رہے ہیں یا متروک ہی ہو چکے ہیں یا متروک کر دیے گئے لیکن آپ کے یہاں یہ جو پرانے لفظ ہیں وہ اس طرح نہیں آرہے ہیں کہ آپ گویا زبان میں کہنگی کا رنگ لا رہے ہیں ایسا قطعاً نہیں ہے لیکن ان لفظوں سے ظاہر ہے ایک فضا تو بنتی ہی ہے اور وہ فضا پرانی نہیں ہے یعنی کسی کو یہ شبہ نہیں ہوگا کہ یہ اب سے مثلاً ستر سال پہلے کے کسی شاعر کا کلام ہے لیکن وقت کا ایک عجب سا شعور اس سے بیدار ہوتا ہے۔ اب ہم لوگوں کی جو عمر ہے اگر چہ اس کو فراخ دلی سے آپ بھی تسلیم نہیں کریں گے کہ ہم اب بڈھے ہیں لیکن ہے یہی کہ بڈھے ہو چلے ہیں۔

عرفان صدیقی: (ہنسی) ہاں ہو تو چلے ہیں۔

نیر مسعود: اور جو تبدیلیاں ہم نے دیکھی ہیں۔ گذشتہ چالیس پینتالیس برس میں اور کسی کا کہنا ہے کہ جو تبدیلیاں ایک ایک سو سال میں ہوا کرتی تھیں وہ ہمارے زمانے میں دس دس سال میں ہو رہی ہیں۔

عرفان صدیقی: درست ہے یہ بہت تیز رفتار زندگی ہوگئی ہے۔

نیر مسعود: تو ہم نے اپنی زندگی میں گویا چار سو سال کی تبدیلیاں......

عرفان صدیقی: وہ گویا ہم نے اپنی پچھلی عمر میں دیکھی ہیں۔

نیر مسعود: اس کا آپ کے یہاں آئینی اظہار بھی ملتا ہے اگر چہ براہ راست یہ موضوع آپ کا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ وقت کا گذرنا۔ تو یہ گذرنا دو طرح سے ہے ایک تو خارجی لحاظ سے، گذشتہ سفر زندگی کی طرف اشارے ہیں کہ جو باتیں پہلے تھیں وہ......

عرفان صدیقی: جی ہاں وہ تو خارج۔

نیر مسعود: اور ایک یہ کہ خود ہم پر سے بہت وقت گذر گیا بلکہ یہ شاید زیادہ تکلیف دہ ہے۔

عرفان صدیقی: جی ہاں۔

نیر مسعود: آپ کے یہاں اس کا شدید احساس ہے لیکن آپ کی بیشتر شاعری کی طرح کوئی چیختا ہوا اظہار بھی اس کا نہیں ہے تو آپ کی شاعری کے محرکات میں یہ وقت یا زمان کیا کردار ادا کر رہا ہے؟

عرفان صدیقی: نیر صاحب، میں بہت واقعی آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے یہ پوچھ کر مجھے بہت ضروری بات کہنے کا موقع دے دیا نیز صاحب وقت جو ہے وہ جیسا کہ ہم سب واقف ہیں، وقت سے زیادہ mysterious اور پر اسرار اور سمجھ میں نہ آنے والی چیز نہیں ہے لیکن اس کے باوجود یہ انسانی ذہن کی گویا مجبوری ہے کہ ہمیشہ انسان نے اس کے بارے میں سوچا ہے کسی نہ کسی شکل میں۔ کسی نہ کسی نہج پر میرے یہاں بھی صاحب وقت کا تصور کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک تو زمان کا معاملہ ہے کہ جس کے حصے آپ کر سکتے ہیں کہ صاحب ایسا زمان جو پہلے مستقبل تھا پھر حال ہوا اور آگے ماضی ہو جائے گا اور پھر زمان مستقل ہے جس میں نہ ماضی ہے نہ حال ہے کچھ نہیں ہے۔ یہ دونوں پہلو مجھے بیحد mysterious لگتے ہیں اور ان میں آدمی

کہاں کھڑا ہوا ہے یہ موضوع ایسا ہے کہ جس میں میں نے کچھ سوچا بھی ہے اور جو کچھ اندر اس سلسلہ میں وارد ہوا اس کے اظہار کی کوشش بھی کی۔ اس میں مجھے......اس کا رشتہ پھر وہی۔ آپ نے جو شروع میں کہا تھا لفظوں کے استعمال کے بارے میں مثلاً میرا ایک شعر ہے:

ترک سفر پہ کیسا نمودار ہو گئے
وہ ناحیے جو در بدری میں نظر نہ آئے

اب تو ظاہر ہے کہ ایک سلسلہ ہے کہ آدمی تلاش میں نکلا اور وہ ذہنی، ذہنی سفر تھا یا خارج میں مادی physical سطح پر تلاش تھی لیکن وہ ایک سفر تھا۔ ایک تلاش تھی لیکن اس میں بعض چیزیں اس وقت تو آشکار نہیں تھیں بے حد کوشش اور تلاش اور جستجو اور سفر کے باوجود لیکن پھر یوں ہوا کہ وہ سلسلہ رک گیا تو اچانک بعض چیزیں آشکار ہو گئیں اور ایکدم معلوم ہوا کہ ارے یہ اس وقت تو نہیں تھا یہ کیسے ہو گیا کہ جب ہم نے تلاش کی تو کچھ نہ ملا اور جب ترک تلاش کی منزل میں پہونچ گئے تو اچانک وہ چیزیں سمجھ میں آنے لگیں۔

نیر مسعود: وہ کھویا ہوا شہر سامنے آرہا ہے۔

عرفان صدیقی: آرہا ہے۔ اب یہاں میں نے ''ناحیے'' کا استعمال کیا، وہ ناحیے جو در بدری میں نظر نہ آئے تو اب تھوڑی سی کوشش کے بعد اس مصرع کا structure بدلا جا سکتا تھا اور اس کو موزوں رکھتے ہوئے ''قریہ'' یا ''شہر'' وغیرہ کہا جا سکتا تھا لیکن ''ناحیے'' کا معاملہ یہ ہے کہ نیر صاحب، کہ میں شہر میں نہیں پہونچا ہوں۔ میں کسی ایک منزل تک پہونچ ہی نہیں پایا۔ میرا تو صرف ناحیے تک معاملہ رہا۔ ناحیہ بستی بھی نہیں ہے بلکہ گویا تقریباً پہونچ گئے ہیں تو میں کہنا یہی چاہتا ہوں کہ ہم بالکل تو نہیں پہونچ پائے صاحب پھر پہونچ بھر گئے تھے۔

نیر مسعود: ہاں، یہ سب اس لفظ کی وجہ سے اور یہ پھر وہی لفظ ہے جو اب کم استعمال ہو رہا ہے۔

عرفان صدیقی: جی ہاں

نیر مسعود: اور ''ناحیے'' ہم کو کسی مکانی نقطے پر نہیں نظر آ رہا ہے۔ زمان کے نقطے پر نظر آ رہا ہے۔

عرفان صدیقی: جی ہاں، وہی۔ اس لئے عرض کر رہا تھا کہ وقت سے اس کا یہ رشتہ قائم ہوا کہ بھائی ہم جس سفر پر نکلے تھے اپنے ذہن میں وہ ایک ایسا عجیب و غریب سفر ہے کہ پہونچ تو اس وقت بھی نہ پائے آج بھی جو چیز آشکار ہوئی ہے وہ بالکل اور مطلق کوئی چیز نہیں ہے ناحیے ہی ہیں وہ بھی یعنی اس وقت بھی ملتے تو ناحیے ہی ہوتے۔ تو وقت کے سلسلہ میں صاحب یہ ہے کہ مجھے کئی طرح سے haunt کرتا ہے ایک تو یہ ہے کہ جو تھا وہ اب نہیں ہے وہ گویا میری ذاتی واردات کا حصہ بن گیا۔ وقت کی ایک چھاپ تو یہ ہے کہ جو کچھ تھا وہ اب نہیں رہا۔ تو ایک عجب اندوہ کہیں نہ کہیں اس کا ہے۔ بعض بہت پیاری چیزیں تھیں جو تھیں اور اب نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر میرا ایک شعر ہے:

سب دھوپ اتر گئی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے

مگر ایک کرن مرے خوابوں میں اسیر ہوئی

تو یہ بھی وہی وقت گذر جانے کا معاملہ ہوا۔ اچھا، ایک تو یہ ہے، اور ایک وہ وقت ہے جس میں ہم سب گویا ہمیشہ قائم ہیں۔ وہ وقت جیسا پہلے تھا وہی آج بھی ہے، کل بھی رہے گا۔ اس کی مثال میں میں آپ کو ''کینوس'' سے ایک شعر سنانا چاہتا ہوں۔ ظاہری لفظ شاید آپ کو کافی dubious اور دھوکہ دینے والے لگیں گے لیکن موضوع کے اعتبار سے اگر آپ غور فرمائیں گے تو لگے گا کہ موضوع وہی ہے جو میں عرض کر رہا ہوں:

ذرا سوچو تو اس دنیا میں شاید کچھ نہیں بدلا

وہی کانٹے ببولوں میں وہی خوشبو گلابوں میں

تو ایک زمان یہ ہے۔

نیر مسعود: جو نہیں بدلتا۔

عرفان صدیقی: بعض چیزیں ایسی ہیں جو قائم رہتی ہیں یعنی خارج میں بھی ان کا وجود قائم رہتا ہے، حالانکہ زمان اس سے بھی آگے کی چیز ہے یہ تو صرف خارجی علامات ہیں ورنہ زمان کو تو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا تو وقت مجھے انسانی زندگی میں سب سے زیادہ پراسرار چیز لگتی ہے۔ میں طرح طرح سے اس پر غور کرتا ہوں۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا لیکن سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

مسعود: اچھا ایک شعر کا میں اور ذکر کروں گا۔ وہ ایک معمورہ پس......

عرفان صدیقی: ......سیل بلا چلتا ہے۔ اصل میں شعروں کا معاملہ یہ ہے کہ برمحل شعر یاد کرنے میں مجھے خاصی زحمت ہوتی ہے۔

مسعود: اس میں بھی آپ نے وقت کے حوالے سے......

عرفان صدیقی: ہاں درست ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

اس خرابے میں بھی ہو جائے گی دنیا آباد
ایک معمورہ پس سیل بلا چلتا ہے

تو صورت یہی ہے بھئی کہ کوئی چیز مستقل نہیں ہے، دائمی کچھ بھی نہیں۔ زمان مسلسل میں کوئی چیز دائمی نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ، کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ایک امکان کی بشارت بھی مجھے کبھی کبھی ملتی ہے نامحسوس طور پر جس کی طرف اس شعر میں بھی اشارہ ہے۔ اس خرابے میں بھی خرابہ ظاہر ہے کہ بے حد اندوہ گیں معاملہ ہے لیکن......

نیر مسعود: ہاں دبائے رکھنا بہتر ہے۔

عرفان صدیقی: تو اگر آپ۔ اسے میں تو شاعری کا ہنر سمجھتا ہوں صاحب، کہ شاعری کا ہنر یہی ہونا چاہئے کہ کہیں انگلی رکھ کے آپ نہیں بتا سکتے کہ یہ کون سی چیز ہے۔ اسی طرح سے شاعری ہو یا اور کوئی فن ہو اس میں معاملہ یہی ہے کہ چیزوں کو بغیر کہے ہوئے اگر آپ پہونچا سکیں یا جتنے subdued انداز میں خصوصاً آپ کے جو اندوہ ہیں۔ آپ کی جو اندرونی، داخلی

اذیتیں ہیں ان کا بیان اگر بہت واضح آپ نے کر دیا تو یہ کوئی بہت اعلیٰ درجے کی بات نہیں۔

نیر مسعود: نہیں وہ تو بہت ہی...... یہ تو نوحہ گری۔ تو اب وقت کے سلسلہ میں بہت صحیح بات آپ نے کہی۔ ایک وقت تو ظاہر ہے کہ وہ ہے جو ہم پر سے گزر رہا ہے، بہت سی یادیں ہیں جو ماضی کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔

عرفان صدیقی: جی، جی۔ ایک وقت وہ ہے جس سے ہم گذر رہے ہیں۔ کچھ چیزوں کو ہم کہہ رہے ہیں کہ اب نہیں ہیں ہم سب کے بچپن کی، نوجوانی کی یادیں جواب ختم ہو رہی ہیں، لیکن بہت سی ایسی چیزیں ہیں جواب بھی موجود ہیں، نہیں بدلیں۔ وہ آپ کے گلابوں کی خوشبو ہے جسے لیکن وہ بھی بدل جاتی ہے جب ہم وقت سے گذر جاتے ہیں۔

نیر مسعود: پتنگ بازی میں پہلے یہ عالم تھا کہ ذرا سی پتنگ کے لئے کوٹھے پر سے پھاند پھاند پڑتے تھے اب سر کے اوپر سے ڈور گذر جائے......

عرفان صدیقی: گذر جائے تو ہاتھ بڑھانے کو جی نہ چاہے۔

نیر مسعود: تو یہ وقت نہیں گذرا ہم گذر گئے۔ اور آپ کے یہاں یہ دونوں اذیتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں بلکہ یہ دوسری اذیت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ جو گذری ہوئی چیزوں کا احساس ہوتا ہے وہ اتنا شدید نہیں ہے لیکن خود اپنے گذر جانے کا۔

عرفان صدیقی: اپنے گذر جانے کا۔ جی ہاں۔

عرفان صدیقی: تو کیا شاید اسی لئے اس کا اظہار اتنا ہی کم ہوا ہے؟

عرفان صدیقی: کہ اس کا اندوہ نیر صاحب اتنا ہی زیادہ ہے۔ چونکہ اندوہ زیادہ ہے اس لئے اظہار اتنا ہی دبایا گیا ہے اور کوشش یہ کی ہے کہ لگے کہ دبایا ہوا ہے یعنی کسی چیز سے یہ بھی پتہ چل جائے کہ کوئی بڑا ہی گمبھیر دکھ ہے جسے نہ کہنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

نیر مسعود: اچھا ایک بات رہی جا رہی ہے۔ مجموعی رویے کی۔ یہ بھی اس میں کوئی اچھائی

برائی کا سوال نہیں...... کہ آپ کا رویہ رجائی نہیں ہے۔ کچھ شعر ہیں۔ آپ نے سنائے بھی لیکن مجموعی حیثیت سے مایوسی۔ مایوسی بھی نہیں کہیں گے ہم۔ اس لئے کہ ناامیدی کا اظہار آپ کے یہاں نہیں ہوتا لیکن افسردگی بہت سخت قسم کی ہے تو خیر۔ مجھ کو اپنے مزاج کی وجہ سے یہ چیز بہت پسند ہے لیکن خود آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا عمومی رویہ شاعری میں افسردہ تقریباً مایوس شخص کا سا ہے یا......

عرفان صدیقی: میں عرض کئے دیتا ہوں نیر صاحب۔ مایوس شخص تو میں بالکل نہیں ہوں اور اگر کہیں اس طرح کا تاثر میری شاعری سے قائم ہوتا ہے تو میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ وہ شعر میرا نہیں ہے یا میں نے اس تاثر کے تحت وہ شعر نہیں لکھا ہوگا، ممکن ہے ایسا ہو بلکہ ضرور ہوا ہوگا لیکن رویہ میرا بحیثیت شاعر کے مایوسی کا ہرگز نہیں ہے۔ اصل میں مجموعی طور پر اگر آپ دیکھیے تو میرا رویہ اپنے کو رنج اور خوشی دونوں سے تھوڑا سا detached رکھنے کا ہے یعنی میرے لئے یہ جو کچھ گذر رہا ہے بہ حیثیت شاعر کے وہ جیسے کسی observatory میں ایک متجسس سا شخص کھڑا ہوا ہے۔ اس طرح کا معاملہ ہے تو میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ بعض چیزوں کا اثر مجھ پر ظاہر ہے کہ کیفیات مختلف قسم کی طاری ہوتی ہیں۔ اچھا چونکہ شاعری کے لئے پیغام کو میں نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں سمجھتا بلکہ کبھی کبھی بہت خراب چیز سمجھتا ہوں اس لئے شاعری کے ذریعہ سے پیغام دینا بھی میرا کوئی معاملہ نہیں ہے کہ میری رجائیت یا قنوطیت کا ذکر کیا جائے لیکن اتنا ضرور سہی کہ زندگی کے تئیں کسی قسم کی مایوسی مجھے نہیں محسوس ہوتی، اس لئے کہ زندگی ایک مسلسل عمل ہے جو ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں ہر طرح کی چیزیں ہو رہی ہیں۔ اچھی بھی ہو رہی ہیں بری بھی ہو رہی ہیں۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے ہم خوش ہوتے ہیں۔ بعض چیزوں پر ملال ہوتا ہے تو ان تمام واردات کا سچا سچا اظہار اپنے ذاتی تجربے کے حوالے سے۔ یہ گویا میری شاعری کا معاملہ ہے تو اس میں مایوسی کا معاملہ تو نیر صاحب بالکل نہیں ہے۔

نیر مسعود: نہیں۔ مایوسی تو میں نے خود بھی نہیں......

عرفان صدیقی: لیکن محزونی اور افسردگی۔ آپ نے بہت بجا فرمایا۔ ایک خاص قسم کی محزونی اور افسردگی ہے اور وہ کچھ تو اس لئے ہے کہ خارج میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اندر دکھ پہونچا رہی ہیں تو اس دکھ کا عکس بھی پڑ رہا ہے اور آپ کو معلوم ہو رہا ہے، لیکن کچھ بشارتیں مجھے خوش بھی کر رہی ہیں۔ اس کا بھی عکس شاعری میں ملے گا۔

مجموعی طور پر زندگی سے بہت زیادہ شاکی ہونے کا قائل نہیں ہوں یعنی زندگی کوئی شکایت کی چیز نہیں ہے اگر صرف شکایت یا خرابی کی کوئی چیز ہے تو پھر زندہ رہنا بیکار ہے تو مجھے زندگی بیکار تو بالکل نہیں لگتی۔ بہت بامعنی لگتی ہے لیکن زندگی کے معنوں کی تلاش میں جو مختلف کیفیتیں مجھ پر گذرتی ہیں ان میں محزونی بھی ہے افسردگی بھی ہے، اس لئے کہ بعض چیزیں بہت تکلیف پہونچاتی ہیں اور ان کا اظہار ملتا ہے لیکن بشارتیں ہیں جو زندگی کو قائم رکھنے پر اصرار کرتی ہیں۔ تو یہ کیفیت ہے صاحب۔

نیر مسعود: اچھا ایک بہت ضروری سوال چھوٹا جاتا ہے۔ گفتگو میں مزہ بھی آرہا ہے ایک شعر آپ کا ہے اس طرح اور شعر بھی ہوں گے۔

کہیں کسی کے بدن سے بدن نہ چھو جائے
اس احتیاط میں خواہش کا ڈھنگ سا کچھ ہے

عرفان صدیقی: ''کچھ ہے''۔ جی ہاں۔

نیر مسعود: یہ خاصے شوقین آدمی کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

عرفان صدیقی: (قہقہہ) ہاں، جی ہاں۔

نیر مسعود: اور آپ کے یہاں ظاہر ہے۔ رومانی شاعر کا تو ہمارے یہاں زوال ہی ہو گیا ہے۔ پہلے کی طرح کی عشقیہ شاعری نہیں ہو رہی ہے آپ کے یہاں بھی بہت کم ہے۔ لیکن جو

ہے تھوڑی بہت وہ بہت ہی پرقوت قسم کی شاعری ہے۔اب یہ تو ہم نہیں پوچھیں گے آپ سے کہ صاحب اپنے معاشقوں کی داستان سنائیے (ہنسی) لیکن اس کا آپ کی شاعری میں کسی حد تک عمل دخل رہا ہے؟

عرفان صدیقی: اگراس طرح کے معاشقے ہوتے تو سنا ضرور دیتا۔اس میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ ذرا مزے دار بات ہے۔اس لئے ایک پہلو تو، بالکل جملہ معترضہ کے طور پر مجھے کہہ لینے دیجیے۔معاشقوں کے سلسلہ میں کہ ذہنی سطح پر ہوسکتا ہے بہت سے معاشقے رہے ہوں لیکن جسمانی تجربات کچھ بہت قابل ذکر نہیں ہیں۔لیکن اس چیز کی کمی اگر ہے تو وہ کسی چیز نے پوری کی ہے تو وہ کوشش ہے مشاہدے کو تیز کرنے کی۔تو یہ جو شعر آپ نے پڑھا۔

کہیں کسی کے بدن سے بدن نہ چھو جائے
اس احتیاط میں خواہش کا ڈھنگ ...... کچھ ہے

اصل میں تو میں کہنا یہ چاہتا ہوں اس میں کہ لگتا تو ایسا ہے کہ بالکل مجتنب ہے کوئی شخص۔لیکن یہ اجتناب ہی یہ ظاہر کر رہا ہے کہ نہیں صاحب، اندر کچھ ہے۔اگر کچھ نہیں ہے تو اس قدر احتیاط کیا معنی؟

تو ایک انسانی reaction کو میں نے ظاہر کرنا چاہا ہے۔اچھا جہاں تک عشق کا تعلق ہے تو عشق تو کیا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ نہ کیا ہو۔یہ ریکارڈ ہو رہی ہے بات (ہنسی) لیکن یہ کہ عشق سے عام طور پر جو چیزیں مراد لی جاتی ہیں۔یعنی عشق کے ظاہری معاملات۔ان میں بہت سی چیزیں نہیں ہوئیں۔ظاہر ہے کہ کوئی بہت اچھا لگا ہوگا، بہت پسند آیا ہوگا، بہت کچھ اس کے بارے میں سوچا ہوگا۔وہ سب تو رہتا ہے۔اس طرح کی عشقیہ شاعری جس کا خارج میں اظہار ہوتا ہے نہیں ملے گی اس لئے کہ وہ ہے نہیں اور جس کا وجود ہی نہیں ہے وہ شاعری میں

کہاں سے ملے گا؟ لیکن جسم ایک چیز ہے، انسانی حسن ایک چیز ہے، تناسب جسمانی ایک چیز ہے، انسانی جسم کی کشش ایک چیز ہے۔ اس کے مختلف پہلو میں بدن کے ہزاروں اسرار ہیں۔ وہ سب میں جانتا ہوں اوران کا شائق بھی ہوں اوران کو بہت اہم اور ضروری چیز بھی سمجھتا ہوں کیونکہ بہت ادھورا رہتا ہے آدمی ان چیزوں کے بغیر۔

نیر مسعود: عشقیہ شاعری کا ذکر اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ آپ کی شاعری کی عام فضا کی جو بات ہو رہی تھی کہ اندوہ اور محزونی کی فضا ہے تو اس میں بالکل متوقع یہ بات تھی کہ آپ کے یہاں جو عشق اور گذشتہ محبتوں اور رومانوں کا تذکرہ ہوگا وہ بھی ایک فریاد کے انداز میں ہوگا لیکن یہ عجیب وغریب چیز ہے کہ اس لحاظ سے آپ کا جو عشقیہ یا رومانی کلام ہے یہ اس فضا سے بالکل الگ ہے۔ آپ کے یہاں مجھے کوئی ایسا شعر یاد نہیں آرہا ہے ممکن ہے کہ ہو جہاں رومان یا نسوانی حسن کا جو ذکر ہو اس میں اداسی یا محرومی کا بھی تصور ہو بلکہ بہت ہی جاندار قسم کا......

عرفان صدیقی: اصل میں نیر صاحب آپ مجھے اجازت دیں میں دو شعر آپ کو سناؤں۔

نیر مسعود: ہاں ہاں!

عرفان صدیقی: وہ ایک طرح سے عشقیہ شاعری، یا جو بھی کہیے اس میں ایک طرح سے میری approach کی ترجمانی کریں گے۔ ایک شعر تو یہ ہے کہ ع

ناچیز بھی خوباں سے ملاقات میں گم ہے

......میں نے عرض کیا نہ کہ مجھے تصوف سے جو فائدے پہونچے ہیں وہ محض فکری سطح پر نہیں پہونچے بلکہ مجھے شاعری میں بہت مدد دی ہے بعض چیزوں نے۔

ناچیز بھی خوباں سے ملاقات میں گم ہے

مجذوب ذرا سیر مقامات میں گم ہے

تو ایک معاملہ تو یہ ہے صاحب! اب مجذوب پر بھی ہزاروں چیزیں گذرتی ہیں۔ کبھی وہ سالک

ہوتا ہے، کبھی اور آگے بڑھتا ہے، مختلف مقامات ہوتے ہیں قرب حسن کے تو وہ مقامات آتے ہیں۔ زندگی میں کہیں ٹھہر ٹھہر کے رکنا نہیں چاہتے۔ مجذوب تبھی آدمی ہو پاتا ہے جب رکتا نہیں ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ آدمی رکتا ہے ہر مقام پر اور رک کے اس کی سیر کرتا ہے۔ ع

کھلتے ہی نہیں لمس پہ اس جسم کے اسرار

دیکھئے صاحب میں نے ہاتھ واتھ نہیں کہا ہے، نہ آنکھ......

نیر مسعود: جی ہاں محض لمس ہے۔

عرفان صدیقی: کھلتے ہی نہیں لمس پہ اس جسم کے اسرار

سیاح عجب شہر طلسمات میں گم ہے

تو یہ ایک چیز ہے صاحب، تلاش تو مجھے بھی ہے کہ کیا کیا معنویتیں ہیں انسانی حسن کی، جمال کی اور اس سے قرب اور اتصال کے معاملات کی۔ اور ایک اور شعر یہ ہے کہ:

میں ڈوب گیا جب ترے پیکر میں تو ٹوٹا

یہ وہم کہ تو خود ہی مری ذات میں گم ہے

اصل میں معاملہ یہ ہے نیر صاحب کہ اس میں بھی مجھے اصرار ہے اپنے وجود کو الگ قائم رکھنے کا۔ اس طرح کے عشق کا میں قائل نہیں ہوں آپ نے بالکل صاحب اپنے آپ کو......

نیر مسعود: ہاں۔ محبوب میں گم کر دیا۔

عرفان صدیقی: گم کر دیا اچھا یہ بھی نہیں ہے کہ مجھے ایسا لگے کہ میں اپنے میں کافی ہوں۔ اتصال کی ضرورت ہی نہیں۔ وصل کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ تو میرے اندر ہی موجود ہے۔ نہیں دونوں کا الگ الگ وجود ہے اور دونوں کا قرب اور لمس ضروری بھی ہے اور اس سے انسان کی بہت سی کمیوں کی تلافی ہوتی ہے اور آدمی زیادہ مکمل ہوتا ہے۔

مسعود: ڈاکٹر صاحب ایک چیز میں یہ عرض کروں کہ اس بات کی نشان دہی ''کینوس'' میں

زیادہ ملتی ہے۔

نیر مسعود: وہ جوانی کا کلام ہے بھئی، ظاہر ہے کہ......

مسعود: ہم سفر کے چھوٹ جانے کا ملال، ہمسفر کا ذکر۔ عشق بمعنی ہمسفر۔

نیر مسعود: اصل میں ہمارے یہاں عشقیہ شاعری بہت ہی...... فاروقی صاحب کی زبان میں، پلپلی ہوتی رہی ہے، تو بیشتر جو ہمارے عشقیہ شاعر ہیں میرا تو خیال ہے کہ انھوں نے قاعدہ سے عورت کو دیکھا ہی نہیں (ہنسی)

عرفان صدیقی: وجہ یہی ہے۔ نیر صاحب پلپلی اس لئے ہے۔ واقعی سچ ہے کہ یا تو وہ واردات ان پر گذری ہی نہیں۔ یونہی بس سنی سنائی باتیں بیان کرتے رہے اور یا گذری تو اس سطح سے آگے نہیں بڑھ سکے جو گویا جسمانی اتصال کی سطح ہے۔ عشق کے اسرار کو دریافت کرنے کی کوئی کوشش۔۔۔۔

نیر مسعود: ......نہیں ہے، یہ تو آپ کے یہاں بہت قابلِ ذکر چیز ہے۔ جب کبھی آپ کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اس کا بھی ذکر ہونا چاہیے کہ اس وقت جب کہ عشقیہ شاعری out of date ہو چکی ہے تو یا غزل میں سے جا چکی ہے اور اگر آتی ہے تو بہت ہی خراب طریقے پر۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ اب اگر عشقیہ شاعری میں تھوڑی سی جان پیدا کی جاسکتی ہے تو غم سے مدد لے کر چونکہ غم ایک قوی جذبہ ہے کشش پیدا کرتا ہے موضوع میں محبت کی مایوسیوں کا تذکرہ کریں تو عشقیہ شاعری شاید کچھ جاندار معلوم ہو ورنہ گیا اس کا زمانہ۔ لیکن آپ کے شعروں میں ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہے ظفر اقبال کے یہاں بھی۔ وہ بڑا جاندار اور زندہ اور شادکام اور بامراد عشق ہے۔ عشق کیوں کہیں۔ اس کو ہم سیدھا سیدھا وصال کہیں......

عرفان صدیقی: وصال کہیں، بالکل۔

مسعود: یہ ہمارے کلاسیکی شاعروں کے یہاں بہت ہے۔

نیر مسعود: بہت ہے میرؔ، مصحفیؔ وغیرہ ہیں۔ اب یہ سوال، اس کا تعلق صرف آپ کی شاعری سے نہیں ہے لیکن یہ کیا بات ہے کہ رومان ہمارے تقریباً پورے ادب ہی سے غائب ہوتا جارہا ہے یعنی اب عشقیہ کہانی گویا اچھی لکھی ہی نہیں کہی جاسکتی، نہ عشقیہ شعر اچھا کہا جاسکتا ہے بالعموم یہی کیفیت ہے۔

عرفان صدیقی: آپ صحیح فرمارہے ہیں اصل میں اس کی وجہ وہی ہے کہ اب یہ معاملہ آدمی کا، یا شاعر کا ذاتی واردات کا معاملہ نہیں رہا پہلی محرومی تو یہ رہی۔ میں محرومی ہی کہوں گا اسے کہ شاعری کے لئے بہت ہی بنیادی موضوع ہے...... تو اب معاملہ ہے اس طرح کا۔ سماج اور زندگی انسان کی ایسی ہوگئی ہے کہ جسمانی تمناؤں کی تکمیل اب کوئی مشکل کام نہیں ہے وہ ایک خاصا میکانکی عمل ہوگیا ہے تو بیان کیا کریں آپ؟ آپ کیا بیان کریں گے؟ لیکن جو لوگ عشق کو عشق سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ میر جیسا عشق تو کسی کو نصیب نہیں ہوگا تو پھر ظاہر ہے کہ میرؔ جیسی عشقیہ شاعری بھی کسی کو نصیب نہیں ہوگی۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ عشق کو کچھ یوں خارج کردیا گیا ہے، شاعری سے آجکل عموماً کہ عشق بہ حیثیت ایک انسانی واردات کے لوگوں کے تجربوں کا حصہ نہیں رہا۔ عشق میں جسمانی اتصال کی بات نہیں کررہا ہوں۔ جسمانی اتصال تو میں نے عرض کیا کہ وہ ایک میکانیکی ہے۔ تمناؤں کی تکمیل ہوگئی، خواہشات کی تکمیل ہوگئی، بات ختم ہوگئی۔ لیکن عشق کا معاملہ یہاں پر ختم نہیں ہوجاتا۔ آپ اجازت دیں تو میں ایک شعر سنادوں۔ میرا ایک مطلع ہے:

تیرا سراپا میرا تماشا کوئی تو برج زوال میں تھا
رات چراغ ساعت ہجراں روشن طاق وصال میں تھا

......تو ایک معاملہ تو یہ ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں وصال بھی گویا تقریباً فراق بن جاتا ہے یا میرا ایک اور شعر ہے:

درد کی شب گذر گئی تیرے خیال کے بغیر
اب کے بجھا چراغ ہجر بادِ وصال کے بغیر

تو اب اس میں دیکھیے جسم اس طرح سے کوئی رول play نہیں کر رہا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جسم کا نہ ہونا، دوسرے شعر میں جسم کا نہ ہونا ایک بہت بڑی محرومی لگ رہا ہے، عجیب و غریب سانحہ لگ رہا ہے کہ بھئی یہ کیا ہوا؟ ہونا تو یہ چاہیے کہ چراغ ہجر جو ہے وہ بادِ وصال سے بجھے لیکن نہیں ہوا۔ ایسا نہیں ہوا۔ کوئی بات ہی تیری یاد نہیں آئی تیرا جسم ہی ذہن میں نہیں آیا۔ کچھ معاملات نہیں ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی کیفیت ہی طاری نہیں ہوئی یعنی کوئی خواہش پیدا نہیں ہوئی تیرے قرب کو حاصل کرنے کی۔ یہ بڑا زبردست المیہ ہوگیا یہ کیا ہوگیا۔ تو میں نے جیسا کہ عرض کیا یہ اس لئے کم ہوگیا ہے کہ ادھر لوگ ایک تو خالص جسمانی سطح پر اس کو برت رہے ہیں تو خاصے میکانیکی انداز میں برت رہے ہیں۔ شاعری کے لئے کوئی مواد فراہم نہیں ہو رہا ہے۔

نیر مسعود: ہاں عشق قریب قریب تفریحی مشغلہ ہے۔

عرفان صدیقی: تفریحی مشغلہ ہے تو چونکہ اچھا اور گہرا عشق انسان کی زندگی سے تقریباً خارج ہوگیا ہے۔ اس لئے شاعری سے بھی خارج ہوگیا تو میں صاحب اب بھی اس عشق کی بڑی قدر کرتا ہوں اور موقع ملے تو میں ویسا عشق پھر کروں جو مجھے بہت اچھے عشقیہ شعر لکھنے کے لئے آمادہ کرے۔

نیر مسعود: اچھا ایک سوال۔ بس اب...... اب واقعی گفتگو ختم کر رہے ہیں۔

عرفان صدیقی: جی جی فرمائیں۔

نیر مسعود: یہ سب آپ کی شاعری ہی پر گفتگو ہو رہی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاعری ہی کے برابر دسترس آپ کو نثر پر بھی حاصل ہے حالانکہ نثر کم آپ لکھ رہے ہیں لیکن جتنی چیزیں بھی

آپ نے لکھی ہیں وہ بہت ہی عمدہ ہیں، خیالات کے علاوہ زبان کے اعتبار سے بھی۔ تو شاعری کے بارے میں تو خیر درخواست نہیں ہے اس لئے کہ شاعری تو آپ کریں ہی گے مجبوراً......

عرفان صدیقی: جی ہاں۔ بالکل مجبوری ہے۔

نیر مسعود: لیکن نثر کے سلسلہ میں ہم لوگوں کی یہ درخواست بھی ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہیے کچھ چیزیں آپ نے لکھنا شروع کیں لیکن آپ کی غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے وہ تکمیل کو نہیں پہونچ رہی ہیں۔

عرفان صدیقی: بالکل صحیح ہے۔ اصل میں یہ ہوا ہے کہ نثر تو بہت جی چاہتا ہے لکھنے کو۔ کچھ تھوڑا بہت لکھا بھی۔ دو چیزیں نثر میں رہیں ایک تو ترجمے کی سطح پر کچھ کام کیا وہ اب بھی بہت اہم لگتا ہے۔ ترجمہ دشوار لیکن اتنا ہی نشاط انگیز تجربہ لگتا ہے۔ تو ایک تو وہ سطح ہے نثر نگاری کی۔ وہ جاری ہے۔ کچھ چیزیں ہیں جن پر کام کیا جا رہا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ نیر صاحب کہ میرے جی میں بہت ...... بہت دن کچھ ناول یا ناول قسم کی چیز لکھنے کا معاملہ تھا کئی سال سے۔ تو کچھ اس میں لکھا بھی گیا۔ اب سوچتا ہوں کہ اس کو مکمل کروں اور وہ سامنے آجائے۔ وہ اصل میں بات وہی آجاتی ہے نیر صاحب کہ چاروں طرف بٹ جانے سے concentration میں کچھ کمی آتی ہے لیکن مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ یہ چیزیں (نثر اور شاعری) ایک دوسرے کو compliment کرتی ہیں یعنی اگر میں شاعر ہوں۔ شاعری کرتا ہوں تو میری نثر نگاری اس کا ایک compliment ہوگی۔

نیر مسعود: اچھے شاعر کو اچھا نثر نگار ہونا ہی چاہیے۔

عرفان صدیقی: جی۔ تو ایک تو یہ ہے کہ انشاءاللہ ارادہ ہے کہ ناول مکمل کروں جو خاصے عرصہ سے ادھورا پڑا ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ کچھ اور چیزیں نثر میں لکھنے کا ارادہ ہے کچھ ترجمے ذہن میں ہیں تو انشاءاللہ کچھ نہ کچھ ہوگا۔

مسعود: ایک سوال ڈاکٹر صاحب میں بھی سوچ رہا ہوں۔

نیر مسعود: ہاں ہاں۔ضرور۔

مسعود: یہ گفتگو غزل کے حوالے سے ہو رہی تھی۔آپ کی شاعری جو سب سے بہتر اور زیادہ اظہار ہوا ہے وہ غزل ہی میں ہوا ہے اور جو دوسری چیزیں آپ نے لکھی ہیں ان میں بھی اکثر غزل ہی کے فارم کا سہارا لیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں جو اردو غزل کی روایت ہے اس میں ایک تو وہ دھارا ہے جو میر تقی میرؔ سے چلا اور دوسری غالبؔ کی لہر ہے میں اس کو یوں دیکھتا ہوں کہ میرؔ کی غزل کو آگے لے چلیے تو جدید دور میں وہ ناصرؔ کاظمی تک آ جاتی ہے اور وہ شکست وریخت جو ہے وہ غالبؔ کے یہاں ہے کہ بہت سے طے شدہ ادبی اصول غالبؔ نے توڑے ہیں۔ یہ تو دو دھارے ہیں اس کے بعد پھر ترقی پسند تحریک کا دور آتا ہے۔

عرفان صدیقی: جی یہ بھی ایک ردیف کی مجبوری ہے (ہنسی)

مسعود: اس نے غزل کو ایک حد تک......

عرفان صدیقی: نقصان پہونچایا......

مسعود: نقصان پہونچایا۔ بہرحال ہماری جو روایت بنتی بگڑتی رہی اس کا ایک حصہ وہ بھی ہے تو آپ کی غزلیں جب ہم پڑھتے ہیں تو بہ حیثیت ایک قاری کے لیکن اگر میں نقادی پر آ جاؤں۔

عرفان صدیقی: نہیں نہیں آپ انشاءاللہ نقاد بنیں گے۔

نیر مسعود: بلکہ اس وقت بھی ہیں۔

مسعود: تو مجھے یہ دونوں دھارے آپ کی غزل میں نہیں نظر آتے۔کم از کم مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔

عرفان صدیقی: صاحب، میں خدا کی قسم بہت خوش ہوں اگر میں کسی دھارے میں آپ کو نظر نہیں آ رہا ہوں اس لئے کہ میں اصل میں کسی دھارے کا شاعر نہیں ہوں۔ میں تو، میں آپ سے

سچ عرض کرتا ہوں کہ اب تک میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں میرؔ کو غالبؔ سے کہاں ممیز کروں۔

مسعود: ممیّز کرنے کی بات نہیں ہے۔

عرفان صدیقی: نہیں۔ میں عرض اس لئے کر رہا ہوں۔ مجھے بات پوری کرنے کی اجازت دیں۔ غالبؔ کے ذہن کی پیچیدگی، زبردست پیچیدہ ذہن، عجیب وغریب! لیکن میرؔ کہیں کہیں مجھے لگتا ہے کہ اس سے زیادہ پیچیدہ ذہن کا شاعر ہے سمجھ میں اب تک نہیں آتا کہ میں، اگر گروہ ہو سکتے ہیں شاعری میں، تو میں میرؔ کے گروہ کا شاعر ہوں یا غالبؔ کے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان دونوں کے گروہوں میں آدھا آدھا بٹا ہوا ہوں اس لئے کہ بہت زیادہ فیصلہ نہ کر سکنے کے باوجود یہ طے ہے کہ غالبؔ کی شاعری مجموعی طور پر میرؔ سے مختلف ہے۔ یہ تو ضرور طے ہے تو پھر یہ بھی طے ہے کہ یہ دونوں شاعر الگ الگ طرح کے ہیں۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے دونوں ہی اس قدر پُر اسرار اور اتنے اپنی طرف کھینچ لینے والے لگتے ہیں کہ میں کبھی اس طرف جاتا ہوں، کبھی اس طرف جاتا ہوں، بلکہ ایک ہی وقت میں دونوں طرف بٹا ہوا رہتا ہوں۔ ایک ہی وقت میں، ایک ہی شعر میں۔ یہ عجیب وغریب معاملہ ہے اور یہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے لیکن دل میرا میرؔ کی طرف بہت کھنچتا ہے، سچ بات یہ ہے۔

نیر مسعود: بلکہ میرؔ کے بلاک میں غالبؔ کا بلاک موجود ہے۔

عرفان صدیقی: موجود ہے۔ اصل میں معاملہ یہی ہے اور فاروقی صاحب نے تو اس کو تقریباً وضاحت سے عیاں کر دیا ہے۔

مسعود: ہم لوگوں میں کچھ پہلے بات ہو رہی تھی آپ کی شاعری سے متعلق۔ تو ہم نے یہ کہا تھا کہ عرفان صاحب مصحفی کا ذکر بہت کرتے ہیں اپنی گفتگوؤں میں۔

عرفان صدیقی: جی ہاں میں مصحفی کو بڑا اہم شاعر مانتا ہوں۔

مسعود: میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے مصحفی کو زیادہ پڑھا نہیں ہے تو میں یہ نہیں طے کر پا رہا

ہوں کہ آیا مصحفی کا کوئی دھارا بنتا ہے یا نہیں۔

عرفان صدیقی: دیکھئے مصحفی کا دھارا بن سکتا تھا اگر میرؔ نہ ہوتے۔ میرؔ کا وجود خارج کر دیجیے آپ اردو شاعری سے تو مصحفی کا دھارا بہت بڑا دھارا بنتا۔ لیکن ایسا تو ہے نہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ میرؔ کا چربہ ہوں۔ بالکل نہیں ہیں، لیکن عجیب وغریب شاعر ہیں۔ لیکن دھارا وہی ہے تو اب اس دھارے میں چونکہ ان سے بہت بڑا شاعر موجود ہے یعنی ظاہر ہے کہ میرؔ اور مصحفی کا کوئی مقابلہ ہم نہیں کر سکتے تو جیسے کسی نے یہ مثال دی تھی کہ برگد کے نیچے کتنا ہی بڑا کوئی درخت ہو۔ کتنا ہی وہ پنپ جائے نظر تو پہلے برگد ہی پر پڑے گی اور رہے گا وہ برگد ہی کے نیچے تو صاحب میرؔ کے برگد کے نیچے آ گئے ہیں مصحفی۔ معاملہ یہ ہے۔ ورنہ مصحفی بہت اہم شاعر ہیں۔ مثلاً یہ شعر ہے۔ اگر کوئی نہ جانے، مجھ ایسا جاننے والا تو بہ آسانی اسے میرؔ کا شعر سمجھ سکتا ہے۔

ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا

مسعود: بہت بہت شکریہ۔ خدا حافظ

عرفان صدیقی: خدا حافظ۔

(بہ شکریہ ماہنامہ شب خون، الہ آباد)

☆☆☆

تفہیم اقبال

شرکائے گفتگو: عرفان صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی، نیر مسعود

پہلی نشست

عرفان صدیقی: کلام اقبال کی تفہیم کے سلسلے میں جو چیز سب سے پہلے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں تاریخی، مذہبی، اساطیری حوالے، تلمیحات اور استعارے، اتنی کثرت سے ملتے ہیں کہ لگتا ہے جب تک ان سے پوری طرح واقفیت نہ ہو اس کلام کی تہ تک پہنچنا مشکل ہوگا۔ اقبال کے یہاں یہ حوالے دوسرے شاعروں کے مقابلے زیادہ ہیں۔ ان کی بہت سی شاعری مختلف رجحانات، تحریکوں اور تاریخی واقعات سے کوئی ربط اور سلسلہ رکھتی ہے۔ مثلاً جب ہم پڑھتے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز
ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبور نیاز

تو ''کلاہ لالہ رنگ'' کو صرف سرخ رنگ کی ٹوپی سمجھ لینے سے کام نہیں بنتا۔ جب تک آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ خلافت عثمانیہ کا زوال کس طرح ہوا اور اس میں انگریزوں کا کیا کردار رہا تھا، اس وقت تک کلاہ لالہ رنگ، یا ترکی ٹوپی کے رسوا ہونے کا مفہوم روشن نہیں ہوتا۔ فاروقی صاحب،

آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ان حوالوں کو سمجھے بغیر کلام اقبال کی علیحدہ سے تفہیم ممکن ہے؟

شمس الرحمٰن فاروقی: اس میں شک نہیں کہ جیسا آپ نے فرمایا، اقبال کے یہاں تاریخی اشارے، علمی اشارے، فلسفیانہ اشارے کثرت سے ہیں اور جب تک ان سے کچھ نہ کچھ واقفیت نہ ہو تب تک بہت سے اشعار کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا، اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ ان اشعار کی بڑائی اور عظمت سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن ایک مشکل اور بھی ہے اس سے زیادہ، وہ اس وقت پیش آتی ہے جب تاریخ اور فلسفے کا وہ تصور جو اقبال کے ذہن میں تھا، اس سے واقفیت نہ ہو۔ کیوں کہ یہ تو ممکن ہے کہ جو واقعات ہیں، وہ تاریخ میں لکھے ہوئے دیکھ لیے جائیں کہ ۱۹۰۳ء میں یہ ہوا اور ۱۹۰۴ء میں یہ ہوا، اور سلطان عبدالمجید کو یوں معزول کیا گیا، وغیرہ۔ یا حضرت ابوبکرؓ کا واقعہ، یا جو بھی واقعہ سمجھ لیجئے۔ لیکن جیسے یہ شعر ہے ؎

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم

نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

اب اس میں اسلامی اور مسلم تاریخ کا بھی ایک خاص نظریہ ہے، اس سے واقفیت چاہیے۔ مان لیجیے میں آپ کو بتا بھی دوں کہ صاحب، اس میں اسمٰعیل علیہ السلام کی اور حسین علیہ السلام کی قربانی کا جو معاملہ ہے، جو ان کا معرکہ تھا حق و باطل کا، وہ ہے۔ لیکن اس سب کے ساتھ ساتھ ایک پورا تاریخی منظر اور تاریخ کا ایک تصور بھی ہے۔

اور وہیں پر مشکل آ پڑتی ہے۔ اب، مثلاً یہ کہ چونکہ ہم نے پچھلے پچاس ساٹھ ستر برس سے اقبال کا ایک طرح سے استحصال کر رکھا ہے، کچھ لوگ جو ایک خاص نظریے کے مالک ہیں وہ اقبال کو بھی اسی نظریے کا حامل سمجھنا چاہتے ہیں۔ کوئی انھیں انقلابی کہتا ہے، کوئی مسلم chauvinistic کوئی کہتا ہے وہ پاکستان کے نظام کے گویا بانی تھے وغیرہ وغیرہ۔ کچھ لوگ جو اقبال کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ان کے فاشسٹ خیالات ہیں، جنگ جویانہ خیالات ہیں، وہ امن کے

مخالف ہیں، قوت کے حامی ہیں۔ وغیرہ۔ تو یہاں مشکل آپڑتی ہے کہ جب اقبال کا ایک تصور تاریخ ہے اور اس کو سمجھے بغیر ہم ان کے کلام کی پوری معنویت کو نہیں سمجھ سکتے، تو اس تصور تاریخ کو ہم کیسے متعین کریں؟ چونکہ اقبال کے ساتھ Vested Interest بہت ہیں، اس لیے......

اب اگر اسی شعر کو آپ لے لیجیے غریب و سادہ و رنگیں ہے......تو اس میں سوشلسٹ قسم کا نقاد تاریخی اعتبار سے کچھ اور معنی بتائے گا، جو اسلام پسند ہے وہ کچھ اور معنی نکالے گا، جو اقبال کو قومیت پرست ثابت کرنا چاہتا ہے، کہ گویا ہندوستان کی سالمیت کے معاملے میں وہ کانگریس کی پالیسیوں کے حامی تھے، کم و بیش، وہ اور معنی نکالے گا۔ کتنے معنی نکالے کوئی۔ تو سب سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اقبال کا اپنا تصور تاریخ، تصور فلسفہ اور تصور فن کیا تھا اور اس کو ہم اپنے طور پر نہیں، خود اقبال کے اقوال، تصورات اور کلام سے نکالیں۔ ایک تو صاحب یہ مشکل ہے، دوسری مشکل یہ ہے کہ بہت ساری چیزیں جو اقبال نے پڑھی تھیں وہ ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ مثلاً ان کے وہ اشعار جو فلسفیوں، اسپنوزا، افلاطون، ہیگل وغیرہ یا شعراء جیسے بائرن، براؤننگ وغیرہ کے بارے میں ہیں۔ اب وہ تو دو دو شعر لکھ کر چلے گئے ہیں، لیکن ظاہر ہے ان کے پیچھے خود اقبال کا پورا انیسویں صدی کے ذہنی مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے مطالعہ تھا کہ اٹھارہ سو نوے یا انیسویں صدی کے ذہنی مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے مطالعہ تھا کہ ۱۸۹۰ء یا ۱۹۰۴ء، ۱۹۰۵ء، ۱۹۱۰ء کے قریب مغربی یورپ میں لوگوں کا بائرن کے بارے میں کیا خیال تھا، براؤننگ کے بارے میں کیا خیال تھا، اس سے واقفیت اگر نہ ہو تو پھر یہ اشعار......آپ تعریف ضرور کر دیں گے۔ لیکن ان اشعار کی گہرائی تک نہیں پہنچیں گے۔ تو معاملہ صرف میکانیکی طور پر تلمیحات اور حوالوں کا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے پیچھے جو تاریخی فلسفیانہ تصور اقبال کے ذہن میں تھا اس تک پہنچنے کا بھی معاملہ ہے۔

عرفان صدیقی: فاروقی صاحب، آپ نے بہت صحیح فرمایا، اقبال کے یہاں بعض حوالے

ایسے ہیں کہ محض تاریخی طور پر آپ انھیں تھوڑا سا decode کر لیں تو کام نہیں بنتا۔ مثال کے طور پر انھوں نے بہت سے مغربی مفکرین کے اقوال کا ایک طرح سے ترجمہ کر دیا ہے، جمہوریت کے بارے میں، آمریت کے بارے میں، فلاں اصول کے بارے میں، فلاں تحریک کے بارے میں، تو دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے پورے شعری، فکری نظام میں ان چیزوں کی اہمیت کیا ہے۔ مثلاً انھوں نے ایک جگہ کہہ دیا کہ صاحب وہ بھی ترجمہ ہے، کہ ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

درست کہا اچھا، اب مجھے یہ لگتا ہے کہ بظاہر انھوں نے محض ترجمہ کر دیا ہے لیکن دراصل یہ جمہوریت پر ان کا comment بھی ہے۔ اور جب comment ہے تو اس میں شاعر کا اپنا نقطۂ نظر بھی شامل ہو گیا۔ نیر صاحب، آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟

نیر مسعود: عرفان صاحب، ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ ایک تو اسی نقطۂ نظر کو سمجھنے کا ہے۔ اس کو ہم صحیح سمجھ رہے ہیں یا نہیں۔ یہ تو بعد میں...... بلکہ وہ ہم قارئین ادب کا دردِ سر ہے بھی نہیں۔

عرفان صدیقی: ہاں، بالکل صحیح ہے۔

نیر مسعود: ہاں آپ نے صحیح فرمایا کہ اقبال کے یہاں مختلف قسم کے حوالے اور تلمیحات بکثرت ہیں۔ حوالے اور تلمیحات ہماری شاعری میں پہلے بھی بہت تھیں۔ یعنی علوم کا ایک وسیع قسم کا مطالعہ اپنی کلاسیکی شاعری کو سمجھنے کے لیے پہلے بھی ہمارے لیے ضروری تھا۔ تھوڑا بہت نجوم جانیں، کچھ طب جانیں، کچھ تاریخ، کچھ دینیات جانیں، لیکن وہ مطالعہ صرف شاعری کے حوالے سے تھا۔ مثلاً مانی پیغمبری کا مدعی اور ایک تحریک کا بانی تھا، اس سے ہم کو مطلب نہیں، ہم کو صرف یہ معلوم رہنا چاہیے کہ وہ چین کا بہت بڑا مصور تھا۔ حالانکہ نہیں تھا، چینی بھی نہیں تھا۔ لیکن اگر ہم کو اس قسم کا علم نہیں ہے تو ہم ناقص قاری ہیں اور ہم کو شاعری پڑھنے اور سمجھنے کا حق

نہیں ہے۔ لیکن اقبال کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی علم کافی نہیں ہے جتنا کلاسیکی شعری نظام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اقبال کے مطالعے کے لیے ہمارا علم نہ صرف وسیع بلکہ گہرا بھی ہونا چاہیے۔ ہم صرف مانی کو نہ جائیں بلکہ ایران کی پوری ذہنی تاریخ سے بھی ہم کو تھوڑی بہت واقفیت ہو۔ گویا اقبال کو سمجھنے کے لیے ہمیں لغت سے زیادہ انسائیکلو پیڈیا دیکھنا ہوگا۔

شمس الرحمن فاروقی: جی ہاں، بہت خوب۔

نیر مسعود: ترکان عثمانی کا ابھی ذکر ہوا تھا۔ ایک شعر مجھے یاد آیا ؎

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکان عثمانی سے کم ترکان تیموری

اس شعر کی شرح بیخود دہلوی نہیں کر سکتے تھے، نہ بیخود موہانی کر سکتے تھے، نہ ہم کر سکتے ہیں جب تک ترکوں کی اس تاریخ سے واقف نہ ہوں جس کی طرف اشارہ کیا گیا۔ تو اقبال کی تفہیم کا ایک تو یہ مسئلہ ہے۔ سیدھا سیدھا علمی مسئلہ ہے جس کے لیے میں نے عرض کیا کہ انسائیکلو پیڈیا چاہیے اور یہ حل بھی ہو سکتا ہے۔ ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اقبال فوراً آپ کو مرعوب کر کے مبہوت کر دیتے ہیں۔ خود اپنا تجربہ بتاؤں کہ بچپن میں اقبال کے کلام سے آشنا ہوا اور پہلی بار میں ان کے جو شعر دل پر نقش ہو گئے وہ یہ تھے ؎

دیکھ چکا المنی شورش اصلاح دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں
چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب......

وغیرہ، تو اس سے مجھے غرض نہیں تھی کہ المنی کسی آدمی کا نام ہے یا کوئی قوم ہے، یا فرانسیس کوئی شخص تھا یا کوئی ملک یا ملت ہے۔ اصلاح دیں کی شورش کیا تھی، اسے مجھے کوئی مطلب نہیں تھا، بس شعر بہت عمدہ معلوم ہوئے اور دل میں اتر گئے۔

عرفان صدیقی: صحیح ہے۔

نیر مسعود: تو ایک قاری گویا مطمئن ہو گیا۔ اب اسے کوئی فکر نہیں ہے اس لیے کہ وہ لطف اندوز ہو چکا۔ لیکن جب اسی کلام کی تفہیم کا معاملہ ہو تو پھر اب یورپ کی تاریخ سے واقف ہونا بھی ضروری ہو جائے گا۔ وہی بات آ گئی کہ اقبال کو سمجھنے کے لیے ہمیں دوسری طرف کا علم بھی درکار ہے۔ ایک اور مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ہم اپنے کلاسیکی شعری نظام کی مانوس چیزیں اقبال کے یہاں پاتے ہیں لیکن ان کو بھی سمجھنے میں ہمارا گذشتہ مطالعہ اور شعری مسلمات کا علم ہماری مدد نہیں کرتا۔ مثلاً سب سے سامنے کی چیز ہے ''عشق''۔ اقبال کے یہاں عشق کا ذکر تو بہت ہے لیکن یہ وہ عشق نہیں ہے جس سے ہم واقف چلے آ رہے ہیں۔ ''خواجہ'' اقبال کے یہاں کیا ہیں؟ ''ملا'' کیا ہیں؟ یہ مختلف قسم کے لوگ بن گئے ہیں۔ اقبال کو سمجھنے میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے اور اس کا حل بھی بڑی حد تک اقبال کے کلام ہی میں موجود ہے۔ اقبال کے یہاں ''عشق'' کیا ہے، یہ معلوم کرنے کے لیے اقبال ہی کو پڑھیے۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو صرف اقبال کو پڑھنے سے حل نہیں ہوں گی۔ گذشتہ گفتگوؤں میں ہم اس بات پر متفق ہوئے تھے کہ میر اور غالب کو سمجھنے کے لیے انھیں پڑھنا کافی ہے۔ لیکن اقبال کو سمجھنے کے لیے صرف اقبال کو پڑھنا......

عرفان صدیقی: ......کافی نہیں ہے۔

نیر مسعود: بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا کہ کچھ بھی پڑھنا کافی نہیں ہے۔

شمس الرحمن فاروقی: ایک بات مجھے اس میں اور کہنے کا خیال آیا۔ جیسا کہ نیر صاحب نے فرق کیا، کہ بہت ساری معلومات ہیں جو کتابوں میں ملی ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا وغیرہ ہم دیکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ صرف اطلاع نہیں، بلکہ اقبال کے کلام کو سمجھنے کے لیے کچھ علم بھی چاہیے۔ اب جیسا میں سمجھتا ہوں، علم سے مراد صرف یہ نہیں کہ صاحب، آپ نے فلسفہ پڑھا ہو، تاریخ پڑھی ہو، بلکہ عمومی طور پر ایک ایسا ذہن ہو جو علمی مسائل کو انگیز کر سکتا ہو اور علمی مسائل

سے لطف اٹھا سکتا ہو۔ اگر لطف نہیں ملتا تو پھر مشکل ہو جائے گی کہ آپ اقبال کے کلام کو کسی بھی صورت سے پسند کر سکیں۔ بہت سے لوگ جو اقبال کے شاکی ہیں انھوں نے کہا صاحب دیکھیے یہ تمام اونچی اونچی باتیں کرتے ہیں، بڑی بلند آہنگی ہے، مگر دل کو چھونے والی بات نظر نہیں آتی۔ تو یہ بھی ایک مسئلہ کہ دل کو چھونے والی بات اقبال کے یہاں ہے یا نہیں ہے، اور اگر نہیں ہے تو اس سے اقبال کا نقصان کتنا ہوا ہے؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ آج کے زمانے کے لحاظ سے دل کو چھونے والی بات اقبال کے یہاں کم ملے گی۔ ممکن ہے ۱۹۲۰ یا ۱۹۳۰ میں جب بڑا انقلابی اور حریت پسندی کا ماحول تھا تو ان کے کلام میں یہ صفت رہی ہو کہ وہ لوگوں کے دلوں کو گرمادے اور ان کو میدان میں لے آئے۔ لیکن آج جو ان کے یہاں strong affirmation ہے وہ کچھ ہم کو گویا متاثر نہیں کرتا۔ چونکہ دنیا اتنی منتشر اور تہ و بالا ہو چکی ہیں کہ اب اقبال کے یہاں جو self assurance ہے وہ ذرا کھٹکتی ہے، اور اگر علمی مذاق نہ ہو تو اور بھی کھٹکے گی۔ لیکن پھر بھی اس شاعر کی جو فکر کی جولانی ہے وہ متاثر کیے بغیر نہیں رہتی ۔

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری

اب ابوالعلا معری کے بارے میں تین صفحے لکھ دیجیے، کچھ بھی پلے نہیں پڑے گا، اس لیے کہ جہاں لے جا کر ختم کیا ہے اس نے ع

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

یہ ایک فکری معاملہ ہے۔ آدمی اگر علمی اور فکری ذہن رکھتا ہے تب تو اس نظم کو بہت پسند کرے گا اور enjoy کرے گا۔ اور وہ ذہن اگر نہیں ہے تو...... اچھا ہم لوگوں کی نسل کے مقابلے میں اگر آپ دیکھیں، جیسا کہ نیر صاحب نے کہا کہ بارہ پندرہ برس کی عمر میں پڑھنا شروع کیا، پلے نہیں پڑ رہا ہے لیکن......

عرفان صدیقی: ہاں، مرعوب ہو رہے ہیں اور متاثر ہو رہے ہیں......

فاروقی: ......کہ کیا چیز ہے بھئی! جھوم رہے ہیں اس پر، لیکن آج، مثلاً اپنے بچوں کو اقبال پڑھاتے وقت میں نے محسوس کیا، میری بیٹیاں مجھ سے پوچھتی تھیں کہ صاحب ٹھیک ہے، لیکن بات کچھ بن نہیں رہی ہے، تو وہ اسی وجہ سے کہ جس طرح کا تیقن اور جس طرح کا بلند آہنگ دعویٰ اقبال کے یہاں ملتا ہے وہ موجودہ ذہن کو متاثر نہیں کرتا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

عرفان صدیقی: فاروقی صاحب، آپ نے یہاں دو بہت اہم نکتے اٹھائے۔ ایک تو اقبال کی شاعری کی......اگر میں اس کو تاثیر کہوں تو انگیز کر لیجیے۔

شمس الرحمن فاروقی: ہاں ہاں، تاثیر......

عرفان صدیقی: کہ دل کو چھوتی نہیں ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اس وقت ہمارے اس مسئلے، تفہیم اقبال، سے اس کا سیدھا سروکار نہیں ہے جس سے ہم کہنا چاہیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ اس لیے کہ......

شمس الرحمن فاروقی: سروکار تو صاحب، خیر میں بعد میں عرض کروں گا۔ آپ کہہ لیجیے۔

عرفان صدیقی: تو اس کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی رکھتے ہیں کہ تاثیر اور اثر کا معاملہ کیا ہے۔ لیکن یہ بات طے ہوگئی کہ اقبال کے سلسلے میں محض مطلب شناسی سے کام نہیں بنتا۔ جب تک آپ اس کی شعری فکر کی تہ تک نہ پہنچیں، اور اس تک پہنچنے کے لیے جیسا کہ ہمارے نیر صاحب نے فرمایا، صرف لغات سے یا اور فرہنگوں سے، بلکہ قاموس سے بھی کام نہیں چلتا۔ اقبال کے حوالوں کو بہر حال decode کرنا ہے، اس کے بغیر اقبال فہمی کے سلسلے میں قدم آگے نہیں بڑھا سکتے۔ اس کے علاوہ آپ کو اس پورے عصر کی تاریخ کو سمجھنا ہوگا۔

شمس الرحمن فاروقی: یہ بات صحیح ہے۔ لیکن اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں اگلی نشست میں عرض کروں گا جہاں مجھے کچھ اختلاف بھی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فکری تاریخ اور خود اقبال کی ذہنی تاریخ سے واقفیت کے بغیر اقبال کا کلام خاصا مشکل معلوم ہوگا۔ بلکہ

یہ کہنا چاہیے کہ اس کے دروازے بند نظر آئیں گے۔

عرفان: جی ہاں درست ہے۔ شکریہ۔

دوسری نشست

عرفان: پچھلی گفتگو میں فاروقی صاحب، آپ نے یہ اہم نکتہ اٹھایا تھا کہ آج کے ماحول میں جب ہم اقبال کی شاعری پڑھتے ہیں تو بہت سی جگہوں پر اس کی تاثیر پہلے کی طرح دل پر قائم نہیں ہوتی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہ بات یہاں صاف ہو جائے کہ کسی شعر کی تاثیر کا اس شعر کی تفہیم سے کتنا تعلق......

شمس الرحمن فاروقی: ہاں، یہ تو اتنا عمدہ سوال اٹھا ہے اس وقت کہ میرے خیال میں نیر صاحب بھی اس کی داد دیں گے۔

نیر مسعود: یقیناً!

شمس الرحمن فاروقی: میرا خیال یہ ہے کہ شعر کو سمجھنے کے لیے اس سے متاثر ہونا ضروری ہے۔ جب تک شعر کی تاثیر آپ کے ذہن پر مرتب نہیں ہوگی، تب تک آپ اس کی تہیں کھولنے سے قاصر رہیں گے، اس لیے کہ تاثیر کے بغیر اس کی شکل یہ ہو جائے کہ گویا کوئی معما ہے۔ آپ دماغ لگاتے رہیے، پسینہ ٹپکاتے رہیے، وہ آپ کے ذہن میں شعر کی سطح پر جلوہ گر نہیں ہوگا۔ رچرڈس نے بہت مزے کی بات کی تھی کہ کسی نظم کے معنی بیان کرنا اس کو سمجھنے کا طریقہ نہیں بلکہ یہ خود نظم ہے۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ جب تک شعر آپ پر اثر نہ کرے، آپ کو برانگیخت نہ کرے کہ اس کے سمجھنے کے لیے کچھ زحمت کریں، کچھ کوشش کریں، اس وقت تک ...... میں نے پچھلی گفتگو میں عرض کیا تھا کہ اقبال کو exploit بہت کیا گیا۔ کوئی کہتا ہے اقبال فلسفی، کوئی کہتا ہے اقبال اسلامی مفکر۔ مگر اقبال کا بہت سا ایسا کلام ہے جس میں تاثیر ہی

تاثیر ہے، معنی اور تصور کا معاملہ جانے دیجیے۔ خود ''مسجد قرطبہ'' کو لے لیجیے۔ اب بلا وجہ اس میں فلسفے چھانٹے جارہے ہیں کہ صاحب یہ وہ ٹائم ہے اور real ٹائم ہے، اور فلانا ٹائم ہے۔ مگر وہاں تو یہ ہے کہ دو مرتبہ آپ پہلا مصرع پڑھ دیجیے ع ''سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات'' تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اقبال کے کلام کے اس پہلو کو...... جو اس کا آہنگ ہے، خوب صورتی ہے، بہاؤ ہے، اس کی روشنی میں دیکھیں کہ یہ شعر اچھا ہے کہ نہیں اور اس کے کیا معنی نکل سکتے ہیں۔ ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار اقبال نے صبح اٹھ کر کہا کہ بھئی رات کو میں نے خواب میں ایک شعر کہا ہے اور معنی اس کے واضح نہیں ہو رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ کیا بات ہوئی، ذرا فرمائیں۔ تو انھوں نے شعر پڑھا ۔

دوزخ کے کسی طاق میں افسردہ پڑی ہے
خاکستر اسکندر و چنگیز و ہلا کو

اب میں نے جب یہ واقعہ پڑھا، اس وقت میری عمر کم تھی، تو میں نے کہا بھئی اس میں کیا ہے۔ اس میں تو کوئی بات ہی نظر نہیں آرہی جو مشکل ہو۔ لیکن جب آپ غور کیجیے تو پھر مشکل بھی نظر آتی ہے کہ دوزخ کے کسی طاق میں...... اور ان تینوں کو خاص کر لایا جانا، اور انھیں خاک کر کے طاق پر کیوں رکھا گیا، وغیرہ۔ تو اب ظاہر ہے کہ اس میں تاریخی علم بھی ضروری ہے، تاریخی شعور بھی ضروری ہے لیکن اس علم اور شعور کے بغیر بھی شعر میں ایک تاثیر موجود ہے جو آپ کو فوراً گرفتار کر لیتی ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ اس پہلو پر بھی ذرا زور دیں کہ آجکل تفہیم اقبال میں جو ناکامی ہو رہی ہے اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ہم اقبال شاعر کی جگہ اقبال فلسفی اور محقق اور مفکر پر توجہ کرتے ہیں۔

نیر مسعود: فاروقی صاحب، جیسا کہ آپ نے کہا اقبال کی تفہیم میں یہ چیز حائل ہوتی ہے کہ ہم ان کو شاعر کم، مفکر زیادہ سمجھتے ہیں۔ چلیے بہت انصاف کریں گے تو برابر کا شاعر اور مفکر مان

لیں گے۔ کم اور زیادہ کی ناپ تول سے قطع نظر، دراصل وہ بیک وقت شاعر بھی تھے اور مفکر بھی تھے۔ ان کے شعر کی تفہیم میں ہم کو بھی گویا سوئچ آن اور آف کرنا پڑتے ہیں۔ کبھی یہ سمجھ کر کہ کوئی مفکرانہ دانشورانہ بات کہی گئی ہے ہم ان کے شعر کا مطلب دوسری طرح سوچتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے جذبات کو مہمیز کر رہا ہے تو اسے خالص شاعری سمجھ کر دوسری طرح سوچتے ہیں۔ اقبال کا یہ گویا مخصوص انداز ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں کو عجیب طرح سے ملا دیتے ہیں۔ مثلاً بات شروع کریں گے۔ وہ تفکر اور فلسفے سے ع

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے

اب ہم تیار ہو کر بیٹھتے ہیں کہ کچھ فلسفۂ زوال اقوام......

عرفان صدیقی: ......بیان کیا جائے گا۔

نیر مسعود: ......مگر وہاں آتا ہے ؎

شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

تو فوراً ہم کو سوئچ اوور کرنا پڑتا ہے۔ یا ع

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

اس کے دوسرے مصرعے میں ہم تیموریوں وغیرہ کا ذکر سننے کے لیے دماغ کو تیار کرتے ہیں، مگر مصرع کہتا ہے ع

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اور وہ جوان کی نظم ہے، فاروقی صاحب، میں تو اسی کو ان کا شاہکار سمجھتا ہوں، ''ذوق وشوق''......

شمس الرحمن فاروقی: بالکل صحیح۔

نیر مسعود: اس میں یہ چیز بہت نمایاں ہے ع

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب''

یہ بالکل دوسرا او ہی تفکر والا آہنگ ہے، لیکن دوسرا مصرع ہے ع

گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عرفان صدیقی: واہ، کیا کہنے ہیں۔

نیر مسعود: تو یہ جو اقبال کی ایک بہت بڑی قوت ہے، یہی ان کے بیچارے مفسروں کو کم زور کر دیتی ہے کہ دونوں مصرعوں کو ایک ہی ڈور میں کس طرح پرویا جائے، کہ اس شعر کی عظمت آخر ہم دونوں میں سے کس کی بنا پر سمجھیں گے۔ بالعموم ہم یہ کرتے ہیں کہ کبھی تو اس پہلو پر زور دے رہے ہیں کہ صاحب یہ بہت عمدہ مفکرانہ شعر ہے اور اس کے شاعرانہ فنی پہلو کو فراموش کر گئے اور کبھی......اس سلسلے میں عرفان صاحب، کچھ دیر بعد میں شاید بھول جاؤں تو آپ یاد رکھئے گا، اس پر ذرا غور کرنا ہے، ان دونوں پہلوؤں کے سلسلے میں کہ خالص فن کی حیثیت سے اقبال......

شمس الرحمن فاروقی: ایک مشکل، میرا خیال ہے، اقبال کو سمجھنے میں یہ بھی ہے کہ وہ جو بہر حال انکی بڑی اور مشہور نظمیں ہیں، بڑی بھی اور مشہور بھی، مثلاً ''ذوق وشوق'' کا ذکر آیا، یا مثلاً ''مسجد قرطبہ''، اور جو نظمیں میرے خیال میں اتنی بڑی نہیں ہیں لیکن مشہور بہت ہوئیں مثلاً ''طلوع اسلام''، یا وہ نظمیں جن کے بعض بعض حصے واقعی شاعری ہیں، جیسے ''خضر راہ''، اور بعض جو اتنی اچھی نہیں ہیں، مثلاً ''شمع وشاعر''، اس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ بیچ کی نظم ہے۔ بہت اچھی ہے مگر اقبال کے بہترین کلام کے برابر نہیں ہے۔ ان سب نظموں میں ایک بات مجھ کو شروع ہی سے محسوس ہوتی رہی ہے کہ اس شخص کو کسی بھی غیر معمولی یا غیر فطری یا مافوق الفطری طاقت یا قوت یا ہستی سے خطاب کرنے میں جھجک نہیں ہوتی، وہ برابر کی گفتگو ان سے کرتا ہے۔ چاہے وہ شمع سے شاعر کی بات ہو رہی ہو، چاہے وہ ساحل دریا پر خضر سے، چاہے......

عرفان صدیقی: ......بندہ خدا سے بات کر رہا ہو۔

فاروقی: ......جو بھی ہو، اس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ انیسویں صدی میں لوگوں کے

ذہن میں شاعر کے متعلق ایک رومانی قسم کا تصور تھا کہ شاعر عام انسانوں کی فطرت سے بھی مافوق الفطرت چیزوں سے بھی ہم آہنگ ہوتے ہیں اوران سب میں ایک ہی قسم کی روح دوڑ رہی ہے جس کو برگساں نے vitality of life کہا تھا۔ یہ پھر وہی فکری معاملہ ہے کہ اس شخص کو کوئی حجاب نہیں ہے، خفتگان خاک سے بھی بات کرلیتا ہے، جگنو سے بھی بات کرلیتا ہے اور پہاڑ سے بھی، اور پیغمبرؑ سے بھی بات کرلیتا ہے، وہ اسی لیے کہ اس کے یہاں یہ سب ایک نظام حیات ہے جس میں ایک ہی روح دوڑ رہی ہے۔ اور یہی چیز اقبال کے کلام کو ایک غیر معمولی وسعت اور پہنائی بھی عطا کرتی ہے اوران کے مقابلے میں جولوگ سامنے آتے ہیں ان میں کسی کے یہاں وہ وسعت اور پہنائی نہیں ہے۔ اگر اس بات کو ہم فراموش کر جائیں تو پھر ہمیں مشکل ہوجائے گی کہ ان کی بڑائی کو کس طرح ظاہر کریں۔

عرفان صدیقی: صحیح ہے فاروقی صاحب، کہ جو وسعت اور پہنائی اور گہرائی اقبال کے یہاں ہے، اس کا انداز اپنے معاصروں سے تو الگ ہے ہی، پہلے والے شاعروں سے بھی الگ ہے۔ مثلاً آپ نے تخاطب کا معاملہ لیا۔ تو تخاطب تو ہماری شاعری میں بہت ملتا ہے، خدا سے بھی اور دوسروں سے بھی، لیکن اقبال کے یہاں دو فطری عناصر جس طرح بات کرتے ہیں ان کی شناخت اور ایک دوسرے سے گفتگو کا انداز ہی بالکل مختلف ہے۔ ظاہر ہے اس کی جڑیں بھی تفہیم سے اس طرح ملتی ہیں کہ ہمیں تلاش کرنا پڑے گا کہ اقبال نے ان عناصر میں گفتگو کا یہ approach کیوں اختیار کیا۔ تو یہ تفہیم کا مسئلہ بنتا ہے۔ میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں جو میرے ذہن میں نیر مسعود صاحب کی گفتگو سے آئی۔ انھوں نے بڑی اچھی بات کہی کہ اقبال نے ایک بڑا کام، یعنی شعری اور تخلیقی اعتبار سے بڑا کام، یہ کیا کہ بہت سے مروجہ الفاظ اور اصطلاحات بدل دیے، بلکہ کہیں کہیں الٹ دیے۔ مثلاً ''عشق'' ان کی بڑی زبردست اور بنیادی اور کلیدی اصطلاح ہے۔ لیکن یہ عشق بالکل وہ عشق نہیں ہے جو اس سے پہلے تھا۔ بلکہ ان

پر اعتراض بھی ہوا کہ صاحب آپ عشق کو اتنی فوقیت دیتے ہیں اور قرآنی فکر سے اس کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ قرآن میں تو عشق...... یعنی یہ لفظ ہی......

شمس الرحمن فاروقی: ہاں، لفظ ہی استعمال نہیں ہوا۔

عرفان صدیقی: نہیں ہوا ہے، اور مذہبی فکر میں عشق کو آپ پرانے حوالے سے پڑھنا چاہیں گے تو اقبال آپ پر کھلیں گے ہی نہیں۔ یہ بات درست کہی نیر مسعود صاحب نے کہ اقبال نے بہت سے شعری کلیدی الفاظ استعمال کیے لیکن ان میں ایک دوسرا رنگ اور دوسری معنویت بھر دی ہے۔ اس معنویت کی تلاش اقبال کی تفہیم کے سلسلے میں ایک بڑا کام ہے اور اسی وجہ سے میرے خیال میں فاروقی صاحب کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ اقبال کا آہنگ بھی خاص مختلف نظر آتا ہے؟ اقبال کی غزلیں جو ہیں وہ اپنی پیش رو غزلوں سے بالکل الگ ہیں اور نظمیں بھی۔ آپ فرما رہے تھے، نیر مسعود صاحب نے بھی ''ذوق وشوق'' کا حوالہ دیا، اس طرح کی نظمیں آپ کو اس وقت بھی نہیں ملتی تھی، آج بھی نہیں ملتیں۔ تو آہنگ کا یہ فرق جو ہے، اقبال کی شعری سچائی کو دریافت کرنے کے لیے اس کی بھی تلاش کرنا چاہیے کہ یہ فرق کیا ہے، اس کی وجہ سے ان کا شعر کیوں مختلف اور بہتر ہو جاتا ہے؟

شمس الرحمن فاروقی: عرفان صاحب، غزل کو تو میرے خیال میں اگلی نشست کے لیے اٹھا رکھتے ہیں، اس لیے کہ غزل کے بارے میں بہت کچھ کہنا ہے اور یہ کہ اقبال کی غزل، غزل ہے بھی کہ نہیں۔ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ابھی تو وہ پہلی والی بات سامنے رکھتے ہیں کہ جیسا کہ نیر صاحب نے کہا یہ عشق وغیرہ دسیوں لفظ ایسے ہیں۔ اس لیے ایک بات جو ہم اکثر بھول جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگرچہ اقبال کا جو عام لہجہ ہے وہ کلاسیکی شعرا سے ملتا جلتا ہے لیکن ایک معاملے میں وہ بالکل جدید ہیں، اور گویا پہلے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے یہ کام کیا ہے کہ الفاظ کو اپنے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اب اس پہلو پر لوگ غور نہیں کرتے کہ

اقبال نے ان کو جب اپنے معنی دیے ہیں تو جب تک ہم اقبال کے اپنے ذہن سے ان معنی کو نہ نکالیں بات نہیں بنتی۔ جب وہ کہتے ہیں ''اک دانش نورانی اک دانش برہانی'' تو غور کرنا پڑتا ہے کہ بھئی دانش تو دونوں جگہ کہہ رہے ہیں پھر یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ نورانی الگ ہوتی ہے، برہانی الگ ہوتی ہے۔ تو وہ کیا ہے، صرف تعقل اور تصوف ہے، یا کچھ اس سے بڑھ کر ہے یا کم ہے؟ مجھے اپنی بات پھر یاد آتی ہے، جیسے مان لیجیے کہ ''لالہ صحرا'' ہے۔ جب میں نے پہلی بار اس کو پڑھا اور اس وقت سے لے کر اب تک ہزاروں بار پڑھ چکا ہوں اور کتنی بار با آواز بلند پڑھ چکا ہوں۔

نیر مسعود: اس میں کوئی تلمیحی حوالہ نہیں ہے۔ وہ خالص ......

فاروقی: کوئی تلمیحی حوالہ نہیں ہے، لیکن اس لیے وہ نظم اپنی جگہ پر اس قدر مکمل بھی ہے اور مشکل بھی کہ اس میں تمام الفاظ کو اقبال نے خود اپنے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً ؎

یہ گنبد مینائی یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

اب ظاہر ہے کہ یہ گنبد مینائی آسمان ہے بھی اور نہیں بھی، اور یہ دشت جو ہے، یہ دشت حیات ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اس پر مجھے خوف ہے کہ بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے۔ لوگ یہی کہتے رہے ہیں کہ عشق ان کے یہاں علامت ہے اور شاہین ان کے یہاں ...... لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے جو روز مرہ کے الفاظ ہیں ان کو اپنے معنی میں استعمال کیا ہے، اسی لیے ان کی نظم مشکل ہوتی ہے۔

نیر مسعود: آپ نے بہت صحیح بات کہی، فاروقی صاحب۔ اسی ''لالۂ صحرائی'' میں جو شعر ہے، اس کا مطلب اب تک پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا ہے لیکن بہت زبردست شعر معلوم ہوتا ہے اور ابھی جیسا آپ نے ۔۔ معلوم ہوتا ہے اس کا ہر لفظ اقبال کسی الگ معنی میں، ذاتی معنی

میں استعمال کررہے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

یہ بالکل عام الفاظ ہیں۔

عرفان صدیقی: بظاہر بالکل کلاسیکی رنگ کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

نیر مسعود: جی ہاں۔ کوئی بھی تو معنی خیز لفظ نہیں، حتیٰ کہ بھنور کے لیے ''گرداب'' بھی نہیں استعمال کیا جو نسبتہً معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔ تو اس پر بھی ذرا گفتگو ہونا چاہئے۔ اقبال کا استعمال الفاظ۔

عرفان صدیقی: درست ہے۔ اس گفتگو میں یہ بالکل طے شدہ بات لگی کہ اقبال نے تمام شعری نظام میں جو تبدیلیاں کیں ان میں ایک بڑی تبدیلی الفاظ کو......

شمس الرحمن فاروقی: ......اپنے معنی میں استعمال کرنا......

عرفان صدیقی: ......اپنے طور پر برتنا ہے، پہلے وہ کسی بھی انداز میں استعمال ہوتے رہے ہوں۔

نیر مسعود: اچھا، اسی سے عرفان صاحب یہ بھی مان لینا چاہیے کہ اگر ایسا کوئی شاعر ہے جو لفظوں کو اپنے طور پر استعمال کر سکے تو زبان کا اس سے بڑا ماہر تو کوئی......

شمس الرحمن فاروقی: ......قطعی، بے شک۔

عرفان صدیقی: یقیناً وہ زبان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ زبان سے ان کا بڑا اجتہادی رشتہ تھا، بلکہ کہیں کہیں تو بڑا باغیانہ رشتہ ہو جاتا ہے۔

نیر مسعود: اور اقبال کو بڑا شاعر ماننے کا سوال ہی نہیں جب تک ہم پہلے یہ نہ تسلیم کر لیں کہ وہ زبان کے بڑے ماہر تھے۔ اگر ہم ان کو سب سے بڑا شاعر مان رہے ہیں تو انھیں سب سے بڑا ماہر زبان بھی مان رہے ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی: ہاں، ماننا پڑے گا۔

نیر مسعود: اور یہ حقیقت بھی تھی۔ ایک مثال بس، اس گفتگو کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ فاروقی صاحب، وہ جو سنائی کی زمین میں قصیدہ ہے......

شمس الرحمن فارقی: ہاں ع

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا

نیر مسعود: اسی میں مصرع ہے ع

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کے بیچ کھاتا ہے

چرا کر بیچ کھانا، کسی اور شاعر کی ہمت نہ پڑتی کہ اس شان کے قصیدے میں ایسا عامیانہ محاروہ استعمال کرے۔

شمس الرحمن فاروقی: اور وہ بھی کن چیزوں کے سلسلے میں۔

عرفان صدیقی: کن چیزوں کے سلسلے میں، واقعی ذرا سوچئے......

شمس الرحمن فاروقی: گلیم بوذر و دلق اویس و......

عرفان صدیقی: ......چادر زہرآ!

نیر مسعود: اس فعل کا گھٹیا پن اور چھچھور پن ظاہر کرنے کے لیے ایسا ہی عامیانہ محاورہ چاہیے تھا۔

شمس الرحمن فاروقی: یہ تو میری کر سکتے تھے کہ ؎

مت ان نمازیوں کو خانہ ساز دیں جانو
کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت

اسی نے کہا صاحب، اور اس کے بعد پھر اقبال نے کہا اور کوئی نہیں کہہ سکتا۔

عرفان صدیقی: درست ہے۔ شکریہ۔

تیسری نشست

عرفان صدیقی: پچھلی گفتگو کا سلسلہ اس پر ختم ہوا تھا کہ اقبال نے کس انداز میں پرانے شعری الفاظ کی اصطلاحوں کو اپنے طور پر ایک نئی معنویت دی ہے اور تقریباً بالکل معنی بدل کے استعمال کیا ہے۔ ایک شعر کے حوالے سے میں اس بات کو تھوڑا سا آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ یہ شعر خاص طور پر اس لیے پڑھ رہا ہوں کہ اقبال کی تفہیم سے تعلق رکھنے والے دونوں مسئلے اس میں سامنے آتے ہیں۔ یعنی تاریخی اور مذہبی حوالے اور الفاظ کی معنویت۔ شعر ہے ان کا ؂

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

ٹھیک ہے، معلوم ہے کہ انھوں نے قرآن کی دو تفسیروں کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہاں اگر آپ ''کتاب'' کو صرف قرآن کے معنوں میں سمجھیں گے تو شاید پورا شعر منکشف نہیں ہوگا۔ ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب، ظاہر ہے کہ قرآن آپ پر نہیں اتر سکتا۔ لگتا ہے کہ اس میں کچھ اور بات کہی گئی ہے۔ یہاں ''کتاب'' کا جو لفظ ہے وہ کسی وسیع تر معنویت کا حامل ہے اور اس کی تلاش کی جانی چاہیے۔

نیر مسعود: اس پر، عرفان صاحب یاد آ گیا۔ ایک بہت ذہین نوجوان عالم دین سے ایک مرتبہ گفتگو ہو رہی تھی۔ موضوع یہی نزول قرآن تھا۔ انھوں نے بہت عمدہ بات کہی کہ اکثر جب میں کلام پاک کی تلاوت کرتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں دو کتابیں پڑھ رہا ہوں۔

شمس الرحمن فاروقی: واہ!

نیر مسعود: ایک تو وہ جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی، اور ایک وہ جو خاص مجھ پر نازل ہو رہی ہے۔ تو یہ غالباً بلکہ یقیناً اقبال کا بھی تجربہ ہوگا۔ ان کے یہاں کتاب صرف قرآن نہیں بلکہ کچھ کتاب کائنات قسم کی چیز بھی ہے۔

شمس الرحمن فاروقی: ہاں۔اِس لیے کہ اس اصطلاح کو تو انھوں نے اور جگہ بھی برتا ہے۔

خدا تجھے کس طوفان سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

جب میں نے اس کو پہلی بار پڑھا تو سوچا یہ کیا بات ہے؟ کتاب خواں ہے، مگر صاحب کتاب نہیں؟ صاحب کتاب تو ہم سب لوگ ہیں۔تو جیسا کہ عرفان صاحب نے کہا کہ یہاں کتاب کی معنویت کو بدل کے دیکھنا ہوگا۔

نیر مسعود: جی ہاں''کہہ ڈالے قلندر نے اسرار......

شمس الرحمن فاروقی: ......کتاب آخر'' بالکل۔پھر پیغمبرؐ کے لیے خاص کر''الکتاب'' کہتا ہے۔تو ظاہر بات ہے، اب اس طرح کے الفاظ چونکہ شاعری میں پہلے سے بھی موجود تھے، پوری زبان ہی میں مستعمل ہیں، کتاب ہے، قلم ہے، لوح ہے۔تو اگر پڑھنے والا ان کو غور سے نہ پڑھے اور ان پر نگاہ نہ رکھے گا تو ممکن ہے کہ وہ ان سے یوں ہی گذر جائے۔

عرفان صدیقی: یا یہ کہ گم راہ ہوجائے۔اگر مروجہ معنوں میں لفظ کو سمجھ لیا تو مفہوم شعر تک رسائی تو در کنار، وہ بالکل دوسری سمت میں چلنا شروع کردے گا۔

شمس الرحمن فاروقی: ہاں ہاں، یہ بھی ہوسکتا ہے اور یہیں سے وہ بات نکلتی ہے جو پچھلی گفتگو میں آئی کہ جوان کا تخاطب ہے، مثلاً تخاطب جو اللہ سے ہے، یا جو تخاطب پیغمبرؐ سے ہے، اگر ہم یہ سمجھیں کہ یہ وہی تخاطب ہے جو عام طور پر دو شخصیتوں یا ہستیوں میں ہوتا ہے تو مشکل پڑ جائے گی۔مثلاً ۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے، یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اب اس میں اگر ایک طرح کا چڑ چڑا پن سمجھ لیا جائے کہ صاحب، دیکھیے یہ تو محض لڑکپن کا سا انداز ہے۔ اتنا ہی دیکھا جائے تو ظاہر ہے کہ ہم اس کی اصل معنویت سے محروم رہ جائیں گے۔ کیوں کہ اقبال کے کلام کی ایک طرح سے بنیادی لے، یا زیریں لہر یہی سوال ہیں کہ کائنات میں انسان کا کردار کیا ہے اور کائنات سے انسان کا رشتہ کیا ہے؟ اس کی ان کو بہت فکر ہے۔ اور وہ اس کے بارے میں بہت سوچتے ہیں اور بہت پوچھتے رہتے ہیں۔ خود سے بھی پوچھتے ہیں، اللہ سے بھی پوچھتے ہیں، تمام لوگوں سے پوچھتے ہیں، خود کائنات سے سوال کرتے ہیں، اور غالباً پہلی بار اتنا تجسس، اتنا سوال اور استفسار اردو شاعری میں نظر آتا ہے کیوں کہ پہلے زمانے میں تو گویا لوگوں کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہی تھا کہ بھئی انسان کی کیا وقعت ہے، کائنات میں اس کی کیا حیثیت ہے اور اللہ کہاں پر ہے، اور کائنات کہاں پر ہے، اور ہم کہاں پر ہیں۔ ان تمام رشتوں کو بھی ایک طرح سے upset کرنا......

عرفان صدیقی: ہاں جو roles پہلے defined تھے ان سب کو بدل دینا......

شمس الرحمن فاروقی: ......یا ان کو کم سے کم question کرنا۔

نیر مسعود: اب دیکھیے یہ جو گفتگو اس وقت ہو رہی ہے اس کا تعلق اقبال کی شاعری کے موضوع اور مشتملات اور نفس مضمون سے ہے، خالصتہً ان کے فن یا شعری حرفت سے نہیں ہے۔ ایک دلچسپ، یا افسوس ناک بات کہہ لیجیے، فاروقی صاحب تو شاید مشتعل ہو جائیں۔ میرا خیال ہے عرفان صاحب، آپ سے گفتگو کی جائے۔ اقبال کی شاعرانہ حیثیت کے علاوہ ایک دانشورانہ، مدبرانہ اور سیاسی حیثیت بھی تھی اور ایک معمار ملک بھی مانے جاتے ہیں۔ تو فاروقی ......نہیں فاروقی صاحب سے بات نہیں کر رہا ہوں۔

عرفان صدیقی: کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے کہ بات تو ان سے کی ہی جائے گی۔

نیر مسعود: ان کو غصہ آئے گا، اور پھر......

عرفان صدیقی: نہیں تو ان کو تھوڑا سا مشتعل کیا جائے گا۔

نیر مسعود: خاص طور پر ہندوستان کے نقاد، اور ان میں فاروقی صاحب یقیناً شامل ہیں، اگر اقبال کے فنی محاسن پر گفتگو کو مرکوز رکھتے ہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ گویا ایک منصوبے کے تحت ایسا کیا جا رہا ہے۔ اور اقبال کی جو اصل عظمت تھی، فکری عظمت، اس کو چھپانے کے لیے اس پر زور دیا جا رہا ہے کہ صاحب وہ ''شاعر بہت اچھے تھے''، یہ جو فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ ان کے موضوعات سے ہم کو مطلب نہیں ہے، اور فلسفی وہ بہت غیر معمولی قسم کے نہیں تھے اور ان سے بہتر فلسفی تو مثلاً رسل تھا، یہ سب ایک سازش ہے کہ اقبال کی جو اصل عظمت ہے اس کو چھپا کے بس یہ کہتے ہیں کہ وہ ''شاعر'' بہت عمدہ تھے۔ تو عمدہ شاعر تو ''داغ'' بھی تھے۔ اب اس پر غصہ ظاہر ہے آنا بھی چاہیے۔ اور یہ احتجاج صحیح بھی نہیں ہے۔

عرفان صدیقی: درست ہے، نیر صاحب، یہ تو طے شدہ بات ہے کہ ہم اقبال کو اس لیے اہم سمجھ رہے ہیں کہ وہ شاعر تھے۔ اب اگر وہ شاعر تھے تو شاعر کی حیثیت سے اور شاعری کے وسیلے سے انھوں نے کن کن موضوعات کو برتا، فکر کی کون کون سی تہیں ان کے یہاں ہیں......

شمس الرحمن فاروقی: ......اس پر بھی ہم بات کر رہے ہیں۔

عرفان صدیقی: جی ہاں، اس پر بھی ہم نے بات کی ہے، لیکن اگر وہ صرف فلسفی تھے، یا صرف دانشور تھے، یا صرف مفکر تھے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ادب کے پڑھنے والوں کا بہت زیادہ concern نہیں رہتے۔

شمس الرحمن فاروقی: نہیں، زیادہ کیا، بالکل نہیں۔

عرفان صدیقی: وہ بہت کچھ تھے لیکن شاعر بھی تھے اور ہم شاعر اقبال ہی کو پڑھیں گے اور

اس پر بات کریں گے۔

نیر مسعود: تو اب ہماری گفتگو اس موضوع پر ہے یعنی اقبال بہ حیثیت فن کار۔ فاروقی صاحب نے کہیں یا تو لکھا ہے یا کسی تقریر میں کہا تھا، بہر حال لوگ اس پر بہت...... تقریباً اچھل پڑے تھے کہ فاروقی صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ اقبال کے یہاں ابہام اور رعایت لفظی بھی ہے۔ یہ تو اقبال کے دامن پر گویا ایک دھبا لگایا جا رہا ہے۔ خیر، اب شاعری اور اپنے شعری اظہار کے سلسلے میں اقبال کے وہ دو فارسی شعر ہیں جن کا پڑھنا ناگزیر ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ؎

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

یعنی بہترین تکلم یا بہترین شاعری وہ ہے جس میں بات کو براہ راست نہ کہا جائے۔ دوسرا شعر ہے ؎

وقت برہنہ گفتن است، من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برم ہم نفسان خام را

کہ یہ تو کھل کر اور واشگاف انداز میں بات کہنے کا وقت ہے، میں کنایوں میں بات کر رہا ہوں، پھر بھلا بتاؤ میں اپنے ہم نفسوں کی کیا ہدایت کر پاؤں گا۔ یعنی وہ تو ہدایت اور رہنمائی کے مقصد کو بھی شاعرانہ اظہار پر قربان کیے ہوئے ہیں۔ اور اس پہلو سے اقبال کا جائزہ نہ لینا تو واقعی......

عرفان صدیقی: ایک ظلم سا ہوگا اقبال پر، تو اب شاعر اقبال کے مطالعے میں، فاروقی صاحب، ان کی غزلوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ format کے اعتبار سے اپنی شکل اور ہیئت کے اعتبار سے وہ غزلیں ہیں بھی اور بعض حیثیتوں سے شاید نہیں بھی ہیں۔ یہ ایک خاصی تکنیکی بحث ہو جائے گی۔ لہٰذا تھوڑی دیر کے لیے یہ مانتے ہوئے کہ ان میں اقبال کا جو ڈکشن ہے وہ دوسرے شاعروں کی غزلوں سے بہت مختلف ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر پڑھتا ہوں ؎

یہ زیر کہن کیا ہے، انبار خس و خاشاک
مشکل ہے گذر اس میں بے نالۂ آتش ناک

تو یہ نالہ تو نہیں ہے جو کوئی پرانا عاشق کرتا تھا۔

شمس الرحمن فاروقی: بلکہ یہ وہ نالہ بھی نہیں جو ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' میں ہے۔

عرفان صدیقی: وہ بھی نہیں ہے۔ تو یہ لگتا ہے کہ اقبال نے ان فن پاروں میں جنھیں ہم اپنی سہولت کی خاطر غزل کہہ رہے ہیں، ڈکشن کا اور ترسیل خیال کا ایک بالکل ہی نیا انداز اختیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

شمس الرحمن فاروقی: مجھے ایک تو اس سلسلے میں آپ سے اختلاف کرنا ہے کہ ''بال جبریل'' کی جن چیزوں پر نمبر پڑے ہوئے ہیں، ان کو آپ غزل کہہ رہے ہیں۔ غزل تو وہ نہیں ہیں۔ ان پر شاعر نے نمبر ڈالے ہیں اور نمبروں میں وہ بھی شامل ہے ۔

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا

عرفان صدیقی: نہیں میں سب کو نہیں کہہ رہا ہوں......

شمس الرحمن فاروقی: تو پھر اس میں تو کچھ بچتا ہی نہیں۔ جن چیزوں پر غزل کا عنوان ڈالا گیا ہے وہ تو ''ضرب کلیم'' میں ہیں اور وہ اس طرح کی چیزیں ہیں ۔

دریا میں موتی اے موج بے باک
ساحل کی سوغات خار و خس و خاک

''بال جبریل'' میں تمام نمبر لگے ہیں اور ان میں ایک نمبر ایسا ہے، پانچواں یا چھٹا جس میں چار شعر کسی اور زمین (مستعار کا، ناپائدار کا) اور ایک شعر، آخری کسی اور ردیف قافیے (کھٹک لازوال ہو، کسک لازوال ہو) میں ہے۔

عرفان صدیقی: وہ تو ظاہر ہے کہ غزل نہیں ہے، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ......بہت

دلچسپ بحث آپ نے چھیڑی ہے۔ آیئے اسے آگے بڑھائیں۔ مثلاً۔

اک دانش نورانی اک دانش برہانی

ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

آپ نے پڑھا تھا۔ یہ کیا ہے، مطلع ہے، یا نہیں ہے؟

شمس الرحمن فاروقی: پتہ نہیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا ہے۔

عرفان صدیقی: نہیں، تو آپ اسے کیا کہیے گا؟

شمس الرحمن فاروقی: اس پیکر خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری

میرے لیے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی

اب یہ شعر ہے کہ اس پر سر دھنیے آپ، آسمان چھو لیجیے۔ دیکھیے نہ، ایک مطلع لگا دینے کی وجہ سے اسے غزل کہنا......

نیر مسعود: اسے قصیدہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

عرفان صدیقی: نہیں میں نے اس لیے عرض کیا تھا کہ تکنیکی اعتبار سے ہم ان کو غزل کہنے پر اس لیے مجبور ہوتے ہیں کہ ان کا format غزل کا سا ہے۔

شمس الرحمن فاروقی: قصیدے کا format کیوں نہیں مانتے ہیں اس کو آپ؟

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل

کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

بالکل قصیدے کا format ہے۔

عرفان صدیقی: نہیں، قصیدے کا format تو......اچھا تو مجھے یہ بتایئے۔

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں

خدا مجھے نفسِ جبریل دے تو کہوں

توصاحب اس میں ''قصیدیت'' کہاں آپ کو ملے گی؟

شمس الرحمن فاروقی: یہی تو مشکل ہے اب......

عرفان صدیقی: یہی میں عرض کر رہا ہوں۔

شمس الرحمن فاروقی: میں بھی یہی عرض کر رہا ہوں۔ کہ اقبال شاید یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو یہ قصیدے اور غزل دونوں سے ماورا......

عرفان صدیقی: ......کوئی چیز ہے۔ لیکن فی الحال ہم ان کو غزل کہہ لیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان فن پاروں کے ڈکشن اور ترسیل خیال کے لحاظ سے آپ ان کی معنویت کو کس طرح دیکھتے ہیں، اور ان اشعار کی تفہیم کو نظموں کی تفہیم سے کس طرح مختلف پاتے ہیں؟

نیر مسعود: ایک سوال میں بھی اس میں جوڑ دوں۔ فاروقی صاحب، اقبال کا کلام اپنے آہنگ کی وجہ سے فوراً پہچان میں آتا ہے، لیکن اس آہنگ کو بیان کس طرح کیا جائے؟

شمس الرحمن فاروقی: پہلے میرا خیال ہے، پہلی بات کو لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے جس بنا پر لوگوں نے نمبروں والے کلام کو غزل کہا وہ یہ ہے کہ اس میں معنی سے زیادہ کیفیت کی فراوانی ہے اور اس کے معنی بیان کرنا مشکل بھی ہے اس لیے کہ اس میں فکر کا ویسا غلبہ نہیں ہے جیسا ہم اقبال کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں، اور یقیناً یہ ایک طرح کا کلام ہے۔

محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی
شہید محبت نہ کافر نہ غازی
یہ جو ہرا گر کار فرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی

ان میں اس قدر......اس کو سرمستی کہیے، سرشاری کہیے، جو بھی کہیے، لیکن ایک ایسی کیفیت کی فراوانی ہے کہ شعر بہرحال آپ کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر یہ کہیے کہ ان میں مثلاً قصیدے کا وہ

رنگ ہے، جو منوچہری کے چھوٹی بحر والے قصیدوں......

نیر مسعود: ہاں، ع

سلام علیٰ دار ام الکواعب

شمس الرحمن فاروقی: ....اس قسم کے کلام سے مقابلہ کیجیے، تو بات اس لیے نہیں بنتی کہ ع

سلام علیٰ دار ام الکواعب

قسم کے جو چھوٹی بحر والے قصیدے ہیں، ان میں تغزل تو بہت ہے، لیکن ان میں آہنگ کا وہ سب پن نہیں ہے جو اقبال کے یہاں ہے کہ......

نیر مسعود: ......لفظ بہتے چلے جا رہے ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی: جی ہاں اور یہ جو نئی نسل کے لوگ اقبال کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے، اگر ان سے کہا جائے کہ اس کو غزل یا قصیدہ یا نظم سمجھ کر نہ پڑھو، بس کلام سمجھ کر پڑھو تو وہ لوگ زیادہ متاثر ہوں گے، کیوں کہ وہ توقعات جو ہمیں عام غزل، داغ بلکہ غالب کی بھی غزل سے ہیں وہ اس کلام سے پوری نہیں ہوتیں اور اس میں معنی بیان کرنے کے وہ مراحل نہیں ہیں جو مثلاً ''خضر راہ'' میں یا دوسری مشکل نظموں میں ہم دیکھتے ہیں بلکہ ان کی جگہ پر ایک سرمستی ہے۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ کیا یہ سرشاری اور سرمستی کی کیفیت اور جگہ نہیں ہے؟ تو اس کا جواب میں دینا چاہتا ہوں کہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اس لیے کہ اور جگہوں پر معنی بھی کثرت سے ہیں اور یہاں معنی کم ہیں۔ مثلاً سر راس مسعود پر جو نظم انھوں نے لکھی تھی، اس کو پڑھیے آپ۔ پہلا بند جو ہے وہ تو مرثیہ ہے گویا، سر راس مسعود کے بارے میں۔ دوسرے میں بہت فکری رنگ ہے، مگر آہنگ دونوں میں بہت ہی ٹھہرا ہوا اور گمبھیر ہے۔ تو اقبال کے یہاں آہنگ کا تنوع اس طرح ہے، کہ کہیں معنی کی کثرت ہے، پھر بھی آہنگ بہت پر شکوہ ہے۔ بعض جگہ معنی کی

کثرت نہیں ہے لیکن آہنگ میں روانی بھی نہیں ہے اور جو یہ پوچھا جائے کہ ایسا کیوں ہے، تو صاحب اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔

عرفان صدیقی: اس کا جواب، فاروقی صاحب، میرے خیال میں کسی کے پاس نہیں ہے، جیسے اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے کہ وہ فن پارے کیا ہیں؟ انھیں قصیدہ نہیں کہہ سکتے، غزل نہیں کہہ سکتے، لیکن ان میں آہنگ کی فراوانی ہے اور یہ decode کرنا بھی مشکل ہے کہ وہ فراوانی کثرت مفہوم کی بنا پر ہے یا الفاظ کے نئے پن کی بنا پر ہے، یا خود الفاظ کے اپنے آہنگ کی بنا پر ہے۔

نیر مسعود: اس کی بہت اچھی مثال ''ساقی نامہ'' ہے۔ روانی اور تسلسل بھی ہے، فکر اور کثرت معنی بھی ہے اور الفاظ کی غنائیت بھی ہے۔ لیکن یہ وہ مسئلہ ہے جو ہم لوگوں کو حل کرنا بھی نہیں ہے کہ یہ آہنگ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ رہ گیا یہ طریقہ کہ ایک لفظ کو، جیسے کسی نے کہا بھی ہے کہ ع

نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

والی نظم میں کچھ حرفوں......

شمس الرحمن فاروقی: ارے وہ کہاں، ''دریا کے خموش، کہسار کے سبز پوش۔'' ش ش اور وہ......

عرفان صدیقی: بس اس آہنگ سے ہم لطف اندوز بھی ہوں۔ اگر اتنا ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں تفہیم کا ہمارا ایک مرحلہ سر ہو جائے گا۔

شمس الرحمن فاروقی: ہاں، بس۔

نیر مسعود: بس، اتنا کافی ہے۔

عرفان صدیقی: بہت، بہت شکریہ۔

(بہ شکریہ ماہنامہ شب خون، الہ آباد)

☆☆☆

عرفان صدیقی سے ایک مکالمہ

(شکیل صدیقی / ہندی سے ترجمہ: رفعت عزمی)

ش۔ ص: غزلیں کہنا آپ نے کب سے شروع کیا؟

ع۔ص: بہت عرصہ ہوگیا۔ ٹھیک تو یاد نہیں بس اتنا تو یاد ہے کہ ۵۶۔۱۹۵۵ء میں میری غزلیں میگزینوں میں شائع ہونے لگی تھیں۔ جیسے تحریک، تلاش، محور اور سجاد ظہیر کی ادارت میں نکلنے والے ہفتہ وار حیات میں۔

ش۔ص: تحریک داہنے بازو کے انتہا پسند نظریات کا جریدہ تھا جب کہ حیات کمیونسٹ؟

ع۔ص: میں سیاسی نظریات کے پیچھے بھاگنے والا آدمی نہیں ہوں جو مجھے صحیح لگتا ہے وہ کہتا ہوں۔

ش۔ص: یوں تو آپ نے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی لیکن ابتدا ہی سے آپ کی پسندیدہ اور خاص صنف غزل ہی رہی جبکہ آپ کے زیادہ تر ہم عصر غزل کے ساتھ ہی نظم میں بھی اپنے جوہر دکھاتے رہے؟

ع۔ ص: آپ درست فرماتے ہیں۔ نظمیں تو میں نے بھی کہی ہیں لیکن غزل پر مجھے زیادہ اعتماد ہے۔ بہت پیارا لگتا ہے مجھے یہ میڈیم۔ طاقتور، سکت اور امکانات سے بھرا ہوا۔ اپنے بیشتر شعری اور سماجی تجربوں کے اظہار کے لئے مجھے یہ میڈیم کافی لگتا ہے، یہ میڈیم مجھے مطمئن کرتا ہے، بے چین بھی کرتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کے بیان کا یہ بہترین ذریعہ ہے اس میں پیچیدہ سے پیچیدہ باتیں اور زندگی کا بڑے سے بڑا تجربہ اختصار میں خوبصورتی سے کہا جاسکتا ہے۔ پھر ذریعہ

توشاعراپنی صلاحیت Creative Urge اورفکری سطح کے حساب سے منتخب کرتا ہے۔

ش۔ص: لیکن غزل پرتو محدودامکانات کی صنف کے طور پرالزام تراشی ہوتی رہی ہے۔

ع۔ص: میں ان الزامات کودرست نہیں مانتا۔محدودیت تواس ذریعہ میں ہے۔غزل کی بھی کچھ حدیں ہوسکتی ہیں لیکن جیسا کہ پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ میں اسے لامحدودامکانات کی صنف کے طور پر دیکھتا ہوں اور قبول کرتا ہوں۔زندگی کا کون سا تجربہ اس میں بیان نہیں ہوا ہے! آپ قدیم زمانے کی غزل سے لیکرآج تک کی غزل پرنظرڈالتے جایئے۔

ش۔ص: غزل پرموضوعات کی یکسانیت اور دہرانے کے الزامات بھی لگتے ہیں۔ ہندی بولنے والوں کا یہ عام نظریہ ہے کہ غزل میں محبت،حسن اورتعیش کے تجربوں کی کثرت ہے؟

ع۔ص: غلط ہے یہ نظریہ۔موضوعات کودہرانے کاالزام بھی بے بنیاد ہے۔غزل تجربوں کے تنوع سے بھری پڑی ہے۔آپ اردوغزل کی تاریخ پرنظردوڑایئے عظیم شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے اورکوئی شاعرنقل یاتقلید سے عظیم نہیں ہوتا ہے اس کا اپنا تخلیقی تجربہ اور جو ہر ہوتا ہے ہرشاعراپنے وقت کی حقیقتوں کو بیان کرتا ہے۔اس کے اپنے شعری تجربے ہوتے ہیں ہاں بڑا شاعراپنی زبان اورعلامتیں خودوضع کرتا ہے۔میر،غالب،سودا،درد،نظیر،ولی،اقبال،حسرت، عزیز،یگانہ کی غزل میں اگرلوگوں کوفرق نظرنہیں آتا تواس میں غزل کا کوئی جرم نہیں۔آپ دیکھئے تجربوں کے کتنے رنگ ہیں۔فکر کی کتنی سطحیں ہیں۔اتنا میں ضرورکہوں گا کہ غزل کو کچھ لوگوں نے Stereotype Music System بنادیا ہے۔اس سے غزل کا وقار مجروح ہوا ہے اورغزل کی بدنامی بھی ہوئی ہے ہاں مقبولیت میں اضافہ ضرور ہوا ہے باجوداس کے اصلی غزل اورنقلی غزل کی پہچان مشکل نہیں ہے۔غزل توخیرنقلی شاعرکوبرداشت ہی نہیں کرسکتی۔

ش۔ ص: لیکن خوداردوغزل کے کچھ دانشوروں یہاں تک کہ شاعروں نے بھی غزل پر الزامات لگائے ہیں جگر کا وہ شعرتوبہت مشہور ہے کہ''شاعرنہیں ہے وہ غزل خواں ہے آجکل'' یا

کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنف کہا؟

ع.ص: آپ بجا فرما رہے ہیں۔ غزل پر ایسا برا وقت بھی آیا ہے خاص کر بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ترقی پسند تحریک کے عروج کے دنوں میں نظم کی بڑی دھوم تھی ان دنوں لیکن غزل ان تاریک دنوں میں بھی پوری آن بان کے ساتھ پیش رفت کرتی رہی۔ خود حالی نے جو اصلاحی تحریک میں پیش پیش تھے بہت اچھی غزلیں کہیں۔ اقبال بھی نشاۃ الثانیہ کے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے بہت اہم غزلیں کہیں۔ میں اصلاحی یا ترقی پسند تحریک کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کرتا۔ ہماری ادبی اور سماجی زندگی میں ان کا بڑا رول ہے۔ میں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتا کہ ۱۹ ویں صدی کے دوسرے نصف یا ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد غزل پر جاگیردارانہ رجحانات کے دباؤ میں اضافہ ہوگیا تھا۔ مبالغہ اور لفظوں کی تزئین کاری بڑھ گئی تھی چند خاص طرح کے موضوعات بہت مقبول ہوگئے تھے۔ ۲۰ ویں صدی ہماری زندگی میں نئی بیداری لے کر آئی اسے ہم تبدیلی کا شعور بھی کہہ سکتے ہیں۔ قومی تحریک کے انکھوے پھوٹ رہے تھے۔ فرانس کی Anti Romantic تحریک کا بھی کچھ اثر رہا بہر حال حالؔی اور ان کے کچھ ہم عصروں نے ادب کے سماجی مقصد پر زور دیا پھر بھی غزل کا مقام اس تحریک میں بھی قائم رہا۔ اس نے تبدیلی کے شعور سے اپنے کو ہم آہنگ کر لیا۔ کلیم الدین احمد صاحب نے اسے نیم وحشی صنف شاید اس لئے کہا کیونکہ اس میں خیال کی وحدت نہیں ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ غزل کی اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے کہ اس میں ایک مکمل آہنگ ہوتا ہے۔ عام طور پر ہر غزل کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے غزل ایک شریف صنف ہے۔ نیم وحشی سماج میں وہ پنپ ہی نہیں سکتی۔

ش.ص: اور ترقی پسند تحریک کے دور میں......؟

ع.ص: جہاں تک ترقی پسند تحریک کا سوال ہے۔ تو اس دور میں بھی غزل نے خوب ترقی کی۔ آپ دیکھیں کہ نظم کو اہمیت ضرور حاصل ہوگئی تھی۔ بہت اچھی نظمیں بھی کہی گئیں اس دور میں۔

بیرونی تجربوں، سماجی حقیقت نگاری اور مقصدیت کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ تبدیلیوں کا زمانہ تھا وہ لیکن فرد کی تنہائی کا احساس اور اس کی اندرونی کیفیتیں اس دور کی تخلیقات میں بھی اپنا کردار ادا کر رہی تھیں۔ ن۔م راشد جیسا Modern Sensibility کا اتنا بڑا شاعر اسی دور کی پیداوار ہے۔ پھر یہ دیکھئے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ زیادہ تر شاعروں نے غزل کی ترقی میں بہت اہم رول ادا کیا۔ غزل تجربات اور احساس کی ایک نئی دنیا سے روشناس ہوئی۔ اگر اس تحریک سے جڑے ہوئے شاعروں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو فراقؔ، فیضؔ، مجروحؔ، مجاز، جذبی، مخدوم جانثار اختر ......سب کے سب غزل کے اچھے بلکہ بہت اہم شاعر ہیں...... ہاں دیکھئے غلام ربانی تاباں اور احمد ندیم قاسمی کے نام تو چھوٹے جا رہے ہیں۔ نام تو اور بھی چھوٹے ہوں گے۔

ش.ص: اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ غزل پر روایت پرستی کا الزام پوری طرح مناسب نہیں ہے۔

ع.ص: دیکھئے شکیل صاحب ......روایت کو پوری طرح جانے بغیر تو اچھی غزل کہی ہی نہیں جا سکتی اس لئے تھوڑی بہت تو روایت پرستی رہے گی ہی۔ آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ آج کے زیادہ تر اہم شاعروں پر کلاسیکی غزل کا گہرا اثر ہے اصل چیز تو Diction ہے۔ وقت بدل رہا ہے۔ زندگی بدل رہی ہے تو پھر غزل کیوں نہیں بدلے گی۔ یہ تو زندگی سے وابستہ صنف ہے۔ آپ دیکھئے نہ کہ غزل کیا سے کیا ہوگئی۔ اب فیض ہی کو لیجئے۔ روایتی علامتوں سے انھوں نے بالکل نئے معانی پیدا کئے ہیں۔ ان کی غزلوں میں روایتی علامتوں کو نیا Relavance ملا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ نئی زبان، تکنیک یا محاورے کی تلاش نہیں ہوئی ہیئت اور مواد کے بھی کئی لوگوں نے کامیاب تجربے کئے ہیں۔

ش.ص: تو کیا غزلوں میں ہیئت کے تجربے ممکن ہیں۔

ع.ص: کیوں نہیں۔ لیکن بہت زیادہ تجربوں کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا بندھا ٹکا سانچا

ہے۔اس کی اپنی شرطیں ہیں غزل یا تو غزل ہے یا پھر غزل نہیں ہے۔کوئی درمیانی صورت اس میں نظر نہیں آتی۔وزن، ردیف اور قافیہ کی شرطوں کو تو تسلیم کرنا ہوگا۔

ش۔ص: آزاد غزل کے جو تجربے روایتی ہیئت سے باہر جانے کے ہوئے۔؟

ع۔ ص: بے معنی تھے۔آزاد نظم یا نثری نظم جیسے تجربے غزل میں کامیاب نہیں ہو سکتے غزل سے اس طرح کے تجربات کا تقاضا بھی نہیں کرنا چاہئے۔

ش۔ص: آج جو غزل کہی جارہی ہے یا یوں کہیں کہ موجودہ دور کی غزل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ع۔ص: آج جو غزل کہی جارہی ہے وہ مجھے مطمئن کرتی ہے۔بڑی بات یہ ہے کہ Original Diction سامنے آتے ہیں اور ہر شاعر کا روایت سے بھی بہت مضبوط رشتہ ہے سچ پوچھئے تو آج کی غزل نے امکانات کی نئی راہیں دکھائی ہیں نئی امیدیں جگائی ہیں۔کئی باکمال شاعر اس دور کو حاصل ہوئے ہیں کچھ نے اپنی الگ انفرادیت دریافت کرلی ہے اس دور میں کچھ پانے کی کوشش میں غزل بہت Rich ہوئی ہے۔ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں کی مثالیں لے سکتے ہیں۔زندگی کی غزل کا رشتہ آج بھی بہت مضبوط ہے تخلیقی اور تنقیدی دونوں سطحوں پر آج کے ٹوٹے شکست خوردہ دربدر اور پریشاں حال آدمی کے ساتھ غزل کے مکالمہ میں زیادہ اپنائیت شامل ہوئی ہے۔تنہائی کا شکار ہوتی ہوئی زندگی میں اس کی حصہ داری بڑھی ہے ظلم، نا انصافی اور جذباتی بے حرمتی کے خلاف ہر موقع پر اس نے اپنا احتجاج درج کرایا ہے۔انسانی تکلیف کا بیان کیا ہے۔اس دور میں انسان کی خارجی و داخلی دنیا میں بہت کچھ واقع ہوا ہے۔ ان سب کی بازگشت غزل میں سنی جا سکتی ہے۔

ش۔ص: کہیں ایسا ترقی پسند تحریک کے اثر کی وجہ سے تو نہیں ہے؟

ع۔ص: قطعی نہیں۔احتجاجی غزل کی بہت پرانی روایت ہے۔کیا فارسی غزل، کیا اردو غزل۔

میر اور غالب کی غزلیں اسکی بہترین مثال ہیں۔اور بھی بہت سے شاعر ہیں۔غالب اور ۱۹۴۷ء کے درمیان ہی جنھوں نے غزل کو احتجاج کا محاورہ بنایا۔مثلاً یگانہ چنگیزی۔بعد کے شاعروں کا ذکر تو آپ چھوڑ ہی دیجئے۔ہاں پاکستان کی غزل کا تذکرہ ضروری لگتا ہے۔کیوں کہ وہاں احتجاج اور عصری حقیقتوں کے بیان کے لئے نئی علامتیں تلاش کی گئیں۔نئے محاورے ڈھونڈے گئے۔

ش۔ص: ہندی غزلیں بھی آپ نے سنی اور پڑھی ہوں گی۔غزل کی اس روایت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

ع۔ص: جی ہاں۔سنی بھی ہیں۔پڑھی بھی ہیں لیکن کم از کم جتنا میں نے سنا اور سمجھا ہے اس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہندی غزل اردو غزل کے قریب آرہی ہے۔روایت سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کچھ کمزوری جھلکتی ہے۔سانچے کچھ خام معلوم ہوتے ہیں۔تجربے بہت پیارے اور متاثر کرنے والے ہیں۔کچھ لوگ چونکاتے ہیں جیسے راجیش ریڈی پراگ وغیرہ خاص طور پر دیشنت کمار مجھے بہت پسند ہیں لیکن ایک بات ضرور کہہ دوں کہ غزل کہنا بہت مشکل کام ہے بہت ظالم میڈم ہے یہ۔پھر ہندی میں غزل کی پرانی روایت بھی نہیں رہی۔مشکل سے ۵۰۔۶۰ سال کی اس کی تاریخ ہے اس کے علاوہ ہندی میں نہایت بلند درجے کی شاعری ہوئی ہے۔میں اسے انسانی وقار کی شاعری کہتا ہوں۔اس کے آگے ہندی غزل ٹھہر پائے گی، مجھے نہیں لگتا۔غزل کی ہیئت مقبول ہو رہی ہے۔مجھے یہ دیکھ کر خوش محسوس ہوتی ہے اور غزل پر اعتماد بڑھتا ہے۔

ش۔ص: غزل کا مستقبل آپ کو کیسا لگتا ہے؟

ع۔ص: میں غزل کے مستقبل کے بارے میں مطمئن ہوں مجھے یقین ہے کہ غزل باقی رہے گی کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ آدمیت باقی رہے گی۔غزل نے ہمیشہ ہی اعلا اصولوں کی طرفداری کی۔میں تو کہتا ہوں کہ اگر غزل زندہ رہتی ہے تو زندگی کی اعلا قدریں اور اعلا

جذبے بھی زندہ رہیں گے۔

ش۔ص: لیکن جدید ٹکنالوجی اور الکٹرانک میڈیا سے جو خطرے درپیش ہیں انھیں دیکھتے ہوئے آپ غزل کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ع۔ص: اس سے غزل کی ضرورت اور معنویت میں اضافہ ہوا ہے آگے مزید اضافہ ہوگا۔ جدید ٹکنالوجی انسان کو مطمئن نہیں کر پا رہی ہے۔ غزل میں اس برے وقت میں ناامیدی اور بے چینی کے لمحوں میں انسان کو سکون پہونچانے کی طاقت ہے پھر آپ یہ بھی دیکھئے کہ آج کے دور میں Information Explosion ہوا ہے اور جدیدیت کے طور طریقوں نے جو ضرورتیں بتائی ہیں غزل ان تقاضوں پر کھری اترتی ہے۔ کم الفاظ میں یعنی اختصار میں بات کرنے کی ضرورت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ غزل کے ایک شعر میں بڑی سے بڑی بات پر اثر طریقے سے کہی جا سکتی ہے اس کا مختصر ہونا Modern Message کی جان ہے۔ غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ الکٹرانک میڈیا نے غزل کی ہیئت کو بہت مقبول بنایا ہے غزل باقی رہے گی کیوں کہ زندگی باقی رہے گی۔ وہ ہمارے Thought Process کا حصہ بن چکی ہے، وہ ہمارے مزاج اور خمیر میں رچ بس گئی ہے۔ وہ ہماری ثقافت کا ایک وصف بن گئی ہے۔

ش۔ص: اور سماجی برتاؤ کا حصہ بھی؟

ع۔ص: یقیناً اپنی بات میں اثر پیدا کرنے کے لئے لیڈر، دانشور، اور ناقدین سبھی غزل کے شعروں کا سہارا لیتے ہیں۔ میں نے کہا نا کہ غزل ہماری ثقافت کا حصہ بن چکی ہے۔

ش۔ص: معاصر اردو غزل کے نمایندہ نام بتانے کی زحمت فرمائیں؟

ع۔ص: بھائی یہ ناموں کا چکر مناسب نہیں کس کا نام لوں اور کس کا چھوڑ دوں۔ آپ تو سب جانتے ہیں۔

ش۔ص: ہندی قارئین کو نظر میں رکھ کر سوال کر رہا ہوں؟

ع۔ص: جہاں تک Original Diction کا سوال ہے تو سب سے پہلے میں منیر نیازی کا نام لوں گا۔ظفر اقبال نے غزلوں کو وسعت دی ہے۔ناصر کاظمی، احمد مشتاق، مجید امجد، شکیب جلالی بہت اہم شاعر ہیں۔بے گھری اور فسادات کا المیہ، اقتدار کی شکست، ظلم و جبر کے خلاف انسان کے کمزور ہوتے جانے کے احساس کے عکس ان کی غزلوں میں پورے تاثر کے ساتھ ملیں گے۔

ہندوستان میں بانی، مظہر امام، خلیل الرحمٰن اعظمی، زیب غوری، شہر یار جیسے باکمال شاعر ہیں جن کی بنیاد کلاسیکیت پر ہے جن کے یہاں رنگوں کا تصور اور معنی کی تہہ داری ہے۔ ندا فاضلی کے یہاں Diction کا انوکھا پن ہے تو زبیر رضوی کے یہاں غزلوں سے غائب ہوتی سرشاری، نشاط اور الھڑ پن کی کیفیتیں بچی ہوئی ہیں۔اسعد بدایونی اپنے ہم عصروں میں مخصوص اور توانا شاعر ہیں تو آشفتہ چنگیزی، شارق کیفی، وقار ناصری اور انیس اشفاق نئی نسل کے اچھے شاعر ہیں۔غزل کو ایک الگ طرح کا رنگ، احساس اور کیفیت دینے کے لئے ساقی فاروقی، شہزاد احمد اور احمد جاوید کا نام بھی لیا جانا چاہئے۔

ش۔ص: معاف کیجئے گا۔ایک سوال جو مجھے پہلے کرنا چاہئے تھا وہ اس جگہ پوچھنا پڑ رہا ہے وہ یہ کہ اردو ہندی کے علاوہ برصغیر کی دوسری زبانوں میں بھی غزلیں کہی جا رہی ہیں جیسے پنجابی، سندھی، گجراتی، بنگلہ، سرائیکی، پشتو وغیرہ۔یاد آتا ہے کہ میں نے سنسکرت، بھوجپوری اور اودھی زبانوں میں بھی غزلیں پڑھی ہیں۔

ع۔ص: مطعِ کلام کے لئے معافی چاہتا ہوں دیکھئے شکیل صدیقی صاحب میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ غزل اظہار کا اتنا پیارا اور طاقتور ذریعہ ہے کہ اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہونا ہی ہے۔

ش۔ع: اردو کی بین اقوامی توسیع کے ساتھ غزل بھی دنیا کے کئی ممالک میں کہی جا رہی ہے اس کے باوجود غزل کا اہم خطہ ہندوستان اور پاکستان ہی ہے۔ان دونوں ملکوں میں جو غزل کہی

جارہی ہے اس میں کوئی فرق آپ کو نظر آتا ہے؟

ع۔ص: فرق تو ہے۔ بہت سے تجربات دونوں جگہ مختلف ہیں Approach کا بھی فرق ہے بہت سی چیزوں کے بارے میں۔ وہاں علامتیں زیادہ استعمال ہوئیں استعاروں کے ذریعہ بات کہی گئی۔ فرق مواد کا بھی ہے۔ زبان کی سطح پر کچھ اختلافات ہیں۔ ۷۰۔۱۹۶۵ء کے بعد یہ فرق زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ اسلامی تواریخ کی علامتیں وہاں زیادہ رائج ہوئیں جبکہ ہمارے یہاں کربلا اور ہندو Mythology کی علامتوں کا زیادہ استعمال ہوا ہے۔ وہاں الفاظ میں تبدیلی جلدی جلدی ظاہر ہوئی ہے۔ ہماری شاعری شناخت کی شاعری ہے زیادہ کشادہ اور زیادہ فکری۔ حالات کا فرق غزل پر تو اثر انداز ہوگا ہی۔ اس وقت ہندوستان میں زیادہ اہم شاعری ہو رہی ہے۔ خاص طور پر ہمارے یہاں نوجوان اچھی شاعری کر رہے ہیں وہ شاعری چونکاتی ہے۔

ش۔ص: آپ کی غزلوں میں مزاحمت کے جو اتنے تیکھے پرتو ہیں تو یہ کس احساس کی دین ہیں؟

ع۔ص: دراصل غزل کہنے کو محض میں جذباتی یا قدرتی عمل نہیں تسلیم کرتا۔ یہ باخبر یا یوں کہیں کہ یہ جذبے اور بیداری، احساس اور بیداری بھی کہہ سکتے ہیں سے جاری وساری ہونے والا تخلیقی عمل ہے جس میں ہمارے خیالات و تجربات کا بھی دخل ہوتا ہے۔ میں فکر اور جذبے کی شاعری کو الگ کر کے نہیں دیکھتا اچھی شاعری کے لئے دونوں ضروری ہیں۔ میرے چاروں طرف جو کچھ ہو رہا ہے جس طرح غیر انسانی رویے تیز ہو رہے ہیں۔ خوف اور جبر میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اقدار اور اصول ٹوٹ رہے ہیں، میں ان سب سے متاثر ہوتا ہوں۔ میری شاعری پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ میں بھی ان سب پر اپنا ردعمل ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے غزل میرے لئے ردعمل کا، لوگوں سے مکالمہ قائم کرنے کا اور خراب حالات میں مہذبانہ مداخلت کا موثر Tool ہے۔ میں سوچتا ہوں، محسوس کرتا ہوں اس لئے احتجاج کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ غزل اعلا قدروں اور اعلا جذبوں کے دفاع کی فکر سے لازمی طور سے وابستہ ہوئی ہے۔

ش۔ص: غزل کو ترقی پسند تحریک اور جدیدیت دونوں تحریکوں نے متاثر کیا ہے۔آپ ان اثرات کے فرق کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

ع۔ص: سن ۱۹۳۶ء کے بعد غزل میں شامل ہوئی فکر، موضوعات اور زبان کا فرق ترقی پسند تحریک کے اثر کی شناخت ہے، روایتی ہیئت اور علامتوں میں عصری حقیقتوں کی تصویر کشی ہوئی۔ زندگی کی نئی تعمیر میں اس کا کردار زیادہ وسیع ہوا۔ جبکہ جدیدیت کے رجحان کا زیادہ اثر روایت سے آزاد ہونے کی چھٹ پٹاہٹ اور شخصی اصراروں کی شدت میں نظر آیا۔ محرومی، تنہائی اور شکست و ریخت کے جذبات گھرے ہوئے اسے ہم ٹوٹے ہوئے، رشتوں کی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ سانچوں کی داخلی شناخت کا رجحان تیز ہوا۔ صنعت کاری اور شہر کاری نے آدمی کی زندگی میں جو بیگانگی بھر دی، بے چہرگی کا جو خطرہ پیدا ہوا جدیدیت پسند شاعروں کی توجہ اس طرف زیادہ ہوئی۔ داخلی کیفیت کے بیان پر زور زیادہ ہوا۔ اس سے اپنے وقت کے آدمی سے غزل کا مکالمہ کچھ کمزور بھی پڑا۔

ش۔ص: اس دور یا اس رجحان کی غزل میں ثقافتی ٹوٹ پھوٹ کا احساس اور مذہبیت کی طرف جانے کا میلان بھی دکھائی پڑا۔

ع۔ص: یہ تو ہوگا ہی۔ جب Ideologies سے یقین اٹھ رہا ہو۔ آدمی اپنے کو کمزور اور تنہا محسوس کر رہا ہو تو مذہبی رجحانات زور پکڑیں گے ہی......

ش۔ص: ہم عصر جد و جہد کے ساتھ بیداری اور احساس کی سطح پر ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے بھی تو ایسا ہو سکتا ہے؟

ع۔ص: ضرور ہو سکتا ہے لہٰذا میں اپنے وقت کی تمام ضروری جد و جہد سے اپنے کو ہم آہنگ محسوس کرتا ہوں۔

ش۔ص: ادھر کچھ مدت سے غزل میں اسلامی علامتوں کے استعمال کے رجحان میں اضافہ ہوا

ہے اس سے غزل کے روایتی سیکولرازم کی شبیہہ کو کیا نقصان نہیں پہونچتا؟

ع۔ص: میں ایسا نہیں سوچتا۔ غزل کا زیادہ تر حصہ اب بھی سیکولر ہے۔ ہم نے اس روایت کو قائم رکھا ہے۔ نئی غزل کا بھی خاص رجحان سیکولرزم اور انسان دوستی کا ہے۔ پاکستان میں کچھ ایسے تجربے ضرور ہوئے۔ ثقافتی شکست وریخت ہوئی تو مذہبی احیاء پرستی کی تحریک بھی چلی۔ روایت سے الگ ہونے کی کوشش میں کچھ شاعروں نے اسلامی علامتوں کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس کا کچھ اثر ہمارے یہاں بھی پڑا لیکن یہ سب زیادہ دور تک نہیں چل پاتا۔ آج کا شاعر تو اظہار کے لئے تو زندگی سے علامتیں تلاش کر رہا ہے۔

ش۔ص: آپ کی غزلوں میں بھی کربلا کی علامتیں موجود ہیں؟

ع۔ص: میں نے کربلا کی علامتوں کو وسیع تر انسانی سیاق میں دیکھا ہے اور برتا ہے۔ وہ پوری قوم کا تجربہ ہے۔ پھر وہ تو میرا روحانی تجربہ بھی ہے۔

ش۔ص: فراق گورکھپوری نے غزل کو "A Series of Climaxes" کہا ہے آپ اس سے کتنا متفق ہیں؟

ع۔ص: پوری طرح متفق ہوں جناب۔ اور ایسا انھوں نے معیاری غزلوں کو نظر میں رکھ کر ہی کہا۔ غزل کا ہر شعر ایک مکمل یونٹ ہے۔ ہر شعر اپنے معنی اور خیال میں مکمل ہوتا ہے، ہر بڑے شاعر کے یہاں خیال اپنے عروج پر پہونچ کر ہی شعر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس طرح ایک ہی غزل میں خیالات اور تجربات کے کئی Climaxes دیکھنے کو ملتے ہیں اور یہ خصوصیت صرف غزل کو حاصل ہے۔

(بہ شکریہ نیا دور، عرفان صدیقی نمبر)

☆☆☆

آگ کے دریاؤں کا مسافر: شکیب جلالی

عرفان صدیقی.................

اس اخبار کے اندرونی صفحوں میں بالکل غیر اہم انداز کی وہ مختصر سی خبر دیکھی تو کانوں میں اچانک بہت سی بھولی ہوئی آوازیں گڈ مڈ ہوکر گونجنے لگیں اور ذہن میں بیتے دنوں کی دھندلی دھندلی تصویریں خلط ملط سی ہونے لگیں جیسے کرچ کرچ آئینوں میں چہرے۔

نئی اردو غزل کے منفرد شاعر شکیب جلالی نے ریل سے کٹ کر خودکشی کرلی۔ وہ مغربی پاکستان کی حکومت میں پبلسٹی افسر کے عہدے پر کام کررہے تھے۔ پسماندگان میں انھوں نے ایک بیوہ اور دو بچے چھوڑے ہیں۔ خودکشی کا سبب معلوم نہیں ہوسکا۔ خبر نویس کو خودکشی کا سبب معلوم بھی کیسے ہوتا۔ شکیبؔ تو پہلے ہی کہہ گیا تھا ؎

سایہ کیوں جل کے ہوا خاک تجھے کیا معلوم
تو کبھی آگ کے دریاؤں میں اترا ہی نہیں

۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۶ء تک یہ مدت یعنی بدایوں چھوڑنے سے لے کر یہ دنیا چھوڑ جانے تک کا پورا عرصہ شکیبؔ کے لئے سچ مچ آگ کے دریاؤں کا سفر تھا۔ پھر اس سفر میں اس کے وجود پر بے حسی، سخت کوشی اور زمانہ سازی کا کوئی فائر پروف لبادہ بھی نہ تھا جو اسے خاک ہوجانے سے بچالیتا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس کا دل ایک عجیب وغریب آتش کدہ تھا جس میں جاکر زمانے کی ننھی سی چنگاری بھی بھڑکتا ہوا شعلہ بن جاتی تھی اور یہ آگ اس کے وجود کو

کھائے جا رہی تھی۔ ایک طرح سے یہ چھوٹی سی خبر اس کا مقدر بن چکی تھی۔

آج میں موسموں کی کتاب کے بیس یا تیس ورق الٹتا ہوں تو کچھ دھندلے عکس اجاگر ہو کر بولتی تصویروں میں بدل جاتے اور کتنی ہی بھولی بسری یادیں مجسم ہو جاتی ہیں۔

چوتھائی صدی پہلے زندگی اتنی دل شکن معلوم نہ ہوتی تھی نئی عصری حقیقتیں اس چھوٹی سی بستی کے دروازے پر بھی دستک دے رہی تھیں لیکن آنکھوں میں گزری ہوئی روایتوں کے عکس ابھی جاگ رہے تھے۔ جو نسل اس وقت بدایوں میں جوان ہو رہی تھی اس کے ہاتھوں میں ماضی کے دامن کی مہک باقی تھی اور آنکھوں میں آنے والے برسوں کے خواب جگمگا رہے تھے۔ ادبی محفلیں، مباحثے رسالوں کا اجراء، ڈرامے، ادبی اور ثقافتی انجمنوں کا قیام، گہری خاموش بامعنی دوستیاں، دل نواز رقابتیں اور بااُصول وسیع القلب دشمنیاں کچھ کر دکھانے کے حوصلے۔

یہ فضا تھی جس میں شکیبؔ کا جسم اور اس کا شعور جوان ہو رہے تھے۔ میرا اس سے راست تعارف بس اتنا ہی تھا جتنا کسی کا اپنے بڑے بھائی کے دوست سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس وقت بھی اداس اور گہری آنکھوں والے اس نوجوان کی شخصیت جو بھائی صاحب کے عزیز دوستوں میں تھا۔ کوئی ایسی بات تھی جو اس کو حلقۂ یاراں میں ایک خاص انفرادیت دیتی تھی۔ آج اتنے برسوں کے بعد شاید میں اس تاثر کا مکمل طور پر تجزیہ نہیں کر سکتا۔ ہاں اس کی شاعری کے حوالے سے اب اس کی ذات کو دیکھتا ہوں تو میرے اسی تاثر سے ملتا جلتا ایک تاثر اُبھرتا ہے جسے کلاسیکی انداز میں 'آنے دارد' سے سمجھا جا سکتا ہے۔

نیاز یعنی میرے بھائی صاحب کے دوستوں کا حلقہ یوں بہت وسیع تھا لیکن ان کے قریب ترین ہم مذاق ساتھیوں میں شکیبؔ، افضال، شروانی، عبدالباری تسنیم، اخلاق اختر حمیدی اور فرخ جلالی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی تھے لیکن ذہنی رفاقت کی بنا پر یہ لوگ بیشتر ہر ادبی ہنگامے میں ساتھ ہی ہوتے تھے۔ فرخ جلالی کو چھوڑ کر جوان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی

کے شعبہ لائبریری سائنس سے وابستہ ہیں باقی سب دوست رفتہ رفتہ پاکستان چلے گئے۔اس کوہِ ندا کی طرف جو یا اخی پکارتا رہتا ہے اور حوصلہ مند، ذہین اور خواب دیکھنے والے نوجوان جس کی وسعتوں میں گم ہوتے رہتے تھے۔

یہ حوالے شاید شخصی محسوس ہوں مگر میرے لیے شکیبؔ کی ذات کو اس پس نظر سے الگ کر کے دیکھنا اور سمجھنا مشکل ہے ہمارے گھر کا مردانہ حصہ ان نوجوانوں کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ مباحثے ہوتے تھے۔ ادبی مقابلے اور شعری محفلیں برپا کی جاتی تھیں۔ ادبی رسالے نکالے اور بند کئے جاتے تھے، انجمنیں قائم کی جاتی تھیں۔ ابا مرحوم (داداجان قبلہ شاؔد بدایونی) ایک مشفقانہ تبسم سے کبھی کبھی اظہار پسندیدگی فرماتے کبھی والد صاحب کچہری اور مؤکلوں سے فارغ ہوتے تو تقسیم انعامات کے لئے تشریف لاتے اور یوں بھی ہوتا کہ انجمن سازی میں اگر کوئی قضیہ پیدا ہوجاتا تو اس کے فیصلے کے لئے ابا مرحوم سے رجوع کیا جاتا، ماضی کا تناور درخت ابھی سایہ کئے ہوئے تھا۔ اور اس کی چھاؤں میں ذہن اور شعور پنپ رہا تھا شکیبؔ تب تک شکیبؔ جلالی نہ بنا تھا لیکن شعر کہتا تھا شعر سناتا تھا مباحثوں میں حصہ لیتا تھا اور نیاز کے ساتھ کالج کی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں آگے آگے رہتا تھا۔ یہ پوری نسل مجھ سے سات آٹھ سال آگے تھی۔ اس لئے ہمارے سماجی اسٹیٹس میں اسی اعتبار سے فرق تھا میں اور میرے دو تین ساتھی ان محفلوں اور ہنگاموں کے بس تماشائی تھے یا زیادہ سے زیادہ صفِ آخر کے حاضرین۔

پھر یوں ہوا کہ محفل تتر بتر ہوگئی۔ ہوائیں تو سمتِ غیب سے پہلے ہی چل رہی تھیں کچھ جھونکوں نے بہت سے دوستوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تسنیم اور اخلاق اختر کے بعد شکیبؔ بھی ایک دن خاموشی سے ترکِ وطن کر گئے پھر افضال شروانی نے رختِ سفر باندھا، فرخ جلالی نے علی گڑھ بسایا، کچھ دن نیاز تنہا تنہا سے اس شاخِ نہال غم کی آبیاری کرتے رہے پھر بریلی چلے گئے۔

۱۹۵۵ء کی گرمی کی چھٹیوں میں اپنے فائنل امتحانات سے فارغ ہوکر بھائی صاحب بدایوں آئے ہوئے تھے مجھے ان کے کمرے میں جا کر ان کی کتابوں، رسالوں، خطوں اور ڈائریوں کو چوری چھپے پڑھنے کی شروع سے عادت رہی تھی۔ کبھی کبھی پکڑا بھی جاتا تھا۔ اب کی بار ان کی ڈاک میں ایک بڑا خوبصورت ماہنامہ بھی شامل تھا ''جاوید'' اور لاہور سے نکل رہا تھا پہلے صفحہ پر مدیر کی جگہ جلی قلم میں لکھا تھا شکیبؔ جلالی، رسالہ بے حد خوبصورت لگا پورا رسالہ بڑے ستھرے مذاق اور گہرے شعور کا آئینہ تھا دو ڈھائی سال کی مختصر مدت میں شکیبؔ نے وہاں خود کو نہ صرف ایک منفرد اور باشعور غزل گو کی حیثیت سے متعارف کرا لیا تھا۔ بلکہ ادبی صحافت کے معیاروں کی تلاش میں کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔ رسالہ کے ساتھ ہی بھائی صاحب کے نام اس کا ایک خط بھی آیا تھا۔

''نیاز تم وہاں سے یہاں کی زندگی کا اندازہ نہیں کر سکتے اچھا ہوں شب و روز کی نہ پوچھو دن 'مغربی پاکستان' (اس نام کا سرکاری رسالہ جس سے شکیبؔ وابستہ ہو گئے تھے) کی نذر ہو جاتا ہے اور رات کشاکشوں میں کٹ جاتی ہے حال ہی میں ایک غزل کہی ہے اس سے کچھ اندازہ کر سکتے ہو کیا گزرتی ہوگی۔

یہ جھاڑیاں، یہ خار، کہاں آ گیا ہوں میں
اے حسرتِ بہار، کہاں آ گیا ہوں میں
کیا واقعی نہیں ہے یہ موسیقیوں کا شہر
کیوں چپ ہیں نغمہ کار، کہاں آ گیا ہوں میں

کچھ دن بعد بھائی صاحب بھی چلے گئے شکیبؔ وہیں لاہور میں تھا اور بھائی صاحب کراچی میں لیکن اکثر نصف ملاقاتیں اور کبھی بھائی صاحب کے لاہور جانے پر پوری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں وہ کبھی کبھی مجھے بھی اس کے بارے میں لکھ دیتے تھے۔ اب وہ 'مغربی پاکستان' چھوڑ کر

کسی اور اخبار سے وابستہ ہو گیا ہے۔ اب اس نے ''جاوید'' بند کر دیا ہے اب اس نے تعلقات عامہ کے محکمے میں ایک ذمہ دار جگہ حاصل کر لی ہے اب اس نے شادی کر لی ہے اب وہ ایک شفیق اور حساس باپ ہے۔

ایک بار بھائی صاحب گھر آئے تو میں نے تفصیل سے اس کے بارے میں پوچھنا چاہا بھائی صاحب نے بہت افسردگی سے کہا ''عرفان'' شکیبؔ خوش نہیں ہے سمجھ میں نہیں آتا بات کیا ہے وہ شاید اس لئے اداس رہتا ہے کہ اس کے تصور کے مطابق ڈھل نہیں پا رہی ہے وہ اس دھرتی کے ایک اُکھڑے ہوئے درخت کی طرح معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی سلگتی، جلتی زندہ تپیدہ شاعری......اُف

میں جانتا تھا اس طرح کے لوگ اتنے ذہین اور اتنے حساس اور اتنے خوددار اور اتنے خواب دیکھنے والے لوگ ذرا مشکل ہی سے خوش رہ سکتے ہیں۔

پھر ۱۹۶۴ء میں ابا مرحوم کا بدایوں میں انتقال ہوا۔ بھائی صاحب کراچی میں بلک رہے تھے لاہور سے شکیب کا خط آیا۔

''میں تجھے صبر کرنے کے لئے کیسے کہوں جب مجھے خود صبر نہیں آتا وہ ہماری عزیز ترین روایتوں کی علامت تھے اور ہمارے ذوق اور شعور نے ان کے سائے میں نمو پائی تھی......

آہ تو تنہا نہ رو نیاز تیرا شکیبؔ تیرے ساتھ رو رہا ہے۔''

میں ۱۹۶۲ء سے مرکزی محکمۂ اطلاعات سے وابستہ ہو کر دلی آ گیا تھا بیچ کے برسوں میں شکیبؔ کے زیادہ تفصیلی حالات تو نہ معلوم ہو سکے البتہ پاکستانی رسائل اور اخبارات میں اس کی غزلیں نظر سے گزرتی رہیں اور اس کی سلگتی ہوئی شخصیت ذہن میں اُبھرتی رہی۔ اس کی غزلیں بتا رہی تھیں کہ اس کا شعور اور اس کا احساس جس سفر پر نکلے ہیں وہ آگ کے دریاؤں ہی سے گزرتا ہے۔

پھر اچانک ایک دن وہ اپنے جسم کی ٹوٹی پھوٹی فصیل پر تازہ لہو کے چھینٹے چھوڑ کر حدودِ وقت سے آگے جانے کہاں نکل گیا۔

اس نے کہا بھی تو تھا

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

☆☆☆

میرے کھوئے ہوئے موسم

عرفان صدیقی.................

وہ فروری کی ایک سرد شام تھی۔ اداس اور خاموش۔ خشک دھند لکے میں لپٹی ہوئی۔ شاستری بھون کو اشوک روڈ سے ملانے والی سڑک پر دور تک بکھرے ہوئے خشک پتے ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ میں ان پتوں کے ساتھ، نئی دہلی کی سڑکوں اور پرانی دلی کی گلی کوچوں میں پچھلے چھتیس سال کی کوچہ گردی میں کھوئے ہوئے ان موسموں کو تلاش کر رہا تھا جو میں نے اور عظیم اختر نے اس شہر میں ساتھ گزارے تھے اور جو ہم دونوں کے عہد جوانی کے حوصلوں، امنگوں اور خوابوں سے عبارت تھے۔ اتنے برسوں کے بعد بھی موسم کا یہ منظر نامہ اس ماضی کو زندہ کر رہا تھا جو ہماری بہترین یادوں کا امین تھا:

شاہراہوں پہ وہی برگ خزاں اڑتے ہیں
اور اطراف میں خوشبوئے بہاراں ہے وہی

ان پتوں کے ساتھ چلتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ تین دہائیوں سے زیادہ کا یہ زمانی فاصلہ پلک جھپکتے طے ہو گیا ہے اور ہم دونو جوان اپنے شوق اور حوصلوں کے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ ہماری تگ و تازآ کاش وانی بھون کی کثیر منزلہ عمارت، اس سے ملے ہوئے براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے کمروں، رہداریوں اور عمارت کے احاطے میں مونگا ریسٹورینٹ، جن پتھ کا رنگینیوں سے معمور بازار، قدیم کافی ہاؤس، پھر تھیٹر کمیونی کیشن بلڈنگ کے میدان میں عارضی خیموں

میں قائم نیا کافی ہاؤس، ریگل سنیما کے مصروف فٹ پاتھ اور کناٹ سرکس کی زندگی کی سرگرمی سے معمور پیچ در پیچ راہداریوں میں نگاران دلی کے رنگین پیراہن اور غارت گرانِ ایمان کے جلوؤں کی چکا چوند، نئی دلی کی شاہراہوں اور پرانی دلی کے 'اوراق مصور'' گلی کوچوں، کارپوریشن کی لائبریری، جامع مسجد اور اردو بازار کے کتب فروشوں، پرانے چائے خانوں، فٹ بال میچوں کے مرکز، بہادر شاہ ظفر مارگ پر اخبارات کے دفاتر، لال قلعہ میں منعقد ہونے والے جشنِ جمہوریت کے مشاعروں اور ایسی ہی نہ جانے اور کتنی جگہوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

پریس انفارمیشن بیورو میں ہم دونوں نے، تقریباً سال بھر کے فرق سے جوائن کیا پی آئی بی میں اگرچہ اس وقت بہت سے ہم عمر ساتھی تھے تاہم مزاجوں کی ہم آہنگی نے ہمیں قربت اور دوستی کے ایسے رشتے میں جوڑ دیا جس میں ہم ایک دوسرے کے لئے ع

'دل کفِ دست کی مانند کھلا رکھا ہے' کی مثال بن گئے۔ اب جو ۶۴ء کے بعد اس زمانے کی یادوں کے سفر پر نکلا ہوں تو واقعات اور چہروں کا ایک طویل سلسلہ ذہن کے پردے پر تصویروں کی طرح رواں ہے۔ عظیم اختر کے والد مرحوم، دلی کی سماجی زندگی کی مشہور شخصیت اور معتبر شاعر مولانا علیم اخترؔ مظفر نگری کی وجیہ اور پروقار شخصیت ہمارے سروں پر محبت اور شفقت کے ایک چھتنار درخت کی طرح سایہ فگن تھی۔ پھاٹک حبش خاں کے چھوٹے رنگ محل میں جو اس وقت بھی ''اوراق مصور'' کی یاد دلاتا تھا۔ مولانا علیم اختر مظفر نگری کے مکان کا دیوان خانہ جسے مولانا حسرت موہانیؔ، جگر مرادآبادیؔ، احسان دانشؔ، روشؔ صدیقی، آلم مظفر نگری اور مجازؔ لکھنوی جیسے انگنت مشاہیر شعراء کی میزبانی کا شرف حاصل تھا، ہماری ادبی، شعری اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھا اور میرے لیے پردیس میں گویا گھر کے نعم البدل کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ مولانا کی سرپرستی اور شفقت میرا بڑا اہم سرمایہ تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنے خوبصورت اور اثر انگیز اشعار سے نوازتے یا اپنی ادبی وتہذیبی یادداشتوں کے ورق الٹتے تو عظیم اور میں دونوں

خاموشی کے ساتھ ذہنی اور جذباتی وابستگی کے ساتھ انکے ہم سفر ہو جاتے۔

دہلی کی بزرگ شخصیتوں اور نوجوان دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے جن سے مولانا کے اس مکان اور عظیم اختر سے دوستی کے حوالے سے نیازمندی یا خلوص دوستی کے راستے استوار ہوئے اس میں بسمل سعیدی، استاد رسا دہلوی، مسلم احمد نظامی (ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور شاہد احمد دہلوی کے چھوٹے بھائی)، اعجاز صدیقی (سیماب اکبر آبادی کے بیٹے اور ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کے مدیر)، گوپال متل (مدیر تحریک دہلی)، صاحبزادہ مستحسن فاروقی (مدیر آستانہ دہلی) غلام احمد فرقت کاکوری، سلام مچھلی شہری، عنوان چشتی، شمیم کرہانی، دیویندر سیتارتھی، جاوید وششٹ، مخمور سعیدی اور شعروادب کے ہم عصر منظر نامے میں نمایاں ہوتے ہوئے بانی ایم اے زبیر رضوی اور کے کھلر اور میرے قیام دہلی کے آخری حصے میں سید ضمیر حسن دہلوی، یعقوب عامر، اقبال عمر خاص طور پر یاد آتے ہیں۔ جن لوگوں سے خصوصی قربت اور اخلاص کا تعلق رہا ان میں سلام مچھلی شہری بہت یاد آتے ہیں جو ہم دونوں سے بہت سینئر ہونے کے باوجود بہت بے تکلف تھے اور جنہیں ہم محبت سے ''شام اودھ کا شہزادہ'' کہتے تھے۔ دہلی کی شاہراہوں اور کافی ہاؤس میں ان گنت شامیں جو میں نے اور عظیم اختر نے اس البیلے شاعر اور مخلص اور خوش خیال انسان کے ساتھ گزاریں وہ ہماری قیمتی یادوں کا حصہ ہیں۔ دہلی میں زندگی کی امنگوں سے بھرے ہوئے ان دنوں میں صہبا وحید (آل انڈیا ریڈیو کی اردو نیوز کے وحید قریشی) کے ساتھ رفاقت اور اخلاص کا گہرا رشتہ بھی یادوں کے سرمائے میں شامل ہے۔

عظیم اختر کے مزاج کا کھلنڈرا پن آج بھی بحمد اللہ اسی طرح قائم ہے اب بھی اسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ گزرے ہوئے ماہ و سال ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ برگِ خزاں کی ہمراہی میں ماضی کے اس سفر کا مقصد عظیم کے ساتھ اپنی دوستی کی عمر کا حساب دینے سے زیادہ اس ذہنی اور جذباتی پس منظر کو اجاگر کرنا ہے جس نے ہمارے درمیان رفاقت اور دوستداری کے تعلق کی

بنیادیں استوار کی تھیں۔ پرانی اور گہری دوستی کی شناخت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ماضی کو اس تعلق کے بغیر یاد نہیں کیا جاسکتا۔ اس تعلق کا بنیادی حوالہ زندگی کے پہلوؤں کے بارے میں ہمارے رویوں کا اشتراک اور اپنی ثقافتی اور تہذیبی روایات، خصوصاً شعر و ادب سے ہماری وابستگی تھی۔ لیکن اس کے بظاہر کھلنڈرے انداز اور سیمابی کیفیت کی تہہ میں ایک گہرا خلوص اور ایک شوخ بچے کی سی معصومیت کارفرما رہی ہے۔ مشاعروں اور ادبی نشستوں میں، کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس میں ہماری بیٹھکوں کے دوران اس کے شوخ لیکن معنی خیز فقرے رہے ہوں یا فٹ بال میچوں میں، ہم دونوں کے پسندیدہ سٹی کلب کے کھیل کے دوران اس کا جوش و خروش، زندگی کے ساتھ اسکا رویہ ہمیشہ امید اور حوصلوں سے بھرپور رہا ہے۔ مولانا علیم اختر مرحوم کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے اس نے شعر و ادب کی روایات ورثے میں پائی ہیں اور اس ورثے کی اس نے بڑی لگن سے پاسداری کی ہے۔ اسے اپنے گھر پر لڑکپن ہی سے بزرگ شاعروں اور ادیبوں کی جو قربتیں میسر رہیں انہوں نے اس کے ادبی ذوق کو جلا بخشی ہے۔

پریس انفارمیشن بیورو میں ہمارا ساتھ آٹھ نو برس رہا اور رفاقت کے یہ چراغ خدا کا شکر ہے بدستور روشن ہیں۔ وہ پی آئی بی سے دلی ایڈ منسٹریشن میں پریس افسر کی حیثیت سے چلا گیا اور پھر دلی کی ریاستی سول سروس کا ایک ذمہ دار رکن بن کر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کرسی سنبھالی لیکن اسے دیکھ کر آج بھی حوصلوں، شوخیوں اور توانائیوں سے بھرپور وہی کھلنڈرا نوجوان عظیم اختر یاد آتا ہے جس سے ۶۴ء میں دوستی کا آغاز ہوا تھا۔

اس نے ٹوٹ کر چاہا بھی ہے اور وہ چاہا بھی گیا ہے۔ اور میں دل کے ان معاملات میں اس کا رازداں تو ہمیشہ رہا ہوں تاہم اپنی طبیعت کی افتاد کی بنا رقیب کبھی نہ بنا۔ وہ دو ایک برس کے لیے ملازمت کے دوران تبادلہ پر جالندھر چلا گیا تھا جہاں سے وہ اپنی واردات، دل کی روئداد لمبے لمبے خطوط میں مجھے بھیجا کرتا تھا۔ جالندھر کے اس قیام میں اس کے دل کے

گداز میں اضافہ ہوا لیکن انجام اس معاملے کا وہی ہوا جو عموماً ہوتا ہے یعنی فاصلے اور جدائی اور پھر کبھی کبھی خواب جیسی کچھ یادیں۔

عظیم کی یاد اللہ دلی کے ایسے ''امیرزادوں'' سے بھی رہی ہے جن کے بارے میں میرؔ نے کہا تھا۔

امیر زادوں سے دلی کے مت ملا کر میرؔ
کہ ہم فقیر ہوئے ہیں انہیں کی دولت سے

لیکن یہ ''امیر زادے'' عظیم اختر کی شوخی گفتار، بے باکی اور پر معنی فقرہ بازی سے خائف ہی رہتے تھے اور اپنی حدوں سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

اسی دور میں اس نے شاعری بھی شروع کی تھی جو بیشتر نثری نظموں پر مشتمل تھی۔ لیکن پھر اس کی توجہ نثر نگاری کی طرف ہوگئی۔ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ آگے چل کر اسی شوق اور توجہ کے نتیجے میں انشائیہ اور طنز نگاری کے میدان میں اسے اپنی صلاحیتوں کو تسلیم کرانا تھا۔

ہم نے ایک مدت تک دلی میں اتنی شامیں روشن کی ہیں، اتنی راتیں جگائیں ہیں، اتنے موسم جذب کئے ہیں کہ انکا بیان چند صفحات میں ممکن نہیں ہے اس دور کی دلی اب تک میری یادوں میں زندہ ہے اگر چہ جن چہروں اور پیکروں سے وہ زمانہ روشن تھا ان میں سے بہت سے اب وقت کی دھند میں کھو چکے ہیں۔ ان میں جانے پہچانے چہرے بھی ہیں اور وہ لوگ بھی جن سے ہم دونوں کے سوا اور کوئی شاید واقف بھی نہ ہو لیکن یہ سب لوگ ہمارے کھوئے ہوئے موسموں کے رنگ اور خوشبوؤں کا لازمی حوالہ ہیں۔ عظیم اختر اب ایک منفرد اور صاحب طرز خاکہ نگار اور طنز نگار تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس نے ''حرف نیم کش''، ''دلی حرف حرف چہرے'' اور اب ''دلی، میری بستی میرے لوگ'' میں نئے اور پرانے چہروں، پیکروں، بزم آرائیوں اور موسموں کی جو تصویریں بنائی ہیں انکے ذریعے اس نے ایک خوبصورت، توانا

اور رنگارنگ تہذیبی روایت کو زندہ رکھنے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ اس کے خاکوں اور طنزیہ انشائیوں میں اس کی شخصیت ہی کی سی بے ساختگی، شوخی اور سچائی ہے اور ان خاکوں میں وہ جن لوگوں سے ہمیں ملواتا ہے وہ یہ شعر یاد دلاتے ہیں۔

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

اپنی تہذیبی روایت کو زندہ رکھنے کا یہ عمل زندگی کی خوبصورتی کے تسلسل پر ہمارا یقین تازہ کرتا ہے۔ عظیم اختر کا گھر آج بھی دلی میں منیر ہمدم، نور جہاں ثروت، ع۔ حامد، رؤف رضا اور اقبال اشہر جیسے اردو شاعروں ادیبوں کی نئی، تازہ دم اور تازہ کار نسل کے نمائندوں کا مرکز ہے جو اس سے ذہنی قربت محسوس کرتے ہیں ان ''نئے دیوانوں'' کو دیکھ کر بقول احمد مشتاق خوشی بھی ہوتی ہے اور اپنا گزارا ہوا عہد جوانی بھی یاد آتا ہے۔

جی چاہتا ہے کسی دن عظیم اختر کو ساتھ لے کر دلی کی شاہراہوں اور گلی کوچوں کے اس سفر پر پھر نکلوں جو لگ بھگ پینتیس برس پہلے ہم نے شروع کیا تھا اور جس کی خوشبوئیں اب تک ہمیں اپنی طرف بلاتی رہتی ہیں اور یہ یقین دلاتی رہتی ہیں کہ موسم گل اب بھی انہیں اطراف میں کہیں عرفان صدیقی اور عظیم اختر کے انتظار میں ہے۔

☆☆☆

اقلیتی درسگاہیں اور سپریم کورٹ کا فیصلہ

(عرفان صدیقی کا تحریر کردہ روزنامہ صحافت کا اداریہ)

سپریم کورٹ کی گیارہ رکنی بنچ نے چھ ججوں کی اکثریت سے چیف جسٹس بی این کرپال کی سرکردگی میں اقلیتی تعلیمی اداروں سے متعلق جو فیصلہ دیا ہے وہ اپنے مضمرات اور دور رس اثرات کی بنا پر گہری توجہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اس فیصلے کے تعلق چوں کہ اقلیتوں کے ایک بے حد اہم آئینی حق یعنی اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور انہیں چلانے سے ہے، اس لئے عدالت عالیہ کے فیصلے کا سرسری جائزہ اور اس پر فوری ردعمل کے اظہار کے بجائے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرکے یہ اندازہ لگانے کی ضرورت ہے کہ اس فیصلے سے مکاتب اور ابتدائی درسگاہوں سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹی سطح تک کے اقلیتی تعلیمی اداروں پر کیا اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ اقلیتی فرقے کو مذہب کی بنیاد پر اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا اختیار حاصل ہے لیکن اگر اس نے ایسے ادارے کے لئے حکومت سے امداد حاصل کی تو اسے سرکاری قواعد وضوابط کی پابندی کرنی ہوگی۔ چھ ججوں کی اکثریت والے اس فیصلے کے بموجب اگر کسی اقلیتی ادارے نے حکومت سے گرانٹ یا امداد لی تو وہ مذہب، ذات، نسل یا زبان کی بنیاد پر دوسرے فرقوں کے لوگوں کو داخلہ دینے سے انکار نہیں کرسکے گا۔ بنچ نے یہ بھی کہا ہے کہ حکومت سے امداد نہ لینے والے اقلیتی تعلیمی اداروں کے انتظام میں بھی حکومت اسی وقت تک مداخلت نہیں کرے گی جب تک ان کا بندوبست

صاف وشفاف ہو اور طلباء کو داخلہ دینے کے معاملے میں میرٹ یعنی اہلیت کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہو۔ ایک اور اہم بات اس فیصلے میں یہ کہی گئی ہے کہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا یہی حق اکثریتی فرقے کو بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ فیصلے کے مطابق اقلیتی فرقے کے تعلیمی اداروں کو اپنے فرقے کے طلباء کو داخلے دینے کے ساتھ ہی دوسرے فرقوں کے طلباء کو بھی ایک مخصوص فیصد تک جس کا فیصلہ حکومت اس ادارے سے متعلق مقامی آبادی کی بنیاد پر کرے گی، داخلہ دینا ہوگا اور داخلہ کا عمل، امداد پانے والے اقلیتی اداروں میں مشترکہ داخلہ ٹسٹ کے ذریعے ہوگا جو حکومت یا متعلقہ یونیورسٹی اپنی نگرانی میں کرائے گی۔ پانچ ججوں جسٹس وی ایم کھرے، جسٹس ایس ایس ایم قادری، جسٹس روما پال، جسٹس ایس این وریوا اور جسٹس اشوک بھان نے اپنے علاحدہ فیصلوں میں غیر امداد یافتہ تعلیمی اداروں کے انتظام کے معاملے پر اختلاف ظاہر کرتے ہوئے باقی فیصلے سے اتفاق کیا ہے۔

اس طرح یہ ظاہر ہے کہ سرکاری امداد پانے والے اور نہ پانے والے دونوں قسم کے اقلیتی تعلیمی اداروں کا قیام اور انتظام کا حق تسلیم کرنے کے باوجود انہیں غیر امداد یافتہ اداروں میں کارکردگی کی شفافیت کی شرط پر اور امداد یافتہ اداروں کو امداد حاصل کرنے کی بناء پر، سرکاری قواعد وضوابط کا پابند کیا گیا ہے۔ یعنی اس فیصلے کے مطابق دونوں صورتوں میں اقلیتوں کا یہ حق مطلق اور غیر مشروط نہیں ہے۔ اقلیتوں کے ذریعے اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کے حق کی ضمانت آئین نے دی ہے اور سپریم کورٹ کے فیصلے میں اس حق کا تسلیم کیا جانا یقیناً آئینی حقوق کے تحفظ کے لحاظ سے اہم بات ہے لیکن بنچ کے اکثریتی فیصلے میں ایسے سرکاری امداد یافتہ اداروں کے نظم ونسق میں سرکاری قواعد وضوابط کی پابندی کی شرط سے بہر حال اقلیتوں کے ذریعے قائم اداروں کے انتظام میں سرکاری مداخلت کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے اس طرح عدالت عالیہ کا اس امر پر زور کہ اقلیتی تعلیمی اداروں میں انتظام شفاف رکھا جائے، بالکل درست

ہے اور داخلوں میں اہلیت کی بنیادی اہمیت سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا لیکن اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ ایسے کسی ادارے کی کارکردگی کی شفافیت کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار اگر صرف انتظامیہ کو رہے گا تو ان اداروں کو چلانے میں مختلف پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔

سرکاری امداد حاصل کرنے والے اداروں کے معاملات میں چیک اور بیلنس کے کسی نظام کے بغیر سرکاری ضوابط کی پابندی سے سرکاری مداخلت کا جو امکان پیدا ہوسکتا ہے وہ خود اقلیت کے اس بے حد اہم آئینی حق کو محدود کرسکتا ہے لیکن اس سے قطع نظر، ان اداروں میں داخلوں کے ضمن میں اقلیتی اور غیر اقلیتی طلباء کے فیصد کا تعین متعلقہ ریاست کی اقلیتی آبادی کی بنا پر طے کیے جانے سے اقلیتی ادارے کی بنیادی شکل اور کردار ہی کے متاثر ہونے کا خطرہ ایسا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس بندوبست سے ثانوی اور یونیورسٹی سطح کے تمام اقلیتی اداروں میں طلباء کے تناسب پر اثر پڑے گا۔ اس فیصلے کی جو تفصیل اخبارات میں آئی ہے اس میں ایک بات جو عجیب محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جو اقلیتی تعلیمی ادارے امداد نہیں لے رہے ہیں انہیں بھی ایک مخصوص فیصد تک جس کا فیصلہ بھی مقامی آبادی کی بنیاد پر کیا جائے گا، غیر اقلیتی طلباء کو داخلہ دینا ہوگا۔ کیا اس کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ مثال کے طور پر مسلم اقلیت کے جو دینی مدارس اور مکاتب سرکار سے ایک پیسہ بھی نہیں لے رہے ہیں اور اپنے بچوں کو اپنے مذہب اور کلچر کے تعلیم و تربیت دینے کے لئے چلائے جارہے ہیں وہ بھی اس بندوبست کے دائرے میں آئیں گے؟

عیسائی اقلیتی رہنما دلی کے پادری عمانویل نے مجموعی طور پر اس فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے لیکن اس کے جن پہلوؤں سے اقلیتی اداروں کے انتظام میں سرکاری مداخلت کی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے اس پر فکر بھی ظاہر کی ہے۔ سید شہاب الدین نے بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اظہار تشویش کیا ہے کہ اقلیتی اداروں میں غیر اقلیتی فرقوں کے طلباء کے داخلوں کے معاملے پر ہر شہری کو بلا امتیاز مذہب و زبان و نسل تعلیم حاصل کرنے کے حق سے متعلق

آئین کی دفعہ ۲۹ (۲) اور اقلیتوں کے اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کے حق سے متعلق دفعہ ۳۰ (۱) کے درمیان عملاً ایک ربط قائم کر دیا گیا ہے۔ بہرحال، شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ اقلیتوں، خصوصاً مسلم اور عیسائی فرقوں کے معتبر اور صاحب نظر رہنما، دانشور، ماہرین قانون اور ماہرین تعلیم سپریم کورٹ کے پورے فیصلے کا تفصیل اور گہرائی سے جائزہ لے کر اس کے مضمرات اور اثرات کا پورا اندازہ لگائیں اور اگر کوئی پہلو اقلیتوں کے حقوق پر منفی طور سے اثر انداز ہو سکتا ہو تو اس کے بارے میں قانونی و آئینی اصلاحی تدابیر تلاش کریں۔

(روزنامہ صحافت لکھنؤ۔ جلد نمبر ۱۲، شمار نمبر ۲۹۳)

☆☆☆

تعلیم پر بھگوا رنگ کا غلبہ

(عرفان صدیقی کا تحریر کردہ روزنامہ صحافت کا اداریہ)

ملک کی تاریخ اور ثقافت کو ہندوتو کے مخصوص نظریات وتصورات کی رنگ میں پیش کرنا سنگھ پریوار اور دوسری انتہا پسند تنظیموں کا خاص پروگرام ہے اور اس کے لئے تعلیم کو ایک کارگر وسیلے کے طور پر بہت دن سے استعمال کیا جارہا ہے۔ تعلیم کو بھگوا رنگ میں رنگنے کا یہ مہم حالیہ دنوں میں کچھ اور شدت پکڑ
گئی ہے اور نصابی کتابوں کے ذریعہ فرقہ وارانہ خیالات کی تشہیر کا کام بی جے پی کے زیر اقتدار مرکز اور ریاستی سرکاروں کی سرپرستی میں زور وشور سے چلایا جارہا ہے اور تعلیم کو زہر آلود بنانے کی ان کوششوں کے خلاف ملک کے سیکولر اور روشن خیال حلقوں میں احتجاج کی آوازیں بھی بلند کی جارہی ہیں لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ متعلقہ حکومتیں ان حالات کی اصلاح کیلئے کوئی ٹھوس عملی اقدام نہیں کررہی ہیں۔ مرکز میں حکمراں اتحاد سے باہر سیاسی جماعتیں جن نو ریاستوں میں برسر اقتدار ہیں ان کے وزرائے تعلیم نے بی جے پی کی زیر قیادت مرکزی حکومت کو اس بات کے لئے مورد الزام ٹھہرایا ہے کہ وہ تعلیمی نظام کو فرقہ واریت سے آلودہ کرکے ملک کے اتحاد اور یکجہتی کو نقصان پہنچارہی ہے۔

اس سلسلہ میں مذکورہ ریاستوں کے وزرائے تعلیم نے تعلیم پر فرقہ پرستی کے تسلط کے خلاف نئی دلی میں ایک قومی کنونشن منعقد کیا ہے اور گزشتہ پیر کو اس کے اختتام پر ایک تجویز منظور

کی ہے جس میں تعلیم کو فرقہ واریت سے مسموم کرنے کی کوشش پر شدید تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ تجویز میں کھل کر کہا گیا ہے کہ موجودہ مرکزی حکومت نے قومی سطح کے تقریباً ہر علمی اور تعلیمی ادارے کو سنگھ پریوار کا فرقہ وارانہ ایجنڈا نافذ کرنے کا ایک وسیلہ بنا دیا ہے۔ اس مقصد سے ان اداروں کی سربراہی ایسے افراد کو سونپی جارہی ہے جن کے تقرر کی واحد بنیاد پریوار کے نظریات سے ان کی وابستگی ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن جیسے اعلیٰ اور خود مختار ادارے نے حکومت کے ایماء پر اس سلسلہ میں جو طرز عمل اختیار کیا ہے اس پر گزشتہ دنوں مختلف حلقوں میں شدید اعتراض کیا گیا ہے۔ اب ان وزرائے تعلیم نے بھی کہا ہے کہ کمیشن دیسی تعلیمی نظام کو تعلیمی اداروں میں رائج کر رہا ہے جب کہ ملک کی یونیورسٹیاں ضروری فنڈ کی کمی کا شکار ہیں۔ کنونشن کے خیال میں اس اقدام کا مقصد رجعت پسندی کو بڑھاوا دینا اور اعلیٰ تعلیم کے سائنسی کردار کو برباد کرنا ہے۔

تعلیم پر فسطائی نظریات مسلط کرنے کا یہ عمل بلا شبہ اتنا خطرناک ہے اور اس کے نتائج اتنے تباہ کن ہو سکتے ہیں کہ ملک کو اس خطرے سے بچانے کے لئے ان تمام حلقوں اور افراد کا منظم ہو کر کوشش کرنا انتہائی ضروری ہے جو ملک کے اتحاد اور سیکولر نظام کو عزیز رکھتے ہیں۔ یہ مسئلہ صرف مسلمانوں یا دوسری اقلیتوں کے خلاف اس نئے تعلیمی نظام کے وسیلے سے پیدا کی جانے والی نفرت ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کے ہولناک اثرات ملک کے تمام طبقوں اور پورے قومی ڈھانچے پر پڑیں گے بلکہ یہ اثرات عملاً سامنے آنا بھی شروع ہو گئے ہیں۔ تعلیم میں فرقہ واریت کے غلبہ کے خلاف مختلف سماجی اور ثقافتی تنظیموں اور اداروں کے ذریعہ وقتاً فوقتاً جلسے اور سیمینار وغیرہ کے انعقاد سے بھی اس نفرت انگیزی کے خلاف فضا بنانے میں مدد ملتی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک میں سیکولرزم اور سماجی اتحاد کے علمبردار سیاسی جماعتیں بھی اس فتنہ سے لڑنے کو اپنے سیاسی ایجنڈے کا ایک ترجیحی موضوع بنائیں۔

نئی دلی میں وزرائے تعلیم کا یہ قومی کنونشن وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کی سمت میں ایک مثبت قدم ہے جس کو وسیع پیمانے پر عوامی حمایت حاصل ہونی چاہیے۔ کنونشن میں شبانہ اعظمی، اڈوارڈو فلیرو، منی شنکر ایر اور دوسرے ممبران پارلیمنٹ نے مرکزی حکومت سے بالکل درست مطالبہ کیا ہے کہ وہ ریاستی وزرائے تعلیم کا ایک اجلاس بلا کر اور ایک مرکزی تعلیمی صلاح کار بورڈ بنا کر قومی تعلیمی پالیسی کے امور پر ریاستوں سے ضروری صلاح و مشورہ کرنا شروع کرے۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے سیتارام یچوری نے یہ کہہ کر ایک اہم سچائی بیان کی ہے کہ حکومت ہندوستان کی تاریخ کو دوبارہ لکھنے کی کوشش کر کے ایک شدید فرقہ پرستانہ مذہبی ریاست کے قیام کی کوشش کر رہی ہے۔

(روزنامہ صحافت لکھنؤ۔ جلد نمبر ۱۱، شمار نمبر ۲۱۲)

سارک پر بے یقینی کے سائے

(عرفان صدیقی کا تحریر کردہ روزنامہ صحافت کا اداریہ)

جنوبی ایشیا کے سات ملکوں کے علاقائی تعاون کی تنظیم سارک کا بنیادی مقصد ان ملکوں یعنی ہندوستان، پاکستان، سری لنکا، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان اور مالدیپ کے درمیان اقتصادی وتجارتی اشتراک وتعاون کو فروغ دینا تھا اور تنظیم کے قیام کے وقت سے ہی یہ طے کیا گیا تھا کہ یہ سیاسی تنازعوں، خصوصاً دو ممبر ملکوں کے باہمی سیاسی تنازعوں سے دور رہے گی۔ اس کے باوجود مختلف موقعوں پر سارک کے اجلاس، اس تنظیم کے دو سب سے بڑے ممبروں یعنی ہندوستان اور پاکستان کے باہمی سیاسی مسائل کے درمیان میں لائے جانے کی بنا پر اختلاف اور انتشار کا شکار ہوتے رہے ہیں اور اس کے نتیجہ میں علاقائی اقتصادی ترقی کے وہ نشانے پورے نہیں ہوسکے جن کے حصول کے لیے اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اپنے بنیادی مقصد سے دور ہوجانے کی صورت حال کے لیے اصلاً پاکستان ذمہ دار رہا ہے جس نے ہر موقع پر اس تنظیم کو کشمیر کا مسئلہ اٹھانے کے لیے ایک پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اقتصادی ترقی کے ایک ادارے کے طور پر سارک کی موجودہ بے اثری میں کچھ نہ کچھ حصہ اس بددلی اور سخت ردعمل کا بھی ہے جو پاکستان کے رویے کی بنا پر ہندوستان کی طرف سے اس تنظیم کے تعلق سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسباب اور عوامل کا تجزیہ اپنی جگہ، افسوسناک سچائی یہ ہے کہ سارک محض ایک بے اثر اور غیر فعال علاقائی تنظیم ہو کر رہ گئی ہے جس کا عدم اور وجود

تقریباً برابر ہے۔

آئندہ جنوری میں پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں ہونے والا سارک اجلاس بھی ہندوستان اور پاکستان کے باہمی اختلافات کا شکار ہوتا نظر آ رہا ہے۔ سارک کے اس اجلاس کی حیثیت چوٹی کانفرنس کی ہوگی جس میں ممبر ملکوں کے سربراہان حکومت کو شرکت کرنا ہے۔ کچھ مدت پہلے تک سیاسی حلقوں میں تاثر یہ تھا کہ وزیراعظم مسٹر باجپئی اس میں شرکت کریں گے لیکن گجرات، دلی اور جموں و کشمیر میں دہشت گردی کے حالیہ واقعات کے بعد سے صورت حال میں بہت فرق آ گیا ہے۔ سارک اجلاس پر بے یقینی کے سائے گہرے ہوتے دکھائی دے رہے ہیں اور سرحد پار سے ہونے والی دہشت گردانہ کاروائیوں کی وجہ سے ہندوستان کے وزیراعظم کا اس اجلاس میں شرکت کرنا غیر یقینی نظر آتا ہے۔

میڈیا میں بی بی سی کے ایک پروگرام کے حوالے سے وزیراعظم مسٹر باجپئی کے قومی سلامتی امور کے مشیر برجیش مشرا کا یہ بیان آیا ہے کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لئے چونکہ پاکستان نے ''قطعاً کچھ نہیں'' کیا ہے اس لیے وزیراعظم اٹل بہاری باجپئی کا اس اجلاس کے لیے اسلام آباد جانا ''بہت مشکل'' ہے۔ خبروں کے مطابق مسٹر مشرا نے یہ تو تسلیم کیا ہے کہ دراندازی میں کمی ہوئی ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ یہ کمی پاکستان کے عمل کے نتیجے میں نہیں بلکہ اس لیے ہوئی ہے کہ ہندوستان نے اس معاملے پر بہت زیادہ دباؤ بنایا ہے۔ انہوں نے وی ایچ پی کے اشوک سنگھل کے اس مبینہ ریمارک کے بارے میں کہ جو وزیراعظم پاکستان کے خلاف کاروائی کرے گا وہ الیکشن جیت لے گا، پوچھے جانے پر یہ دعویٰ کیا کہ سرکار پر جنگ چھیڑنے کے لئے کسی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہے حالانکہ پارلیمنٹ اور فوجی کیمپ پر دہشت گردوں کے حملے کے بعد ''جذبات بہت بھڑک گئے تھے''۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر مشرا نے کہا کہ اس ملک میں ایک بڑا حلقہ ہندوستان کی طرف سے جنگ چھیڑے جانے کے خلاف ہے

اور تمام تنازعات کا تصفیہ باہمی مذاکرات کے ذریعہ کرنے کے حق میں ہے۔

یہ سب باتیں سرحد پار کی دہشت گردی کے بارے میں ہندوستان کے موقف کا اعادہ کرتی ہیں اور ان پر زور دیتے رہنا بھی ضروری ہے لیکن ان مسائل کو سارک جیسی خالص معاشی و تجارتی ترقیاتی تنظیم کے اجلاس میں شرکت سے وابستہ کرنا خود تنظیم کی اس بنیادی حیثیت سے مطابق نہیں رکھتا کہ اسے باہمی سیاسی تنازعات سے دور رکھا جائے گا۔ پاکستان کی حمایت سے ہونے والی دہشت گردی کا انسداد لازم ہے لیکن اگر ان واقعات کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کے سیاسی اور سفارتی تعلقات قائم ہیں اور تجارتی اشتراک کے شعبے میں ہندوستان اب بھی یہ توقع کرسکتا ہے کہ پاکستان اسے ''انتہائی مراعات یافتہ ملک'' کی حیثیت دے گا، تو پھر سارک جیسی علاقائی اقتصادی تعاون کی تنظیم کے اجلاس میں شرکت کو ہند۔ پاک تنازعات کے حل سے مشروط کرنا کہاں تک ایک حقیقت پسندانہ رویہ ہوگا؟

(روزنامہ صحافت لکھنؤ۔ جلد نمبر ۱۲، شمار نمبر ۳۱۸)

☆☆☆

عرفان صدیقی

کا

غیر مدوّن کلام

دو جگہ رہتے ہیں ہم، ایک تو یہ شہرِ ملال
ایک وہ شہر جو خوابوں میں بسایا ہوا ہے

❁

قیدِ نام و نسب و رنگ میں رہتے ہوئے بھی
دل وہی سونا ہے اس زنگ میں رہتے ہوئے بھی

مجھ کو حیرت ہے کہ ہر بات پہ حیران ہیں لوگ
آئینہ خانۂ نیرنگ میں رہتے ہوئے بھی

چاہیے اپنے کناروں سے گذرتے رہنا
درد کی لہر کو آہنگ میں رہتے ہوئے بھی

کیا کرشمہ ہے کہ کچھ اور نمو کرتا ہے
وہ بدن پیرہنِ تنگ میں رہتے ہوئے بھی

جانے یہ لذّتِ پیوست کہاں سے آئی
تم سے اس دوریِ فرسنگ میں رہتے ہوئے بھی

آؤ ان پر سخن آباد کا در کھولتے ہیں
لفظ مرجاتے ہیں فرہنگ میں رہتے ہوئے بھی

یہ خرابہ بھی کبھی خطۂ یونان تھا کیا
میں جگر چاک اسی خاک پہ حیران تھا کیا

اس کے ہنسنے کی یہ آواز کہاں سے آئی
دستِ مستانہ میں پھر اپنا گریبان تھا کیا

سبزہ و گل کے تکلف کی ضرورت کیا تھی
اس سے پہلے ترا معمورہ بیابان تھا کیا

کس لیے باغ لگائے تھے صف آراؤں نے
آگ سے بچ کے نکل آنے کا امکان تھا کیا

آخر اس قید میں جینے کا ہنر سیکھ لیا
توڑ دینا تری زنجیر کو آسان تھا کیا

لوگ ہر شخص کو اپنے ہی پہ کرتے ہیں قیاس
میں جب آسودہ نہیں تھا تو پریشان تھا کیا

مجھ سے ملنے کو وہ بلقیس نہ آئی نہ سہی
رنج کس بات کا میں کوئی سلیمان تھا کیا

حق فتحیاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا
تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا

جب حشر اسی زمیں پہ اٹھائے گئے تو پھر
برپا یہیں پہ روز جزا کیوں نہیں ہوا

وہ شمع بجھ گئی تھی تو کہرام تھا تمام
دل بجھ گئے تو شور عزا کیوں نہیں ہوا

واماندگاں پہ تنگ ہوئی کیوں تری زمیں
دروازہ آسمان کا وا کیوں نہیں ہوا

وہ شعلہ ساز بھی اسی بستی کے لوگ تھے
ان کی گلی میں رقصِ ہوا کیوں نہیں ہوا

آخر اسی خرابے میں زندہ ہیں اور سب
یوں خاک کوئی میرے سوا کیوں نہیں ہوا

کیا جذبِ عشق مجھ سے زیادہ تھا غیر میں
اس کا حبیب اس سے جدا کیوں نہیں ہوا

جب وہ بھی تھے گلوے بریدہ سے نالہ زن
پھر کشتگاں کا حرف رسا کیوں نہیں ہوا

کرتا رہا میں تیرے لیے دوستوں سے جنگ
تو میرے دشمنوں سے خفا کیوں نہیں ہوا

جو کچھ ہوا وہ کیسے ہوا جانتا ہوں میں
جو کچھ نہیں ہوا وہ بتا کیوں نہیں ہوا

اس نے بیکار یہ بہروپ بنایا ہوا ہے
ہم نے جادو کا اک آئینہ لگایا ہوا ہے

دو جگہ رہتے ہیں ہم، ایک تو یہ شہرِ ملال
ایک وہ شہر جو خوابوں میں بسایا ہوا ہے

رات اور اتنی مسلسل، کسی دیوانے نے
صبح روکی ہوئی ہے چاند چرایا ہوا ہے

عشق سے بھی کسی دن معرکہ فیصل ہوجائے
اس نے مدت سے بہت حشر بڑھایا ہوا ہے

لغزشیں کون سنبھالے کہ محبت میں یہاں
ہم نے پہلے ہی بہت بوجھ اٹھایا ہوا ہے

بانوئے شہر ہمیں تجھ سے ندامت ہے بہت
ایک دل ہے سو کسی اور پہ آیا ہوا ہے

❁

پلٹ کے آیا ہے کیا اس کے در سے آخری بار
یہ پوچھنا ہے دلِ معتبر سے آخری بار

کسی طرح شبِ گریہ کو صبح تک لے جاؤ
گذر رہے ہیں یہ لشکر ادھر سے آخری بار

بہار برگ و ثمر آتی جاتی رہتی ہے
اڑے نہیں ہیں یہ طائر شجر سے آخری بار

نئے جہان کے نقشے بنا بھی سکتے ہیں
جو لوگ نکلے ہیں آج اپنے گھر سے آخری بار

عجب نہیں ہے کہ ہاتھ اس کا ہاتھ میں آجائے
اٹھاؤ فائدہ طولِ سفر سے آخری بار

جلا رہے یہ فغاں کا چراغ مقتل میں
ہے کچھ اجالا اسی کے اثر سے آخری بار

❁

پلٹ کے آیا ہے کیا اس کے در سے آخری بار
یہ پوچھنا ہے دلِ معتبر سے آخری بار

کسی طرح شبِ گریہ کو صبح تک لے جاؤ
گذر رہے ہیں یہ لشکر ادھر سے آخری بار

بہار برگ و ثمر آتی جاتی رہتی ہے
اڑے نہیں ہیں یہ طائر شجر سے آخری بار

نئے جہان کے نقشے بنا بھی سکتے ہیں
جو لوگ نکلے ہیں آج اپنے گھر سے آخری بار

عجب نہیں ہے کہ ہاتھ اس کا ہاتھ میں آجائے
اٹھاؤ فائدہ طولِ سفر سے آخری بار

جلا رہے یہ فغاں کا چراغ مقتل میں
ہے کچھ اجالا اسی کے اثر سے آخری بار

وہ بہت دور کہیں انجمن آرا ہی تو ہے
میں ستارہ اسے کہتا تھا، ستارہ ہی تو ہے

ابھی کس بات پہ آزردہ ہے دنیا مجھ سے
اس کو پایا تو نہیں، اس کو پکارا ہی تو ہے

باغ کی سمت دریچہ میں کہاں کھولتا تھا
یہ بھی میرے گلِ خوبی کا اشارہ ہی تو ہے

شہر یاروں پہ ہنسی آتی ہے بیچاروں نے
جیسے دنیا میں مرا رزق اتارا ہی تو ہے

آسماں سر پہ رہے، بند سہی شہر پناہ
کہیں رک جاؤں گا شب بھر کا گذارہ ہی تو ہے

لوگ کیوں مجھ کو بلاتے ہیں کنارے کی طرف
میں جہاں ڈوب رہا ہوں وہ کنارہ ہی تو ہے

دل کا جو حال ہوا دشمن جانی کا نہ ہو
آخرِ شب کبھی آغاز کہانی کا نہ ہو

لوگ کیا جانیں کہ گزرے ہوئے موسم کیا تھے
جب قبا پر کوئی پیوند نشانی کا نہ ہو

ہم کہاں قید میں رہ سکتے تھے لیکن ترا ہاتھ
ہے وہ زنجیر کہ احساس گرانی کا نہ ہو

مسکراتا ہوں تو اکثر یہ خیال آتا ہے
آنکھ میں نم ابھی برسے ہوئے پانی کا نہ ہو

عرضِ احوال پہ دنیا مرا منھ دیکھتی ہے
جیسے رشتہ کوئی الفاظ و معانی کا نہ ہو

اور کچھ دیر ابھی سیر سرِ ساحل کی جائے
جب تلک حکم سفینے کو روانی کا نہ ہو

مرا قاتل فغاں کرنے کو نکلا
نیا قصہ بیاں کرنے کو نکلا

ہواؤں کے بلاوے کا بہانہ
مجھے بے خانماں کرنے کو نکلا

نواحِ جاں میں سناٹا تھا کب سے
سو میں سیرِ جہاں کرنے کو نکلا

ہوئی شام اور چھت پر اک ستارہ
زمیں کو آسماں کرنے کو نکلا

اچانک طاق سے اک شعلۂ شب
مرے گھر میں دھواں کرنے کو نکلا

یوں ہی یہ رات کیا کم تھی کہ مہتاب
اسے کوہِ گراں کرنے کو نکلا

میں پاکر خاک پر آویزۂ گم
تلاشِ کارواں کرنے کو نکلا

کنارے پر کھڑا تھا مدتوں سے
مجھے دریا رواں کرنے کو نکلا

تجھے کیا خوش نظر آتے ہیں ہم لوگ
کہ رنجِ رفتگاں کرنے کو نکلا

مرے رہزن کا تھا جو کارِ مقصود
وہ میرا پاسباں کرنے کو نکلا

طنابیں کٹ گئیں جب جسم و جاں کی
تو کوئی سائبان کرنے کو نکلا

کسی کا حکم پا کر حاکمِ وقت
کماں داروں سے ہاں کرنے کو نکلا

پسِ گرد ستم چمکی کوئی چیز
کوئی حیلہ گماں کرنے کو نکلا

سفر کیا ہے عجب اہتمام کرتے ہوئے
جہاں سے کوچ وہیں پر قیام کرتے ہوئے

وہ ناگہاں مرے سینے میں آ کے بیٹھ گیا
ارادہ، فرسِ تیزگام کرتے ہوئے

شکار گاہِ محبت بھی خوب ہے کہ وہ شخص
ہوا اسیر مجھے زیرِ دام کرتے ہوئے

میں پھر خرابۂ جاں کی طرف پلٹ آیا
سیاحتِ یمن و روم و شام کرتے ہوئے

عجیب کھیل ہے، اہلِ ستم کو دیکھتا ہوں
صدائے گریہ پسِ قتلِ عام کرتے ہوئے

ہنر ملا ہے غزل کی زبان بولنے کا
تم ایسے کم سخنوں سے کلام کرتے ہوئے

ہم پہ احسان نہ کر شمع جلا کر بابا
دل کی جھولی میں پڑے ہیں مہ و اختر بابا

رک گئے ہم ترے کوچے میں کہ گم گشتہ جہاز
ڈال دیتے ہیں جزیروں پہ بھی لنگر بابا

سیرِ افلاک ہمارا کوئی معمول نہیں
لہر آئے تو لگا آتے ہیں چکر بابا

یہ چمک سی جو سخن میں نظر آتی ہے تجھے
ہم نے اس خاک میں بو رکھے ہیں گوہر بابا

دل کو مجبور نہ کر اپنی اطاعت کے لیے
یہ علاقہ ہے ترے ملک سے باہر بابا

قتل ہونا ہی مقدر ہے تو کیا دیکھنا ہے
مہر کس کس کی لگی ہے سرِ محضر بابا

جا، تجھے پھول کھلانے کی دعا دی ہم نے
تو نے جس شاخ کو توڑا ہے اسی پر، بابا

رات پھر جمع ہوئے شہرِ گریزاں والے
وہی چہرے تھے مرے دیدۂ حیراں والے

سارے آشفتہ سراں ان کے تعاقب میں رواں
وحشتیں کرتے ہوئے چشمِ غزالاں والے

چاند تاروں کی رداؤں میں چھپائے ہوئے جسم
اور انداز وہی خنجرِ عریاں والے

پاس داروں کا سرا، پردۂ دولت پہ ہجوم
سلسلے چھت کی فصیلوں پہ چراغاں والے

نارسائی پہ بھی وہ لوگ سمجھتے تھے کہ ہم
شہرِ بلقیس میں ہیں ملک سلیماں والے

پھر کچھ اس طرح پڑے حلقۂ زنجیر میں پاؤں
سب جنوں بھول گئے دشت و بیاباں والے

میں بھی اک شامِ ملاقات کا مارا ہوا ہوں
مجھ سے کیا پوچھتے ہیں وادیِ ہجراں والے

اب انھیں ڈھونڈ رہا ہوں جو صدا دیتے تھے
''ادھر آبے ارے او چاک گریباں والے''

جس دل کو لذتِ سخنِ آرائی چاہیے
تھوڑا سا دکھ، بہت سی شکیبائی چاہیے

ایک حرفِ دل نواز سے آسودہ کر مجھے
یوسف نہیں ہوں میں کہ زلیخائی چاہیے

قائم ہیں اپنی وضع پہ ہم سرکشیدہ لوگ
بس قاتلوں کی حوصلہ افزائی چاہیے

انبوہِ دلبراں، میں وہ چہرہ نہ بھول جاؤں
کچھ دیر کے لیے مجھے تنہائی چاہیے

کرتا ہے مجھ سے روز کمالِ سخن سوال
تشہیر چاہیے کہ پذیرائی چاہیے

عذابِ جاں بھی غرور ہنر بھی ختم ہوا
سخن بھی ختم ہوئے دردِ سر بھی ختم ہوا

زمیں بھی پاؤں تلے سے نکل گئی کب کی
فلک کا جادوئے بالائے سر بھی ختم ہوا

نمودِ نو میں بھی مٹی کسی کے کام نہ آئی
سو آج وہمِ دلِ کوزہ گر بھی ختم ہوا

جو موج آئی سروں سے گذر گئی آخر
مگر دلوں سے سمندر کا ڈر بھی ختم ہوا

وہ اک ندی سی جو تھی دشتِ جاں میں سوکھ گئی
چلو یہ مرحلۂ خشک و تر بھی ختم ہوا

محمود ایاز کی وفات پر

غبارِ شام میں صورت نظر نہیں آتی
صدائے ناقہ سواراں ادھر نہیں آتی

سوادِ شب کے ادھر ہیں ہزار ہا مہتاب
کوئی کرن سر دیوار و در نہیں آتی

نگاہ اٹھے تو چاک جگر رفو ہوجائے
کس کو اب یہ ادائے ہنر نہیں آتی

ہمیں عبث ہے سکوتِ گذشتگاں کا ملال
یہاں تو ہم سفروں کی خبر نہیں آتی

شگفتِ غنچہ ہوائے سحر سے ہو کہ نہ ہو
وہ موجِ رفتہ تو اب لوٹ کر نہیں آتی

جنگل میں ایک رات

مالا کے بن میں رتجگے کرتی ہوئی ہریالیاں
جگنو جلاتے مشعلیں، پتے بجاتے تالیاں
اندر کہیں مردنگ سا بجتا ہوا سناہٹا
باہر کوئی آسیب سا گاتا ہوا قوالیاں
آنکھوں سے اوجھل سرحدیں گھیرے گھنیرے ڈھاک کی
اک دائرے میں گھومتی پیچاک راہیں کالیاں
رم خوردگاں سنتے ہوئے پیکِ اجل کی آہٹیں
ہاریں کمندیں بازیاں، جیتیں زقندیں پالیاں
دھمتال کرتی چھال میں چالاک تھا روٗ زادیاں
گھگھروں میں تارے آئنے، کانوں میں چندا بالیاں
جنگل میں پڑتی ہے بھرن، چاہے تو بھر لے جان وتن
یہ کھیتیاں ہیں سوکھیاں، یہ جھولیاں ہیں خالیاں
اس جنتِ سفاک میں اے جان، دونوں ہیچ ہیں
میری پریشاں حالیاں، تیری بلند اقبالیاں

مژگاں اٹھا، اشارۂ پیکاں میں بات کر
اے جاں طلب، محاورۂ جاں میں بات کر

یا برگ ریزِ ہُو میں نہ ہو ہم سے ہم کلام
یا لہجۂ ہوائے بہاراں میں بات کر

کیا یوں ہی محوِ جامہ دری میں ہمارے ہاتھ
کچھ دیکھ کر تو اپنے گریباں میں بات کر

ممکن نہیں مکالمۂ درد ،شہر میں
اچھا یہ بات ہے!، تو بیاباں میں بات کر

کیوں رشک ہے کہ بول رہے ہیں ہمارے زخم
تو بھی زبانِ سادہ و آساں میں بات کر

پیشِ حبیب طولِ سخن اور بات ہے
اک روز جا کے بزمِ رقیباں میں بات کر

جوہر ہماری خاک میں برق و شرر کا ہے
تو لعل چاہتا ہے بدخشاں میں بات کر

اسی دنیا میں مرا کوئے نگاراں بھی تو ہے
ایک گھر بھی تو ہے، اک حلقۂ یاراں بھی تو ہے
آ ہی جاتی ہے کہیں موجِ ہوائے نمناک
اس مسافت میں کہیں خطۂ باراں بھی تو ہے
راستوں پر تو ابھی برگِ خزاں اڑتے ہیں
خیر اطراف میں خوشبوئے بہاراں بھی تو ہے
کچھ نظر آتی نہیں شہر کی صورت ہم کو
ہر طرف گردِ رہِ شاہ سواراں بھی تو ہے
حاکمِ وقت کو یوں بھی نہیں گوشِ فریاد
اور پھر تہنیتِ نذر گزاراں بھی تو ہے
ایسے آشوب میں کس طرح سے چُپ بیٹھا جائے
خون میں تاب وتبِ حوصلہ داراں بھی تو ہے

جب بھی کی ہم رہی بادِ بہاری ہم نے
خاک پر آکے نظر اپنی اتاری ہم نے

ہم ہر اک شخص کی دعوت پہ کہاں جاتے ہیں
پھیر دی ہے مہ و انجم کی سواری ہم نے

لوگ اب کیا سببِ وحشتِ جاں پوچھتے ہیں
جب رہا کردیئے آہوئے تتاری ہم نے

بانوئے شہر کو ہے ہم سے تقاضا بیکار
اپنے دلبر کی نہ کی آئینہ داری ہم نے

موجِ خوں نے کسے سیراب کیا ہے اب تک
لے کے کیا کرنا ہے یہ چشمۂ جاری ہم نے

عمر بھر ہم سے وہ اک حرف کی دوری پہ رہے
اور نہ سیکھا ہنرِ عرض گزاری ہم نے

خشک ہوتا ہی نہیں دیدۂ تر پانی کا
یم بہ یم آج بھی جاری ہے سفر پانی کا

دیکھنے میں وہی تصویر ہے سیرابی کی
اور دل میں ہے کوئی نقشِ دگر پانی کا

کون مشکیزی سرِ نیزہ علم ہوتا ہے
دیکھئے دشت میں لگتا ہے شجر پانی کا

آج تک گریہ کناں ہے اسی حسرت میں فرات
کاش ہوتا درِ شبیر پہ سر پانی کا

تیری کھیتی لبِ دریا ہے تو مایوس نہ ہو
اعتبار اتنا مری جان نہ کر پانی کا

❁

مُجھکو جانا ہے ذرا ہم سفروں سے آگے
اُنکی آنکھوں سے پرے، اپنے پروں سے آگے

ہم جو یہ جان بچانے کا ہنر جانتے ہیں
کچھ رہ درسم تھی بیدار گروں سے آگے

تم کو اے خیرہ سرد، ہم پہ فضیلت کیا ہے
بس وہی طرّۂ دستار سروں سے آگے

وہیں رہ جاتے ہیں سب حد سے گزرنے والے
چلتی رہتی ہے زمیں بے خبروں سے آگے

عمر بھر بصرہ وبغداد بساتے رہے لوگ
اور دیکھا تو وہی دشت گھروں سے آگے

درد کے فیض سے دل عیش دو عالم سے غنی
عشق کے راج میں ہم تاجوروں سے آگے

کلام بخطِ شاعر

ایسا تو نہیں کہ ان سے ملاقات نہیں ہوئی
جو بات میرے دل میں تھی وہ بات نہیں ہوئی

[illegible]
ہم کو تو خیر جنسِ قناعت بھی تھی قبول
اس رزق پر مگر گزر اوقات نہیں ہوئی

تیرے بغیر بھی غمِ جاں ہے وہی کہ ہیں
نکلا اگر نہ چاند تو کیا رات نہیں ہوئی

ہم کون ہیں جو دل زدگاں ہیں کہ عشق میں
یاراں تیرے ہجروں سے کرامات نہیں ہوئی

بہتر یہ ہے وہ پیکرِ شاداب ادھر نہ آئے
برسوں سے دل کے شہر میں برسات نہیں ہوئی

اک بوسہ ہے کہ جان چھڑالی دوا سے
رشوت ہوئی حضور یہ سوغات نہیں ہوئی

کب تک اس انتظار میں مہمان ہو چلے
اب تک نئے جہاں کی شروعات نہیں ہوئی

کُٹیا میں مجھ گدا کا وہ توشہ پڑا ہوا
ٹھوکر پہ مارتا ہوں خزانہ پڑا ہوا

کچھ بس چلا نہ مرحبیِ روزگار کا
گردن میں تھا جو جبّۂ مولا پڑا ہوا

پشتوں سے ہیں سگِ درِ حیدر ہوں دیکھ لو
گردن میں میری کس کا ہے پٹّا پڑا ہوا

اور یہ بھی دیکھ لو اسی نسبت کے فیض سے
پیروں پہ ہے مرے سگِ دنیا پڑا ہوا

خورشیدِ حشر، آلِ حبیبِ علی ہوں میں
ہے سر پہ اُن سحاب کا سایہ پڑا ہوا

سورج کو مل گئی درِ دولت کی چاکری
سیّارگاں کی صف میں ہے غوغا پڑا ہوا

مقصودِ جاں ہے جاذبۂ سفرِ بوتراب
اور راہ میں ہے جسم کا مُردا پڑا ہوا

بخشش بھی بے حساب، سعادت بھی بے حساب
ہے مدح گو کو مدح کا چسکا پڑا ہوا

زر تاب تیرا قریہ ویران کر دیا
میرے لہو نے سب سر و سامان کر دیا

ان تیز آندھیوں میں سحر تک جلا کیے
ہم نے شب سیاہ کو حیران کر دیا

اس بار یوں ہوا کہ اندھیروں کی فوج کو
دو چار جگنوؤں نے پریشان کر دیا

کمزور طائروں کو بھی کیا تیر تند نے
شاہیں بچوں سے دست و گریباں کر دیا

دست ستم کا حملہ گو کارگر نہ ہو سکا
تیرا اشارہ میرے جسم کا نقصان کر دیا

سینے پہ نیزہ، پشت پہ دیوار سنگ تھی
تنگ آ کے ہم نے جنگ کا اعلان کر دیا

وہ آفتیں پڑیں کہ خدا یاد آ گیا
ان حادثوں نے مجھ کو مسلمان کر دیا

وہ درد ہے کہ دل سے نکلتا نہیں سراج
ہم نے سپرد خانۂ بہ جان کر دیا

عرفان بزم بادہ و گل تھی زمین شعر
تم نے تو اس کو حشر کا میدان کر دیا

سخن میں موسمِ گل اُن کے نام سے آئے
پڑھوں سلام تو خوشبو کلام سے آئے

شگفتِ اسمِ محمد ﷺ کا وقت ہے دل میں
یہاں نسیمِ سحر احترام سے آئے

وہی سراجِ منیر آخری ستارۂ غیب
اجالے جس کے اُسی ماہِ تمام سے آئے

وہ جس کو نانِ جویں بخش دیں اُنھی کے لیے
خراجِ مملکتِ روم و شام سے آئے

اُنھیں سے ہو دل و جاں پر سکینتوں کا نزول
قرار اُن کے ہی فیضانِ عام سے آئے

اُنھیں کے نام سے قائم رہے وجود مرا
نمو کی تاب اُنھیں کے پیام سے آئے

میں اُن کا حرفِ ثنا اپنی دھڑکنوں میں سنوں
وہی صدا مرے دیوار و بام سے آئے

یہ بے کسانِ گرفتار سب اُنھیں کے طفیل
نکل کے حلقۂ زنجیر و دام سے آئے

امیر ہم سے تو اے تاجور زیادہ نہیں
ہمارے اشکوں سے تیرے گہر زیادہ نہیں

احد سے کرب و بلا تک شمار کر دیکھو
حق اس طرف ہی ملے گا جدھر زیادہ نہیں

ستم کے سامنے تنہا کھڑا ہوں میدان میں
تمہیں انتظار کرانا مگر زیادہ نہیں

وہ باب علم ہیں احمد حال دل سمجھے ہیں
ضرورت سخن مختصر زیادہ نہیں

گذارنا ہے ہمیں وقت ایک لمحہ بھر
کہ عمر خضر پیدا اگر زیادہ نہیں

نکلے تو کوئی اندھیرے سے روشنی کی طرف
یہ فاصلہ تو بہت ہے سفر زیادہ نہیں

متاع جاں تو ہے حوالہ کی اس شہر کا پاس
سمجھ کے نذر گزاروں اگر زیادہ نہیں

سو ہم تدبیرِ فراموشی پہ سب اشعار کر دیں گے
وہ ہم سے کہہ رہا ہے کیا تجھے بیمار کر دیں گے

وہی سچ ہے جو آنکھوں سے ہویدا ہوتا رہتا ہے
اگر ہر ترجماں سے پوچھو گے تو وہ انکار کر دیں گے

بدن کی ریت پر اب تک اسی وعدے کا سایہ ہے
ہم آئیں گے تو تیرے دشت کو گلزار کر دیں گے

بتانِ شہر سے یہ دل تو زندہ ہو نہیں سکتا
بہت ہوگا تو میری خواہشیں بیدار کر دیں گے

مرے قاتل کا یہ کتنا قیامت استعارہ ہے
کہ ہم ابرو ہی کیا سارا بدن تلوار کر دیں گے

ابھی دیوارِ جاں ہی سے الجھنے دو کہ وحشی ہیں
اگر چھیڑا تو دیوارِ جہاں مسمار کر دیں گے

کسی کو شہر میں سیلِ بلا کی زد پہ آنا ہے
چلو یہ کام میرے ہی در و دیوار کر دیں گے

حاصل نہیں کچھ وصل کے ارماں سے زیادہ
وحشی ہے سخن میرا غزالاں سے زیادہ

لذّت میں وہ لب کیوں شکر افشاں نہیں ہوں گے
قیمت میں جو ہیں لعلِ بدخشاں سے زیادہ

کیا تنگ لباسی ہے کہ وہ پیکرِ خوبی
قاتل ہے کبھی خنجرِ عریاں سے زیادہ

ہم ساتھ تھے اور کچھ مرے ہاتھوں میں نہیں تھا
اُس رات ترے دستِ گریزاں سے زیادہ

کیا سہل نہ تھا کوئی ہدف اے تنِ سفّاک
مجھ سادہ دل و مردِ مسلماں سے زیادہ

یہ خون کے اُترتے ہوئے دریا کی تب و تاب
اک سیر کرو موجِ چراغاں سے زیادہ

دیکھو میں کوئی یوسفِ ثانی بھی نہیں ہوں
اُلجھو نہ مرے پیرہنِ جاں سے زیادہ

وہ آگ تو بجھنے بھی لگی اور میں ابھی تک
روشن ہوں چراغِ شبِ ہجراں سے زیادہ

لب خاموش سے یا صوت و صدا سے بولو
اپنا خوں صرف کرو اپنی نوا سے بولو

آسمانوں پہ بہت دیر سے سناٹا ہے
اب تو آرام کرے دستِ دعا سے بولو

ریت کا ڈھیر ہیں صحرا ہی میں رہنا ہے ہمیں
کیوں عبث شور مچاتی ہے ہوا سے بولو

جانے تم کیا کہو، کیا اُس کی سمجھ میں آ جائے
کاہے کو وحشیِ زنجیر بہ پا سے بولو

کبھی جی چاہا تو کر لیں گے تماشائے بہار
ہم ابھی سیر سے لوٹے ہیں صبا سے بولو

عشق کی آمدنی، درد کی مزدوری کیا
اور کچھ کام کریں۔ اہلِ وفا سے بولو

ہر برس جس سے وہ کترا کے گزر جاتی ہے
ہم اُسی شہر میں زندہ ہیں گھٹا سے بولو

کینوس

(منتخب کلام)

میں اپنے وقت سے آگے نکل گیا ہوتا
مگر زمیں بھی میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی

اس تکلف سے نہ پوشاکِ بدن گیر میں آ
خواب کی طرح کبھی خواب کی تعبیر میں آ

میں بھی اے سرخیِ بے نام تجھے پہچانوں
تو حنا ہے کہ لہو، پیکرِ تصویر میں آ

اس کے حلقے میں تگ و تاز کی وسعت ہے بہت
آہوئے شہر، مری بانہوں کی زنجیر میں آ

چارہ گر خیر سے خوش ذوق ہے اے میری غزل
کام اب تو ہی مرے درد کی تشہیر میں آ

وہ بھی آمادہ بہت دن سے ہے سننے کے لیے
اب تو اے حرفِ طلب معرضِ تقریر میں آ

ایک رنگ آخری منظر کی دھنک میں کم ہے
موجِ خوں، اٹھ کے ذرا عرصۂ شمشیر میں آ

قدم اٹھے تو گلی سے گلی نکلتی رہی
نظر دیے کی طرح چوکھٹوں پہ جلتی رہی

کچھ ایسی تیز نہ تھی اس کے انتظار کی آنچ
یہ زندگی ہی مری برف تھی پگھلتی رہی

سروں کے پھول سرِ نوکِ نیزہ ہنستے رہے
یہ فصل سوکھی ہوئی ٹہنیوں پہ پھلتی رہی

ہتھیلیوں نے بچایا بہت چراغوں کو
مگر ہوا ہی عجب زاویے بدلتی رہی

دیارِ دل میں کبھی صبح کا گجر نہ بجا
بس ایک درد کی شب ساری عمر ڈھلتی رہی

میں اپنے وقت سے آگے نکل گیا ہوتا
مگر زمیں بھی میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی

چراغ دینے لگے گا دھواں، نہ چھو لینا
تو میرا جسم کہیں میری جاں نہ چھولینا

زمیں چھٹی تو بھٹک جاؤ گے خلاؤں میں
تم اڑتے اڑتے کہیں آسماں نہ چھولینا

نہیں تو برف سا پانی تمہیں جلا دے گا
گلاس لیتے ہوئے انگلیاں نہ چھولینا

ہمارے لہجے کی شائستگی کے دھوکے میں
ہماری باتوں کی گہرائیاں نہ چھولینا

اُڑے تو پھر نہ ملیں گے رفاقتوں کے پرند
شکایتوں سے بھری ٹہنیاں نہ چھو لینا

مروتوں کو محبت نہ جاننا، عرفان
تم اپنے سینے سے نوکِ سناں نہ چھولینا

مروّتوں پہ وفا کا گماں بھی رکھتا تھا
وہ آدمی تھا غلط فہمیاں بھی رکھتا تھا

بہت دنوں میں یہ بادل ادھر سے گزرا ہے
مرا مکان کبھی سائباں بھی رکھتا تھا

عجیب شخص تھا، بچتا بھی تھا حوادث سے
پھر اپنے جسم پہ الزامِ جاں بھی رکھتا تھا

ڈبو دیا ہے تو اب اس کا کیا گلہ کیجیے
یہی بہاؤ سفینے رواں بھی رکھتا تھا

تو یہ نہ دیکھ کہ سب ٹہنیاں سلامت ہیں
کہ یہ درخت تھا اور پتیاں بھی رکھتا تھا

ہر ایک ذرہ تھا گردش میں آسماں کی طرح
میں اپنا پاؤں زمیں پر جہاں بھی رکھتا تھا

لپٹ بھی جاتا تھا اکثر وہ میرے سینے سے
اور ایک فاصلہ سا درمیاں بھی رکھتا تھا

جھلس رہے ہیں کڑی دھوپ میں شجر میرے
برس رہا ہے کہاں ابرِ بے خبر میرے

گرا تو کوئی جزیرہ نہ تھا سمندر میں
کہ پانیوں پہ کھلے بھی بہت تھے پر میرے

اب اس کے بعد گھنے جنگلوں کی منزل ہے
یہ وقت ہے کہ پلٹ جائیں ہمسفر میرے

خبر نہیں ہے مرے گھر نہ آنے والے کو
کہ اس کے قد سے تو اونچے ہیں بام و در میرے

بہت ہے آئنے جن قیمتوں پہ بک جائیں
یہ پتھروں کا زمانہ ہے، شیشہ گر میرے

حریفِ تیغِ ستم گر تو کر دیا ہے تجھے
اب اور مجھ سے تو کیا چاہتا ہے سر میرے

مجھے الجھا دیا دانش کدوں نے صرف خوابوں میں
کوئی تعبیر رکھ دو میرے بچوں کی کتابوں میں

طلسم ایسا تو ہو جو خوبصورت ہو حقیقت سے
ہنر یہ بھی نہیں ہے آج کے افراسیابوں میں

تعلق اک تعارف تک سمٹ کر رہ گیا آخر
نہ وہ تیزی سوالوں میں نہ وہ تلخی جوابوں میں

مکاں کیسے بھی ہوں، خوابوں کی خاطر کون ڈھاتا ہے
کم از کم اس قدر ہمت تو تھی خانہ خرابوں میں

ذرا سوچو تو اس دنیا میں شاید کچھ نہیں بدلا
وہی کانٹے ببولوں کے، وہی خوشبو گلابوں میں

❁

کہیں تو لٹنا ہے پھر نقدِ جاں بچانا کیا
اب آ گئے ہیں تو مقتل سے بچ کے جانا کیا

ان آندھیوں میں بھلا کون ادھر سے گزرے گا
دریچے کھولنا کیسا، دیے جلانا کیا

جو تیر بوڑھوں کی فریاد تک نہیں سنتے
تو ان کے سامنے بچوں کا مسکرانا کیا

میں گر گیا ہوں تو اب سینے سے اُتر آؤ
دلیر دشمنو، ٹوٹے مکاں کو ڈھانا کیا

نئی زمیں کی ہوائیں بھی جان لیوا ہیں
نہ لوٹنے کے لیے کشتیاں جلانا کیا

کنارِ آب کھڑی کھیتیاں یہ سوچتی ہیں
وہ نرم رو ہے ندی کا مگر ٹھکانا کیا

نرم جھونکے سے یہ اک زخم سا کیا لگتا ہے
اے ہوا، کچھ ترے دامن میں چھپا لگتا ہے

ہٹ کے دیکھیں گے اسے رونقِ محفل سے کبھی
سبز موسم میں تو ہر پیڑ ہرا لگتا ہے

وہ کوئی اور ہے جو پیاس بجھاتا ہے مری
ابر پھیلا ہوا دامانِ دعا لگتا ہے

اے لہو میں تجھے مقتل سے کہاں لے جاؤں
اپنے منظر ہی میں ہر رنگ بھلا لگتا ہے

ایسی بے رنگ بھی شاید نہ ہو کل کی دنیا
پھول سے بچوں کے چہروں سے پتا لگتا ہے

دیکھنے والو، مجھے اس سے الگ مت جانو
یوں تو ہر سایہ ہی پیکر سے جدا لگتا ہے

زرد دھرتی سے ہری گھاس کی کونپل پھوٹی
جیسے اک خیمہ سرِ دشتِ بلا لگتا ہے

موجِ خوں بن کر کناروں سے گزر جائیں گے لوگ
اتنی زنجیروں میں مت جکڑو، بکھر جائیں گے لوگ

قاتلوں کے شہر میں بھی زندگی کرتے رہے
لوگ شاید یہ سمجھتے تھے کہ مر جائیں گے لوگ

ان گنت منظر ہیں اور دل میں لہو دو چار بوند
رنگ آخر کتنی تصویروں میں بھر جائیں گے لوگ

جسم کی رعنائیوں تک خواہشوں کی بھیڑ ہے
یہ تماشا ختم ہوجائے تو گھر جائیں گے لوگ

جانے کب سے ایک سناٹا بسا ہے ذہن میں
اب کوئی ان کو پکارے گا تو ڈر جائیں گے لوگ

بستیوں کی شکل و صورت مختلف کتنی بھی ہو
آسماں لیکن وہی ہوگا جدھر جائیں گے لوگ

سرخرو ہونے کو اک سیلاب خوں درکار ہے
جب بھی یہ دریا چڑھے گا پار اتر جائیں گے لوگ

دیکھ لے، آج تری بزم میں بھی تنہا ہوں
میں، جو گزرے ہوئے ہنگاموں کا خمیازا ہوں

جانے کیا ٹھان کے اٹھتا ہوں نکلنے کے لیے
جانے کیا سوچ کے دروازے سے لوٹ آتا ہوں

میرے ہر جزو کا ہے مجھ سے الگ ایک وجود
تم مجھے جتنا بگاڑوگے میں بن سکتا ہوں

مجھ میں رقصاں کوئی آسیب ہے آوازوں کا
میں کسی اجڑے ہوئے شہر کا سناٹا ہوں

اپنا ہی چہرہ انھیں مجھ میں دکھائی دے گا
لوگ تصویر سمجھتے ہیں میں آئینہ ہوں

لمحۂ شوق ہوں، میری کوئی قیمت ہی نہیں
میں میسر تجھے آجاؤں تو کیا مہنگا ہوں

میں جھپٹنے کے لیے ڈھونڈھ رہا ہوں موقع
اور وہ شوخ سمجھتا ہے کہ شرماتا ہوں

ہر جگہ فتنۂ محشر کی علامت ہے وہی
لکھنؤ میں بھی بتوں کا قد وقامت ہے وہی

بات کرنے لگے سناٹے تو معلوم ہوا
اب بھی خاموش زبانوں میں کرامت ہے وہی

کون ہم خانہ خرابوں کو کرے گا برباد
جو اس آشوب میں غارت ہے سلامت ہے وہی

آستیں پر کوئی دھبہ تو نہیں ہے، لیکن
اس کی آنکھوں میں بہر حال ندامت ہے وہی

کم سے کم ایک روایت تو ابھی زندہ ہے
سر وہی ہوں کہ نہ ہوں سنگِ ملامت ہے وہی

موجِ خوں ہو کہ ترے شہر کی دلدار ہوا
یار، جو سر سے گزر جائے قیامت ہے وہی

ذہن ہو تنگ تو پھر شوخیِ افکار نہ رکھ
بند تہہ خانوں میں یہ دولتِ بیدار نہ رکھ

زخم کھانا ہی جو ٹھہرا تو بدن تیرا ہے
خوف کا نام مگر لذتِ آزار نہ رکھ

ایک ہی چیز کو رہنا ہے سلامت پیارے
اب جو سر شانوں پہ رکھا ہے تو دیوار نہ رکھ

خواہشیں توڑ نہ ڈالیں ترے سینے کا قفس
اتنے شہ زور پرندوں کو گرفتار نہ رکھ

اب میں چپ ہوں تو مجھے اپنی دلیلوں سے نہ کاٹ
میری ٹوٹی ہوئی تلوار پہ تلوار نہ رکھ

آج سے دل بھی ترے حال میں ہوتا ہے شریک
لے یہ حسرت بھی مری چشمِ گنہ گار نہ رکھ

وقت پھر جانے کہاں اس سے ملا دے تجھ کو
اس قدر ترکِ ملاقات کا پندار نہ رکھ

وہ ان دنوں تو ہمارا تھا لیکن اب کیا ہے
پھر اس سے آج وہی رنج بے سبب کیا ہے

تم اس کا وار بچانے کی فکر میں کیوں ہو
وہ جانتا ہے مسیحائیوں کا ڈھب کیا ہے

دبیز کہر ہے یا نرم دھوپ کی چادر
خبر نہیں ترے بعد اے غبار شب کیا ہے

دکھا رہا ہے کسے وقت ان گنت منظر
اگر میں کچھ بھی نہیں ہوں تو پھر یہ سب کیا ہے

اب اس قدر بھی سکوں مت دکھا بچھڑتے ہوئے
وہ پھر تجھے نہ کبھی مل سکے عجب کیا ہے

میں اپنے چہرے سے کس طرح یہ نقاب اٹھاؤں
سمجھ بھی جا کہ پس پردۂ طرب کیا ہے

یہاں نہیں ہے یہ دستور گفتگو عرفانؔ
فغاں سنے نہ کوئی، حرفِ زیرِ لب کیا ہے

خوشبو کی طرح ساتھ لگا لے گئی ہم کو
کوچے سے ترے بادِ صبا لے گئی ہم کو

پتھر تھے کہ گوہر تھے، اب اس بات کا کیا ذکر
اک موج بہر حال بہا لے گئی ہم کو

پھر چھوڑ دیا ریگِ سرِ راہ سمجھ کر
کچھ دور تو موسم کی ہوا لے گئی ہم کو

تم کیسے گرے آندھی میں چھتنار درختو؟
ہم لوگ تو پتے تھے، اُڑا لے گئی ہم کو

ہم کون شناور تھے کہ یوں پار اترتے
سوکھے ہوئے ہونٹوں کی دعا لے گئی ہم کو

اس شہر میں غارت گرِ ایماں تو بہت تھے
کچھ گھر کی شرافت ہی بچا لے گئی ہم کو

اپنے آنگن ہی میں تھا، راہگزر میں کیا تھا
ایسا تنہا تھا میں باہر بھی کہ گھر میں کیا تھا

سبز پتوں نے بہت راز چھپا رکھے تھے
رُت جو بدلی تو یہ جانا کہ شجر میں کیا تھا

تھا کمیں گاہ میں سناٹے کا عالم، لیکن
اک نیا رنگ یہ ٹوٹے ہوئے پر میں کیا تھا

تم جو کچھ چاہو وہ تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا تھا

اور کیا دیکھتی دنیا ترے چہرے کے سوا
کم سے کم رنگ تھا سرخی میں، خبر میں کیا تھا

تم یہ دیکھو کہ فقط خاک ہے پیراہن پر
یہ نہ پوچھو کہ مرے رختِ سفر میں کیا تھا

تم بتاتے تو سمجھتی تمہیں دنیا عرفانؔ
فائدہ عرضِ ہنر میں تھا، ہنر میں کیا تھا

ایک ضد تھی، مرا پندارِ وفا کچھ بھی نہ تھا
ورنہ ٹوٹے ہوئے رشتوں میں بچا کچھ بھی نہ تھا

تھا بہت کچھ جو کوئی دیکھنے والا ہوتا
یوں کسی شخص کے چہرے پہ لکھا کچھ بھی نہ تھا

اب بھی چپ رہتے تو مجرم نظر آتے ورنہ
سچ تو یہ ہے کہ ہمیں شوقِ نوا کچھ بھی نہ تھا

یاد آتا ہے کئی دوستیوں سے بھی سوا
اک تعلق جو تکلف کے سوا کچھ بھی نہ تھا

سب تری دین ہے، یہ رنگ، یہ خوشبو، یہ غبار
میرے دامن میں تو اے موجِ ہوا کچھ بھی نہ تھا

اور کیا مجھ کو مرے دیس کی دھرتی دیتی
ماں کا سرمایہ بجز حرفِ دعا کچھ بھی نہ تھا

لوگ خود جان گنوا دینے پہ آمادہ تھے
اس میں تیرا ہنر اے دستِ جفا کچھ بھی نہ تھا

سبز موسم میں ترا کیا تھا، ہوا نے پوچھا
اڑ کے سوکھے ہوئے پتے نے کہا کچھ بھی نہ تھا

شہر میں گلبدناں، سیم تناں تھے کتنے
راہ زن درپئے نقدِ دل و جاں تھے کتنے

خوب ہے سلسلۂ شوق، مگر یاد کرو
دوستو، ہم بھی تو شیدائے بتاں تھے کتنے

کچھ نہ سمجھے کہ خموشی مری کیا کہتی ہے
لوگ دلدادۂ الفاظ و بیاں تھے کتنے

تو نے جب آنکھ جھکائی تو یہ محسوس ہوا
دیر سے ہم تری جانب نگراں تھے کتنے

اب تری گرمیٔ گفتار سے یاد آتا ہے
ہم نفس، ہم بھی کبھی شعلہ زباں تھے کتنے

وقت کے ہاتھ میں دیکھا تو کوئی تیر نہ تھا
روح کے جسم پہ زخموں کے نشاں تھے کتنے

کسی تعبیر نے کھڑکی سے نہ جھانکا، عرفانؔ
شوق کی راہ میں خوابوں کے مکاں تھے کتنے

شبِ درمیاں

(منتخب کلام)

ریت پر تھک کے گرا ہوں تو ہَوا پوچھتی ہے
آپ اس دشت میں کیوں آئے تھے وحشت کے بغیر

دستِ عصائے معجزہ گر بھی اسی کا ہے
گہرے سمندروں کا سفر بھی اسی کا ہے

میرے جہاز اسی کی ہواؤں سے ہیں رواں
میری شناوری کا ہنر بھی اسی کا ہے

لشکر زمیں پہ جس نے اتارے ہیں رات کے
کھلتا ہوا نشانِ قمر بھی اسی کا ہے

آبِ رواں اسی کے اشارے سے ہے سراب
بادل کے پاس گنجِ گہر بھی اسی کا ہے

وہ خشک ٹہنیوں سے اگاتا ہے برگ و بار
موسم تمام اس کے، شجر بھی اسی کا ہے

منظر میں جتنے رنگ ہیں نیرنگ اسی کے ہیں
حیرانیوں میں ذوقِ نظر بھی اسی کا ہے

بس اپنا اپنا فرض ادا کر رہے ہیں لوگ
ورنہ سناں بھی اس کی ہے سر بھی اسی کا ہے

تیغِ ستم کو جس نے عطا کی ہیں مہلتیں
فریادِ کشتگاں میں اثر بھی اسی کا ہے

تیرا یقین سچ ہے مری چشمِ اعتبار
سب کچھ فصیلِ شب کے اُدھر بھی اسی کا ہے

مجرم ہوں اور خرابۂ جاں میں اماں نہیں
اب میں کہاں چھپوں کہ یہ گھر بھی اسی کا ہے

خود کو چراغِ راہ گزر جانتا ہوں میں
لیکن چراغِ راہ گزر بھی اسی کا ہے

سب لقب پاک ہیں سب نام ہیں نامی تیرے
روشنی لکھتی ہے اسمائے گرامی تیرے

حرفِ حق تیرے حوالے سے اجالے کا سراغ
لفظ پائندہ ترے، نقش دوامی تیرے

اذنِ معبود کا مقصود بھی نصرت تیری
مصحفِ نور کے آیات بھی حامی تیرے

سب ستارہ نظراں، خوش ہنراں، چارہ گراں
پیک تیرے، سفری تیرے، پیامی تیرے

بے اماں قریوں پہ دائم تری رحمت کا نزول
حبشی تیرے ہیں حجازی ترے، شامی تیرے

تو غزالو ں کو کمندوں سے بچانے والا
سارے سلطان غلامانِ قیامی تیرے

کشتِ سر سبز ترے فیض کی ہریالی سے
دشت میں نخلِ نمودار تمامی تیرے

میرے الفاظ فقط عجزِ بیاں کا اقرار
کعبؔ و حسّانؔ ترے، سعدیؔ و جامیؔ تیرے

نوریاں مدح سرا خاک نہادوں کی مثال
کہیں محسن، کہیں جبریل سلامی تیرے

سب تری مملکتِ جود و کرم میں آباد
حکم نافذ مرے قوسین مقامی تیرے

تول مت مجھ کو، کہ پاسنگ بہت ہے مجھ میں
میں بھی سونا ہوں مگر زنگ بہت ہے مجھ میں

آؤ میں تم کو تمہارے کئی چہرے دکھلاؤں
آئنہ خانہ ہوں، نیرنگ بہت ہے مجھ میں

میرا دشمن مرے سینے سے اترتا ہی نہیں
غالباً حوصلۂ جنگ بہت ہے مجھ میں

اس نے کیا سوچ کے چھیڑا تھا، میں کیا بول اٹھا
تار کوئی غلط آہنگ بہت ہے مجھ میں

اتنی افسردہ نہ ہو کوچۂ قاتل کی ہوا!
چھو کے تو دیکھ، ابھی رنگ بہت ہے مجھ میں

اے ہوا، کل تیری راہوں پر نشاں میرا بھی تھا
کارواں میں کچھ غبارِ کارواں میرا بھی تھا

اب خیال آتا ہے سب کچھ راکھ ہو جانے کے بعد
کچھ نہ کچھ تو سائباں در سائباں میرا بھی تھا

اس کی آنکھوں میں نہ جانے عکس تھا کس کا، مگر
انگلیوں پر ایک لمسِ رائیگاں میرا بھی تھا

کیا تعاقب کر رہی ہے تشنگی، اے تشنگی
کیا کوئی خیمہ سرِ آبِ رواں میرا بھی تھا

جان پر کب کھیلتا ہے کوئی اوروں کے لیے
ایک بچہ دشمنوں کے درمیاں میرا بھی تھا

شہر کے ایوان اپنی مٹھیاں کھولیں ذرا
اس زمیں پر ایک ٹکڑا آسماں میرا بھی تھا

میں نے جس کو اگلی نسلوں کے حوالے کر دیا
یار، سچ پوچھو تو وہ بارِگراں مرا بھی تھا

شاخ کے بعد زمیں سے بھی جدا ہونا ہے
برگِ افتادہ! ابھی رقصِ ہوا ہونا ہے

ہم تو بارش ہیں خرابے کی ہمیں اگلے برس
در و دیوار کے چہرے پہ لکھا ہونا ہے

سر اگر سر ہے تو نیزوں سے شکایت کیسی
دل اگر دل ہے تو دریا سے بڑا ہونا ہے

کچھ تو کرنا ہے کہ پتھر نہ سمجھ لے سیلاب
ورنہ اس ریت کی دیوار سے کیا ہونا ہے

حرف ہوں، اور پر اسرار بنا دے مجھ کو
کبھی مرہم کبھی تلوار بنا دے مجھ کو

تو نے صحرا میں اگایا ہے تو کچھ کام بھی لے
میں تنک سایہ ہوں، چھتنار بنادے مجھ کو

بارشِ سنگ ہی جب میرا مقدر ہے، تو پھر
اے خدا، شاخِ ثمر دار بنا دے مجھ کو

کوئی سچ میرے سلگتے ہوئے سینے میں بھی ڈال
آگ ہی آگ ہوں، گلزار بنادے مجھ کو

میں کہاں تک دلِ سادہ کو بھٹکنے سے بچاؤں
آنکھ جب اٹھے گنہگار بنادے مجھ کو

باڑھ میں بہتی ہوئی شاخ کا مصرف کیا ہے
ڈوبتے ہاتھ کی پتوار بنادے مجھ کو

جیسے کاغذ پہ کوئی اسم مرادوں والا
میں بگڑ جاؤں، وہ ہر بار بنادے مجھ کو

شہرِ خوف

گلی میں خوف
دریچوں میں خوف
آنکھ میں خوف
فصیلِ شہر پہ سفاک وقت ٹھہرا ہوا
سماعتوں میں پراسرار آہٹوں کا ہجوم
ابھی وہ آئیں گے
میرے شکستہ زینے سے
اور اس مکان کے سارے چراغ، سارے گلاب
مری کتابیں، مرے خواب، میری تصویریں
مرے یقیں
مری ناممکنات کی دنیا
دھواں بنا دیں گے
عجیب زہر لہو میں اترتا جاتا ہے
مگر یہ بچہ جو سوتے میں مسکراتا ہے

مجھے شام ہوئی جنگل میں

جب دھوپ سنہری جاگی
میں قریۂ جاں سے نکلا
آنکھوں میں چھپا اک منظر
بازو پہ بندھی دو آنکھیں
پیروں سے لگی اک چوکھٹ
مٹھی میں دبی اک خوشبو
بارش میں دُھلی اک بستی
چندا سے ملا اک رستہ
مرے تلووں نے پی ڈالے
سب اوس کے موتی قطرے
موسم کی صدا کے پیچھے
سایہ سا، مکاں سے نکلا

پھر منظر بدلا پل میں
مجھے شام ہوئی جنگل میں

یہ شہر ذات بہت ہے اگر بنایا جائے
تو کائنات کو کیوں دردِ سر بنایا جائے

ذرا سی دیر کو رک کر کسی جزیرے پر
سمندروں کا سفر مختصر بنایا جائے

اب ایک خیمہ لگے دشمنوں کی بستی میں
دعائے شب کو نشانِ سحر بنایا جائے

یہی کٹے ہوئے بازو علم کیے جائیں
یہی پھٹا ہوا سینہ سپر بنایا جائے

سنا یہ ہے کہ وہ دریا اتر گیا آخر
تو آؤ پھر اسی ریتی پہ گھر بنایا جائے

عجب مصاف، سکوت و سخن میں جاری ہے
کسے وسیلۂ عرضِ ہنر بنایا جائے

تو انہیں یاد آئے گی اے جوئبار اگلے برس
اب تو لوٹے گی پرندوں کی قطار اگلے برس

اور کچھ دن اس سے ملنے کے لیے جاتے رہو
بستیاں بس جائیں گی دریا کے پار اگلے برس

تم تو سچے ہو مگر دل کا بھروسہ کچھ نہیں
بجھ نہ جائے یہ چراغِ انتظار اگلے برس

پہلے ہم پچھلی رتوں کے درد کا کرلیں حساب
اس برس کے سارے زخموں کا شمار اگلے برس

میں نئے موسم میں برگِ تازہ بن کر آؤں گا
پھر ملیں گے اے ہوائے شاخسار اگلے برس

روح کے معجزوں کا زمانہ نہیں جسم ہی کچھ کرامات کرتے رہیں
اپنے ہونے کا اعلان کرتے رہیں اپنے ہونے کا اثبات کرتے رہیں

برف رت آگئی پھر نئی بستیوں سے نئی ہجرتوں نے پکارا ہمیں
لیکن اس بار پر دیس جاتے ہوئے راستوں پر نشانات کرتے رہیں

پھر کوئی تشنہ لب تیر اس دشت میں ہم تک آیا ہے طے کر کے کتنا سفر
اے رگ جاں کی جوئے رواں ہم بھی کچھ میہماں کی مدارات کرتے رہیں

ایک ہی پیڑ پر سانپ اور آدمی ساتھ رہتے ہیں سیلاب اترنے تلک
ہم سفر ہے اگر دشمن جاں تو کیا راہ سنسان ہے بات کرتے رہیں

جان لینے کا ویسا سلیقہ ابھی لشکر دشمناں میں کسی کو نہیں
آؤ اب اپنے خیموں میں واپس چلیں دوستوں سے ملاقات کرتے رہیں

کوئی بجلی ان خرابوں میں گھٹا روشن کرے
اے اندھیری بستیو تم کو خدا روشن کرے

ننھے ہونٹوں پر کھلیں معصوم لفظوں کے گلاب
اور ماتھے پر کوئی حرفِ دعا روشن کرے

زرد چہروں پر بھی چمکے سرخ جذبوں کی دھنک
سانولے ہاتھوں کو بھی رنگِ حنا روشن کرے

ایک لڑکا شہر کی رونق میں سب کچھ بھول جائے
ایک بڑھیا روز چوکھٹ پر دیا روشن کرے

خیر اگر تم سے نہ جل پائیں وفاؤں کے چراغ
تم بجھانا مت جو کوئی دوسرا روشن کرے

آگ جلتی چھوڑ آئے ہو تو اب کیا فکر ہے
جانے کتنے شہر یہ پاگل ہوا روشن کرے

دل ہی فانوسِ ہوا، دل ہی خس و خارِ ہوس
دیکھنا یہ ہے کہ اس کا قرب کیا روشن کرے

یا تو اس جنگل میں نکلے چاند تیرے نام کا
یا مرا ہی لفظ میرا راستا روشن کرے

پکارتا ہے مگر دھیان میں نہیں آتا
عجیب حرف ہے امکان میں نہیں آتا

بس ایک نام ہے اپنا نشاں جو یاد نہیں
اور ایک چہرہ جو پہچان میں نہیں آتا

میں گوشہ گیر ہوں صدیوں سے اپنے حجرے میں
مصاف بیعت و پیمان میں نہیں آتا

مجھے بھی حکم نہیں شہر سے نکلنے کا
مرا حریف بھی میدان میں نہیں آتا

میں اس ہجوم میں کیوں اس قدر اکیلا ہوں
کہ جمع ہو کے بھی میزان میں نہیں آتا

مرے خدا مجھے اس آگ سے نکال کہ تو
سمجھ میں آتا ہے ایقان میں نہیں آتا

زوالِ شب میں کسی کی صدا نکل آئے
ستارہ ڈوبے ستارہ نما نکل آئے

عجب نہیں کہ یہ دریا نظر کا دھوکا ہو
عجب نہیں کہ کوئی راستہ نکل آئے

وہ حبس ہے کہ دعا کر رہے ہیں سارے چراغ
اب اس طرف کوئی موجِ ہوا نکل آئے

یہ کس نے دستِ بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں نخلِ دعا نکل آئے

خدا کرے صفِ سر دادگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

تم ہمیں ایک دن دشت میں چھوڑ کر چل دیے تھے تمھیں کیا خبر یا اخی
کتنے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر نکلنے میں یہ بال و پر یا اخی

شب گزیدہ دیاروں کے ناقہ سواروں میں مہتاب چہرہ تمھارا نہ تھا
خاک میں مل گئے راہ تکتے ہوئے سب خمیدہ کمر جام و در یا اخی

یہ بھی اچھا ہوا تم اس آشوب سے اپنے سرسبز بازو بچا لے گئے
یوں بھی کوئے زیاں میں لگانا ہی تھا ہم کو اپنے لہو کا شجر یا اخی

جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہے تو پھر میرے دل کی کمیں گاہ میں کون ہے
اک شقی کاٹتا ہے طنابیں مرے خیمہ خواب کی رات بھر یا اخی
نہر اس شہر کی بھی بہت مہرباں ہے مگر اپنا رہوار مت روکنا
ہجرتوں کے مقدر میں باقی نہیں اب کوئی قریہ معتبر یا اخی
زرد پتوں کے بکھرے بدن اپنے ہاتھوں پہ لے کر ہوا نے شجر سے کہا
اگلے موسم میں تجھ پر نئے برگ و بار آئیں گے تب تلک صبر کر یا اخی

سرِ تسلیم ہے خم اذنِ عقوبت کے بغیر
ہم تو سرکار کے مداح ہیں خلعت کے بغیر

سر برہنہ ہوں تو کیا غم ہے کہ اب شہر میں لوگ
برگزیدہ ہوئے دستار فضیلت کے بغیر

دیکھ تنہا مری آواز کہاں تک پہنچی
کیا سفر طے نہیں ہوتے ہیں رفاقت کے بغیر

عشق میں میرؔ کے آداب نہ برتو کہ یہاں
کام چلتا نہیں اعلانِ محبت کے بغیر

ریت پر تھک کے گرا ہوں تو ہَوا پوچھتی ہے
آپ اس دشت میں کیوں آئے تھے وحشت کے بغیر

اک ذرا خم ہو کے میں پیشِ ستم گر بچ گیا
میری پگڑی گر گئی لیکن مرا سر بچ گیا

زندہ رہنے کی خوشی کس لاش سے مل کر مناؤں
کس کھنڈر کو جا کے مژدہ دوں مرا گھر بچ گیا

پیاس کے صحرا میں بچوں پر جو کچھ بیتی نہ پوچھ
ہاں خدا کا شکر، بازوئے برادر بچ گیا

سچ تو یہ ہے دوستو، بیکار ہیں سارے حصار!
لوگ گھر میں لٹ گئے، میں گھر کے باہر بچ گیا

چاہیے کوئی نہ کوئی راستہ سیلاب کو
سر پھری دیوار آخر بہہ گئی، در بچ گیا

زندگی کا مول وہ بھی اس سے کم کیا مانگتے
میں بھی اپنے قاتلوں کو جان دے کر بچ گیا

ایک خط آج اگلے زمانوں کے نام
اک غزل دشت کے ساربانوں کے نام

ایک خیمہ زمیں پر کھجوروں کے پاس
ایک نیزہ بلند آسمانوں کے نام

ایک حرفِ خبر، ساریہ کے لیے
چشمِ بیدار کالی چٹانوں کے نام

نہر کے نام جاگیرِ خوں، دوستو
دولتِ جاں، کڑکتی کمانوں کے نام

تشنگی میرے سوکھے گلے کا نصیب
دودھ کی چھاگلیں میہمانوں کے نام

میری آنکھیں مری آشیانوں کی سمت
میرے پَر میری اونچی اڑانوں کے نام

کتنی موجوں پہ میرے سفینے رواں
کتنے ساحل مرے بادبانوں کے نام

ایک پودا مرے کوئے جاں کا نشاں
ایک محراب میرے مکانوں کے نام

سلطنت، کھلنے والی کمندوں کا اجر
اپنے بچوں کا سکھ بے زبانوں کے نام

آج جو آگ سے آزمائے گئے
کل کی ٹھنڈک ان آشفتہ جانوں کے نام

لکھ رہی ہیں سلگتی ہوئی انگلیاں
دھوپ کے شہر میں سائبانوں کے نام

سات سماوات

(منتخب کلام)

اٹھو یہ منظرِ شب تاب دیکھنے کے لیے
کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لیے

❁

یاد آتی ہوئی خوشبو کی طرح زندہ ہم
کسی گزرے ہوئے موسم کے نمائندہ ہم

اُڑ گئے آنکھ سے جب لمحۂ موجود کے رنگ
رہ گئے نقش گرِ رفتہ و آئندہ ہم

حرفِ نا گفتہ کا خواہاں کوئی ملتا ہی نہیں
اور اسی گوہرِ ارزاں کے فروشندہ ہم

ایسے آشوب میں دکھ دینے کی فرصت کس کو
ہیں بہت لذتِ آزار سے شرمندہ ہم

اس اندھیرے میں کہ پل بھر کا چمکنا بھی محال
رات بھر زندہ و رخشندہ و تابندہ ہم

اپنا اس حرف و حکایت میں ہنر کچھ بھی نہیں
بولنے والا کوئی اور نگارندہ ہم

شمعِ تنہا کی طرح، صبح کے تارے جیسے
شہر میں ایک ہی دو ہوں گے ہمارے جیسے

چھوگیا تھا کبھی اس جسم کو اک شعلۂ درد
آج تک خاک سے اڑتے ہیں شرارے جیسے

حوصلے دیتا ہے یہ ابرِ گریزاں کیا کیا
زندہ ہوں دشت میں ہم اس کے سہارے جیسے

سخت جاں ہم سا کوئی تم نے نہ دیکھا ہوگا
ہم نے قاتل کئی دیکھے ہیں تمہارے جیسے

دیدنی ہے مجھے سینے سے لگانا اس کا
اپنے شانوں سے کوئی بوجھ اتارے جیسے

اب جو چمکا ہے یہ خنجر تو خیال آتا ہے
تجھ کو دیکھا ہو کبھی نہر کنارے جیسے

اس کی آنکھیں ہیں کہ اک ڈوبنے والا انسان
دوسرے ڈوبنے والے کو پکارے جیسے

اٹھو یہ منظرِ شب تاب دیکھنے کے لیے
کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لیے

عجب حریف تھا میرے ہی ساتھ ڈوب گیا
مرے سفینے کو غرقاب دیکھنے کے لیے

وہ مرحلہ ہے کہ اب سیلِ خوں پہ راضی ہیں
ہم اس زمین کو شاداب دیکھنے کے لیے

جو ہو سکے تو ذرا شہ سوار لوٹ کے آئیں
پیادگاں کو ظفریاب دیکھنے کے لیے

کہاں ہے تو کہ یہاں جل رہے ہیں صدیوں سے
چراغ، دیدہ و محراب دیکھنے کے لیے

مال کیا پاس ترے ہمتِ عالی بھی نہیں
اتنا خالی تو مرا کاسۂ خالی بھی نہیں

سرِ شوریدہ کو تہذیب سکھا بیٹھا ہوں
ورنہ دیوار مجھے روکنے والی بھی نہیں

خیمۂ شب میں عجب حشرِ عزا برپا ہے
اور ابھی رات چراغوں نے اجالی بھی نہیں

اور ہی شرط ہے پرواز کی، دیکھا تم نے
اب تو وہ مسئلۂ بے پرو بالی بھی نہیں

رات دن شعروں میں تمثال گری کرتا ہوں
طاقِ دل میں کوئی تصویرِ خیالی بھی نہیں

نقشِ پا ڈھونڈنے والوں پہ ہنسی آتی ہے
ہم نے ایسی تو کوئی راہ نکالی بھی نہیں

وحشت کے ساتھ دشت مری جان چاہیے
اس عیش کے لیے سر وسامان چاہیے

کچھ عشق کے نصاب میں کمزور ہم بھی ہیں
کچھ پرچۂ سوال بھی آسان چاہیے

تجھ کو سپردگی میں سمٹنا بھی ہے ضرور
سچا ہے کاروبار تو نقصان چاہیے

اب تک کس انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں لوگ
امید کے لیے کوئی امکان چاہیے

ہوگا یہاں نہ دست و گریباں کا فیصلہ
اس کے لیے تو حشر کا میدان چاہیے

آخر ہے اعتبارِ تماشا بھی کوئی چیز
انسان تھوڑی دیر کو حیران چاہیے

جاری ہیں پائے شوق کی ایذا رسانیاں
اب کچھ نہیں تو سیرِ بیابان چاہیے

سب شاعراں خریدۂ دربار ہوگئے
یہ واقعہ تو داخلِ دیوان چاہیے

ملکِ سخن میں یوں نہیں آنے کا انقلاب
دو چار بار نون کا اعلان چاہیے

اپنا بھی مدتوں سے ہے رقعہ لگا ہوا
بلقیسِ شاعری کو سلیمان چاہیے

ختم ہو جنگ خرابے پہ حکومت کی جائے
آخری معرکۂ صبر ہے عجلت کی جائے

ہم نہ زنجیر کے قابل ہیں نہ جاگیر کے اہل
ہم سے انکار کیا جائے نہ بیعت کی جائے

مملکت اور کوئی بعد میں ارزانی ہو
پہلے میری ہی زمیں مجھ کو عنایت کی جائے

یا کیا جائے مجھے خوش نظری سے آزاد
یا اسی دشت میں پیدا کوئی صورت کی جائے

ہم عبث دیکھتے ہیں غرفۂ خالی کی طرف
یہ بھی کیا کوئی تماشا ہے کہ حیرت کی جائے

گھر بھی رہیے تو چلے آتے ہیں ملنے کو غزال
کاہے کو بادیہ پیمائی کی زحمت کی جائے

اپنی تحریر تو جو کچھ ہے سو آئینہ ہے
رمزِ تحریر مگر کیسے حکایت کی جائے

اب کے صحرا میں عجب بارش کی ارزانی ہوئی
فصلِ امکاں کو نمو کرنے میں آسانی ہوئی

پیاس نے آبِ رواں کو کردیا موجِ سراب
یہ تماشا دیکھ کر دریا کو حیرانی ہوئی

سر سے سارے خوانِ خوشبو کے بکھر کر رہ گئے
خاکِ خیمہ تک ہوا پہنچی تو دیوانی ہوئی

دور تک اڑنے لگی گردِ صدا زنجیر کی
کس قدر دیوارِ زنداں کو پشیمانی ہوئی

تم ہی صدیوں سے یہ نہریں بند کرتے آئے ہو
مجھ کو لگتی ہے تمہاری شکل پہچانی ہوئی

میرا جسم اور کہیں میرا خیال اور کہیں
پار اُتارے گی مجھے موجِ وصال اور کہیں

دور تک آئنے ویران ہیں آنکھوں کی طرح
ڈھونڈنے جایئے اپنے مہہ و سال اور کہیں

کچھ اسی دشت پہ موقوف نہیں تیرِ ستم
زندگی ہے تو ہدف ہوں گے غزال اور کہیں

تہہِ افلاک ستاروں کا سفر جاری ہے
اب کے نکلیں گے ہم اے شامِ زوال اور کہیں

ہم ترے حرف دل آزار سے خوش ہیں جاناں
یوں بھی ہوتی ہے کہاں پرسشِ حال اور کہیں

ساعتِ وصل بھی عمرِ گزراں سے کم ہے
کیا سمندر ہے کہ اک موجِ رواں سے کم ہے

ہے بہت کچھ مری تعبیر کی دنیا تجھ میں
پھر بھی کچھ ہے کہ جو خوابوں کے جہاں سے کم ہے

وادیِ ہو میں پہنچتا ہوں بہ یک جستِ خیال
دشتِ افلاک مری وحشتِ جاں سے کم ہے

جان کیا دیجیے اس دولتِ دنیا کے لیے
ہم فقیروں کو جو اک پارۂ ناں سے کم ہے

میں وہ بسمل ہوں کہ بچنا نہیں اچھا جس کا
ویسے خطرہ ہنرِ چارہ گراں سے کم ہے

تجھ کو بھی اے ہوائے شب جی کا زیاں بہت ہوا
بجھ تو گیا مگر چراغ شعلہ فشاں بہت ہوا

رخصتِ سفر اٹھا گیا کون سرائے خواب سے
رات پھر اس نواح میں گریۂ جاں بہت ہوا

موسمِ گل سے کم نہ تھا موسمِ انتظار بھی
شاخ پہ برگِ آخری رقص کناں بہت ہوا

کوئی افق تو ہو کہ ہم جس کی طرف پلٹ سکیں
شام ہوئی تو یہ خیال دل پہ گراں بہت ہوا

مصافِ دشتِ تماشا نہیں ٹھہر جاؤ
اور اس کے آگے بھی دریا نہیں ٹھہر جاؤ

سوادِ شب میں کسی سمت کا سراغ کہاں
یہ سیمیا ہے ستارہ نہیں ٹھہر جاؤ

تم اس حریف کو پامال کر نہیں سکتے
تمہاری ذات ہے دنیا نہیں ٹھہر جاؤ

یہ ہُو کا وقت، یہ جنگل گھنا، یہ کالی رات
سنو یہاں کوئی خطرہ نہیں ٹھہر جاؤ

ہوا رُکے تو وہی اک صدا سنائی دے
''انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ''

بے کراں رات میں تو انجمن آرا ہے کہ ہم
اے زمیں تو ہی اندھیرے کا ستارہ ہے کہ ہم

اس نے پوچھا تھا کہ سر بیچنے والا ہے کوئی
ہم نے سر نامۂ جاں نذر گزارا ہے کہ ہم

کیا خبر کون زوالِ شبِ ہجراں دیکھے
یاں چراغِ شبِ ہجراں کا اشارہ ہے کہ ہم

تو ادھر کس کو ڈبونے کے لئے آئی تھی
دیکھ اے موجِ بلا خیز کنارہ ہے کہ ہم

آج تک معرکۂ صبر و ستم جاری ہے
کون جانے یہ تماشا اسے پیارا ہے کہ ہم

جب یہ عالم ہو تو لکھیے لب و رخسار پہ خاک
اڑتی ہے خانۂ دل کے در و دیوار پہ خاک

تو نے مٹی سے الجھنے کا نتیجہ دیکھا
ڈال دی میرے بدن نے تری تلوار پہ خاک

ہم نے مدت سے اُلٹ رکھا ہے کاسہ اپنا
دستِ زر دار ترے درہم و دینار پہ خاک

پتلیاں گرمیِ نظارہ سے جل جاتی ہیں
آنکھ کی خیر میاں رونقِ بازار پہ خاک

پائے وحشت نے عجب نقش بنائے تھے یہاں
اے ہوائے سرِ صحرا تری رفتار پہ خاک

یہ بھی دیکھو کہ کہاں کون بلاتا ہے تمھیں
محضرِ شوق پڑھو، محضرِ سرکار پہ خاک

آپ کیا نقدِ دو عالم سے خریدیں گے اسے
یہ تو دیوانے کا سر ہے سرِ پندار پہ خاک

یہ غزل لکھ کے حریفوں پہ اُڑا دی میں نے
جم رہی تھی مرے آئینۂ اشعار پہ خاک

ملالِ دولتِ بردہ پہ خاک ڈالتے ہیں
ہم اپنی خاک سے پھر گنجِ زر نکالتے ہیں

میں اپنے نقدِ ہنر کی زکوٰۃ بانٹتا ہوں
مرے ہی سکّے مرے ہم سخن اچھالتے ہیں

بڑھا کے میرے معانی پہ لفظ کا زنگار
مرے حریف مرے آئنے اجالتے ہیں

سجا کے آئنۂ حرف پیشِ آئنہ
ہم اک کرن سے ہزار آفتاب ڈھالتے ہیں

عذابِ جاں ہے عزیزو خیالِ مصرعِ تر
سو ہم غزل نہیں لکھتے عذاب ٹالتے ہیں

سروں کو ربط رہا ہے سناں سے پہلے بھی
گزر چکے ہیں یہ لشکر یہاں سے پہلے بھی

یہ پہلی چیخ نہیں ہے ترے خرابے میں
کہ حشر اُٹھے ہیں میری فغاں سے پہلے بھی

ہماری خاک پہ صحرا تھا مہربان بہت
ہوائے کوفۂ نا مہرباں سے پہلے بھی

بجھا چکے ہیں پرانی رفاقتوں کے چراغ
بچھڑنے والے شب درمیاں سے پہلے بھی

ہمیں نہیں ہیں ہلاکِ وفا کہ لوگ پر
چلے ہیں تیر صفِ دوستاں سے پہلے بھی

حاصلِ سیرِ بے دلاں کون و مکاں نہیں نہیں
کوئے حرم نہیں نہیں، شہرِ بتاں نہیں نہیں

جسم کی رسمیات اور، دل کے معاملات اور
بیعتِ دست ہاں ضرور، بیعتِ جاں نہیں نہیں

درد کی کیا بساط ہے جس پہ یہ پیچ و تاب ہو
دیکھ عزیز صبر صبر، دیکھ میاں نہیں نہیں

ہم فقراء کا نام کیا، پھر بھی اگر کہیں لکھو
لوحِ زمیں تلک تو خیر، لوحِ زماں نہیں نہیں

دونوں تباہ ہوگئے، ختم کرو یہ معرکے
اہلِ ستم نہیں نہیں، دل زدگاں نہیں نہیں

گرمیٔ شوق کا صلہ دشت کی سلطنت غلط
چشمۂ خوں کا خوں بہا خوئے رواں نہیں نہیں

فقیری میں یہ تھوڑی سی تن آسانی بھی کرتے ہیں
کہ ہم دستِ کرم دنیا پہ ارزانی بھی کرتے ہیں

درِ روحانیاں کی چاکری بھی کام ہے اپنا
بتوں کی مملکت میں کارِ سلطانی بھی کرتے ہیں

جنوں والوں کی یہ شائستگی طرفہ تماشا ہے
رفو بھی چاہتے ہیں چاک دامانی بھی کرتے ہیں

مجھے کچھ شوقِ نظارہ بھی ہے پھولوں کے چہروں کا
مگر کچھ پھول چہرے میری نگرانی بھی کرتے ہیں

جو سچ پوچھو تو ضبطِ آرزو سے کچھ نہیں ہوتا
پرندے میرے سینے میں پر افشانی بھی کرتے ہیں

ہمارے دل کو اک آزار ہے، ایسا نہیں لگتا
کہ ہم دفتر بھی جاتے ہیں غزل خوانی بھی کرتے ہیں

بہت نوحہ گری کرتے ہیں دل کے ٹوٹ جانے کی
کبھی آپ اپنی چیزوں کی نگہبانی بھی کرتے ہیں

❁

اے مرے طائرِ جاں کس کی طرف دیکھتا ہے
ناوکِ کور کماں کس کی طرف دیکھتا ہے

ہم کسے اپنے سوا عشق میں گردانتے ہیں
دلِ بے مایہ یہاں کس کی طرف دیکھتا ہے

بانوئے ناقہ نشیں دیکھ کے چہرہ تیرا
بندۂ خاک نشاں کس کی طرف دیکھتا ہے

میں تو اک منظرِ رفتہ ہوں مجھے کیا معلوم
اب جہانِ گزراں کس کی طرف دیکھتا ہے

ہم سب آئینہ در آئینہ در آئینہ ہیں
کیا خبر کون، کہاں، کس کی طرف دیکھتا ہے

اس کے بسمل ہیں سو ہم دیکھتے ہیں اس کی طرف
وہ شہِ چارہ گراں کس کی طرف دیکھتا ہے

تم جو عرفان یہ سب دردِ نہاں لکھتے ہو
کون ہے جس کے لیے نامۂ جاں لکھتے ہو

جانتے ہو کہ کوئی موج مٹادے گی اسے
پھر بھی کیا کیا سرِ ریگِ گزراں لکھتے ہو

جس کے حلقے کا نشاں بھی نہیں باقی کوئی
اب تک اس رشتے کو زنجیرِ گراں لکھتے ہو

یہ بھی کہتے ہو کہ احوال لکھا ہے جی کا
اور یہ بھی کہ حدیثِ دگراں لکھتے ہو

یہ بھی لکھتے ہو کہ معلوم نہیں ان کا پتا
اور خط بھی طرفِ گمشدگاں لکھتے ہو

سایہ نکلے گا جو پیکر نظر آتا ہے تمہیں
وہم ٹھہرے گا جسے سروِ رواں لکھتے ہو

اتنی مدت تو سلگتا نہیں رہتا کچھ بھی
اور کچھ ہوگا جسے دل کا دھواں لکھتے ہو

کوئی دلدار نہیں تھا تو جتاتے کیا ہو
کیا چھپاتے ہو اگر اس کا نشاں لکھتے ہو

تم جو لکھتے ہو وہ دنیا کہیں ملتی ہی نہیں
کون سے شہر میں رہتے ہو، کہاں لکھتے ہو

ہوائے دشتِ ماریہ

(منتخب کلام)

گھُٹی میں ہے وِلا کا وہ نشّہ پڑا ہوا
ٹھوکر پہ مارتا ہوں خزانہ پڑا ہوا

یہ عجب مسافتیں ہیں

یہ عجب مصافِ جاں ہے

کہ میں سینکڑوں برس سے

اسی دشتِ ماریہ میں

سرِ نہرِ شب کھڑا ہوں

وہی اک چراغِ خیمہ

وہی اک نشانِ صحرا

وہی ایک نخلِ تنہا

نہ فرشتگاں کے لشکر

نہ بشارتوں کے طائر

وہی اگلے دن کی آہٹ

یہ ستارہ ہے کہ نیزہ

یہ دعا ہے یا دھواں ہے

مگر اک صدا مسلسل

یہ کہاں سے آ رہی ہے

ابھی رات درمیاں ہے

ابھی رات درمیاں ہے

رکا ہوا ہے یہ صحرا میں قافلہ کیسا
اور ایک شور سا خیموں میں ہے بپا کیسا

اسیر کس نے کیا موج موج پانی کو
کنارِ آب ہے پہرہ لگا ہوا کیسا

ابھی سیاہ، ابھی سیم گوں، ابھی خوں بار
افق افق ہے یہ منظر گریز پا کیسا

یہ چیخ ہے کہ علم کیا بلند ہوتا ہے
یہ جل رہا ہے ہوا میں چراغ سا کیسا

یہ لوگ دشتِ جفا میں کسے پکارتے ہیں
یہ باز گشت سناتی ہے مرثیہ کیسا

وہ مہربان اجازت تو دے رہا ہے مگر
اب آگئے ہیں تو مقتل سے لوٹنا کیسا

یہ ایک صف بھی نہیں ہے، وہ ایک لشکر ہے
یہاں تو معرکہ ہوگا، مقابلہ کیسا

سلگتی ریت میں جو شاخ شاخ دفن ہوا
رفاقتوں کا شجر تھا ہرا بھرا کیسا

یہ سرخ بوند سی کیا گھل رہی ہے پانی میں
یہ سبز عکس ہے آنکھوں میں پھیلتا کیسا

کھڑا ہے کون اکیلا حصارِ غربت میں
گھرا ہوا ہے اندھیروں میں آئنہ کیسا

یہ ریگِ زرد ردا ہے برہنہ سر کے لیے
اجاڑ دشت میں چادر کا آسرا کیسا

سیاہ نیزوں پہ سورج ابھرتے جاتے ہیں
سوادِ شام ہے منظر طلوع کا کیسا

تجھے بھی یاد ہے اے آسماں کہ پچھلے برس
مری زمین پہ گزرا ہے سانحہ کیسا

گھُٹّی میں ہے وِلا کا وہ نشہ پڑا ہوا
ٹھوکر پہ مارتا ہوں خزانہ پڑا ہوا

کچھ بس چلا نہ مرحبِ روزگار کا
گردن میں تھا جو پنجۂ مولا پڑا ہوا

پشتوں سے میں سگِ درِ حیدر ہوں دیکھ لو
گردن میں میری کس کا ہے پٹّہ پڑا ہوا

اور یہ بھی دیکھ لو اسی نسبت کے فیض سے
پیروں پہ ہے مرے سگِ دُنیا پڑا ہوا

خورشیدِ حشر، آلِ ربیبِ علی ہوں میں
ہے سر پہ اُس سحابِ کا سایہ پڑا ہوا

سورج کو مل گئی درِ دولت کی چاکری
سیّارگاں کی صف میں ہے غوغا پڑا ہوا

مقصودِ جاں ہے حاضریِ شہر بوتراب
اور راہ میں ہے جسم کا صحرا پڑا ہوا

بخشش بھی بے حساب، سعادت بھی بے حساب
ہے مدح گو کو مدح کا چسکا پڑا ہوا

آئینۂ عرفان

کوائف، شجرہ، تصاویر

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک
مسند خاک پہ بیٹھا ہوں برابر اپنے

عرفان صدیقی: ذاتی کوائف

نام:-	محمد عرفان احمد صدیقی
پیدائش:-	۱۱/مارچ ۱۹۳۹ء مقام:- پیدائش بدایوں
تخلص:-	عرفان صدیقی
والد:-	سلمان احمد ہلالی والدہ:- رابعہ خاتون
شادی:-	۱۹۶۴ء ، سیدہ حبیب کے ساتھ
اولاد:-	خالد عرفان (فیضان احمد صدیقی)، مینا عرفان، نغمہ عرفان، رومانہ عرفان اور لبنیٰ عرفان
تعلیم :-	ایم اے (آگرہ یونیورسٹی)
ملازمت:-	۞ ۱۹۶۲ء میں دہلی میں وزارت اطلاعات ونشریات کی مرکزی اطلاعاتی خدمات سے وابستہ ہوئے ۞ ۱۹۷۴ء دہلی سے لکھنؤ ٹرانسفر ۞ ۱۹۸۸ء میں حکومت ہند کے سینٹرل کمان میں (میجر رینک) پی آر او مقرر ہوئے ۞ ۱۹۹۷ء میں بحیثیت ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر ملازمت سے سبکدوش ہوئے
وفات:-	۱۵/اپریل ۲۰۰۴ء، لکھنؤ

اہم اعزازات:- ۞ نشانِ امتیازِ میر (میر اکادمی لکھنؤ)

۞ اعتراف مجموعی خدمات ۔ ۱۹۹۸ء، اتر پردیش اردو اکادمی

۞ غالب ایوارڈ (غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی)

شعری تصنیفات: ۞ کینوس (۱۹۷۸) ۞ شب درمیان (۱۹۸۴ء)

۞ سات سماوات (۱۹۹۲ء) ۞ عشق نامہ (۱۹۹۷ء)

۞ دریا (۱۹۹۹ء)۔ پہلے چار مجموعہ کی کلیات

۞ ہوائے دشتِ ماریہ (۱۹۹۸ء) سلام ومنقبت پر مشتمل ۴۸ صفحات کا مجموعہ

۞ شہرِ ملال (کلّیاتِ عرفان صدیقی طباعت کے مراحل میں)

نثری تصنیفات: ۞ عوامی ترسیل (۱۹۷۷) ۞ رابطہ عامہ (۱۹۸۴)

تراجم: ۞ رت سنگھار (کالی داس کی کتاب رتو سمہارم کا منظوم ترجمہ)

۞ مالویکا اگنی مترم (کالی داس کے ڈرامہ کا سنسکرت سے ترجمہ)

۞ روٹی کی خاطر (عرب ناول نگار محمد شکری کے سوانحی ناول کا ترجمہ)

☆☆☆

شجرۂ نسب

عرفان صدیقی کا ددیہالی شجرۂ نسب
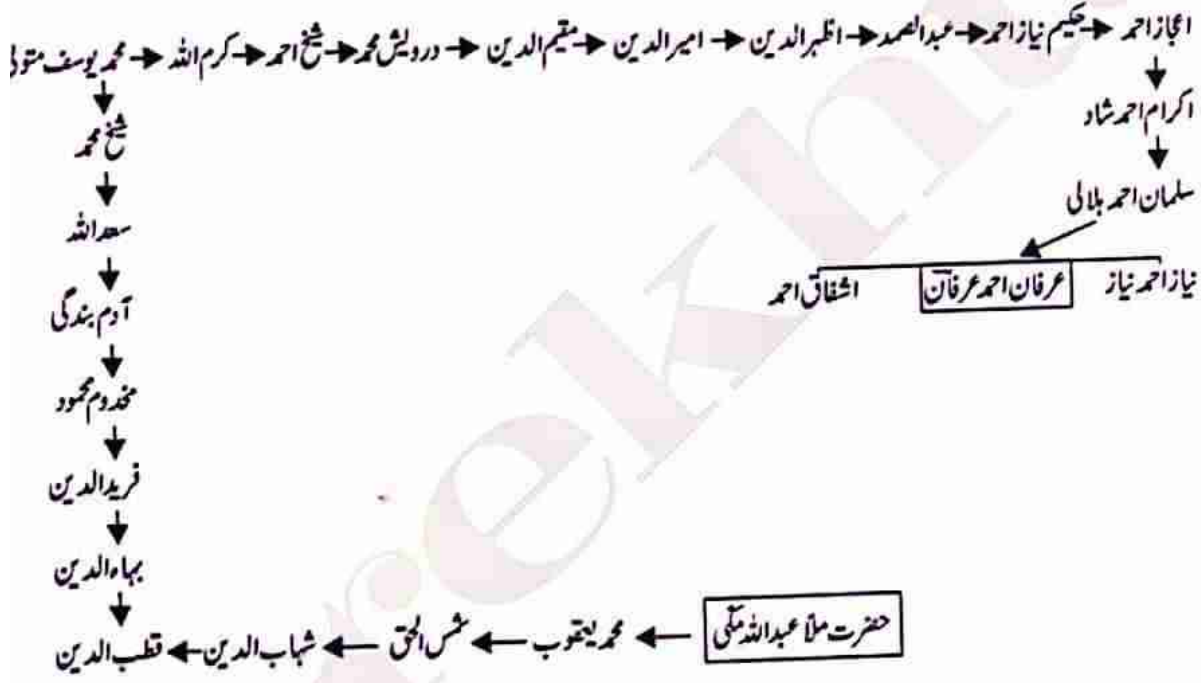
عرفان صدیقی کا نانہالی شجرۂ نسب
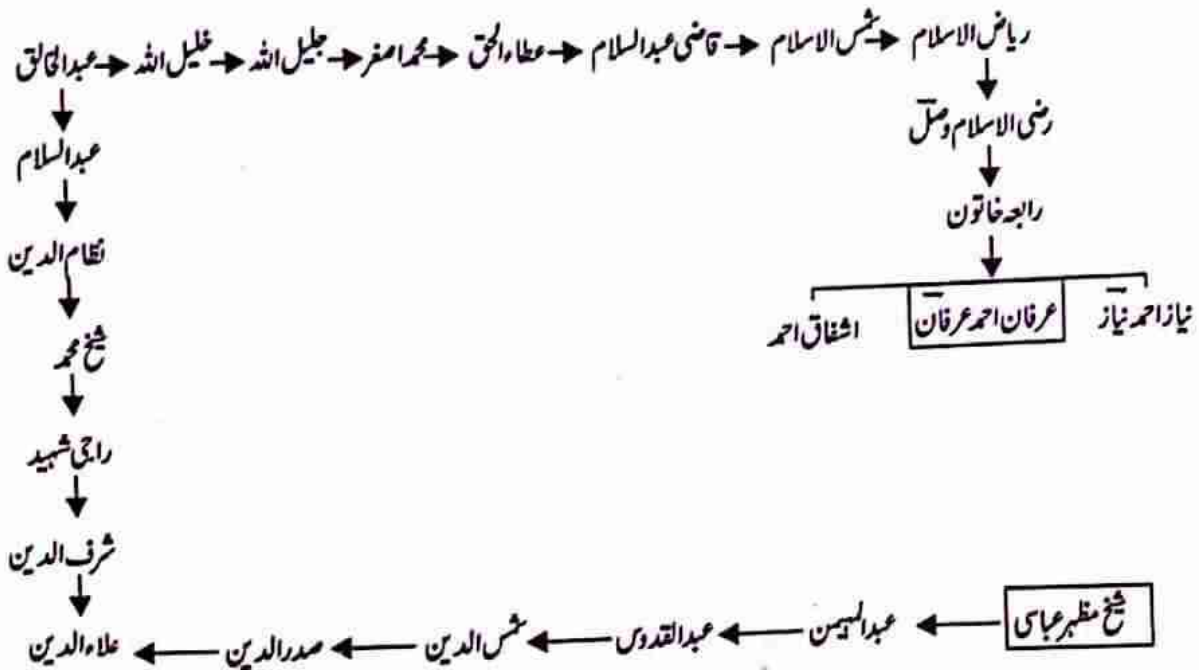
(مرتبہ: تسلیم غوری، بہ شکریہ: نیا دور عرفان صدیقی نمبر)

عرفان صدیقی کی کتابیں
سات سماوات
عرفان صدیقی
سنہ اشاعت، ۱۹۹۲ء
کینوس
عرفان صدیقی
سنہ اشاعت، ۱۹۷۸ء
دریا
سنہ اشاعت، ۱۹۹۹ء
شب درمیاں
سنہ اشاعت، ۱۹۸۴ء
عرفان صدیقی
عشق نامہ
سنہ اشاعت، ۱۹۹۷ء
ہوائے دشت ماریہ
عرفان صدیقی
سنہ اشاعت، ۱۹۹۸ء
سنہ اشاعت، ۱۹۸۳ء
عوامی ترسیل
سنہ اشاعت، ۱۹۸۴ء
سنہ اشاعت، ۱۹۸۱ء
رابطۂ عامہ
سنہ اشاعت، ۱۹۷۷ء
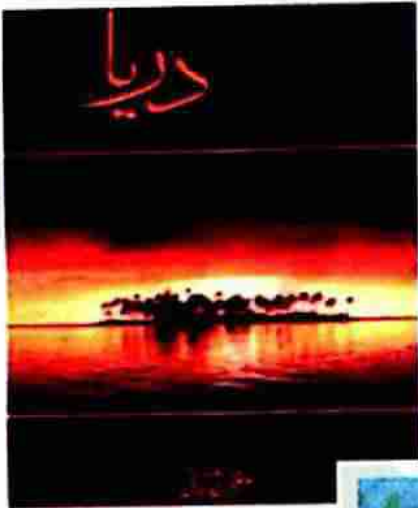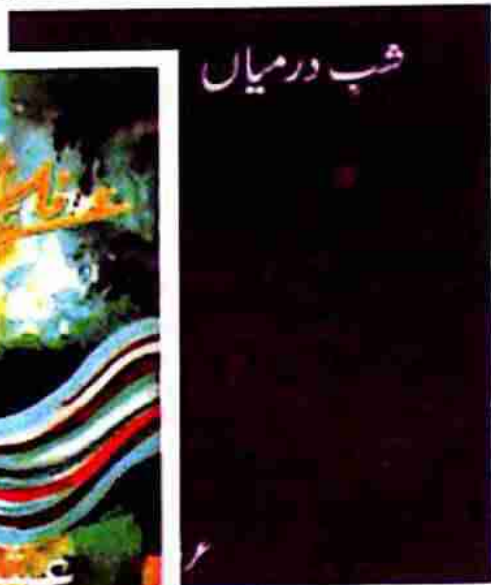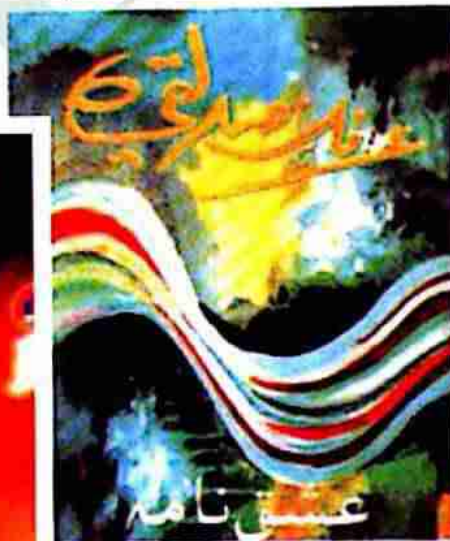
انجمن میڈیا پرسن، لکھنؤ
ANJUMAN MEDIA PERSON

عرفان صدیقی اپنے بھائی نیاز بدایونی اور بھتیجے کے ساتھ

عرفان صدیقی اپنے بڑے بھائی نیاز بدایونی کے ساتھ۔ کراچی میں

سعود عثمانی کے ذریعہ لی گئی عرفان صدیقی کی ایک یادگار تصویر
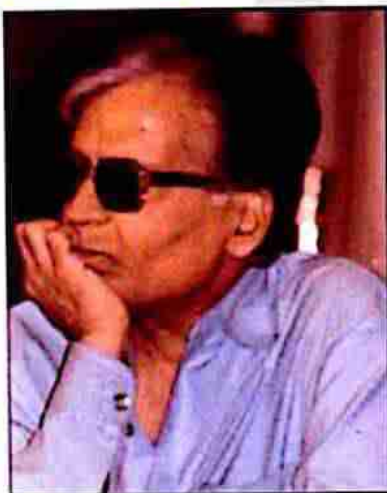
غزل تو خیر ہر اہلِ سخن کا جادو ہے
مگر یہ نوکِ پلک میرے فن کا جادو ہے

Irfan Siddiqui
Hayaat, Khidmaat aur Sheri Kainaat

Compiled by: Aziz Nabeel & Asif Azmi

Majlis-e-Fakhr-e-Bahrain Barae Farogh-e-Urdu

GLOBAL MEDIA PUBLICATIONS
E-42, G F, Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi-110025